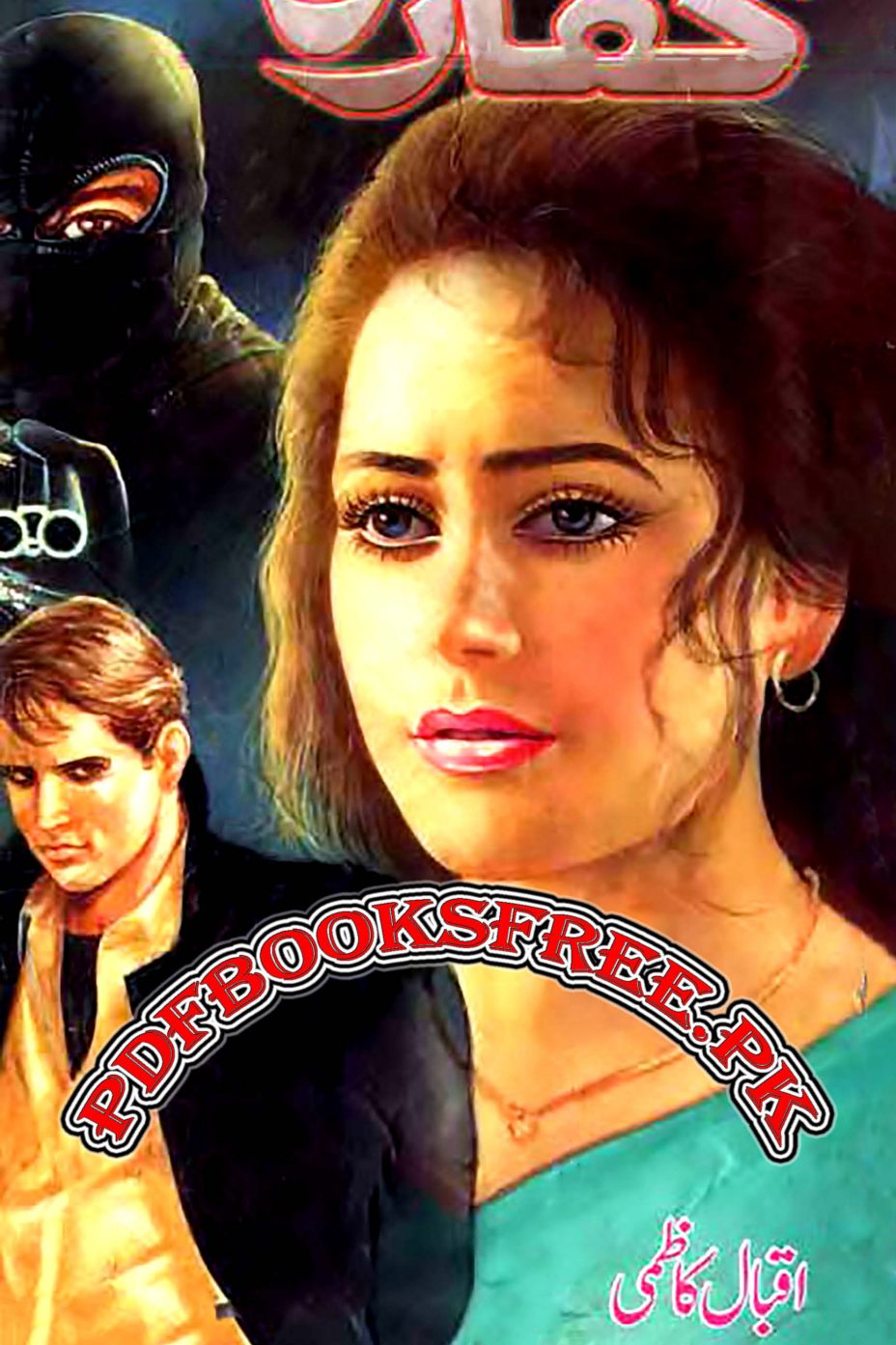


کفارہ



PDFBOOKSFREE.PK

اقبال کاظمی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں
قارئین کے مطالعے اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے
لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر
استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو
تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی
، قانونی و شرعی جرم ہے۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfboosfree.pk



یہ ایک حقیقت ہے اور اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ جرائم پیشہ افراد بھی ہماری معاشرتی زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ گو اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ یہ انتہائی ناپسندیدہ طبقہ جو معاشرے کو کسی ناسور کی طرح سے لاحق ہے، جسم انسانی کو لاحق مہلک ناسور کی طرح سے عملِ جراحی کا مستحق ہے اور اس کا کاٹ پھینکنا اور پورے معاشرے کے وجود کو اس کی تباہ کاریوں سے بچانا بھی ضروری ہے۔ لیکن ہر ذی شعور اور دانش مند انسان اس حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ جب تک مرض کی وجہ کا علاج نہ کر دیا جائے، مرض سے چھکارہ ممکن نہیں ہوتا اور جسم کے جس حصہ کو لاحق ناسور ناقابلِ علاج ہو جائے اور بقیہ جسم کی ہلاکت کا باعث بن رہا ہو تو جسم کے اس حصہ کو کاٹ کر الگ کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پھر ہم اپنے معاشرتی جسم کو کہاں تک کاٹ کاٹ کر پھینک سکتے ہیں۔ یقیناً ہمیں ان وجوہات کا پتہ لگانا اور ان کا سد باب کرنا لازم ہے جو اس ناسوری کیفیت کو جنم دیتی ہیں۔

یہ جرائم پیشہ افراد جن کے باعث ہمارا معاشرہ کسی اپانج جسم کی سی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے ہمارے ہی گھروں میں پیدا ہوتے ہیں اور ہمارے بیچ رہتے ہوئے ہی پروان چڑھتے ہیں۔ لیکن یا تو انہیں ایسا ماحول میسر نہیں آتا جو انہیں باکردار شہری بننے پر معاون ہو یا پھر ہمارے نامناسب اور غیر اخلاقی رویے ان کے کردار کو مسخ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ زیر نظر ناول ایک ایسے ہی نوجوان کی کہانی ہے جسے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے ایسے رویوں کا شکار ہونا پڑا تھا جو آخر کار اسے جرائم کی ناقابلِ عبور دلدل میں گھسیٹ لے گئے۔ ہمارے لئے اس ناول میں ایک سبق ہے۔

دوڑتے دوڑتے میری ٹانگوں میں لڑکھڑاہٹ آگئی۔ میں پیر رکھتا کہیں تھا، پڑتا کہیں۔ سانس پھول گیا اور منہ سے کف بہنے لگا تھا۔ نہ ٹانگوں میں اتنی سکت رہی تھی اور نہ پیچھڑوں میں اتنی قوت کہ میں مزید بھاگ سکتا مگر میں اس خوفناک حقیقت سے بھی پوری طرح واقف تھا کہ کہیں رکنے کا مطلب موت تھا۔ بھیا نک اور اذیت ناک موت۔

تیرا پیچھا کرنے والے انسان نہیں، خونخوار بھیڑیے تھے۔ موت کے فرشتے۔ وہ میرا جو حشر کرتے اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ اس لئے نہایت ناگفتہ بہ حالت ہونے کے باوجود میں کہیں رکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اب میری ہمت جواب دے رہی تھی۔ اب تک تو میں قوتِ ارادی کے سہارے بھاگتا رہا تھا۔ مگر ہر شے کی انتہا ہوتی ہے۔ اور میں قوتِ برداشت کی وہ انتہائی سرحد بھی پار کر چکا تھا۔ میرے پیچھڑے پھٹے جا رہے تھے۔

سڑک کا ایک موڑ گھومتے ہوئے میں ایک درخت کے نیچے رک گیا اور تنے سے ٹیک لگا کر اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ منہ سے بہنے والے کف سے میری ٹھوڑی تر ہو رہی تھی۔ میں نے آستین سے کف پونچھا۔ میری ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ ٹیک لگا کر کھڑے رہنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میرے گھٹنے دوہرے ہونے لگے اور میں درخت کے تنے سے رگڑ کھاتا ہوا نیچے جھکتا چلا گیا۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ رات اگرچہ تاریک تھی لیکن اسٹریٹ لائٹس کی اوجھتی روشنی نے تاریکی کا اثر کسی حد تک زائل کر دیا تھا۔ البتہ سناٹا بہت گہمیر تھا۔ کسی طرف سے کوئی معمولی سی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرنے والے کتے بھی کہیں دہک کر سو گئے تھے۔

میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کوئی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا مگر کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے دو تین منٹ گزر چکے تھے مگر میرا سانس اب بھی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میرے ہانپنے کی آواز دس پندرہ قدم دور سے بھی سنی جاسکتی تھی۔

گلیوں میں بجلی کے کھمبے تو لگے ہوئے تھے مگر بلب کسی کسی کھمبے پر ہی نظر آتے تھے۔ میرا ایک پرانا تجربہ یہ بھی تھا کہ ان بڑے بڑے بنگلوں میں رہنے والے لوگ جتنے دولت مند تھے، اتنے ہی بزدل بھی تھے۔ فائر کی آواز اگر کسی متوسط یا غریب طبقے کی آبادی میں گونجی ہوتی تو لوگ ہاکیاں اور ڈنڈے لے کر سڑکوں پر آچکے ہوتے۔ مگر یہاں دو فائر ہوئے تھے۔ نیند میں ہونے کے باوجود کچھ لوگوں نے آواز سنی ہوگی مگر باہر جھانکنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ ان بنگلوں کے مینوں کی حفاظت کے لئے گارڈز بھی ہوں گے۔ مگر ایسے موقعوں پر تو وہ بھی گیٹ سے باہر جھانکنے کی ہمت نہیں کرتے۔ ڈھائی تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پانے والے محافظ اپنی جان کو داؤ پر لگانے کی حماقت نہیں کر سکتے۔

اب پہلی گلی سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ میں یہاں محفوظ نہیں تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور درخت کی آڑ سے نکل کر ایک طرف دوڑنا چلا گیا اور چونکہ شاید پانچویں بنگلے کے سامنے والے لان میں کھس کر جھاڑیوں کے پیچھے اونہ حالیت گیا اور اس لمحہ دو آدمی دوڑتے ہوئے اس موڑ پر پہنچ گئے تھے جہاں سے میں بھاگا تھا۔ میں نے وہاں سے ہٹنے کا بروقت فیصلہ کیا تھا۔ اگر اس درخت کے نیچے کھڑا رہتا تو ان کی نظروں میں آ جاتا۔

میرے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ سانس بے قابو ہونے لگا۔ میں سینے کے بل لیٹ کر شاخوں میں سے جھانکنے لگا۔ یہ باز اوپر سے تو خاصی سرسبز اور گنجان تھی لیکن نچلے حصے پر بیتیاں جھڑ چکی تھیں اور صرف شانیں ہی رہ گئی تھیں۔ پتلی پتلی شانیں جالی کے تاروں کی طرح ایک دوسرے میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ میں نے نیلی جینز کی پتلون اور میروں کلر کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ تاریکی میں یہ کپڑے بھی کالے ہی لگتے تھے۔ اور یہ بھی غنیمت تھا کہ بنگلے کے گیٹ کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اس لئے مجھے یہ اطمینان تھا کہ جب تک بازو کے قریب آ کر اوپر سے نہ جھانکا جائے میں باہر سے کسی کی نظروں میں نہیں آ سکتا تھا۔ البتہ میری کوئی معمولی سی حرکت قریب سے گزرنے والے کو میری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔

وہ دونوں آدمی دوڑتے ہوئے اس طرف آ گئے اور مجھ سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر رک گئے۔ وہ مرکزی بلب کی روشنی میں تھے اور میں بازو کی شاخوں میں سے انہیں دیکھ سکتا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول یا ریواور تھے۔ وہ معمولی سی آہٹ پر گولی چلا سکتے تھے اس لئے میں بے حس و حرکت اپنی جگہ پر لینا رہا اور ایک ہاتھ منہ پر رکھ لیا تھا تاکہ سانس کی آواز بھی نہ ابھر سکے۔ میرے پاس ایک چاقو کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اگر پستول ہوتا تو میں بڑے

اور پھر دفعہ میں اُچھل پڑا۔ مجھے اپنا دل کپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ فائر کی وہ آواز سنانے میں بازگشت ہی پیدا کرتی ہوئی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ گونجتی ہوئی آواز سے اگرچہ سمت کا اندازہ لگانا دشوار تھا مگر یہ طے شدہ بات تھی کہ وہ پستول یا ریواور کا فائر تھا اور مجھ سے زیادہ سے زیادہ سو گز کے فاصلے پر ہوا تھا۔

میں بڑی پھرتی سے اٹھ کر درخت کے پچھلی طرف چلا گیا۔ میرے دونوں ہاتھ درخت کے تنے پر تھے۔ میں آڑ سے جھانک کر ادھر ادھر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ میرا تعاقب کرنے والے موت کے دو فرشتے قریب پہنچ گئے تھے۔ لیکن میرے لئے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ انہوں نے گولی کس پر چلائی تھی۔ میرے دھوکے میں کوئی بے گناہ اُن کے ہاتھوں مارا گیا تھا یا کسی اور وجہ سے گولی چلائی گئی تھی۔ اور پھر اسی لمحہ کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور فائر ہوا اس مرتبہ گولی کی آواز کے ساتھ کتے کی چپاؤں پیاؤں کی آواز بھی واضح طور پر سنائی دی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پہلی گولی بھی اسی کتے پر ہی چلائی گئی ہوگی۔ مگر غالباً کتا بچ کر دوبارہ ان پر لپکا تھا جس پر دوسری گولی چلا کر اسے ٹھنڈا کر دیا گیا۔ اس بد نصیب کتے کی موت کا تصور کر کے میں دل ہی دل میں کانپ اٹھا۔ اگر میں ان کے ہاتھ آ گیا تو مجھے بھی اسی طرح کتے کی موت مار دیا جائے گا۔

میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ اس وقت تک میں اپنی کیفیت پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا اور یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خونخوار بھیڑیے مجھ سے کم از کم سو گز دور تھے۔ اگر وہ اس طرف نکل آئے تو میرے لئے اپنے آپ کو بچانا مشکل ہو جائے گا۔

میں جس سڑک پر مڑا تھا وہ کافی کشادہ تھی اور اس کے دونوں طرف بڑے بڑے بنگلے تھے۔ ہر بنگلے کے سامنے تقریباً دس فٹ جگہ گھیر کر لان بنائے گئے تھے۔ کسی لان کے آگے محض تار کا جگہ تھا اور کسی کے آگے گارڈینیا کی اوچی باڑ لگی ہوئی تھی۔ اس علاقے میں دولت مندوں کی رہائش تھی۔ یہ بڑے بڑے لوگ تھے۔ انہیں سرکار کی مرضی سے غیر اعلانیہ طور پر بڑی بڑی مراعات حاصل تھیں۔ ہر قسم کے ٹیکس متوسط اور غریب طبقوں کے لوگ ادا کرتے تھے اور ان کا لطف یہ لوگ اٹھاتے تھے۔ سڑکیں صاف ستھری اور ہر پول پر مرکزی بلب روشن تھا۔ ان لوگوں نے اپنی مرضی سے بنگلوں کے سامنے لمبی چوڑی جگہ گھیر کر لان بنارکھے تھے۔ اس کے برعکس متوسط یا غریب طبقوں کے باسی ان سہولتوں سے محروم تھے۔ ہر گلی کے موڑ پر گندگی کے ڈھیر، سڑکیں اس طرح ٹوٹی پھوٹی کہ اگر کسی زچہ کو ایسولینس میں ڈال کر ہسپتال لے جانے کی کوشش کی جائے تو لگنے والے جھکوں سے راستے ہی میں ماں بن جائے۔ ان بستیوں کی سڑکوں اور

اجھل کر حلق میں آگیا۔ تیز روشنی میں باڑ کی شاخوں کے اندر بھی آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ میں بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔ روشنی باڑ پر سے ہوتی ہوئی آگے نکل گئی اور دو تین سیکنڈ بعد وہ کار بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح میرے سامنے سے گزر گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

وہ کار اگلے موڑ پر دائیں طرف مڑ گئی۔ میرے خیال میں اب خطرہ وقتی طور پر ٹل گیا تھا۔ میں لان سے نکل کر آگے کی طرف دوڑنے لگا۔ لیکن میں زیادہ دور تک نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے ایک بار پھر ایک بنگلے کے سامنے والے لان کی باڑ کے پیچھے پناہ لینا پڑی۔

سامنے والی رو کے ایک بنگلے سے اچانک ہی کسی عورت کی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں باڑ کے پیچھے سینے کے بل لیٹ گیا اور سڑک کے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ عورت کے چیخنے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی جس سے مجھے اس بنگلے کی نشاندہی ہو گئی۔

عورت کی چیخوں کی آواز اس قدر نمایاں تھی کہ رات کے آخری پہر کے سناٹے میں دور تک سنی گئی ہوگی۔ میرا خیال تھا کہ اس پاس کے بنگلوں میں سوتے ہوئے لوگ بھی جاگ اٹھے ہوں گے یا کم از کم بنگلوں کے چوکیدار صورتحال معلوم کرنے کے لئے ضرور باہر آئیں گے۔ مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ پانچ منٹ گزر گئے، کسی بنگلے سے کسی انسان نے بھی جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ البتہ کہیں سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

مجھے بہت ڈکھ ہوا لوگوں کی بے حس پر۔ کیا دولت انسان کو اس قدر بے حس کر دیتی ہے کہ انہیں کسی اور کے ڈکھ درد کا احساس نہیں رہتا؟ اپنے سوا کسی اور کا خیال نہیں ہوتا۔ پہلے گولیوں کی آوازیں خاموش فضا میں گونجی تھیں۔ ٹھیک ہے، خطرہ محسوس کر کے کوئی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ مگر کسی عورت کی دردناک چیخوں کی آواز تو پتھر کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ اور کچھ دیر پہلے میں نے جو آوازیں سنی تھیں وہ ایسی ہی تھیں کہ مجھ جیسا سنگدل اور بے رحم شخص بھی کانپ اٹھا تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ آواز سامنے کس بنگلے سے آئی تھی۔ شاید اس بنگلے میں ڈاکو گھس گئے تھے۔ مگر آدھے گھنٹے سے تو میں یہاں موجود تھا۔ اس بنگلے میں داخل ہوتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ اس سڑک پر ہی کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر چیخوں کی وہ آواز بڑی خوفناک تھی۔ پانچ منٹ گزر گئے اور پھر سڑک کے اس پار ایک بنگلے کا گیٹ بہت آہستہ آہستہ کھلتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس طرف کسی قدر اندھیرا تھا مگر سفید گیٹ حرکت کرتا ہوا بڑی آسانی سے نظر آ گیا۔

گیٹ پوری طرح کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک آدمی کا ہیولہ دکھائی دیا۔ اور چند سیکنڈ بعد سرخ رنگ کی ایک کار باہر نکلی۔ اس کے انجن کی آواز بہت ہلکی تھی۔ دوسرے شخص نے گیٹ بند

اطمینان سے ان دونوں کو ڈھیر کر سکتا تھا۔ لیکن میں ان کے ہتھکڑوں کا مقابلہ چاقو سے نہیں کر سکتا تھا۔

”وہ یقیناً ان گلیوں ہی میں ہے۔“ ان میں سے ایک کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”دارے..... تم فوراً واپس جاؤ اور تار کے ساتھ گاڑی لے کر اس طرف آ جاؤ۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔ اسے ہر صورت میں تلاش کرنا ہے۔ اگر وہ حرام زادہ ان گلیوں سے نکل گیا تو اس کا ہاتھ آنا مشکل ہو جائے گا۔ اور تم جانتے ہو ایسی صورت میں باس ہماری کھال اُتر دے گا اس میں بھس بھر دے گا۔ تم جاؤ..... میں اس درخت کے نیچے کھڑا ہوں۔“

اس بد معاش کے منہ سے اپنے لئے گالی سن کر میرے جڑے بھنچ گئے۔ مگر اس وقت مجھے یہ گالی ہضم کرنی پڑی تھی۔ دوسرا شخص جسے دارا کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، دوڑتا ہوا اسی طرف چلا گیا جس طرف سے وہ آئے تھے۔ جبکہ گالی دینے والا اس درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا جہاں چند منٹ پہلے میں تھا۔

میں بے حس و حرکت اپنی جگہ پر پڑا رہا۔ وقت کی رفتار جیسے ختم ہو چکی تھی۔ لمبے صدیاں بن کر بیت رہے تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دیر گزری تھی۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا جیسے زمین کی گردش ختم ہو گئی ہو۔ وقت رک گیا ہو۔

میرا دماغ سُن ہو رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں جیسے ختم ہو چکی تھیں۔ اس وقت اگر ذہن کچھ کام کر بھی رہا ہوتا تو میں کیا کر سکتا تھا۔ وہ جلا دہستول ہاتھ میں لئے چند گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں ذرا سی حرکت بھی کرتا تو وہ مجھے گولی مار دیتا۔

اور پھر اس موڑ پر روشنی دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی تھی۔ خاموش فضا میں گاڑی کے انجن کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر ایک منٹ بعد ایک سفید کار اس درخت کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

کار کا دروازہ کھلا اور دارا نیچے اتر آیا۔ ایک آدمی اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ غالباً تار تھا۔ وہ کار کی کھڑکی سے گردن نکالے چیخ کر کہہ رہا تھا۔

”شیدے! کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ یہاں کسی جگہ بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔ وہ پچھلی طرف پچی بستی کی طرف جانے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ بستی میں پہنچ گیا اور گندہ نالہ پار کر گیا تو تم زندگی بھر اسے تلاش نہیں کر سکو گے۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔ جلدی کرو۔“

دارا اور شیدا دونوں کار میں بیٹھ گئے اور کار ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ کار اسی طرف مڑی تھی۔ مڑتے ہوئے اس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی ایک لمحہ کو باڑ پر پڑی تھی۔ میرا دل

میں گیٹ کے سامنے سے ہٹ کر ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور گہرے گہرے سانس لیتا ہوا ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

یہ بنگلہ غالباً دو ہزار گز پر مشتمل تھا۔ گیٹ کے سامنے سے بجری کی ایک روش عمارت کے پورچ تک چلی گئی تھی۔ اس روش کے دونوں طرف لان تھے۔ گیٹ کی دونوں بتیاں بند تھیں اور سامنے برآمدہ بھی تاریک تھا۔ پورچ میں ایک کار کھڑی نظر آرہی تھی۔

میری حیرت اور میرا شبہ بجا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں نے اس بنگلے سے کسی عورت کی چیخوں کی آواز سنی تھی۔ پھر ایک مرد اور ایک عورت کو کار میں یہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ گیٹ کھلا چھوڑ گئے تھے اور اندر سے بھی کسی نے گیٹ بند نہیں کیا تھا۔

میرے سامنے اس بنگلے کے دو کمرے تھے۔ ایک برآمدے کے دائیں طرف اور ایک بائیں طرف۔ دونوں کی کھڑکیاں تاریک تھیں۔ کہیں کسی ذی روح کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے جس سے میری انکھیں بڑھ رہی تھیں۔ میرے خیال میں اتنے بڑے بنگلے میں کسی نہ کسی چوکیدار کا ہونا ضروری تھا۔ اور پھر بنگلے کے اندر بھی کسی کو ہونا چاہئے تھا۔ مگر گہری خاموشی تھی۔

میں اگرچہ خود گرفتار ہلا تھا۔ موت کے فرشتے مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ نادر اور دارا وغیرہ کے یہاں سے جانے کے بعد مجھے اتنا موقع تو بہر حال مل گیا تھا کہ میں مخالف سمت میں کسی طرف نکل سکتا تھا۔ مگر میرا تجسس مجھے اس بنگلے میں لے آیا تھا اور میں کسی غنی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا۔

میں چند لمحے تاریکی میں گیٹ کے پلر کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا رہا پھر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر میرے قدم خود بخود رک گئے۔ فائر کی آوازیں کہیں دور سے آرہی تھیں اور سمت کا اندازہ لگانا بھی دشوار تھا۔ میں ایک منٹ اور اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ پھر بجری کی روش سے ہٹ کر لان کی دینگز گھاس پر تیزی سے چلنے لگا۔

میں بہت محتاط انداز میں برآمدے میں داخل ہوا تھا۔ ایک ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر میں ایک بار پھر گہری نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

باہر کی طرف فلائی پروف جالی والا دروازہ تھا۔ وہ ہاتھ رکھتے ہی آواز پیدا کئے بغیر بڑے آرام سے کھل گیا۔ اندر کی طرف لکڑی کا دروازہ تھا۔ میں نے بیٹنڈل پر ہاتھ رکھا تو وہ بھی کسی دشواری کے بغیر گھوم گیا۔ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ دروازوں میں عام طور پر آٹو میٹک لاک والے تالے لگائے جاتے ہیں۔ دروازہ بھیڑتے ہی لاک لگ جاتا ہے اور باہر سے پانی۔

کر دیا اور دوڑ کر کار کی پنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ کار ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھی اور میرے سامنے سے گزر گئی۔

کار میں دو ہی افراد تھے۔ ایک وہ شخص جو میرے سامنے کار میں بیٹھا تھا اور دوسری ایک عورت جو اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ کار جب میرے سامنے سے گزر رہی تھی تو اسٹیرٹ لیمپ کی روشنی میں اس عورت کا چہرہ نظر آ گیا اور کار تیزی سے گزر گئی۔ مگر اس عورت کا چہرہ میرے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ میں اسے کہیں بھی دیکھ کر شناخت کر سکتا تھا۔ البتہ وہ آدمی چونکہ دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا اس لئے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں نے اس بنگلے سے کسی عورت کے چہرے کی آواز سنی تھی۔ اور بنگلے سے نکلنے والی کار بھی ایک عورت ہی چلا رہی تھی۔ مگر چیخوں کی وہ آوازیں اس عورت کی نہیں ہو سکتی تھیں۔ جو عورت چند منٹ پہلے اس طرح چیخ رہی ہو جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو، وہ اس طرح ایک نوکر کار کیسے چلا سکتی ہے۔

میرے ذہن میں شبہات سر اٹھانے لگے۔ اس آدمی نے گیٹ تھوڑا سا کھول کر پہلے محتاط انداز میں باہر جھانکا تھا۔ پھر کار کے باہر نکلنے کے بعد اس نے گیٹ محض بھیڑ دیا تھا۔ اس میں تالا نہیں ڈالا تھا۔ اندر سے بھی کسی نے گیٹ بند نہیں کیا تھا۔ اور پھر وہ شخص جس طرح دوڑ کر کار میں بیٹھا تھا اس سے میرے شبہ کو کچھ اور بھی تقویت مل رہی تھی۔

میں غور سے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ سفید رنگ کا وہ گیٹ دوپٹ کا تھا اور ان دونوں پٹوں کے بیچ میں ایک کالی لکیری نظر آرہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ گیٹ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا اور دونوں پٹوں کے بیچ میں درز رہ گئی تھی۔

میرے شبہات کو تقویت ملنے لگی۔ چھٹی حس اس بنگلے کے اندر کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے گارڈینیا کی باڑ سے سر اُبھار کر ادھر ادھر دیکھا۔ سڑک بھی سنسان تھی۔ دونوں طرف دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں بہت محتاط انداز میں باڑ کے پیچھے سے نکل آیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سڑک پار کر کے اس بنگلے کے گیٹ کے قریب پہنچ گیا۔ دور سے دونوں پٹوں کے بیچ وہ سیاہ جھری بہت معمولی نظر آرہی تھی۔ لیکن قریب پہنچ کر پتہ چلا کہ دونوں دروازوں میں بالشت بھر کا فاصلہ تھا۔ میں نے ایک بار پھر محتاط نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور گیٹ پوری طرح بند کر کے بڑی آہستگی سے بولٹ لگا دیا۔

اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔
میں ایک جھنگل سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے پورے جسم پر جھینٹیاں سی رہ گئیں۔ دماغ
میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ وہ عورت کون تھی جس کی چیخوں کی آواز میں نے سنی تھی؟ اور کار
پر بنگلے سے نکلنے والی عورت اور مرد کون تھا؟

میں کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر دائیں طرف کی راہداری میں گھس گیا۔ اس راہداری
میں آنے والے سارے دو کمرے تھے۔ دونوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور دونوں کمرے خالی
تھے۔ سامنے ایک اور دروازہ تھا جو سائیڈ کے لان میں کھلتا تھا۔ یہ دروازہ بند تھا اور اوپر سے
بولٹ لگا ہوا تھا۔ میں اس راہداری میں آ گیا جہاں سے مدھم سی روشنی جھلک رہی تھی۔ اس
راہداری میں بھی دو کمرے تھے۔ بائیں طرف والا کمرہ کھلا ہوا تھا اور اندر اندھیرا تھا۔ دوسرے
کمرے میں ٹائٹ بلب جل رہا تھا اور اس کی مدھم روشنی راہداری میں دکھائی دے رہی تھی۔ میں
کمرے میں داخل ہو گیا۔

یہ بیڈروم تھا۔ میں نے اب تک جتنے بھی کمرے دیکھے تھے ان میں کسی میں بھی کسی طرح کی
افرا تفری نظر نہیں آئی تھی۔ لیکن یہ بیڈروم بری طرح اتھری کا شکار تھا۔ چار کریاں تھیں جن میں
تین الٹی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ لگے ہوئے کوچ کے کشن نیچے گرے ہوئے تھے۔
ڈریسنگ ٹیبل کی ساری چیزیں بھی نیچے گری ہوئی تھیں۔ ایک دراز کھلی ہوئی تھی جس میں رکھا ہوا
پتول نظر آ رہا تھا۔

بستر کی چادر سلی ہوئی تھی۔ نکیہ نیچے گرا ہوا تھا۔ بیڈ کے دوسری طرف دیوار کے ساتھ ایک
الماری ایستادہ تھی۔ الماری اور بیڈ کے درمیان تقریباً چار فٹ کی جگہ تھی۔ الماری کا ایک دروازہ
کھلا ہوا تھا اور کچھ کپڑے نیچے قالین پر گرے ہوئے تھے۔

بائیں طرف باتھ روم کا دروازہ نیم دا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ باتھ روم خالی تھا۔
میں بیڈ کے اوپر سے گھوم کر الماری کی طرف آ گیا۔ اس کے تمام خانوں میں تہہ در تہہ کپڑے
بھرے ہوئے تھے۔ اس کا دروازہ کھولنے سے کچھ کپڑے نیچے گر گئے تھے۔

میرے دماغ میں سنسنی مٹ رہی تھی۔ میں نے اس بنگلے سے کسی عورت کے چیخنے کی
آوازیں سنی تھیں۔ یہاں سے ایک مرد اور ایک عورت کو کار پر نکلے دیکھا تھا۔ اندر بنگلے کے
چوکیدار کی لاش پڑی تھی اور کسی ذی روح کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ چیخنے والی
عورت کون تھی؟ پورے گھر میں اور کوئی نہیں تھا سوائے چوکیدار کی لاش کے۔ کوئی بات سمجھ میں
نہیں آرہی تھی۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ میری نظریں

بغیر کھولنا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن ہینڈل بڑی آسانی سے گھوم گیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ تالا
آٹو لک نہیں تھا اور اگر آٹو لک تھا تو اندر سے اس کی لاک ناب آٹھی ہوئی تھی جس سے دروازہ
لاک نہیں ہوا تھا۔

بنگلے سے دباؤ سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندر بھی اندھیرا تھا۔ میں نے گردن اندر ڈال کر
جھانکا۔ بائیں طرف راہداری میں کسی جگہ سے مدھم سی روشنی آرہی تھی۔ یہ وسیع ہال کمرہ تھا۔ لیکن
خاموشی تھی۔ میں نے اپنے لباس میں چھپا ہوا چاقو نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور اندر داخل ہو کر
دروازہ آہستگی سے بند کر دیا اور دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔

صوفوں کے درمیان قالین پر سے گزرتے ہوئے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور لڑکھڑا کر رہ گیا۔
سنجھل کر نیچے دیکھا تو مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ کوئی انسانی ہیولہ تھا
جو قالین پر پڑا تھا اور میں اسی سے ٹکرا کر لڑکھڑایا تھا۔

راہداری سے اس طرف آنے والی روشنی بہت مدھم تھی۔ وہ آدمی قالین پر ادھما پڑا ہوا تھا۔
میں جھک کر اسے ٹولنے لگا۔ وہ یا تو بے ہوش تھا یا ختم ہو چکا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو
گئی۔ میرے شبہات درست نکلے تھے۔ یہاں خاصی گڑبڑ تھی۔ اور اب یہ اندیشہ بھی جڑیں
مضبوط کر رہا تھا کہ میں کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ ایک لمحہ کو میرے ذہن میں خیال آیا
کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ لیکن پھر یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ میں اوکھلی میں سر دے چکا
تھا اور اب موصول سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ یہاں
کیا ہوا ہوگا۔ میں نے کھڑکیوں کے سامنے پردے کھینچ دیئے اور دروازے کے قریب کی دیوار
ٹٹول کر بتی جلادی۔ کمرہ تیز روشنی سے بھر گیا اور میں ایک بار پھر اس آدمی کے قریب جھک کر
اس کا جائزہ لینے لگا۔

اس کے جسم پر ملیشیا رنگ کے کپڑے کی شلوار قمیض تھی۔ پیروں میں پشادری چپل تھے۔ کمر
میں چوڑا بیلٹ بندھا ہوا تھا اور اس کے چہرے کے نقوش بتا رہے تھے کہ وہ صوبہ سرحد یا شمالی
علاقہ کا رہنے والا تھا۔ اور ظاہر ہے وہ اس بنگلے کا چوکیدار تھا۔ قریب ہی قالین پر اس کی دو نالی
بندوق پڑی ہوئی تھی۔

میں نے اسے سیدھا کر دیا اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکنیں تلاش کرنے لگا۔
نبض بھی ٹٹول کر دیکھی مگر اس میں زندگی کے آثار محسوس نہیں ہوئے۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں
اُبلی ہوئی تھیں۔ اور پھر اس کے گلے میں ایک کپڑا دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ دوپٹہ تھا۔ مجھے

میں بزدل نہیں ہوں لیکن اس صورتحال نے مجھے بری طرح بوکھلا دیا تھا۔ میں موت کے ان فرشتوں سے بچنے کے لئے بھاگا پھر رہا تھا کہ میرا تجسس مجھے بچنے کے اندر لے آیا جہاں دو لاشیں میری منتظر تھیں۔ ہال کمرے میں چوکیدار کی لاش اور یہاں الماری میں چھپائی گئی اس عورت کی لاش۔

اپنی کیفیت پر مکمل طور پر قابو پانے کے بعد میں لاش کا جائزہ لینے لگا۔ اس عورت کی عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ قد ساڑھے پانچ فٹ سے کچھ اوپر ہی رہا ہوگا۔ جسم گمگداز اور بھرا بھرا، چہرے کے نقوش دلکش تھے۔ مگر موت نے اس کے حسن کو بگاڑ دیا تھا۔ اسے بھی چوکیدار کی طرح غالباً گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ آنکھیں باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں۔

کانوں میں طلائی بندے اور گلے میں سونے کی موٹی سی چین تھی جس میں ہاتھ کے انگوٹھے کے اگلے حصے کے برابر دل کی شکل کا لاکٹ تھا جس میں غالباً ہیرا جڑا ہوا تھا۔ لاکٹ سینے پر ایک طرف لٹکا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر مہندی رنگ کارلشی بلاؤز اور اسی رنگ کا کاشن کا پٹینا کوٹ تھا۔ بلاؤز سامنے سے پٹا ہوا تھا۔

گلا گھونٹنے جانے کے باعث چہرے کے نقوش اگرچہ کسی حد تک گم گئے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ بے حد حسین تھی۔ اپنی زندگی میں تو وہ بلاشبہ قیامت رہی ہوگی۔

کمرے کی اور لاش کی صورتحال دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہاں اچھا خاصا ہنگامہ ہوا ہوگا۔ اس عورت نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے بھرپور مزاحمت کی ہوگی جس سے سازمی اس کے جسم سے الگ ہو گئی تھی۔ بلاؤز پھٹ گیا تھا اور سینے اور گردن پر چند ہلکی سی خراشیں نظر آرہی تھیں۔

میں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا مگر سازمی کہیں نظر نہیں آئی۔ دوسرے کمرے میں، میں نے زیادہ تفصیل سے نہیں دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے دھینگا مشتی کسی اور کمرے میں شروع ہوئی ہو جہاں سازمی اس کے جسم سے الگ ہو گئی ہو۔ اور اس کے بعد اسے اس کمرے میں لے آیا گیا ہو۔ یا وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے بھاگ کر اس کمرے میں آگئی ہو اور قاتل بھی اس کے پیچھے یہاں پہنچ گیا۔

چینوں کی آواز اس عورت کی تھی جو اب لاش کی صورت میں میرے سامنے پڑی تھی۔ میں ایک بار پھر جھک کر لاش کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے اگرچہ اسے بیڈ پر سیدھا لٹا دیا تھا مگر اس کا ایک بازو نیچے لٹکا رہ گیا تھا جسے میں نے پکڑ کر اس کے پہلو میں سیدھا کر دیا۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو شاید اس کا گداز بازو ہاتھ سے چھوڑنے کو دل نہ چاہتا۔

تالین پر گرے ہوئے کپڑوں پر جم گئیں۔ وہ زنانہ کپڑے تھے۔ الماری میں کھلے ہوئے خانوں میں بھی زنانہ کپڑے ہی بھرے ہوئے تھے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ بیڈ روم کسی عورت کا تھا۔ مگر وہ عورت کون تھی؟

میں نے آگے بڑھ کر غیر ارادی طور پر الماری کے بند دروازے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس میں چابی لگی ہوئی تھی جسے چنکی میں پکڑ کر میں نے گھما دیا اور ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر دروازے کو آہستگی سے اپنی طرف کھینچا۔ لیکن اس لمحہ یوں لگا جیسے اندر سے کسی نے دروازے کو دھکا دیا ہو۔ دروازہ پوری طرح کھل گیا اور الماری کے اندر کھڑی ہوئی ایک عورت میرے اوپر گر گئی۔ اگر میں اس عورت کو اور اپنے آپ کو نہ سنبھال لیتا تو یقیناً اس کے ساتھ ڈھیر ہو جاتا۔

میں بری طرح بدحواس ہو گیا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ مگر میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ میں نے اس عورت کو اپنی بانہوں کی پلٹ میں لے لیا تھا۔ اور پھر ہوش سنبھالتے ہی مجھے ایک بار پھر سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ عورت زندہ نہیں تھی۔

وہ ایک لاش تھی.....!



الماری کا دروازہ کھولتے ہی جب وہ میرے اوپر گر گئی تھی تو میں یہی سمجھا تھا کہ وہ عورت زندہ تھی جو گھر میں میری موجودگی سے آگاہ ہو کر الماری میں چھپ گئی تھی۔ اور جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا تھا وہ میرے اوپر گر گئی تھی۔

اس کا سر میرے بائیں کندھے سے ٹکرایا تھا۔ بازو پہلوؤں میں لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے بوجھ سے میں لڑکھڑا گیا۔ ایک مرتبہ تو میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا لیکن یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ زندہ عورت نہیں لاش تھی تو میں ایک بار پھر لڑکھڑا گیا اور اس مرتبہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ پہلے بیڈ سے ٹکرایا اور پشت کے بل بیڈ پر گرا۔ میری دونوں ٹانگیں نیچے لٹکی ہوئی تھیں اور وہ لاش میرے سینے پر سوار تھی۔ اور اس کی دونوں ٹانگیں بھی نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ ہمیں اس پوزیشن میں دیکھنے والا کوئی بھی شخص بڑی آسانی سے ہم پر بدقاشی کا الزام لگا سکتا تھا۔

میرا سانس بے قابو ہو رہا تھا۔ کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ ایک انجانے خوف کی لہر میرے پورے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اس لاش کو اپنے اوپر سے ہٹایا۔ چند لمحوں کے بعد گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ لاش آدمی بیڈ پر تھی اور آدمی نیچے لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر بستر پر سیدھا لٹا دیا۔

مگر اس آدمی کا چہرہ میری نظروں میں نہیں آسکا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق یہ بنگلہ دو ہزار گز کے رقبہ پر مشتمل تھا۔ اور اندر کے قیمتی ساز و سامان کو دیکھ کر صاحب خانہ کی مالی حیثیت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ بات ابھی تک میرے لئے معصوم بنی ہوئی تھی کہ کیا اتنے بڑے بنگلہ میں یہ عورت اکیلی ہی رہتی تھی یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ اگر اور لوگ بھی تھے تو وہ کہاں گئے؟ وہ عورت اور مرد کون تھے جو اس عورت اور چوکیدار کو قتل کر کے یہاں سے بڑے اطمینان سے چلے گئے تھے۔

میں لاش سے پیچھے ہٹ کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ یہاں ہر چیز الٹ پلٹ تھی۔ انفرادی تو نظر آرہی تھی مگر اس بات کے شواہد نہیں تھے کہ تلاشی لی گئی تھی۔ الماری کا جو دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا اس میں رکھے ہوئے کچھ کپڑے نیچے گر گئے تھے اور میرا خیال تھا کہ لاش کو چھپانے کے لئے الماری کا وہ حصہ کھولا گیا تھا جس سے اس میں بھرے ہوئے کچھ کپڑے باہر گر گئے تھے اور باقی جوں کے توں تھے۔ اگر تلاشی لینا مقصود ہوتا تو خانوں میں بھرے ہوئے تمام کپڑے باہر پھینک دیئے جاتے اور نیچے کی درازیں بھی کھلی ہوتیں۔ الماری کے دوسرے حصے میں بالکل نیچے ایک دراز تھی جبکہ اوپر کا حصہ بیگروں کے لئے مخصوص تھا۔ وہ بیگروں سمیت نیچے گرے ہوئے تھے۔ تین بیگروں پر رافز پر کپڑے ٹنگے ہوئے تھے جو ایک کنارے پر لٹکے ہوئے تھے۔ یہاں لاش کو کھڑا کر کے دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔

میں ڈیرنگ ٹیبل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس پر اپ اسٹک کے دو سیٹ اور لوٹن کی ایک بولس الٹی پڑی تھی۔ باقی ساری چیزیں نیچے قالین پر ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ ڈیرنگ ٹیبل کی صرف اوپر والی دراز کھلی ہوئی تھی جس میں خواتین کے استعمال کی چند چیزوں کے علاوہ ایک جرم لوگر پستول بھی رکھا ہوا تھا۔ نیچے والی ساری درازیں بند تھیں۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس عورت نے یہ دراز کھول کر پستول نکالنے کی کوشش کی ہوگی مگر کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور قاتلوں کی گرفت میں آ گئی تھی۔ اس کے بعد سارا ہنگامہ اس کمرے میں ہوا تھا۔

میں نے جھک کر پستول اٹھا لیا۔ خاصا وزنی پستول تھا۔ ایسے پستول عام طور پر مرد ہی استعمال کرتے ہیں جبکہ عورتیں چھوٹی لیڈی آٹومیٹک پستول اپنے پاس رکھتی ہیں جسے آسانی سے چلایا جاسکتا ہے۔ میں نے پستول چیک کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر بیڈ پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔ اس جیسی دراز قامت اور صحت مند جسم کی عورت ایسا ہی بھاری پستول اپنے پاس رکھ سکتی تھی۔

سونے کا لاکٹ اس کے سینے پر دائیں طرف لٹکا ہوا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر لاکٹ کو چٹکی میں پکڑ لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ دل کی شکل کا وہ لاکٹ دوہرا تھا۔ میں انگوٹھے کے ناخن سے اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ لاکٹ بڑی آسانی سے کھل گیا۔

میرا خیال تھا کہ لاکٹ کے اندر کوئی تصویر ہوگی۔ شادی شدہ عورت ہو تو لاکٹ میں اپنے شوہر کی تصویر لگا لیتی ہے۔ اور اگر کوئی عورت غیر شادی شدہ ہو تو اپنی کسی محبوب ہستی کو لاکٹ میں چھپا کر سینے سے لگائے رکھتی ہے۔ مگر اس لاکٹ کے حوالے سے میرا خیال غلط نکلا۔ اس میں کوئی تصویر نہیں تھی۔ ایک بہت باریک سا کاغذ تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔ وہ کاغذ لاکٹ میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے ناخن سے کھینچ کر اسے باہر نکالا اور اس کی جہیں کھولنے لگا۔

وہ کاغذ ماچس کی ڈبیہ کے برابر تھا جس کی چار جہیں لگی ہوئی تھیں۔ ایسا کاغذ عام طور پر پتلی بنانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ نیلے رنگ کے اس کاغذ پر آٹھ خانے بنے ہوئے تھے اور ہر خانے میں ایک ہندسہ لکھا ہوا تھا۔ اس قسم کے ہندسے یا تو تمبولہ کے ٹکٹ پر ہوتے ہیں یا تعویذ پر۔ لیکن یہ تعویذ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس عورت کو دیکھ کر یہ سوچنا بھی محال تھا کہ وہ تعویذ گنڈوں پر یقین رکھتی ہوگی۔ میں چند لمبے کاغذ پر ان ہندسوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اسے تہہ کر کے دوبارہ لاکٹ کے اندر رکھ کر لاکٹ بند کر دیا اور زنجیر کو ٹٹولنے لگا۔ گردن کی طرف زنجیر کا بک مل گیا۔ میں نے بک کھول کر زنجیر اس کے گلے سے نکال لی اور اپنے گلے میں ڈال کر بک بند کر دیا۔ لاکٹ کو محفوظ رکھنے کا یہی سب سے بہترین طریقہ تھا کہ فی الحال اسے اپنے گلے کی زینت بنالیا جائے۔ لاکٹ گلے میں ڈالنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اسے چوری کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ مجھے اس کاغذ کی ضرورت تھی جس پر وہ پراسرار ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ اگر وہ کاغذ نکال کر جیب میں ڈال لیتا تو کہیں ادھر ادھر ہو سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اسے لاکٹ میں محفوظ کر کے گلے میں ڈال لیا تھا۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ پراسرار ہندسے اپنے اندر کوئی راز چھپائے ہوئے تھے۔ کوئی قیمتی راز۔ اسی لئے تو وہ کاغذ اس قدر حفاظت سے رکھا گیا تھا۔ اور میں ہندسوں کا وہ راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ بنگلہ کس کا تھا۔ یہ لاش کس عورت کی تھی اور وہ دونوں کون تھے جو کار پر یہاں سے گئے تھے۔ اتنا بہر حال مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اس عورت کے قاتل وہی دونوں تھے۔ جب وہ کار پر ٹپکے تھے تو میرے سامنے سے گزرے تھے۔ اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھی ہوئی عورت کو تو میں نے دیکھ لیا تھا۔ اس کا چہرہ میرے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ اسے تو اگر میں دس سال بعد بھی دیکھوں تو پہچان لوں

بھیڑوں سے بچنے کے لئے کوئی مدد مل سکے۔ لیکن یہاں صورتحال بڑی مختلف نظر آئی تھی۔ اور اب لاکھوں کی یہ دولت دیکھ کر میں نے بھی اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انسان دولت ہی کے لئے سب کچھ کرتا ہے تاکہ زندگی عیش و آرام سے گزر سکے۔ میں بھی اپنے آپ کو ان لوگوں سے الگ نہیں سمجھتا جو چند ٹکوں کے لئے کسی کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ابھی میں نے آپ کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ جب آپ میرے بارے میں پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ میں کس قدر گھٹیا، انسانیت سے گرا ہوا اور ذلیل آدمی ہوں۔ ہو سکتا ہے میری حقیقت جاننے کے بعد آپ لوگ مجھ سے شدید نفرت کرنے لگیں لیکن آپ میں بعض ایسے بھی ہوں گے جنہیں مجھ سے ہمدردی ہوگی۔ مجھے دنیا کا مظلوم ترین آدمی سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بہر حال اپنے بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تو میں اس سنگین صورتحال کے بارے میں بتا رہا تھا جس میں، میں الجھا ہوا تھا۔

جیسا کہ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ ان قیمتی زیورات پر قبضہ کرنے کے بعد میری ہوس بڑھ گئی تھی۔ مجھے یقین تھا یہاں کہیں نقد رقم بھی موجود ہوگی۔ جس کی مجھے زیورات سے زیادہ ضرورت تھی۔ اس خیال کے پیش نظر میں ایک بار پھر کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ بات تو طے تھی کہ یہی کمرہ گھر کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن یہاں تجوری نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے خیال میں اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی تھی۔ اگر کوئی تجوری ہوتی تو قیمتی زیورات ڈرائنگ کی درازوں میں یوں کھلے نہ پڑے ہوتے۔ نقد رقم رکھنے کے لئے بھی کوئی ایسی ہی عام سی جگہ ہوگی۔ میری نظریں ایک بار پھر الماری کی طرف اٹھ گئیں۔

الماری کے کپڑوں والے حصے میں تین ٹیلیٹ تھے۔ ان کے نیچے ایک دراز تھی جو باشت بھر گہری لگتی تھی۔ وہ دراز بھی لاک نہیں تھی۔ اسے کھولتے ہی میری آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس میں نیچے اوپر نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ ہزار، پانچ سو اور سو روپے والے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ میں نے پوری دراز خالی کر دی۔ صرف دو منٹ میں وہ ساری دولت الماری کی دراز سے میرے بیگ میں منتقل ہو چکی تھی۔ میں نے اس سے نیچے والی دراز کھول لی۔ اس میں لیڈین انڈر گارمنٹس بھرے ہوئے تھے۔ میں ایک ایک چیز کو اٹھا کر دیکھتا اور رکھتا رہا۔ پھر میں نے وہ دراز بند کر دی اور بیڈ پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک لمحہ کو مجھے یوں لگا جیسے وہ خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہو۔ میں کانپ کر رہ گیا اور پھر سر جھٹکنے لگا۔ بھلا لاش مجھے کیسے گھور سکتی تھی۔ لیکن مجھے شرم بھی محسوس ہوئی تھی۔ میں ایک ایسے گھر میں موجود تھا جہاں دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کو قتل کیا گیا تھا اور میں ان کے بارے میں پولیس کو اطلاع دینے کی

میں نے پستول کا میگزین نکال لیا۔ اس کے وزن سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس میں پوری گولیاں موجود ہیں۔ اس جیسے پستولوں میں عام طور پر گیارہ گولیاں استعمال ہوتی ہیں۔ میں نے نال کو سونگھ کر بھی چیک کیا۔ بو نہیں تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ پستول عرصہ سے استعمال نہیں ہوا تھا۔

میں جھک کر ڈرائنگ ٹیبل کی دوسری درازیں چیک کرنے لگا۔ کوئی بھی دراز مقفل نہیں تھی۔ ایک دراز میں کچھ زیورات کھلے پڑے تھے۔ سب سے نیچے بڑی دراز میں جیولری باکس تھا۔ اس میں بھی قیمتی زیورات بھرے ہوئے تھے۔ میں نے تمام درازیں بند کر دیں اور کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اب یہ بات طے ہو چکی تھی کہ یہ ڈکیتی کی واردات نہیں تھی۔ اگر ڈکیتی کی واردات ہوتی تو یہاں ایسی کوئی چیز نظر نہ آتی۔ میں کوئی جوہری نہیں ہوں۔ لیکن میرے اندازے کے مطابق ڈرائنگ ٹیبل کی درازوں میں ایک کروڑ سے اوپر کی مالیت کے زیورات تھے۔ کوئی بھی شخص ان کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا حتیٰ کہ میں بھی۔ میرے دل میں بھی اب لالچ پیدا ہو رہا تھا۔ اس بات کا اندازہ تو میں لگا ہی چکا تھا کہ وہ عورت، جس کی لاش میرے سامنے پڑی تھی، اس کٹھی میں اکیلی رہتی تھی۔ اور خاصی مالدار تھی۔ اسے دولت کے لئے قتل نہیں کیا گیا تھا۔ قتل کا مقصد کچھ اور تھا جو دولت سے بھی زیادہ اہم تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا محض اس عورت کو قتل کرنے کے لئے آیا تھا۔ انہوں نے صرف اپنے کام پر توجہ دی تھی۔ اگر وہ درازوں کی تلاشی لیتے تو یہ سب کچھ یہاں چھوڑ کر نہ جاتے اور میں ایسی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے میری نظریں الماری پر رکھے ہوئے کینوس کے ایک ٹولڈر بیگ پر جم گئیں۔ میں نے وہ بیگ اتار لیا۔ پہلے لوگر پستول اپنی جیب میں ٹھونسا اور پھر ڈرائنگ ٹیبل کی درازوں میں بھرے ہوئے زیورات نکال کر بیگ میں ڈالنے لگا۔ دوسری درازوں میں بھی کچھ انگوٹھیاں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی میں نے بیگ میں ڈال لیں۔

میری ہوس بڑھ گئی۔ زن، زر اور زمین۔ یہی تینوں چیزیں اس دنیا میں فساد کا باعث بنتی ہیں۔ ہنگاموں اور قتل و غارت کی بنیاد انہی میں سے کوئی ایک چیز ہوتی ہے۔ اس عورت کو جس مقصد کے لئے قتل کیا گیا تھا وہ یقیناً بہت اہم ہوگا۔ اس حسین عورت اور ڈرائنگ ٹیبل کی درازوں میں بھرے ہوئے ان زیورات سے بھی زیادہ اہم۔

میں محض اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس بیگلے میں آیا تھا۔ میں خود مصیبت میں پھنسا ہوا تھا مگر بیگلے سے کسی عورت کی چیخوں کی آواز سن کر اور ان دونوں کو کار میں بیگلے سے جاتے دیکھ کر میں نے یہ سوچا تھا کہ شاید یہاں کسی کو میری مدد کی ضرورت ہو اور مجھے بھی ان خونخوار

میں چوکیدار کی لاش کے قریب رک گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ چوکیدار بھی یقیناً اپنی مالکن کی چیزوں کی آواز سن کر اندر آیا ہوگا جہاں اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

سرخ کار پر بٹنگے سے جانے والی عورت اور مرد کے بارے میں، میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ لوگ کون ہو سکتے تھے۔ لیکن وہ لوگ جس طرح کار پر یہاں سے گئے تھے اس سے ایک بات طے تھی کہ وہ زبردستی اندر نہیں گھسے تھے۔ وہ یقیناً اس عورت کے جاننے والے تھے اور رات کے ابتدائی حصے میں یہاں آئے ہوں گے۔ اگر آدھی رات باپاس کے بعد بھی آئے ہوں تو وہ چوکیدار اور مالکن کی اجازت سے ہی اندر آئے ہوں گے۔ اگر وہ زبردستی اندر گھسے ہوتے تو چوکیدار کی لاش یہاں ہال کمرے میں نہیں، باہر والے گیٹ کے قریب پڑی ہوئی ملتی۔ وہ جو کوئی بھی تھے، خاتون خانہ کے جاننے والے تھے اور اپنی ہی کار میں آئے تھے۔ جس پر وہ واپس بھی گئے تھے۔ ایک کار میں نے پورچ میں کھڑی ہوئی بھی دیکھی تھی اور وہ غالباً اس گھر کی کار تھی۔

میں بیگ کندھے پر لٹکائے ایک بار پھر تمام کمروں میں گھومنے لگا۔ ایک بیڈروم کے علاوہ، جہاں لاش پڑی ہوئی تھی، تین بیڈرومز اور بھی تھے۔ سب کے سب ضرورت کی ہر چیز سے آراستہ تھے۔ بستروں پر پتھچی ہوئی چادریں بالکل بے ٹھکن تھیں جیسے یہ بستر استعمال میں نہ رہے ہوں۔ لگتا تھا پورے گھر کی بہت مناسب دیکھ بھال ہوتی تھی۔ میں تمام بیڈرومز کے کچھ لگاتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔

ہال کمرہ جہاں میں نے چوکیدار کی لاش دیکھی تھی، پندرہ بائی تیس فٹ تھا۔ مگر ڈرائنگ روم اس سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ میرے خیال میں بیس بائی چالیس فٹ ضرور رہا ہوگا۔ فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ قیمتی آرام دہ صوفے اور ہر چیز بہت قیمتی اور شاندار تھی۔ میں نے کوئی خطرہ محسوس نہ کرتے ہوئے بتی جلائی تھی اور ٹیوب لائٹ کی روشنی میں ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک طرف مینٹل پیس پر آرائش کی چند دیگر چیزوں کے ساتھ ایک فریم دیکھ کر میں آگے بڑھ گیا اور فریم کو ہاتھ میں اٹھا کر اس میں لگی ہوئی تصویر کو دیکھنے لگا۔

نہایت حسین عورت تھی اور بلاشبہ اسے پری چہرہ کہا جاسکتا تھا۔ غزال جیسی موٹی موٹی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک تھی۔ یہ تصویر اس خاتون کی تھی جس کی لاش میں دوسرے کمرے میں دیکھ کر آ رہا تھا اور میرے خیال میں یہ تصویر کم سے کم پندرہ سال پہلے کھینچی گئی تھی۔ لاش کو دیکھ کر ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جوانی میں یہ کچھ اور رہی ہوگی۔ اور اب یہ تصویر دیکھ کر اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ واقعی قیامت تھی۔ مگر اس تصویر کو دیکھ کر مجھے نجانے یہ احساس

بجائے اس گھر میں بھری ہوئی دولت سمیٹ رہا تھا۔ ہے نا یہ انسانیت سے گری ہوئی حرکت! اس وقت آپ یقیناً اپنے دل میں میرے بارے میں نفرت محسوس کر رہے ہوں گے۔ لیکن میں آپ کو ایک بات بتانا چلوں کہ یہ دولت اس وقت لاوارث پڑی تھی۔ اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ اگر کوئی حقیقی وارث ہوگا بھی تو اسے اس کی ہوائ تک نہیں لگنے دی جائے گی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں یہاں آ گیا تھا۔ میں نہ آتا تو سب سے پہلے پولیس ہی اس گھر میں قدم رکھتی۔ پولیس والوں کی فطرت سے تو آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ لاشوں پر توجہ بعد میں دیتے۔ پہلے پورے گھر کی تلاشی لیتے اور اس ساری دولت پر قبضہ کرنے کے بعد دوسرے کمروں میں بھی سامان پھیلا دیتے اور اس واقعہ کو ڈکیتی کا رنگ دے کر نامعلوم لوگوں کے خلاف رپورٹ درج کر لی جاتی۔ اور بات ختم ہو جاتی۔ پولیس کی بجائے اگر میں نے اس لاوارث دولت پر قبضہ کر لیا تھا تو اس میں کیا برائی تھی۔

”سوری ڈیر!“ میں نے بیڈ پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم زندہ ہوتیں تو میں تمہاری مدد ضرور کرتا اور اس وقت میرا کردار مختلف ہوتا۔ لیکن موجودہ صورتحال میں میری مجبوری ہے۔ میں اس دولت کو لاوارث چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ البتہ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تمہارا کوئی جائز وارث مل گیا اور اس وقت تک میرے پاس کچھ بچا تو اس کے حوالے کر دوں گا۔“

مجھے یوں لگا جیسے اس کے چہرے پر کچھ نرمی کے تاثرات ابھر آئے ہوں شاید اسے میری بات پسند آئی تھی۔ میں اپنی اس احمقانہ سوچ پر ایک بار پھر مسکرا دیا۔

میں نے بیگ کندھے پر لٹکا لیا۔ سامنے دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا۔ تین بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے اس بنگلے میں آئے ہوئے تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔

میں اس کمرے سے نکل آیا۔ اب میں کسی قدر مطمئن ہو گیا تھا۔ کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔ ان دونوں نے بھی عقل مندی کی تھی کہ یہاں سے جانے کے بعد پولیس کو ٹیلی فون پر اطلاع نہیں دی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو پولیس بہت دیر پہلے یہاں پہنچ چکی ہوتی۔

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ جب میں اس بنگلے میں داخل ہوا تھا تو میں نے کہیں سے فائرنگ کی آواز سنی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں میرا پیچھا کرنے والوں کا ان دونوں سے سامنا ہو گیا ہو جو سرخ کار میں اسی بنگلے سے نکلے تھے۔ ہو سکتا ہے اس فائرنگ میں وہ دونوں مارے گئے ہوں۔

پڑی ہوئی تھی۔ لاش کو نظر انداز کرتے ہوئے میں قالین پر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگا۔ مجھے چابیوں کا وہ گچھا مل گیا جسے میں نے جلدی سے اٹھالیا۔ وہ مارچی کی چابیاں تھیں۔ کی رنگ میں لگے ہوئے ٹیگ پر ہونڈا کا مخصوص نشان بنا ہوا تھا۔ میں نے سیدھے ہوتے ہوئے ایک بار پھر لاش کی طرف دیکھا اور کمرے سے نکل آیا۔

باہر آنے سے پہلے میں نے برآمدے والے دروازے کے تالے کی تاب اندر سے اٹھا دی۔ دروازہ بھڑکتے ہی ملک کی ہلکی سی آواز ابھری۔ آٹو بینک تالا لگ گیا تھا۔ میں نے جالی والا دروازہ بھی بھڑکیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کار کے قریب پہنچ گیا۔ دروازہ کھول کر بیگ پنجرز سیٹ کے سامنے سیٹ پر ڈال دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے ہی چالی اگنیشن میں لگا کر گھادی۔ گاڑی نئی تھی۔ انجن بالکل بے آواز تھا۔ میں چند سیکنڈ تک ڈیش بورڈ پر ڈائلز اور بٹنوں کو دیکھتا رہا پھر انجن کو گیسر میں ڈال دیا۔

کار کو میں نے گیٹ کے سامنے روک لیا اور انجن چلتا چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ بڑی آہستگی سے میں نے گیٹ کا کنڈا ہٹایا۔ ایک پٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ سڑک دونوں طرف دور دور تک سنسان تھی۔ سامنے والے اور آس پاس کے بنگلوں پر بھی سناٹا تھا۔ میں نے گیٹ پوری طرح کھول دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر آ کر کار میں بیٹھ گیا۔

کار کو گیٹ کے باہر روک کر میں پھر نیچے اتر آیا۔ گیٹ بند کر کے باہر سے کنڈا لگا دیا اور کار میں بیٹھ کر اسے تیزی سے ایک طرف دوڑا دیا۔

اس وقت چار بیٹے والے تھے۔ لاہور کی سڑکوں پر دودھ والی گاڑیوں کی تھوڑی بہت آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ دیہی علاقوں سے آنے والی یہ گاڑیاں شہر کے مختلف علاقوں میں اپنے اپنے مقررہ پوائنٹس پر رکیں گی۔ جہاں سے گوالے اور دکانوں والے اپنی ضرورت کے مطابق دودھ لے جائیں گے۔

میں اس وقت گلبرگ کے علاقے میں تھا اور مجھے یقین تھا کہ موت کے وہ فرشتے اب بھی اسی علاقے میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ اور میں جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس علاقے سے گلبرگ نہر کا پل پار کیا تھا۔ لیکن بہر حال پندرہ بیس منٹ تک مزید گاڑی دوڑانے کے بعد میں وحدت روڈ پر آ گیا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ راستے میں کوئی پولیس پارٹی نظر نہیں آئی تھی۔ رات کے پچھلے پہر عام طور پر پولیس والے گاڑیوں کو روک لیتے تھے اور چیکنگ کے بہانے لوگوں کو پریشان کرتے تھے۔ اکیلے آدمی کو تو یہ

کیوں ہو رہا تھا کہ اسے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ لیکن یاد نہیں آرہا تھا کب اور کہاں دیکھا تھا۔ لیکن ایک بات بہر حال طے تھی کہ میں اس کے قریب کبھی نہیں آیا تھا۔ میرا خیال بہت عجیب و غریب حالات میں گزرا ہے۔ کبھی تو میرے پاس اتنی دولت ہوتی تھی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ میں فائیو اسٹار اور ڈکس ہوٹلوں کے علاوہ کہیں چائے بھی نہ پیتا۔ کسی ایسے ہوٹل میں قدم رکھتے ہی حسین لڑکیاں تیلیوں کی طرح میرے آس پاس منڈلانے لگتیں۔ بعض اوقات میں کسی ہوٹل میں جاتا تھا تو صرف ایک کپ چائے پینے کے لئے۔ لیکن ان حسین تیلیوں کی وجہ سے میرا بل چار پانچ ہزار سے کم نہیں بنتا تھا۔ اس طرح مجھے ایک کپ چائے چار پانچ ہزار میں پڑتی تھی۔ لیکن اس دوران جو لطفائیں حاصل ہوتی تھیں وہ میں لفظوں میں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اور کبھی مجھ پر ایسا وقت آ جاتا کہ میری جیب میں ایک روپیہ تک نہ ہوتا۔ دو دو دن فاقے میں گزر جاتے اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے مجھے چوری کرنی پڑتی۔

ہو سکتا ہے یہ عورت کبھی ان دنوں کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں میری نظروں میں آئی ہو جب میرے حالات اچھے تھے۔ لیکن یہ طے شدہ بات تھی کہ اس حینے سے میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اور اب ملاقات ہوئی تو اس صورتحال میں کہ وہ تو زندگی کی سرحد پار کر چکی تھی اور میں اپنی زندگی بچانے کے لئے بھاگا پھر رہا تھا۔ لیکن مجھے بہر حال یہ نیم ملاقات ہمیشہ یاد رہے گی۔ ایک تو یہ کہ مجھے وقتی طور پر یہاں پناہ مل گئی تھی اور دوسری بات یہ کہ بغیر محنت کے کروڑوں کی دولت ہاتھ آ گئی تھی۔

میں نے تصویر اسی جگہ رکھ دی اور ڈرائیونگ روم سے باہر آ گیا۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے جتنی بچھا دی تھی۔ میں ایک بار پھر مرکزی ہال میں آ گیا جس کی جتنی پہلے سے جل رہی تھی۔ میں نے آخری بار چوکیدار کی لاش کی طرف دیکھا اور برآمدے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بڑی آہستگی سے لکڑی والا دروازہ کھول کر جالی والے دروازے سے باہر جھانکا اور پھر دروازہ بھی کھول کر باہر آ گیا۔ برآمدے میں تاریکی تھی۔ میں ایک پلر کی آڑ میں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ سڑک اور آس پاس کے بنگلوں میں بھی سناٹا تھا۔ میں برآمدے سے اتر کر کار کے قریب آ گیا۔

ہونڈا کار ڈکارتھی۔ لیکن اس کے تمام دروازے لاک تھے۔ دفعۃً مجھے یاد آ گیا کہ میں نے بیڈروم میں ڈرائیونگ ٹیبل کے آس پاس قالین پر بکھری ہوئی چیزوں میں چابیوں کا ایک گچھا بھی دیکھا تھا۔ میں نے بیگ وین کار کے قریب رکھ دیا اور دوبارہ برآمدے والے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ اس مرتبہ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسی بیڈروم میں پہنچ گیا جہاں بیڈ پر لاش

آگے جا کر ملتان روڈ سے جا ملتی تھی۔

اس وقت دن کا ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ میں ایک گلی سے نکلا جی تھا کہ دائیں طرف سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ جس کی چھت پر سرخ جی فلیش کر رہی تھی۔ میں بڑی تیزی سے ایک زیر تعمیر مکان کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ صرف ایک منٹ بعد وہ گاڑی میرے سامنے سے گزر کر وحدت روڈ کی طرف چلی گئی۔ وہ پولیس کی موبائل تھی۔ اگر میں اس وقت تک سڑک پر آچکا ہوتا تو موبائل مجھے دیکھ کر یقیناً رک جاتی اور مجھے اپنے آپ کو بچانا مشکل ہو جاتا۔ میرے پاس دولت بھی تھی اور لوگر پستول بھی۔ مجھے بڑے اطمینان سے کسی بھی ڈکیتی کے الزام میں آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کیا جاسکتا تھا۔

پولیس موبائل بہت آگے جا کر وحدت روڈ پر بائیں جانب مڑ گئی تو میں مکان کی آڑ سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور تقریباً اسی وقت وحدت روڈ کی طرف سے ایک رکشے کی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور رک گیا۔ رکشہ میرے قریب خود بخود رک گیا۔

”کہاں جانا ہے باؤجی؟“ ڈرائیور نے باہر کی طرف جھکے ہوئے پوچھا۔

”جانا تو ایجوکیشن ٹاؤن ہے یار! مگر ایک رکشہ والے نے مجھے پریشان کر دیا“ میں نے جواب دیا۔

”ایجوکیشن ٹاؤن تو یہ سامنے ہے۔“ رکشے والے نے کہا۔ ”آپ کتھوں آئے ہو؟ رکشے والا آپ کو کتھے لے گیا تھا؟“

”بھائی! میں سیالکوٹ سے آیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مینار پاکستان والے چوک پر بس سے اتر ا تھا۔ ایک رکشہ میں بیٹھ گیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا تھا ملتان روڈ سے چلے۔ وہ پتہ نہیں کہاں سے گھماتا ہوا وحدت روڈ کی طرف لے گیا۔ یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ ایک موٹر پر اس کا رکشہ خراب ہو گیا۔ ورنہ پتہ نہیں وہ مجھے کہاں کہاں گھماتا رہتا۔ میں تقریباً دو میل سے بیدل آ رہا ہوں۔“

”نیٹھو باؤجی! دس روپے دے دینا، جہاں کہو گے اتار دوں گا۔“ رکشہ والے نے کہا۔ میری منزل اب اگرچہ زیادہ دور نہیں رہی تھی لیکن میں نے اس رکشہ کو غنیمت سمجھا اور اندر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور رکشہ اور ٹیکسی ڈرائیوروں کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

”یہ لوگ ہر وقت نشے میں رہتے ہیں باؤجی!“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”پنجر سے کراہیہ لیتے ہیں اپنی

خاصا تنگ کرتے تھے۔ کاغذات درست بھی ہوں تو تلاشی ضرور لیتے۔ اور میرے پاس نہ تو کاغذات تھے اور نہ ہی ڈرائیورنگ لائسنس۔ یہ سرکاری دستاویز بنانے کی میں نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ گاڑیاں میں نے ہر قسم کی چلائی تھیں۔ کبھی کوئی پولیس والا کسی وجہ سے روک بھی لیتا تو میں چپکے سے دس کانوٹ اس کی مٹھی میں دبا دیتا اور بات ختم ہو جاتی۔

کونٹھی سے نکلنے کے بعد میں نے خاص طور پر ڈلش بورڈ کے خانے کو چیک کیا تھا۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو روپے کے پانچ اور دس روپے والے نوٹ، پیٹرول کی دو تین پرچیاں اور ایک بال بین رکھا ہوا تھا۔ گلابی کے کاغذات نہیں تھے۔

گاڑی کے کاغذات اور لائسنس کی حد تک تو میں منٹ ہی منٹ تھا لیکن پنجر سیٹ کے سامنے وہ بیگ رکھا تھا جس میں کروڑوں کی دولت موجود تھی۔ اگر کوئی پولیس والا اسے چیک کرنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا تو میں اسے نہیں روک سکتا تھا۔ اس وقت میرا حلیہ بھی کچھ ایسا ہی تھا جو مجھے مشتبہ بنا رہا تھا۔ مگر میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ راستے میں کوئی پولیس پارٹی نہیں ملی تھی۔

وحدت روڈ بھی سنسان پڑی تھی۔ رات کا آخری پہر تھا۔ سڑک کے کنارے کھمبوں پر روشن بتیاں بھی اوجھکتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔

اسی سڑک پر ایک طرف یونیورسٹی اسٹاف آفیسرز کی ایک مختصر سی کالونی تھی۔ یہاں چند دفاتر کے علاوہ آفیسرز کے رہائشی بنگلے بھی تھے۔ کالونی کا گیٹ بند تھا۔ یہاں عام طور پر ایک گاڑی موجود رہتا تھا۔ مگر اس وقت وہ بھی اپنے کیپس میں اونگھ رہا ہوگا۔

اس کالونی سے آگے نکل کر میں نے کار ایک تنگ سی سڑک پر موڑ لی اور تقریباً ایک فرلانگ آگے جا کر کار روک لی۔ انجن بند کر کے ہیڈ لیپس اور دوسری تمام بتیاں بجھا دیں۔ چابی انجینشن ہی میں لگی رہنے دی اور نیچے اتر کر دروازہ بند کر دیا۔

اس سڑک کے ایک طرف کوٹھیاں تھیں اور دوسری طرف کا علاقہ ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ کہیں کہیں کوٹھیاں بن چکی تھیں۔ کہیں زیر تعمیر تھیں اور کہیں صرف بنیادیں بھر کر چھوڑ دی گئی تھیں۔

میں انہی زیر تعمیر کوٹھیوں کے بیچ میں کچے راستے پر ہوتا ہوا اس سڑک پر آ گیا جو اقبال ٹاؤن کی مرکزی مارکیٹ کے سامنے سے ہوتی ہوئی ملتان روڈ کی طرف چلی گئی تھی۔ اس سڑک کے دوسری طرف کا علاقہ بھی ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ میں بیگ کندھے پر لٹکائے اس زیر تعمیر علاقے سے گزرتا ہوا اس سڑک پر آ گیا جو ایجوکیشن ٹاؤن کی طرف چلا گیا تھا۔ یہ سڑک بھی

نہیں تھی۔ برآمدے کی چھت کو تو سامنے والے تین ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا لیکن دروازے کے دائیں بائیں ستونوں کا فائدہ میں اٹھا رہا تھا۔ نیچے سے یہ ستون تقریباً آٹھ انچ کی بلندی تک چوکور تھے اور اس سے اوپر گول تھے۔ ستونوں اور دیوار کے درمیان تین چار انچ جگہ خالی تھی اور میں مکان کی چابیوں کا گچھا ایک ستون کے پیچھے اس خالی جگہ پر رکھا کرتا تھا۔ یہاں کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے جھک کر ستون کے پیچھے سے چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک چابی منتخب کر کے تالا کھولنے لگا۔ دو تالے تھے۔ ایک تو اوپر چائیز تالا لگا ہوا تھا اور دوسرا دروازے کا ہنسی قفل تھا۔ دونوں تالے کھول کر میں اندر آ گیا اور قریب ہی بتی کا سوچ آن کر کے دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔

دو کنال رقبے پر مشتمل یہ کٹھی میں نے دو سال پہلے دو ہزار روپے ماہانہ کرائے پر حاصل کی تھی۔ ہر چھ مہینے بعد میں چھ مہینے کا کرایہ یکسٹ ایڈوانس دے دیا کرتا تھا اس لئے مالک مکان کو کبھی اس طرف آنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کٹھی کی مالک دراصل ایک ادھیڑ عمر بیوہ عورت تھی۔ اس سے میری ملاقات ہر چھ مہینے بعد اس وقت ہوتی تھی جب میں کرایہ دینے کے لئے باغبانپورہ میں اس کے گھر جایا کرتا تھا۔

زبیدہ کا شوہر سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ اسے ریٹائرمنٹ سے جو رقم ملی اس سے کاروبار شروع کر دیا۔ وہ ہانگ کانگ، سنگاپور اور دہلی کے چکر لگا رہتا تھا۔ وہاں سے مختلف چیزیں لاکر یہاں فروخت کر دیتا جس سے اسے معقول آمدنی ہو جاتی۔ آخری مرتبہ وہ ہانگ کانگ گیا تھا۔ واپس آتے ہوئے اس کا جہاز کریش ہو گیا۔ انشورنس کمپنی اور ایئر لائن کی طرف سے زبیدہ کو تقریباً دس لاکھ روپے کی رقم ملی تھی۔ زبیدہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ اس نے صرف میٹرک کیا تھا لیکن کئی سال سے سسرال والوں کے ساتھ رہتے ہوئے اسے کچھ عقل آ گئی تھی۔ اس نے عقل مندی یہ کی کہ شوہر کی موت کے بعد ملنے والی رقم سے یہ پلاٹ خرید کر کٹھی بنوالی اور میں اس کٹھی کا پہلا کرائے دار تھا۔ ان دنوں یہ اسکیم نئی بنی تھی۔ یہاں زندگی کی کوئی سہولت دستیاب نہیں تھی۔ جن لوگوں نے اپنے مکان بنائے تھے وہ تو یہاں رہنے پر مجبور تھے۔ مگر کوئی شہر سے دور اس دیرانے میں آنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ کٹھی بھی مکمل ہونے کے بعد چھ ماہ تک خالی پڑی رہی تھی۔

میں نے شہر کے مختلف علاقوں میں اپنے ٹھکانے بنا رکھے تھے۔ لیکن ایک آدھ ایسا ٹھکانا ضرور رکھتا تھا جس کے بارے میں کسی اور کو علم نہ ہو۔ ان دنوں میرے حالات بھی اچھے تھے۔

مرضی سے مگر تنگ بہت کرتے ہیں۔“

میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ یہ دوسروں کو گالیاں دے رہا تھا اور مجھ سے صرف ایک میل کے فاصلے کے دس روپے طلب کئے تھے۔ میں ڈرائیور کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتا رہا۔ سڑک پر بائیں طرف چند دکانیں تھیں۔ میں نے رکشہ رکوا لیا۔ جب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھا اور بیگ سنبھال کر نیچے اتر آیا۔ یہاں دو تین چھوٹے چھوٹے جنرل اسٹور تھے۔ ایک نان بنائی کی دکان تھی جس نے دو تین پرانی سی میزیں اور کرسیاں بھی لگا رکھی تھیں۔ دکان کے سامنے عام طور پر کچھ بیچ بھیجے رہتے تھے۔ یہاں عام طور پر اس علاقے میں زیر تعمیر کٹھیاں میں کام کرنے والے مزدور ہی کھانا کھایا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دودھ دہی کی ایک دکان تھی۔ جہاں ایک شوکیس میں مٹھائیاں بھی بچی رہتی تھیں۔

دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ حلوئی اور نان بنائی کی دکانیں کھل رہی تھیں۔ وہ اپنا کاروبار شروع کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔

یہ علاقہ بھی ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ کچھ کٹھیاں اور مکان بن چکے تھے جو آباد تھے۔ زیادہ تر مکان ابھی زیر تعمیر تھے۔ گلیاں ابھی کچی ہی تھیں۔ میں تین چار گلیوں میں گھومنے کے بعد ایک نو تعمیر کٹھی نما مکان کے سامنے رک گیا۔ ہرے رنگ کے گیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی دیوار میں ایک اینٹ نکلی ہوئی تھی۔ وہ سوراخ اتنا کشدہ تھا کہ میرا ہاتھ آسانی سے اندر جا سکتا تھا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس سوراخ میں ہاتھ ڈال دیا۔ میرا بازو کندھے تک دیوار کے سوراخ میں چلا گیا۔ اندر بائیں طرف دیوار میں ایک طاقتور سا بنا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ آسانی سے اس طاقتور تک پہنچ گیا اور جب میں نے ہاتھ باہر نکالا تو میری انگلیوں میں ایک چابی دبی ہوئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ اس گلی میں ابھی صرف پانچ چھ مکان آباد تھے اور باقی سب زیر تعمیر تھے۔ میں نے تالا کھولا اور اندر داخل ہو کر گیٹ بند کر دیا۔

تقریباً بیس فٹ کشادہ جگہ تھی جہاں گھاس اور کناروں پر پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ گیٹ کے سامنے والی روش اصل عمارت کے پہلو کے ساتھ آگے تک چلی گئی تھی۔ یہاں گاڑی وغیرہ بھی کھڑی کی جا سکتی تھی۔

لان کے اختتام پر برآمدے کی تین چار سیڑھیاں تھیں۔ برآمدہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ دروازے کے دائیں بائیں دیواروں سے تین چار انچ ہٹ کر دو گول ستون بنے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ ستون کیوں بنائے گئے تھے۔ میرے خیال میں ان کی ضرورت

والوں کی نظریں اس کے پیسے اور کوٹھی پر تھیں۔ زبیدہ کو شوہر کی موت کے بعد تقریباً دس لاکھ روپے ملے تھے۔ جس میں سے پانچ لاکھ کے لگ بھگ پلاٹ کی خرید اور کوٹھی کی تعمیر پر لگ گیا تھا۔ باقی رقم اس نے بینک میں جمع کروادی تھی جس سے معقول منافع مل رہا تھا۔ اس کی ساس اور سر چاہتے تھے کہ زبیدہ اپنے دیوار اکرم سے جو عمر میں اس سے چندرہ سولہ سال چھوٹا تھا، شادی کر لے۔ مگر زبیدہ نے نہ صرف صاف انکار کر دیا بلکہ ان کے دباؤ سے نکلنے کے لئے کرائے پر الگ مکان لے کر رہنے لگی۔

پچھلے دو سال کے عرصہ میں میری زبیدہ سے صرف چار پانچ بار ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ آخری ملاقات تقریباً دو ہفتے پہلے ہوئی تھی جب میں کوٹھی کا کرایہ دینے گیا تھا۔ پہلے میں عام طور پر دروازے کے باہر ہی کھڑا رہتا تھا اور کرایہ دے کر لوٹ آتا تھا۔ لیکن اس روز زبیدہ نے مجھے اندر بلا لیا۔ اس مکان کے صرف تین کمرے تھے جن میں سے ایک کو بیٹھک کے طور پر آراستہ کر لیا تھا۔ اس کی بیٹی سعدیہ بھی اس وقت گھر پر موجود تھی۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا اور کچھ دیر بعد جب زبیدہ چائے بنا کر لے آئی تو سعدیہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

میں تقریباً آدھ گھنٹے وہاں رہا۔ اس روز پہلی مرتبہ مجھے زبیدہ نے اپنے بارے میں سب کچھ بتایا تھا۔

وہاں سے واپس آنے کے بعد میں دو تین دن تک زبیدہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر اس کا خیال ذہن سے نکال دیا۔

میں نے اس کوٹھی میں ضرورت کا ہر سامان جمع کر لیا تھا۔ اگرچہ مجھے شب بستی کے لئے صرف ایک چارپائی کی ضرورت تھی لیکن میں نے تینوں بیڈرومز اور ڈرائنگ روم مناسب فرنیچر سے آراستہ کر لئے تھے۔ کچن میں بھی ضرورت کے برتن اور کھانے پینے کی مناسب چیزیں موجود تھیں۔ میں نے ایک چھوٹا فریج بھی لے لیا تھا۔ میں ہفتے میں ایک یا دو دن یہاں آکر ضرور رہتا تھا۔ پہلے دو سال کے دوران اس کچی میں چند اور مکان آباد ہو گئے تھے۔ یہاں رہائش کے لئے سواری بہت ضروری تھی بصورت دیگر ملتان روڈ تک پیدل جانا پڑتا تھا۔

اس وقت جب میں کوٹھی میں داخل ہوا تو دن طلوع ہو رہا تھا۔ میری پوری رات بھاگ دوڑ میں گزری تھی۔ بری طرح تھکن ہو رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے بتی جلائی۔ دروازہ لاک کر دیا۔ اور اس کمرے میں آ گیا جسے میں اپنے بیڈ روم کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ بیک کندھ سے اتار کر پلنگ پر پھینک دیا اور کپڑے اتار کر ہاتھ روم میں کھس گیا۔

ٹھنڈے پانی کے غسل سے دماغ کی تپش کچھ کم ہوئی۔ میں تولیہ لپیٹ کر باہر آ گیا اور

جیبوں میں نوٹ بھرے رہتے تھے۔ سواری کے لئے ایک عدد کار بھی موجود تھی اور اس روز میں کسی مکان ہی کی تلاش میں اس طرف گھوم رہا تھا۔ یوں تو کسی بھی پر اپنی ڈیڑھ کے ذریعہ کمپن مکان حاصل کیا جاسکتا تھا مگر میں کسی تیسرے آدمی کو بیچ میں نہیں لانا چاہتا تھا اور یہ اتفاق تھا کہ جب میں اس دروازے کی طرف سے گزرا تو زبیدہ اپنی دس سالہ بیٹی اور دیوار کے ساتھ کوٹھی کے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ گیٹ پر گتے پر لکھا ہوا ”کرائے کے لئے خالی ہے“ کا بورڈ بھی آویزاں تھا۔ رابطے کے لئے باغبانپورہ کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے کار روک لی اور نیچے اتر کر زبیدہ کے دیوار سے بات کرنے لگا۔ اس کی عمر بیس ایکس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس سے اپنا مدعا بیان کرنے کے بعد میں نے زبیدہ سے بات کی۔ انہوں نے مجھے اندر لے جا کر کوٹھی دکھادی۔

تین بیڈرومز، ایک لائونج اور ڈرائنگ روم پر مشتمل یہ کوٹھی اگرچہ میری ضرورت سے بہت زیادہ تھی لیکن میں نے اسے لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے دو ہزار روپے ماہانہ کرائے کی آفر کی جسے فوراً ہی قبول کر لیا گیا۔ دو سال پہلے یہاں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ کرایہ نہایت معقول سمجھا گیا۔ اس کے ساتھ پچیس ہزار روپے ڈیپازٹ کی آفر بھی تھی۔ میری یہ پیشکش فوراً ہی قبول کر لی گئی۔

وہ لوگ باغبانپورہ سے بسوں وغیرہ پر دھکے کھاتے ہوئے آئے تھے۔ بہت سا فاصلہ انہیں پیدل بھی طے کرنا پڑتا تھا۔ واپسی پر میں انہیں اپنے ساتھ کار میں لے گیا۔

میرے پاس اس وقت اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ اسی روز سارے معاملات طے ہو گئے۔ میں نے پچیس ہزار روپے ڈیپازٹ کے علاوہ چھ ماہ کا کرایہ بھی پیشگی دے دیا اور یہ وعدہ کیا کہ ہر چھ مہینے بعد انہیں اگلے چھ مہینوں کا کرایہ دے جایا کروں گا۔

زبیدہ کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق دیہات سے تھا۔ شادی کے بعد وہ مستقل طور پر شہر ہی میں رہ رہی تھی۔ وہ میٹرک پاس تھی۔ اس کا لب و لہجہ، پہناؤ اور انداز نشست و برخاست بہت مہذبانہ تھا۔ کسی طرح بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ دیہات کی رہنے والی ہے۔ اس کی صرف ایک ہی اولاد تھی۔ سعدیہ جس کی عمر دس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح بے حد حسین تھی۔

زبیدہ کی عمر اگرچہ پینتیس کے لگ بھگ تھی مگر وہ اتنی عمر کی لگتی نہیں تھی۔ اونچا لمبا قد، گداز اور سڈول جسم، چہرے کے نقوش بے حد دلنریب اور اس کے گلے زبڑے پد کشش تھے۔ گزشتہ دو سال سے اس پر دباؤ پڑ رہا تھا کہ دوسری شادی کر لے مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ سسرال

نہیں ہچکچاتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کئی لوگ میرے ہاتھوں سے مارے جا چکے تھے۔ ایک دور ایسا بھی گزر رہا ہے جس میں کرائے کے قاتل کی حیثیت سے مشہور تھا۔ انڈورلڈ میں مجھے بے حد سفاک اور بے رحم انسان سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ بعض لوگ تو مجھے انسان تسلیم کرنے کو ہی تیار نہیں تھے۔ مجھے انسان کے بھیس میں غوغوار بھیڑیا کہا جاتا تھا اور میں بھی اپنے آپ کو انسان نہیں، قاتل سمجھتا تھا۔ صرف قاتل۔ بے رحم قاتل۔ کسی کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے میرے ہاتھ ذرا بھی نہیں کانپتے تھے۔

کوئی جرم ایسا نہیں تھا جو میرے ہاتھوں سرزد نہ ہوا ہو۔ مگر مجھے نفرت تھی تو صرف ایک چیز سے۔ ہیر وٹن..... آپ کو میری اس بات پر یقیناً حیرت ہوگی کہ ایک جرائم پیشہ شخص ہیر وٹن کے دھندے سے کیسے نفرت کر سکتا ہے؟ حالانکہ سب سے زیادہ منافع اس کا رو بار میں ہے۔ راتوں رات لکھ پتی بن جانے کا یہ بہترین نسخہ ہے۔ لیکن مجھے ہیر وٹن اور دیگر منشیات کے بزنس سے شدید نفرت تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ہیر وٹن کا نشہ ہماری نو عمر اور نوجوان نسل کو جس طرح برباد کر رہا تھا وہ مجھ جیسے جرائم پیشہ شخص کے لئے بھی دکھ کی بات تھی۔ میں نے کئی نوجوانوں کو ہیر وٹن کے نشے میں برباد ہوتے دیکھا تھا۔ اگر میرا بس چلتا تو میں دنیا بھر کے منشیات فروشوں کو قطار میں کھڑا کر کے گولیوں سے چھلنی کر دیتا۔

ان دنوں روسی فوجیں افغانستان پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جنگ پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں افغانی باشندے اپنے گھر بار چھوڑ کر ایران اور پاکستان کی سرحدوں میں پناہ لے رہے تھے۔ ایران نے تو افغان مہاجرین پر کنٹرول رکھا تھا۔ انہیں مہاجر کیمپوں تک محدود کر دیا تھا۔ ان کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی۔ کسی کو کیمپ سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن پاکستان میں صورت حال مختلف تھی۔

افغان مہاجرین کے حوالے سے پاکستان کی انتظامی مشینری بالکل مفلوج ہو گئی تھی۔ کرپشن نے ہر شخص کو اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایک طرف افغان مہاجرین کے لئے اقوام متحدہ سے ملنے والے فنڈز ہڑپ کئے جا رہے تھے اور دوسری طرف کیمپوں میں آنے والے مہاجرین کو بھی لوٹا جا رہا تھا۔

پاکستان میں ہیر وٹن کا تحفہ یہ افغان مہاجرین ہی لے کر آئے تھے۔ پاکستان میں کرپشن، منشیات اور بے حیائی پھیلانے میں ان افغان مہاجرین کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ یہ لوگ مہاجر کیمپوں سے نکل کر پورے ملک میں پھلتے چلے گئے۔ ہیر وٹن اور کلاشکوف جیسی تباہ کن چیزوں کو تو متعارف کرایا ہی تھا، یہ اپنی عورتوں کے ذریعے ہمارے نوجوانوں کا اخلاق بھی بگاڑنے

الماری سے کپڑے نکالنے لگا۔

کچھ ہی دیر بعد میں کچن میں موجود تھا۔ چولہا جلانے کے لئے میں نے گیس کا ایک بڑا سلنڈر لے رکھا تھا جو ہفتے میں صرف ایک یا دو دن چائے بنانے کے لئے ہی استعمال ہوتا تھا۔ چائے بنا کر میں لاونچ میں آ گیا اور صوفے پر بیٹھ کر ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے گزشتہ روز کے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس عورت کے بارے میں میرا ذہن اب بھی الجھا ہوا تھا۔ اسے قتل کیوں کیا گیا تھا؟ قاتل کون تھے؟ وہ کروڑوں کی دولت کیوں چھوڑ گئے تھے؟ اگر یہ قتل دولت کے لئے نہیں کیا گیا تھا تو ان کا مقصد کیا تھا؟ کوئی ذاتی دشمنی یا کچھ اور؟ طرح طرح کے سوالات ذہن میں ابھر رہے تھے لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ایک بات بہر حال طے تھی کہ قاتل جو کوئی بھی تھے اس عورت کے جانے والے تھے اور بڑے اطمینان سے اپنا کام کر کے چلے گئے تھے۔ وہ لوگ غالباً کئی گھنٹے وہاں رہے تھے۔ یہ بات یقیناً ان کے علم میں تھی کہ اس گھر میں کروڑوں کی دولت موجود تھی۔ لیکن انہوں نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ بہر حال، وہاں جو کچھ بھی ہوا تھا میرے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ میں تو محض تجسس کی بنا پر اس بنگلے میں داخل ہوا تھا اور کروڑوں کی یہ دولت میرے ہاتھ لگ گئی تھی اور مجھے یہ دولت سمیٹتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لوگ دولت ہی کے لئے تو سب کچھ کرتے ہیں۔ قتل، اغوا، اسمگلنگ اور نجانے کیا کیا ہوتا رہتا ہے۔ میں بھی دولت ہی کے لئے جرائم کی دلدل میں پھنسا تھا۔ چند ہزار روپوں کی بات ہوتی تو میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ مگر کروڑوں کی دولت سے منہ کیسے موڑا جا سکتا تھا۔ میرے لئے تو یہ ایسی نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی تھی جو بغیر محنت کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اس سے کچھ ہی دیر پہلے اپنی جان کے خوف سے بھاگا پھر رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ بھی دولت ہی کے لئے تھا۔

یوں تو میں ہر وقت خطرات میں گھرا رہتا تھا مگر گزشتہ رات تو میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔

میں نے اپنے بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتایا۔ لیکن یہ بتانا چلوں کہ میں اس طرح جرائم کی دلدل میں دھنسا ہوا ہوں کہ چاہنے کے باوجود اس سے نکلنا ممکن نہیں۔ میں ہمیشہ اکیلا کام کرنے کا عادی ہوں۔ لیکن کبھی کبھار کسی اور کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتا ہوں۔ لاہور کے انڈورلڈ کے باسی میرے بارے میں خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ بعض پارٹیاں اپنے کام کے لئے معقول معاوضے پر میری خدمات بھی حاصل کر لیتی ہیں۔

جرائم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں، میں ملوث نہ رہا ہوں۔ میں کسی کو قتل کرنے سے بھی

اے میری خدمات کی ضرورت تھی۔ تیس من ہیر وٹن تھی اور مجھے انٹرنیشنل مارکیٹ ریٹ پر دو فیصد کمیشن دینا طے ہوا تھا۔ کمیشن ہی کی مد میں کروڑوں روپیہ بنتا تھا۔ اور مجھے دس لاکھ روپے ایڈوانس دیئے گئے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملک شہاب نے چند مہینے پہلے بھرے بازار میں اپنے لوگوں سے میری پٹائی کروائی تھی۔ میں اس تذلیل کو نہیں بھولا تھا۔ مگر شاید ملک شہاب بھول گیا تھا اور اس کی شامت ہی آئی تھی کہ اس نے تیس من ہیر وٹن کراچی پہنچانے کے لئے میری خدمات حاصل کی تھیں۔ یا پھر اسے یہ یقین تھا کہ میں اس کے خلاف کوئی سازش نہیں کروں گا یا اسے دھوکا نہیں دوں گا۔ لیکن میں نے کچھ اور ہی منصوبہ بنالیا تھا۔ یہ نہ صرف ملک شہاب سے انتقام لینے کا بہترین موقع تھا بلکہ میں اس ہیر وٹن کو بھی ضائع کر سکتا تھا جس کے استعمال سے لاکھوں افراد کے مراد ہونے کا اندیشہ تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں اکیلا دنیا کو اس لعنت سے نجات نہیں دلا سکتا تھا لیکن کم از کم اپنے حصے کا کام تو کر ہی سکتا تھا۔

”میں اس کام کے لئے کسی اور کا انتخاب بھی کر سکتا تھا۔“ ملک شہاب نے کہا۔ ”میرے پاس ایسے کئی آدمی موجود ہیں جو اس سے بھی کم کمیشن پر یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن میں تمہاری ذہانت اور چالاکی کی وجہ سے یہ کام تمہیں سونپنا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہاری بہت تعریف سنی ہے۔ جس کام کی ہامی بھرتے ہو اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنی جان کی بازی تک لگا دیتے ہو۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس یقین کے ساتھ تمہارا انتخاب کیا ہے کہ تم پوری ذمہ داری اور دیانت داری سے میرے مال کو ٹھکانے تک پہنچاؤ گے۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔“۔۔۔ بندھنوں کو خاموش ہوا پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

”ملک شہاب غدار کی کرنے والوں اور دھوکا دینے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ اگر تم نے دھوکا دینے کی کوشش کی۔ دنیا کے کسی گوشے میں تمہیں مجھ سے پناہ نہیں ملے گی۔“

”دھمکی دینے کی ضرورت نہیں ملک جی!“ میں نے بھی براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہ ہوتا تو آپ اس کام کے لئے میرا انتخاب نہ کرتے۔ دھوکا اور فریب میری فطرت میں شامل نہیں۔ ایک بات آپ بھی ذہن میں رکھئے کہ اگر میرے ساتھ کسی قسم کا دھوکا ہوا تو آپ کو کبھی دنیا کی کوئی طاقت میرے بچوں سے نہیں بچا سکے گی۔ لوگ مجھے انسان نہیں خونخوار بھیڑیا کہتے ہیں۔ اور یہ کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ میں نے ان بچوں سے بڑے بڑے لوگوں کے زخموں کو دیکھا ہے۔“ میں نے دایاں ہاتھ اس طرح اس کے چہرے کے سامنے کر دیا کہ انکلیاں مڑی ہوئی تھیں اور ان میں خود بخود شدید قسم کا تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

لگے۔ شکار کی تلاش میں سڑکوں پر گھومنے والی یہ عورتیں فائبر اسٹار ہوٹلوں اور اونچی سہ سائٹی تک پہنچ گئیں۔ انہیں اعلیٰ سرکاری افسروں کی خدمت میں رشوت کے طور پر پیش کیا جاتا جس کے عوض یہ ایسی سہولتیں اور مراعات حاصل کرنے لگے جو پاکستان کے اصل باشندوں کو بھی حاصل نہیں تھیں۔ انتظامیہ کے بے ضمیر افسران حسین عورتوں کی آغوش میں ایسے ڈوبے کہ اپنے فرائض تو کیا اپنے آپ کو بھی بھول گئے۔

ہیر وٹن کا بزنس عروج پر تھا۔ راتوں رات کروڑ پتی بننے کے خواہش مند اس طرف آرہے تھے۔ اس لعنت سے نوجوان نسل مفلوج ہو رہی تھی مگر منشیات کا بزنس کرنے والوں کو اس سے کیا غرض تھی۔ وہ تو دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔

مجھے شروع ہی سے منشیات کے دھندے سے نفرت تھی اور انڈر ورلڈ کے بہت سے لوگ میری اس سچائی سے واقف بھی تھے کہ میں نوجوان نسل کو مفلوج ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن ملک شہاب شاید یہ بات نہیں جانتا تھا اس لئے اس نے دو ہفتے پہلے مجھے بلایا تھا۔

ملک شہاب کے بارے میں بھی کچھ بتانا چلوں۔ درمیانے قد کا قدرے بھاری بھر کم یہ آدمی کچھ عرصہ پہلے تک ڈرائی فروٹ کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ اکبری منڈی میں اس کی ہول سیل کی دکان تھی۔ اس کا مال زیادہ تر پشاور اور صوبہ سرحد کے دوسرے شہروں سے آتا تھا۔ یہ خود بھی مہینے میں ایک آدھ مرتبہ پشاور جایا کرتا تھا۔

پاکستان میں افغان مہاجرین کی آمد کے ساتھ ہی ملک شہاب کے کاروبار کی نوعیت بھی بدل گئی۔ ڈرائی فروٹ کی آڑ میں ہیر وٹن کا بزنس ہونے لگا۔ کچھ عرصہ تک تو لوگوں کو پتہ نہ چل سکا۔ لیکن ایک روز پولیس نے اس کی دکان اور گودام پر چھاپہ مارا تو یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ اس کی دکان اور گودام سے مجموعی طور پر دس کلو ہیر وٹن برآمد ہوئی تھی۔ مگر ملک شہاب نہ تو جیل گیا اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی۔ وہ چند روز روپوش رہنے کے بعد پھر سامنے آ گیا اور حسب معمول اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ اب اسے پولیس کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔

ملک شہاب موچی دروازے والا جدی پشتی مکان چھوڑ کر گلبرگ کی ایک کوشی میں منتقل ہو گیا۔ اس وقت تک وہ ہیر وٹن کی بین الاقوامی منڈی میں بھی بڑی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اعلیٰ ترین سرکاری عہدوں پر فائز افسروں سے بھی اس کے خوشگوار تعلقات قائم ہو چکے تھے۔

جس روز ملک شہاب نے مجھے اپنی گلبرگ والی کوشی پر بلایا وہاں صرف تین آدمی تھے جن میں اسلام آباد سے تعلق رکھنے والا ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر بھی تھا۔

پشاور سے ملک شہاب کا مال لاہور آنے والا تھا جسے وہ کراچی بھیجتا چاہتا تھا اور اس کے لئے

”تمہارے ساتھ کیا دھوکا ہوگا؟“ ملک شہاب نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
 ”مال پہنچا کرواپس آؤ گے تو تمہارا کمیشن تمہیں مل جائے گا۔“
 ”مال کتنا ہے۔ کہاں پہنچانا ہوگا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”تیس من ہیروئن کراچی جائے گی۔“ ملک شہاب نے جواب دیا۔ ”یہ ہیروئن ایک ٹرک میں چھپائی جائے گی۔ جس پر اسکرپ لدا ہوا ہوگا۔“
 ”اسکرپ!“ میں نے ملک شہاب کو گھورا۔ ”آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ یہ مشورہ آپ کو کس نے دیا ہے؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کراچی میں.....“
 ”میرا دماغ بالکل درست ہے۔ تم اپنے حواس قابو میں رکھو۔“ ملک شہاب نے میری بات کاٹ دی۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک بار پھر بدل گیا اور لہجے میں سرد مہری تھی۔ ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر کے سامنے اسے میری یہ بے تکلفی پسند نہیں آئی تھی۔ ”میں اس لہجے میں گفتگو پسند نہیں کرتا۔“ وہ خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”میں بیوقوف نہیں ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر میں نے ٹرک پر آئرن اسکرپ لداؤنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لاٹھی کے علاقے میں دو تین اسٹیل ری رولنگ ملز ہیں۔ جنہیں آئرن اسکرپ کی ضرورت رہتی ہے۔“
 ”اسٹیل ری رولنگ ملز آئرن اسکرپ نہیں خریدتیں۔ وہ پاکستان اسٹیل ملز سے اپنی ضرورت کے مطابق خام مال خریدتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں بحث پسند نہیں کرتا۔“ ملک شہاب نے کہا۔ ”میں نے جو فیصلہ کیا ہے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ آئرن اسکرپ ایک ایسی چیز ہے جس کی نقل و حمل پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ کراچی میں کسی کو آئرن اسکرپ کی ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن راستہ میں کوئی تم پر شبہ نہیں کرے گا۔ جگہ جگہ تمہیں روکا تو ضرور جائے گا۔ لیکن ذہین آدمی ہو، آسانی سے اس قسم کی صورتحال سے نمٹ سکتے ہو۔ ویسے تمہارے پاس ٹرک پر لدے ہوئے اسکرپ کے حوالے سے تمام ضروری کاغذات موجود ہوں گے۔ لیکن اگر کوئی سیریس بات ہوئی تو مسٹر سلطان سنبھال لیں گے۔“ اس نے صوفے پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر بھاری بھر کم آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کا تعلق اسلام آباد سے ہے۔ ان کے عہدے سے تھوڑا بہت فائدہ تو اٹھایا جاسکتا ہے۔“

میں نے گھوم کر سلطان کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر پچاس سے اوپر ہی تھی۔ قد نسبتاً چھوٹا اور جسم بھاری بھر کم تھا۔ شکل بل ڈاگ سے کچھ ملتی جلتی اور جڑوں کے نیچے گوشت لٹکا ہوا تھا۔ بال برف کی طرح سفید، تنک پیشانی اور آنکھیں چھوٹی تھیں۔ اس کی صورت ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ نہایت کینہ پرور اور حریص آدمی ہے۔ وہ ایک وزارت میں ڈپٹی سیکریٹری تھا۔ اس

بات کرتے ہوئے میرے جڑے بھی بچھ گئے تھے۔

ملک شہاب کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا۔ میں اس کی طاقت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اتنے وسیع پیمانے پر ہیروئن کی اسمگلنگ کوئی معمولی آدمی نہیں کر سکتا۔ ایسے کاموں کے لئے دوسروں کو اپنے ساتھ ملانا پڑتا ہے۔ کام بہت چھوٹے پیمانے پر ہو تو سرکاری حکموں سے تعلق رکھنے والے چھوٹے چھوٹے لوگوں کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ علاقے کے تھانیدار تک رسائی ہوتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے کام کا حجم بڑھتا جائے گا، تعلقات بھی وسیع تر ہوتے جائیں گے۔ اور پھر تھانیدار، ڈی ایس پی اور ایس پی کی سطح تک کے آفیسرز بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ لوگ آپ کے اشاروں پر چلیں گے۔ ملک شہاب بھی اب اس منزل پر تھا کہ اس کے سامنے ایسے آفیسرز کسی گنتی شمار میں نہیں آتے تھے۔ اس کی رسائی اسلام آباد تک تھی۔ اسے چند بڑے سیاستدانوں کا آشریہ حاصل تھا۔ اس کے آدمی اسمبلیوں اور سینٹ میں موجود تھے۔ کم از کم دو آدمیوں کے بارے میں تو میں بھی اچھی طرح جانتا تھا جنہیں اس نے پچھلے الیکشن میں کامیاب کرا دیا تھا۔ ان میں ایک پنجاب اسمبلی کا تھا اور دوسرا اسلام آباد سے قومی اسمبلی کی سیٹ پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے تھے اور ان دونوں کی کامیابی کے لئے ملک شہاب نے روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ ان کے علاوہ اسمبلیوں میں اور بھی بہت سے ایسے لوگ تھے جن کی ملک شہاب نے خفیہ طرز پر مالی مدد کی تھی۔ ٹیکو کریٹس ان سیاستدانوں کے علاوہ تھے۔ ملک شہاب بہت ذہین آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پاکستان میں آج تک کوئی بھی حکومت دو ڈھائی سال سے زیادہ نہیں چل سکی تھی۔ سیاستدانوں سے صرف اس وقت تک فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا جب تک وہ حکومت میں ہوتے تھے۔ ملکی اسٹیج پر بازی چلنے ہی ملک شہاب بھی چلٹ جاتا تھا۔ وہ ان سیاستدانوں سے دُور ہٹ جاتا تھا جو بقول شخصے نئی حکومت کے ”احتساب“ کی زد میں آجاتے تھے۔ البتہ ٹیکو کریٹس پر اس کی نظر کرم رہتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہر حکومت میں اپنی کرسیوں پر براجمان رہتے تھے اور درحقیقت سارا اقتدار تو انہی کے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔ ہر دور میں یہی سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں۔ برسر اقتدار سیاستدان تو دراصل وہ کٹھ پتلیاں ہوتی ہیں جنہیں یہ بیورو کریٹس اپنی انگلیوں کے اشاروں پر نچاتے رہتے ہیں اور ملک شہاب جیسے لوگ ان بیورو کریٹس کو اپنے اشاروں پر نچاتے ہیں۔ اس وقت جو شخص ملک شہاب کے پاس بیٹھا ہوا تھا اس کا تعلق بھی اس بے ضمیر طبقے سے تھا جو اپنے ذاتی مفاد کے لئے ملک کی جڑیں کھودنے میں مصروف ہیں۔

پہنچ رہے تھے۔ اتفاق سے میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ میں نے مجھے کونہ صرف غنڈوں سے بچایا۔ بلکہ ان لوگوں کی اچھی خاصی دھنکی بھی کر دی تھی۔ اور وہ دم باکر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اس روز سے مجھ کا میرا احسان مند ہو گیا تھا۔ ہم دونوں میں بڑے خوشگوار تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ وہ جب بھی ملتا، مارے محبت اور احترام کے میرے سامنے بچھ بچھ جاتا۔ اس وقت بھی وہ مجھے دیکھ کر لپکا تھا اور اس طرح گرجوٹی سے ملتا تھا جیسے مدتوں سے پہچڑے ہوئے ہوں۔ وہ میرے ساتھ ہی گیٹ سے باہر آ گیا۔

”کوئی جلدی تو نہیں روئی باؤ؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ آج تو مجھے کوئی جلدی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر چلو ایک پیالی چائے کی ہو جائے۔ اوس پاسے۔ لبرٹی ول چلتے ہیں۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ ہم دونوں لبرٹی چوک پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ سامنے لبرٹی سینما میں سلطان راہی کی فلم مولا جٹ چل رہی تھی۔ سینما کی پیشانی پر بڑے بڑے ہورڈنگز لگے ہوئے تھے۔ پندرہ فٹ اونچا ایک ہورڈنگ صرف سلطان راہی کا تھا جس میں وہ اپنے مخصوص انداز میں گنڈا لے لے کھڑا تھا۔ لاچہ اور کرتہ میں جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے، وہ واقعی مولا جٹ لگ رہا تھا۔

انٹرول ختم ہو چکا تھا اس لئے چوک پر قدرے سکون تھا۔ لیکن معمول کی رونق برقرار تھی۔ ہم ایک ریستورنٹ میں آ گئے۔ ہال میں اگرچہ تقریباً ساری ہی میزیں خالی تھیں مگر میں نے باہر تازہ ہوا میں بیٹھنے کو ترجیح دی۔ مجھے نے فوراً ہی ویٹر کو اشارہ کر کے چائے لانے کو کہہ دیا۔

چائے کے دوران ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر چائے ہی مجھے ایک خیال آیا۔ مجھ کا ملک شہاب کے سرکل میں تھا۔ وہ بہت سی امیر کی باتیں بھی جانتا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں اصل مقصد کی طرف آ گیا۔

”بھگے!“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”جانتے ہو ملک شہاب نے آج مجھے یہاں کیوں بلایا تھا؟“

”نہیں روئی باؤ!“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا شمار ملک کے چند قابل اعتماد آدمیوں میں ضرور ہوتا ہے مگر ایسی باتیں ہم سے پوشیدہ ہی رکھی جاتی ہیں۔ ہماری زندگی تو ملک کے وفادار کتوں جیسی ہے روئی باؤ۔ کیا بتاؤں یار۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”میں تو تنگ آ گیا ہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ کوئی مصیبت پڑتی ہے تو ہم جیسے لوگوں کو آگے کر دیا جاتا ہے اور

کے ساتھ دوسرا آدمی بہت ڈبلا پتلا اور لمبے قد کا مالک تھا۔ ان دونوں کی جوڑی کچھ عجیب سی لگتی تھی۔ اس کا تعلق بھی اسلام آباد ہی سے تھا۔ ملک شہاب نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

”کراچی میں مال کہاں جائے گا۔ لائڈھی؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے ملک شہاب کی طرف دیکھا۔

”سہراب گوٹھ۔“ ملک شہاب نے جواب دیا۔

میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ان دنوں ہیروئن کی اسمگلنگ کے حوالے سے سہراب گوٹھ کو دنیا کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ غیر ممالک میں ہمارے سفیروں نے پاکستان کو متعارف کرانے میں اتنا اہم کردار ادا نہیں کیا تھا جتنی شہرت سہراب گوٹھ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس شہرت میں نیک نامی کم اور ذلت و رسوائی زیادہ تھی۔

”سہراب گوٹھ میں کل باز خان تمہارا منتظر ہو گا۔ ٹرک تم اس کے حوالے کر دو گے اور اس کے بعد تمہارا کام ختم ہو جائے گا۔“ ملک شہاب نے کہا۔

”کب روانہ ہونا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

”کل پشاور سے ہمارا مال یہاں پہنچنے والا ہے۔“ ملک شہاب نے جواب دیا۔ ”دو دن یہاں لگ جائیں گے۔ یہ سمجھ لو کہ آج سے چوتھے دن تم یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔ اس دوران تم شہر سے باہر نہیں جاؤ گے بلکہ میرے آدمیوں سے رابطے میں رہو گے تاکہ فوری طور پر تمہیں بلایا جاسکے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ایڈوانس کی رقم کب ملے گی؟“

”کل رات۔“ ملک شہاب نے جواب دیا۔ ”کل رات بارہ بجے کے قریب آ جانا۔ اس وقت تک ہمارا مال بھی یہاں پہنچ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں کل آدھی رات کے بعد کسی بھی وقت یہاں آ جاؤں گا۔“ میں نے کہا اور سلام کئے بغیر اٹھ کر اس شاندار ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔

کوٹھی میں ملک شہاب کے کئی گرگے موجود تھے۔ تین چار تو لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب چہروں ہی سے خراٹ اور چھٹے ہوئے لگتے تھے۔ ان میں سے دو تین تو مجھے جانتے بھی تھے۔ فضل نامی ایک آدمی اٹھ کر میری طرف آ گیا۔ اسے عام طور پر مجھ کا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ کئی مہینے پہلے کشمی چوک پر چند غنڈوں سے اس کی لڑائی ہو گئی تھی۔ وہ بری طرح اسے

نہیں ہوتی۔ ان کا بس چلے تو غریبوں کے کپڑے تک اتار لیں اور ان کے منہ کا نوالہ بھی چھین لیں۔“

”یہ سب کچھ تو ہو رہا ہے رونی باؤ!“ بھجے نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

میں چند لمحے خاموش رہا، پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”سنا ہے کل پشاور سے ملک کا کچھ مال آ رہا ہے۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“ بھجھا چونک گیا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے خود ملک نے بتایا تھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ بھجے کو میں بہت زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن اس کی باتیں سن کر میں نے بھی جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ”ملک ہی نے بتایا تھا کہ کل پشاور سے اس کا مال آ رہا ہے اور وہ یہ مال میری نگرانی میں کراچی بھیجنا چاہتا ہے۔“

”اور.....“ بھجے کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ ”اور تم نے اس کی یہ آفر قبول کر لی؟“

”مجبوری ہے۔“ میں نے گہرا سانس بھرا۔

”اور تم یہ بھول گئے کہ چند مہینے پہلے اس ملک شہاب نے اپنے غنڈوں سے تمہاری پٹائی کرائی تھی۔ صرف اس لئے کہ تم نے اس کے لئے کام کرنے والے ایک لڑکے سے دو سو گرام ہیروئن چھین کر نالی میں پھینک دی تھی۔“

”مجھے وہ سب کچھ یاد ہے۔ لیکن ملک شاید بھول گیا ہے۔“ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

”ایک منٹ۔“ بھجے نے ہاتھ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کی میزیں بھی ہم سے فاصلے پر تھیں۔ ہم مدھم لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ ہماری باتیں سن لئے جانے کا اندیشہ نہیں تھا لیکن بھجھا کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

”چلو..... وہاں گھاس پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے ویٹر کو بلا کر چار کپ چائے کے پیسے دے دیئے اور ایک روپیہ ٹپ کا بھی۔ ”دو کپ چائے ہمیں وہاں پہنچا دو۔“ اس نے پارک کی طرف اشارہ کیا اور لڑکے نے اثبات میں سر ہلادیا۔

لبرٹی سینما کے سامنے ایک کافی کشادہ لان بنا ہوا تھا جس کے گرد چین کا بیر لگا ہوا تھا۔ ہم سڑک پار کر کے لان میں آ گئے۔ گھاس بڑی دبیز تھی۔ اطراف میں پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ وہاں ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ہم دونوں لان کے وسط میں پھولوں کے پودوں کے قریب بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ لڑکا ہمیں چائے دے گیا۔

ملک شہاب خود پیش کرتا ہے۔ میرا تودل برا ہو گیا ہے۔“

”کوئی خاص بات ہے؟“ میں نے ٹٹولنے والی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے اس انداز گفتگو سے مجھے امید ہو گئی تھی کہ مجھے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوگی۔

”تین ہفتے پہلے جیدا ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا۔“ بھجھا کہہ رہا تھا۔ ”جیدا کئی سال سے ملک کے لئے کام کر رہا تھا۔ ملک کا مال بچانے کے لئے کئی مرتبہ اس نے جان کی بازی لگا دی۔

تین ہفتے پہلے بھی یہی ہوا۔ اس کے پاس دو کروڑ کا مال تھا۔ پولیس نے اسے روک لیا لیکن جیدا کسی طرح پولیس والوں کو دھوکا دے کر گاڑی وہاں سے نکال لے گیا۔ پولیس نے پیچھا کیا۔ وہ لوگ جیدے کی گاڑی پر گولیوں کی بارش بھی کرتے رہے۔ جیدا شدید زخمی ہو گیا۔ اسے کئی گولیاں لگی تھیں۔ مگر وہ پولیس والوں کو چکر دے کر اپنے ٹھکانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

لیکن کچھ ہی دیر بعد اس نے دم توڑ دیا۔ جیدے نے ملک شہاب کا مال تو بچا لیا مگر اپنی جان دے دی۔ اور ملک نے کیا صلہ دیا۔ اس کے بیوی بچوں کو صرف دس ہزار روپے۔ یہ تو ظلم ہوا نا باؤ..... دس ہزار روپے کب تک ان کا ساتھ دیں گے؟ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو مہینے کے بعد وہ بیچارے کیا کریں گے؟ بھیک ہی مانگیں گے نا۔“

”ہاں..... یہ تو واقعی ظلم ہے۔“ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”اس کے بیوی بچوں کو کم سے کم پانچ لاکھ تو دینے چاہئیں تھے۔“

”پانچ لاکھ۔“ بھجے کے لہجے میں طعنت تھی۔ ”یہ جو دولت والے ہوتے ہیں نا انہیں بڑی ہوس ہوتی ہے۔ ان کی حرص کبھی کم نہیں ہوتی۔ دس ہزار روپے دیتے ہوئے بھی ملک کی جان نکل گئی ہوگی۔ مجھے تو کمالے کے بیوی بچوں پر بھی بڑا ترس آتا ہے۔“

”کمالہ کون ہے..... اسے کیا ہوا؟“ میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔ حالانکہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کمالہ ملک شہاب کا کارندہ ہے اور آج کل ایک پولیس والے کو قتل کرنے کے الزام میں لمبی سزا بھگت رہا ہے۔

”کمالے نے بھی ملک کا مال بچانے کے لئے ایک پولیس والے کو قتل کر دیا تھا۔“ بھجھا کہہ رہا تھا۔ ”ملک کو چاہئے تھا کہ اس کے مقدمہ کی پیروی کے لئے کسی ایسے وکیل کا بندوبست کرتا۔ اس کے بیوی بچوں کو خرچہ دیتا۔ مگر اس نے تو صاف کہہ دیا کہ وہ کمالے کو جانتا تک نہیں۔ کمالے کو تو لمبی سزا ہو گئی۔ اس کے بیوی بچے خوار ہو رہے ہیں۔ بیوی لوگوں کے گھروں میں جھاڑو برتن کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہی ہے۔ ملک کو ان پر ذرا بھی ترس نہیں آتا۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”دولت والوں کی ہوس واقعی ختم

بولاً۔ ”میں جانتا تھا کہ ملک شہاب نے ایک موقع پر اپنے غنڈوں سے بھرے بازار میں تمہاری پٹائی کرانی تھی اور تمہیں ذلیل کیا تھا۔ لیکن آج تمہیں ملک کی کونٹھی میں دیک کر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔ اور اب ساری باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تمہیں کسی چکر میں پھنسانے کی کوشش کی جارہی ہے۔“

میں اب بھی بچے کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ”بچے!“ بالآخر میں نے وہ بات کہہ دی جو بہت دیر سے میرے ذہن میں کلبلا رہی تھی۔ ”کیا تمہیں واقعی مجھ سے ہمدردی ہے یا ملک شہاب کے آدمی بن کر میرے ساتھ آئے ہوتا کہ مجھے چکر میں لا کر میرے دل کی بات جان سکوں؟“

”رونی باؤ!“ بھجا کراہ اٹھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار ابھر آئے۔ ”یہ تم نے کیا کہہ دیا رونی باؤ۔ کاش میں تمہیں اپنا دل چیر کر دکھا سکتا تو تم مجھے اتنی بڑی گالی نہ دیتے۔“ میں چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ اعزاز تو میں پہلے ہی لگا چکا تھا کہ اس نے اب تک جو کچھ بھی کہا تھا اس میں جھوٹ کا ایک لفظ بھی شامل نہیں تھا اور اب اس کے چہرے کے تاثرات اس کی سچائی کی عکاسی کر رہے تھے۔

”میری بات سے تمہیں دکھ پہنچا، مجھے اس کا افسوس ہے۔ لیکن اب میں نے پروگرام بدل دیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا.....؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”تم مجھے یہ معلوم کر کے بتاؤ کہ ملک شہاب کا مال کل کس وقت پہنچ رہا ہے؟ اگر ٹرک کا نمبر بھی معلوم ہو جائے تو بہتر ہے۔“ میں نے کہا۔

”ٹرک کل صبح کسی وقت پشاور سے روانہ ہوگا۔ نمبر اس کی روانگی کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔ کل دوپہر کے وقت تمہیں ٹرک کا نمبر بتا دوں گا۔ لیکن تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟“ بچے نے کہا۔

”ابھی کچھ واضح نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کل دوپہر بارہ اور ایک بجے کے درمیان میں اجھرہ میں فوج کے ہوٹل میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اس وقت ساری تفصیل بتا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کل بارہ اور ایک بجے کے درمیان پہنچ جاؤں گا۔“ بھجا کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ بچے نے ہوٹل کے ملازم لڑکے کو آواز دے کر خالی کپ

”ہاں، تو تم کیا کہہ رہے تھے؟“ میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مال کراچی بھجوانے کے لئے تمہارا انتخاب کر کے ملک نے واقعی بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم اپنی بے عزتی نہیں بھولے تو یہ ملک سے انتقام لینے کا بہترین موقع ہے۔“

”کھل کر بات کرو۔“ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

”ملک شہاب جیسے لوگ کسی کے نہیں ہوتے۔ انہیں صرف دولت سے پیار ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ انہیں اگر کوئی زندگی پیاری ہوتی ہے تو صرف اپنی۔“ بھجا کہہ رہا تھا۔ ”جیدے اور کمالے کی مثالیں تمہارے سامنے ہیں۔ ان دونوں نے اس کے لئے اپنی زندگیاں برباد کر دیں مگر ان کے بیوی بچے درود کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ میں ملک شہاب کے چند قابل اعتماد آدمیوں میں سے ہوں۔ لیکن یقین ہے کہ اگر مجھ پر کوئی برا وقت آگیا تو یہ شخص مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دے گا۔“

”پھر تم اس کے پاس سے کام چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ میں نے کہا۔

”کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں جیسے ہی اس سے الگ ہوں گا یہ مجھے مرادے گا۔“ بچے نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”ملک شہاب بہت چالاک آدمی ہے۔ میں نے غلط کہا تھا کہ اس نے تمہارا انتخاب کر کے حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جب تم کراچی سے واپس آؤ گے تو وہ کمیشن کی رقم پلیٹ میں سجا کر تمہاری خدمت میں پیش کرے گا؟“

”میں ایسا بیوقوف تو نہیں کہ اس کی بات پر یقین کر لوں۔“ میں نے بھی کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ”مجھے اس کی بالکل توقع نہیں۔ میں بھی ایک منصوبہ بنا رہا ہوں۔“

”مجھے شبہ ہے کہ تمہیں کسی سازش میں پھنسانے کی کوشش کی جارہی ہے۔“ بچے نے کہا۔ لیکن وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکا۔

”بچے!“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”کئی ماہ پہلے میں نے تمہیں غنڈوں سے بچایا تھا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ لیکن تم نے اسے بہت بڑا احسان سمجھا اور اب تک مجھ سے محبت سے پیش آتے رہے۔ لیکن.....“

”وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی رونی باؤ!“ بچے نے میری بات کاٹ دی۔ ”اگر تم اس وقت نہ پہنچ جاتے تو وہ لوگ مجھے مار ڈالتے۔ میری اس کے بعد کی زندگی تمہاری احسان مند ہے۔ میری زندگی کا ایک ایک پل تمہارا دیا ہوا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے

تھے۔ مگر فیتا اس قسم کی صورتحال سے نمٹنا اچھی طرح جانتا تھا۔ کسی جھگڑے نے یہاں کبھی سنگین نوعیت اختیار نہیں کی تھی۔

میں دوپہر کو ٹھیک بارہ بجے یہاں پہنچ گیا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد احساس ہوا کہ مجھے کو یہاں بلا کر میں نے غلطی کی تھی۔ اسے کسی ہسکون جگہ پر بلانا چاہئے تھا۔ بہر حال یہ غلطی مجھ سے ہو گئی تھی۔ اس وقت فیتا کاؤنٹر پر موجود تھا۔ اس سے میری پرانی یادداشت تھی۔ میں کاؤنٹر کے قریب کھڑا اس سے باتیں کرتا رہا اور سوا بارہ بجے مہیجا ہوٹل میں داخل ہوا تو میں اس کے ساتھ ایک بیچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے مجھے کونٹھ کر دیا کہ یہاں کوئی بات نہ کی جائے۔ آس پاس بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

چائے پینے کے بعد ہم وہاں سے نکل گئے اور کچھ دور سڑک پار ایک اور قدرے معیاری ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ یہاں بھی چائے کا آرڈر دینا پڑا۔ بیٹھنے کا کوئی نہ کوئی جواز تو ہونا چاہئے تھا۔

”کچھ معلوم ہوا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے کی طرف دیکھا۔ اس وقت دیگر ہمارے سامنے چائے رکھ کر جا چکا تھا۔

”ٹوک مال کے لرگیا رہ بجے پشاور سے روانہ ہو چکا ہے۔ اس کا نمبر.....“ مہیجا جیب سے ایک کاغذ نکال کر دیکھنے لگا جس پر ٹوک کا نمبر وغیرہ لکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ٹوک کا نمبر بتایا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ بیوی ڈیوٹی بیٹو ٹوک ہے جس پر اسکرپ لدا ہوا ہے۔ ڈرائیور کا نام محبت اللہ خان ہے۔ وہ پشاور ہی کا رہنے والا ہے۔ لمبی داڑھی اور سر پر اونٹ کی کھال کے رنگ کی چترالی ٹوپی پہنتا ہے۔ یہ ٹوک رات دس بجے کے قریب لاہور پہنچے گا۔“

”اسکرپ۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”کیا یہی ٹوک کراچی جائے گا؟“

”نہیں۔“ مجھے نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ملک شہاب کے ایک گودام میں اسکرپ اتار کر ٹوک کی دوہری دیواروں میں چھپا ہوا مال نکال لیا جائے گا۔ پچاس من ہیروئن ہے جو افغانستان سے لائی گئی ہے۔ یہ آئرن اسکرپ بھی افغانستان ہی سے آیا ہے۔ وہاں پورے ملک میں روسیوں کے تباہ شدہ ٹینک، توپیں اور اسی قسم کی چیزیں بکھری ہوئی ہیں جنہیں عام افغان باشندے توڑ پھوڑ کر اسکرپ کی صورت میں جمع کر لیتے ہیں اور پھر پاکستانی تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ مال کو سرحد پار پہنچانے کی ذمہ داری بھی افغانیوں ہی کی ہوتی ہے۔ آئرن اسکرپ کے ساتھ ہیروئن کی کھپ بھی آ جاتی ہے۔ اس ٹوک کی دوہری دیواروں میں پچاس من ہیروئن چھپی ہوئی ہے۔ بیس من لاہور ہی میں روک لی جائے گی اور تیس من کراچی روانہ کر دی جائے۔“

اٹھانے کو کہا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر ملک شہاب کی کونٹھی کی طرف چلا گیا۔ میں بھی لان سے نکل کر مخالف سمت میں چل پڑا۔ اگلے روز دوپہر سوا بارہ بجے مہیجا میرے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچ گیا۔ اجھرہ میں عمر رفیق عرف فیچے کا ہوٹل مین روڈ پر لا تعداد موٹر ورکشاپوں کے بیچ میں واقع تھا۔ بہت لمبا چوڑا ٹین کی چھت والا شیفڈ تھا جس میں میزیں کرسیاں تو نہیں تھیں البتہ لمبے لمبے بیچ اور اس ٹاپ کے لمبی لمبی لا تعداد میزیں بھیجی ہوئی تھیں۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ایسی جگہوں پر میزوں اور بیچوں کی کیا حالت ہو سکتی ہے۔ دن کے وقت ہوٹل کے گاہکوں کی بڑی تعداد ورکشاپوں میں کام کرنے والوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ میزوں کی رنگت سیاہ پڑ چکی تھی۔ ہر میز پر لا تعداد آڑھی ترچھی لکیریں کھدی ہوئی تھیں۔

ہوٹل کا کچن سامنے والے حصے کی طرف تھا۔ کچن کیا تھا ایک لمبا چوڑا چبوترہ تھا جس پر لا تعداد چولہے بنے ہوئے تھے۔ ہر چولہے پر کوئی نہ کوئی دیگ نظر آ رہا تھا۔ یہاں طرح طرح کے کھانے تیار ہوتے تھے مگر ان کی قیمتیں ورکشاپوں میں کام کرنے والوں کی پہنچ میں ہوتی تھیں۔ دن کے وقت تو یہاں ان ورکشاپوں میں کام کرنے والوں کا رش لگا رہتا تھا لیکن رات کو یہاں کی بات ہی کچھ اور ہوتی تھی۔ اس وقت آس پاس کے تمام ورکشاپ بند ہوتے۔ فیچے کے ہوٹل کینج سامنے سڑک تک بہت کھلی جگہ تھی جہاں صاف ستھری میزیں اور کرسیاں لگا دی جاتیں ہوٹل کے سامنے کا حصہ بھی ٹیوب لائٹس کی نفرتی روشنیوں سے منور ہو جاتا۔ چولہوں والے چبوترے کے دوسری طرف دوسرے چبوترے پر کتے، کباب، بالٹی کڑا ہئی گوشت، ہانڈی اور چرغے وغیرہ کے چولہے اور کباب دان لگ جاتے۔ ان کی اشتہا انگیز خوشبو پورے علاقے میں پھیل جاتی۔

رات کے وقت یہاں گاہکوں کی نوعیت مختلف ہوتی تھی۔ گلبرگ، ماڈن ٹاؤن اور قرب و جوار کی اونچی بستیوں کے لوگ ناؤ نوش کے لئے یہاں کا رخ کرتے۔ چھپاتی ہوئی کاروں کی لمبی لائن لگی ہوتی۔ بڑے گھروں کے لوگ یہاں بیٹھ کر کھانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ یوں تو یہاں ہر عمر کے لوگ آتے تھے مگر زیادہ تعداد ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ہوتی تھی جنہیں مادر پدر آزاد کہا جاتا ہے۔ بڑے گھروں کی لڑکیاں آزادی اور بے باکی سے رات گئے تک اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ گھومتی رہتی تھیں۔ انہیں نہ تو اپنی عزت کا خوف تھا اور نہ ہی اپنے ماں باپ کی رسوائی کا احساس۔ یہ ڈر اور احساس تو ان کے بزرگوں کو بھی نہیں تھا جنہوں نے اپنی جوان لڑکیوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔

ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی وجہ سے یہاں چھوٹے موٹے جھگڑے بھی ہوتے رہتے

گی۔

”ڈرائیور کے علاوہ ٹرک میں اور کتنے آدمی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”دو“، مجھے نے جواب دیا۔ ”وہ بظاہر ٹرک کے کلیئر اور میلر ہیں۔ مگر ان کا تعلق اس گینگ سے ہے جو ہیر وٹن سچ رہا ہے۔ وہ دونوں پرانے، تجربہ کار اور خطرناک آدمی ہیں۔“

”لاہور میں یہ ٹرک کہاں جائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”لہان روڈ پر شاہ نور اسٹوڈیوز سے ذرا آگے ملک شہاب کے ایک گودام میں۔ لیکن.....“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ ٹرک گودام تک نہیں پہنچنا چاہئے رونی باؤ۔ اگر ٹرک گودام میں پہنچ گیا تو چند منٹ کے اندر اندر اس میں چھپا ہوا مال غائب کر دیا جائے گا۔“

”فکر مت کرو مجھے! یہ ٹرک گودام تک نہیں پہنچ سکے گا۔“ میں نے کہا۔

”ایک بات اور.....“ مجھ کا بدستور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کل رات میں نے کہا تھا نا کہ تمہیں کسی جال میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آج میں نے وہ بھی سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔“

”کیا.....؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ملک شہاب اس واقعہ کو بھولا نہیں ہے کہ چند مہینے پہلے تم نے اس کے ایک آدمی سے دو گرام ہیر وٹن چھین کر نالی میں پھینک دی تھی اور اس نے سزا دینے کے لئے بھرے بازار میں تمہاری پٹائی کروادی تھی۔“ مجھ کا کہہ رہا تھا۔ ”اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو اس کے لئے یہ سزا کافی ہوتی اور ملک شہاب بھی مطمئن ہو جاتا کہ اب وہ شخص دوبارہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ لیکن.....“ تم تھے۔ تمہارے بارے میں اب وہ اچھی طرح جان چکا ہے کہ اندر ورلڈ میں تمہارا بھی ایک نام ہے۔ وہ یہ بھی جان چکا ہے کہ تم ہر جرم کا ارتکاب کر سکتے ہو لیکن ہیر وٹن کے دھندے سے تمہیں شدید نفرت ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ تم ہیر وٹن کے چھوٹے موٹے بیوپاریوں کی سرکوبی کرتے رہتے ہو اور بعض نسبتاً بڑے بیوپاریوں کو بھی دھمکیاں دیتے رہتے ہو۔ تقریباً ایک مہینہ پہلے ملک شہاب کی کوٹھی میں ایک میننگ ہوئی تھی جس میں لاہور سے تعلق رکھنے والے تمام بڑے بیوپاریوں نے شرکت کی تھی۔ دو آدمی ایسے بھی تھے جن کا تعلق علاقہ غیر سے تھا۔ وہ بڑی تعداد میں یہاں کے بیوپاریوں کو ہیر وٹن سپلائی کرتے ہیں۔ ان سب لوگوں نے تمہیں اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ اور دشمن نمبر ایک قرار دیا ہے۔ اور یہ سازش تمہیں راستے سے ہٹانے کے لئے ہی تیار کی گئی ہے۔“

”اور سازش کیا ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں جس ٹرک پر کراچی بھیجا جائے گا اس میں آئرن اسکرپ لدا ہوگا اور اس میں صرف دو کلو ہیر وٹن اس طرح چھپائی جائے گی کہ تلاشی لینے پر آسانی سے مل جائے۔“ مجھے نے کہا۔ ”پنجاب کی حدود میں تمہارے ٹرک کو نہیں روکا جائے گا مگر سندھ میں کسی جگہ ٹرک کو پکڑ لیا جائے گا اور تلاشی کے دوران ہیر وٹن برآمد کر لی جائے گی۔ ٹرک میں ڈرائیور کے علاوہ صرف تم ہو گے۔ ان کے منصوبے کے مطابق ٹرک اور ڈرائیور کو تو چھوڑ دیا جائے گا مگر تمہیں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جائے گا۔ یہ واقعہ کسی ایسے چھوٹے علاقے میں پیش آئے گا جہاں تم اپنے بچاؤ کے لئے کسی سے رابطہ نہیں کر سکو گے۔ چھوٹے علاقوں کے پولیس والوں کو تم نہیں جانتے۔ وہ اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتے ہیں اور سندھ پولیس کی تو بات ہی الگ ہے۔ وہاں تمہارا خواہ وہ سب انسپکٹر ہو یا انسپکٹر، صوبیدار کہلاتا ہے۔ اور وہ واقعی اپنے آپ کو صوبے کا حکمران سمجھتا ہے۔ بعض علاقوں میں تو اے ایس آئی اور کہیں تو ہیڈ کا کاشیل بھی تھا نہ انچارج اور صوبیدار ہوتے ہیں۔ تمہیں بھی کسی ایسے ہی علاقے میں پھنسانے کا پروگرام بنایا گیا ہے جہاں کا صوبیدار ہیڈ کا کاشیل یا زیادہ سے زیادہ اے ایس آئی ہو۔ ایسے پولیس آفیسر کے لئے ڈیڑھ دو لاکھ کی رقم بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ تمہیں اس طرح غائب کر دیا جائے گا کہ تمہارا سراغ تک نہیں ملے گا اور یہ ثابت کرنا بھی مشکل ہو جائے گا کہ اس دنیا میں تمہارا کہیں کوئی وجود بھی تھا۔“

مجھے کی باتیں سن کر میرے روتے کھڑے ہو گئے۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ کل رات ملک شہاب کی کوٹھی سے نکلنے ہوئے مجھے سے میری ملاقات ہو گئی تھی اور میں ملک شہاب کی اس گھناؤنی سازش سے آگاہ ہو گیا تھا۔ میں مجھے کا بے حد احسان مند تھا کہ اس نے ہر وقت مجھے اس گھناؤنی سازش سے آگاہ کر دیا تھا۔ ایک موقع پر میں نے مجھے کی جان بچائی تھی۔ وہ احسان فراموش نہیں تھا۔ اس نے مجھے اس سازش سے آگاہ کر کے احسان کا بدلہ چکا دیا تھا۔ مجھے ملک شہاب کے منصوبے سے آگاہ کر کے وہ ملک سے غدار کی کار تکب ہوا تھا۔ میں ملک شہاب کو اچھی طرح جانتا تھا۔ جب تک وہ صرف ڈرائی فروٹس کا بیوپاری تھا، شریف آدمی تھا۔ مگر ہیر وٹن کے برٹس میں ہاتھ ڈالنے ہی اس کی ساری شرافت رخصت ہو گئی تھی۔ اب وہ ڈرائی فروٹس کا نہیں، دولت کا بیوپاری تھا۔ اور دولت کا بیوپار کرنے والوں کے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں عرصہ سے جرائم کی دنیا میں تھا۔ ایک فرد کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا تھا۔ کرائے کے کسی قاتل کے دل میں کسی کے لئے رحم کا جذبہ سر ابھار سکتا تھا مگر ہیر وٹن کے سوداگر، درندوں سے زیادہ خونخوار ہوتے ہیں۔ اور ملک شہاب بھی انہی میں سے ایک تھا۔

راہداری میں آکر چلنے لگا اور بالآخر اس کمرے میں داخل ہو گیا جس کے دروازے پر عابد رحمان ایڈوکیٹ کے نام کی پلٹ لگی ہوئی تھی۔ عابد رحمان زیادہ تر ہائی کورٹ کے کیسز لیتے تھے۔ چند سال پہلے میرے ایک کیس کی پیروی بھی کر چکے تھے۔ اس زمانے میں، میں اتنا بدنام نہیں تھا۔ عابد رحمان نے چھ مہینوں تک میرا کیس لڑا تھا اور مجھے بری کروا لیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مجھ سے فیس نہیں لی تھی بلکہ مقدمے کے تمام اخراجات بھی خود ہی برداشت کئے تھے۔

اس کے بعد میں کئی مرتبہ عابد رحمان سے مل چکا تھا۔ وہ خود نمازی اور پرہیزگار تھے، مجھے بھی ہر ملاقات پر ایسی ہی تلقین کرتے رہتے تھے۔ عابد رحمان کا تعلق شہر کے ایک بہت بڑے اور معزز خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے کئی لوگ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ ہمیشہ ان کی دیانت داری کی مثالیں دی جاتی تھیں۔

ایس پی سعید، عابد رحمان کا فرسٹ کزن تھا۔ وہ بڑا سخت گیر پولیس آفیسر مشہور تھا۔ اس کی فرض شناسی اور دیانت داری کی اس کے جھگے میں بھی مثالیں دی جاتی تھیں۔

عابد رحمان کے دختر کے ویننگ روم میں کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کانڈ کی ایک سِلپ پر اپنا نام لکھ کر اس کے سیکرٹری کے حوالے کر دیا۔

”انتظار کرنا پڑے گا۔“ سیکرٹری نے کہا۔ ”دیکھ رہے ہو کتنے لوگ بیٹھے ہیں۔ یہ سب فوری طور پر رحمان صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ اور پھر میرا خیال ہے رحمان صاحب اب تم سے ملنا پسند بھی نہیں کریں گے۔“ ادویہ عمر سیکرٹری میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔

”ایمر جنسی ہے سرجی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ میری سِلپ ان تک نہیں پہنچانا چاہتے تو میں دروازہ کھول کر اندر چلا جاؤں گا۔“

سیکرٹری نے گھور کر میری طرف دیکھا اور پھر میری سِلپ لے کر اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”صاحب کلائنٹ سے فارغ ہو جائیں تو پھر تمہیں بلائے ہیں۔“

میں کونے میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وقت گزرتا رہا اور میری بے چینی بڑھتی رہی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد چوہدری ٹائپ کا ایک آدمی رحمان صاحب کے دفتر سے باہر نکلا۔ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا اسی قسم کا ایک آدمی اندر جانے کے لئے پرتول رہا تھا لیکن میں اس سے پہلے ہی اٹھ کر اندر گھس گیا۔ عابد رحمان کے ساتھ ان کا ایک اسٹنٹ بھی بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے اب پہچنے کی فکر ہو رہی تھی۔ ملک شہاب کو اگر شبہ بھی ہو گیا کہ پہچنے نے مجھے اس کے بارے میں کچھ بتایا ہے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں نے یہی بات پہچنے سے کہی تو اس کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

”رونی باؤ!“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرا دل بہت برا ہو گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں تاکہ دنیا بھی نہ لی اور عاقبت بھی گئی۔ مجھے دنیا میں بھی کچھ نہیں ملا اور جرم و گناہ کی اس دلدل میں پھنس کر اپنی عاقبت بھی بگاڑ لی۔ اللہ میاں ہم جیسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہو کر میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”ملک شہاب کے لئے میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن دوسروں کا انجام دیکھ چکا ہوں۔ مجھے اپنے لئے بھی اس سے کسی صلے کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اگر اسے چھوڑنے کی کوشش کروں تو وہ مجھے مروا دے گا۔ اور کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ کچھ کر کے ہی مر جائے۔ میں جانتا ہوں اسے پتہ چل جائے گا کہ تمہیں یہ سب کچھ میں نے بتایا تھا۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کہیں اور چلے جاؤ؟“ میں نے کہا۔

”میں بزدل نہیں ہوں رونی باؤ!“ پہچنے نے کہا۔ ”بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ مجھے تلاش کر لے گا۔ اور اگر تلاش نہ بھی کر پایا تو میں باقی زندگی خوف کے سائے میں نہیں گزارنا چاہتا۔“

”ٹھیک ہے پہچنے!“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اور میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہئے۔ مجھے اس ٹرک کا بھی بندوبست کرنا ہے۔“ میں نے اس کا دیا ہوا کانڈ تھہ کر کے احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔

مجھجا وہیں بیٹھا رہا اور میں اس سے ہاتھ ملا کر باہر آ گیا۔ اس وقت میں بجتنے والے تھے۔ دھوپ میں چمک اور تپش تھی۔ میں چند لمعے رکا، کچھ دور تک پیدل چلتا رہا اور پھر ایک رکشہ میں بیٹھ گیا۔

میں پرانی انارکلی میں جس عمارت کے سامنے رکشے سے اترا اس میں وکیلوں کے دفاتر تھے۔ ہائی کورٹ یہاں سے قریب ہی تھا۔ دوسری طرف کچہری بھی زیادہ دور نہیں تھی اس لئے اس علاقے کی زیادہ تر عمارتوں میں وکلاء کے دفاتر تھے۔ میں جس عمارت میں داخل ہوا اس میں ایک معمولی پلیڈر سے لے کر سپریم کورٹ تک کے ماہرین قانون نے اپنے دفاتر بنا رکھے تھے۔ شدید گرمی میں تیسری منزل تک سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ سانس پھولنے لگی۔ میں راہداری میں رک گیا۔ چند منٹ سانس پر قابو پانے کے بعد میں

ہوئے سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ عابد رحمان نے سب سے معذرت کی اور اپنے اسٹنٹ اور سیکرٹری کو کچھ ہدایات دے کر باہر نکل آئے۔

ہم دفتر والی عمارت سے نکل کر تقریباً سو گز دور ایک معیاری قسم کے ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ باہر شدید گرمی تھی لیکن ریسٹورنٹ ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی خشکی کا احساس ہوا تھا۔

یہ مہنگا ریسٹورنٹ تھا۔ یہاں گئے چنے لوگ ہی آتے تھے۔ اس وقت گاہکوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ہم ذرا آگے جا کر ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ایس پی کا دفتر بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ چند منٹ میں ہی ایس پی سعید اندر داخل ہوا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔

ایس پی سعید کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ دراز قامت اور بہت اسماٹ آدمی تھا۔ پولیس کی وردی میں تو وہ شاندار لگتا ہی تھا، سادہ لباس میں بھی اس کی شخصیت بڑی پُر وقار تھی۔ دروازے میں داخل ہو کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور سیدھا ہماری طرف آ گیا۔ عابد رحمان صاحب عمر میں اس سے بڑے تھے۔ وہ تو اپنی کرسی پر بیٹھے رہے البتہ میں نے اٹھ کر سلام کیا۔ ”تو تم ہو روٹی“ سعید مجھ سے ہاتھ ملا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”خوش قسمت ہو جواب تک بچے ہوئے ہو۔ لیکن جس دن تمہارے خلاف کوئی ثبوت مل گیا وہ تمہاری آزادی کا آخری دن ہو گا۔ بہر حال، بتاؤ کیا قصہ ہے؟“

مجھے ایک بار پھر شروع سے سب کچھ بتانا پڑا۔ وہ بڑی توجہ سے میری باتیں سن رہا تھا۔ آخر میں، میں نے کہا۔ ”یہ اطلاع بالکل درست ہے سرجی۔ میں چھاپے کے وقت آپ کے ساتھ رہوں گا۔ اگر یہ اطلاع غلط ثابت ہو تو آپ مجھے وہیں پر گولی مار دیجئے۔“

”تمہیں ساتھ لینے کی ضرورت نہیں۔“ ایس پی سعید نے کہا۔ ”اس لئے میں نے تمہیں اپنے دفتر میں نہیں بلوایا۔ میں جانتا ہوں میرے آفس میں بھی کچھ کالی بیٹھریں موجود ہیں جو تمہیں وہاں دیکھ کر کچھ شبہ کر سکتے ہیں۔“ وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر مختلف نوعیت کے سوالات کرتا رہا۔ میں اس کی شخصیت سے پہلے ہی مرعوب ہو چکا تھا۔ سوالات سے کچھ اور گھبرا گیا۔ میں بہر حال سوچ سمجھ کر جواب دیتا رہا۔

”یار! تم لوگ ایسے بدکردار افراد کا محاسبہ کیوں نہیں کرتے؟ معاشرے کو ان کے گندے وجود سے پاک کیوں نہیں کرتے؟“ ہمارے خاموش ہونے پر عابد رحمان نے کہا۔ ”ملک شہاب تو بہت بدنام آدمی ہے۔ ایسے لوگوں کو تو ایک دن بھی آزاد نہیں رہنا چاہئے۔“

”بس بھائی صاحب!“ ایس پی سعید نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہی ہمارا المیہ ہے

”کوئی نئی مصیبت؟“ عابد رحمان نے مجھے گھورا۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ جو کہنا ہے جلدی کہو۔“

”میں تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں سرجی۔“ میں نے کہا۔ ”معاملہ بہت سیریس ہے۔ اور یہ میرا کوئی ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔“

عابد رحمان چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر اپنے ماتحت کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا تو میں نے پہلے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا اور پھر میز کے قریب کھڑے ہو کر اسے سب کچھ تفصیل سے بتانے لگا۔ وہ میری باتیں غور سے سن رہا تھا۔

”معاملہ تو واقعی بہت سیریس ہے۔ لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟“ اس نے میرے خاموش ہونے پر کہا۔

”آپ ایس پی صاحب سے ملاقات کر ادیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پولیس کے محکمہ میں سعید صاحب وہ شخص ہیں جن پر میں بھروسہ کر سکتا ہوں۔ وہ کارروائی کر سکتے ہیں۔“

”اگر یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی تو جانے ہو کیا ہو گا؟“ عابد رحمان نے مجھے گھورا۔

”میں اپنے آپ کو اس وقت تک کے لئے پولیس کی تحویل میں دینے کو تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اطلاع بالکل درست ہے۔ اگر میری یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی تو پولیس میرے خلاف کارروائی کر سکتی ہے۔“

”تم پولیس کے سامنے گئے تو وہ لوگ ویسے ہی تمہیں دھریس گے۔“ عابد رحمان نے کہا۔ ”سرجی! میں بعض سنگین جرائم میں ملوث ضرور رہا ہوں لیکن پولیس کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ پولیس والے کئی مرتبہ مجھے پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کر چکے ہیں لیکن ہر مرتبہ انہیں چند گھنٹوں بعد ہی مجھے چھوڑنا پڑا۔ اگر اس اطلاع میں صداقت نہ ہوئی یا مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا تو میں آپ کے پاس کبھی نہ آتا۔“

عابد رحمان چند لمحے میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچتے رہے، پھر فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگے۔ لائن ملنے پر وہ تقریباً پندرہ منٹ تک بات کرتے رہے، پھر ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”پولیس اسٹیشن میں تمہارا جانا درست نہیں۔ سعید نے ہمیں ایک ریسٹورنٹ میں بلایا ہے۔ چلو۔ وہ اپنے دفتر سے نکل رہا ہو گا۔“

میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازے کا بولٹ گرا کر دروازہ کھول دیا۔ پہلے عابد رحمان کو باہر نکلنے کا موقع دیا پھر خود باہر نکل کر دروازہ بھیڑ دیا۔ عابد رحمان کو دیکھ کر ویننگ روم میں بیٹھے

میں خفیہ اطلاع ملی تھی جس پر میں نے ٹرک کو روک کر تلاشی لی تو اس کے خفیہ خانوں سے بڑی مقدار میں ہیروئن برآمد ہوئی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”راوی کے پل سے اوتھار کا علاقہ میرے ہی دائرہ میں ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ ٹرک ملتان روڈ پر شاہ نور اسٹوڈیوز کے آس پاس کسی جگہ جائے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ راوی کے پل سے اترتے ہی وہ بند روڈ کی طرف مڑے گا۔ وہاں سے یتیم خانہ چوک سے ملتان روڈ پر ایورنڈو اسٹوڈیوز کی طرف مڑے گا۔“

”جی سرجی! روٹ تو یہی بنتا ہے۔ لیکن وہ راستے میں کسی اور طرف نہ نکل جائے۔“ میں نے خدشے کا اظہار کیا۔

”مطمئن رہو۔ اسے کسی اور طرف جانے ہی نہیں دیا جائے گا۔“ سعید نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ اطلاع درست ثابت ہوئی تو شاید تمہاری بہتری کا بھی کوئی راستہ نکل آئے گا۔ اور اگر اطلاع غلط نکلی تو تمہارا آخری ٹھکانہ جیل ہی میں ہوگا۔“

”جی سرجی!“ میں نے سر ہلایا۔ میں نے وہ کاغذ بھی ایسی پی سعید کے حوالے کر دیا تھا جس پر ٹرک کا نمبر اور ڈرائیور کا نام لکھا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں چلے گئے۔ میں ان کے جانے کے بعد بھی چند منٹ تک رہنموتز میں بیٹھا رہا۔ عابد رحمان نے جاتے ہوئے بل ادا کر دیا تھا اس لئے میں کاؤنٹر پر رکے بغیر باہر آ گیا۔

اس وقت ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں پرانی انارکلی سے نکل کر مال روڈ پر چلتا ہوا میکڈونلڈز پر آ گیا جہاں اسٹیشن کی طرف جانے والے ایک تانگے پر جگہ مل گئی۔

لکشمی چوک پر میں تانگے سے اتر گیا۔ یہاں خاصی رونق تھی۔ چہل پہل میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس تاریخی لکشمی چوک کے چاروں طرف عمارتوں میں فلم کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ ایبٹ روڈ کے دونوں طرف لاتعداد سینما ہاؤسز تھے۔ لکشمی چوک پر رات گئے تک رونق رہتی تھی۔ فلموں میں ایکٹرز کا رول کرنے والے چھوٹے بڑے اداکار یہاں گھومتے رہتے تھے۔

میں سڑک پار کر کے بیڈن روڈ پر آ گیا۔ یہ تنگ سی پُرہجوم سڑک آگے جا کر مال روڈ سے مل جاتی تھی۔ لیکن تقریباً ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد میں ایک تنگ سی گلی میں مڑ گیا اور پانچویں مکان کے سامنے رک گیا۔

اس وقت شام ہو چکی تھی۔ گلی میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ میں نے مکان کے دروازے پر ہلکی کا دنگ دی تو ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ ایک دُپلا پتلا سا ادھیر عمر آدمی تھا جس نے کھد کی مٹکی سے دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اوپر پیلی سی بنیان تھی۔ وہ چاچا خیر دین تھا۔

کہ بعض لوگوں کے خلاف سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہمیں ان کی طرف سے آنکھیں بند کرنی پڑتی ہیں۔ کوئی ذمے دار اور فرض شناس پولیس آفیسر ایسے لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنا بھی چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اوپر سے ایسے احکامات آ جاتے ہیں کہ خون کھول اٹھتا ہے۔ ملک شہاب محض ہیروئن کا اسمگلر نہیں۔ یہ بہت اونچی شے ہے۔ اس کے تعلقات براہ راست اسلام آباد سے ہیں۔ کوئی پولیس آفیسر اس کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرے گا تو بہت اوپر سے ایسے آرڈر آ جائیں گے کہ یا تو اس پولیس آفیسر کو معطل کر دیا جائے گا یا کسی دور دراز علاقے میں اس کا تبادلہ کر دیا جائے گا۔“

”یاد آیا سرجی!“ میں نے سعید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کل رات بھی اسلام آباد کا ایک بہت بڑا آفیسر ملک شہاب کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور ان کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ بھی اس منصوبے میں شریک ہے۔“

”کون ہے وہ..... اس کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟“ ایس پی شہاب نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”نام سلطان ہے۔ کسی وزارت میں ڈپٹی سیکرٹری ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ۔“ سعید چوک گیا۔ پھر عابد رحمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ حضرت جن کے بارے میں یہ بتا رہا ہے، وزارت داخلہ کا ڈپٹی سیکرٹری ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ صرف وہی نہیں، اس سے اوپر کے کچھ لوگ بھی اس میں شریک ہوں گے۔ میں اپنے بعض اعلیٰ افسروں کو بھی جانتا ہوں جو ملک شہاب کے نمک خوار ہیں۔ انہیں ملک کی سلامتی اور قومی مفادات سے زیادہ ملک شہاب کے مفادات عزیز ہیں۔ ملک شہاب پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے بہت اوپر سے اجازت لینی پڑے گی۔ جو کبھی نہیں ملے گی۔“

”مگر سرجی!“ میں نے کہا۔ ”آپ ملک شہاب کی کوشی پر تو چھاپہ نہیں مار رہے۔ آپ کو تو پشاور سے آنے والے ایک مشتبہ ٹرک کے بارے میں اطلاع ملی ہے۔ چیکنگ کے لئے تو آپ کسی بھی ٹرک یا گاڑی کو روک سکتے ہیں۔“

”ہاں..... یہ بات تو میں بھی سمجھتا ہوں مگر.....“

”مگر شاید میں نے آپ کے پاس آکر غلطی کی ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی جس کا مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا۔

ایس پی سعید نے چوک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

”نہیں، تم نے غلطی نہیں کی۔“ وہ بولا۔ ”یہ بھی تم نے ٹھیک کہا ہے کہ مجھے کسی ٹرک کے بارے

شہر کے بڑے بڑے لوگ خیر دین سے کام لیا کرتے تھے۔ سیاستدانوں کے لئے وہ ایک بہت اہم آدمی تھا۔ مخالف پارٹی کا جلسہ درہم برہم کرنا ہو، کہیں کوئی گڑبڑ کرنی ہو، دنگا فساد کرانا ہو، کسی کو اغواء کرانا ہو تو خیر دین کی خدمات حاصل کی جاتیں مگر خیر دین تائب ہوا تو اس طرح کہ بالکل ہی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مختلف کاموں کے لئے بڑی بڑی آفرز ہوئیں مگر وہ صاف انکار کرتا رہا۔

خیر دین کا باپ موچی تھا۔ اس نے بھی یہ کام سیکھا تھا۔ بد معاشی چھوڑی تو اس گلی کے موڑ پر ٹھیلانگا کرتے گانفنے کا کام شروع کر دیا۔ لوگ اس میں بھی خیر دین کی کوئی چال سمجھتے تھے۔ پولیس کئی مرتبہ اسے اٹھا کر لے گئی تھی۔ مگر ایک مرتبہ تائب ہونے کے بعد پھر خیر دین کے خون میں ابال نہیں آیا۔

خیر دین کی عمر ڈھلنے لگی۔ کئی سال گزر گئے۔ اب لوگوں کو بھی یقین آ گیا تھا کہ اس میں کوئی چال نہیں تھی۔ وہ واقعی بد معاشی چھوڑ چکا تھا۔ اب وہ خیر و بد معاش نہیں، چاچا خیر دین تھا۔ پولیس نے بھی اب اس کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

چاچا خیر دین سے میری پہلی ملاقات دو سال پہلے اس وقت ہوئی تھی جب میں نے یہ مکان کرائے پر لیا تھا اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ میں اکثر اس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ میں اپنے آپ کو اس دلدل سے نکال لوں۔

ایک روز مجھے پتہ چلا کہ چاچا خیر دین کا کوئی گھر نہیں تھا۔ وہ دن بھر اپنے اس ٹھیلے پر بیٹھا رہتا اور رات بیڈن روڈ کے پیچھے ایک چھوٹے سے مزار پر گزارتا۔ میں نے چاچا خیر دین کو اپنے مکان میں رہنے کی پیشکش کی تو وہ فوراً ہی مان گیا اور اب وہ تقریباً دو سال سے میرے پاس تھا۔ اس علاقے کے لوگ مجھے بہت شریف آدمی سمجھتے تھے اور میں واقعی یہاں بہت شرافت کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس تنگ سی گلی میں بیس بائیس مکان تھے اور میری ملاقات تو یہاں رہنے والوں سے بہت کم ہوتی تھی۔ ویسے بھی میں یہاں کم ہی رہتا تھا۔ چاچا خیر دین نے بھی کسی کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

”آج میرا ایک کام کرنا ہے چاچا!“ میں نے چائے کا کپ خالی کر کے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

”کھم کر پتر!“

”تم جانتے ہو ملک شہاب ہیر دین کا بہت بڑا اسمگلر ہے اور آج پشاور کی طرف سے اس کے

یہ مکان بھی میرے ان چند اڈوں میں سے ایک تھا جن کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے تھے۔ چاچا خیر دین اس مکان کی دیکھ بھال کے لئے یہاں رہتا تھا۔ وہ موچی تھا جو گلی کے موڑ پر اپنا ٹھیلانگا بیٹھا رہتا تھا اور شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے اپنی دکان سمیٹ کر مکان میں آ جایا کرتا تھا۔ میں پچھلے تین دنوں سے اس مکان میں مقیم تھا۔

”آپتر! میں ابھی دکان بند کر کے آیا ہوں۔ اندر بیٹھ جا۔ میں تیرے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں۔“ چاچا خیر دین کہتا ہوا باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔

اس مکان میں صرف تین کمرے تھے۔ ایک داخلی دروازے کے ساتھ جو بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ آگے مختصر سامن تھا جس کے ایک طرف غسل خانہ اور باورچی خانہ تھا۔ دوسری طرف اوپر جانے کے لئے تنگ سی سیڑھیاں اور سامنے دو کمرے تھے جن میں ایک چاچا خیر دین کے استعمال میں تھا اور دوسرا میرے استعمال میں۔

میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا پھر بتی جلائی اور پنکھا کھول کر چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ دن بھر کی اس بھاگ دوڑ میں، میں بری طرح تھک گیا تھا اور کچھ دیر آرام کر لیتا چاہتا تھا۔ کیونکہ آدھی رات کے بعد مجھے پھر ملک شہاب کی کوشی پر جانا تھا۔ لیکن اس سے پہلے جو کچھ ہونے والا تھا میں اس سے بھی باخبر رہتا چاہتا تھا۔

لیئے لیئے میری آنکھ لگ گئی تھی مگر چاچا خیر دین کی آواز سن کر میں اٹھ گیا۔ اس نے چائے کا کپ چارپائی کے قریب تپائی پر رکھ دیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں مٹی کا روٹنی پیالہ تھا جو چائے سے لبا لب تھا۔ وہ ہمیشہ پیالے ہی میں چائے پیا کرتا تھا۔

آج میں نے دن میں کئی مرتبہ چائے پی تھی مگر چاچا خیر دین کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چائے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ میں چارپائی پر پیر لٹکا کر بیٹھ گیا اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے چاچا خیر دین کی طرف دیکھنے لگا جو کرسی کی بجائے دری پر بیٹھا ہوا چائے سڑک رہا تھا۔

چاچا خیر دین اپنے زمانے کا بہت بڑا بد معاش ہوا کرتا تھا۔ لوگ اس کے نام سے ہی تھر تھر کانپتے تھے۔ وہ جس طرف سے گزرتا لوگوں کو سانپ سونگھ جاتا۔ بڑا بھکا تھا اس کے نام کا۔ لیکن پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ چاچا خیر دین تائب ہو گیا۔ اس نے بد معاشی چھوڑ دی اور شرافت کی زندگی گزارنے لگا۔ مگر پولیس ایسے لوگوں کو عزت اور شرافت کی زندگی کب گزارنے دیتی ہے۔ خیر دین کو بھی طرح طرح سے پریشان کیا جانے لگا۔ علاقے میں کہیں بھی کوئی گڑبڑ ہوتی، خیر دین کو پکڑ لیا جاتا۔ خیر دین پولیس کے ہاتھوں گدھوں کی طرح پٹتا لیکن اس نے کبھی کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔

ملکیت تھا جسے ملتان روڈ پر ملک شہاب کے ایک گودام میں لے جانا تھا۔ ڈرائیور نے ٹرک میں ہیر وئن کی موجودگی سے لاعلمی اور لائقیت کا اظہار کیا تھا۔

میں دل ہی دل میں جھوم اٹھا۔ ایس پی سعید نے بالآخر کام کر دکھایا تھا۔ گوکہ ملک شہاب پر براہ راست ہاتھ ڈالنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا مگر پولیس نے ٹرک پر چھاپہ مار کر اس کی کمر توڑ دی تھی۔ سچاس کلو ہیر وئن، عالمی منڈی میں جس کی قیمت اربوں روپے بنتی تھی۔ ایس پی سعید نے یہ عقلمندی بھی کی تھی کہ ٹرک پر چھاپے کے وقت اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں کی پارٹی کو بھی ساتھ رکھا تھا۔ چاچا خیر دین کے کہنے کے مطابق تصویریں کھینچنے کے علاوہ ویڈیو فلم بھی بنائی گئی تھی۔

چند منٹ بعد ہی میں تیار ہو کر گھر سے نکل گیا۔ اس وقت بیڈن روڈ پر سناٹا تھا۔ میں لکشی چوک کی طرف نکل گیا۔ وہاں اس وقت بھی روشنی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے رکشل گیا۔ جب میں گلبرگ میں رکشہ سے اترا تو ڈیڑھ بجنے والا تھا۔ ملک شہاب کی کوشی کے سامنے دو تین گاڑیاں تو کھڑی تھیں مگر کوئی آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حالانکہ عام طور پر رات بھر کوشی کے سامنے والے لان میں بھی دو چار آدمی بیٹھے رہتے تھے۔

کوشی کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور لان میں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں اٹھ کر میرے قریب آ گئے۔ میں نے گہری نظروں سے باری باری ان کی طرف دیکھا۔ ان کے تیور کچھ ایسے نہیں تھے۔ میری چھٹی حس مجھے کسی گڑبڑ کا احساس دلانے لگی۔ ایک لمحہ کو میرے ذہن میں خیال آیا کہ واپس چلا جاؤں مگر اس طرح یہاں تک آ کر لوٹ جانا مجھے ان کی نظروں میں مشتبہ بنا سکتا تھا۔

”ملک جی ہیں تو انہیں بتاؤ کہ روٹی آیا ہے۔“ میں نے نادرتامی شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ اندر چلے جاؤ۔ ملک جی تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“ نادرتامی بجائے دارا نامی دوسرے آدمی نے جواب دیا۔

میں اپنے آپ میں بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ یقیناً کوئی گڑبڑ تھی۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ انہیں ٹرک پکڑے جانے کا پتہ نہ چلا ہو۔ لیکن میرے ذہن میں جو شبہ سر ابھار رہا تھا وہ یہ تھا کہ کہیں ملک کو یہ تو پتہ نہیں چل گیا کہ مخبری میں نے کی تھی۔

میں اندر داخل ہو گیا۔ لاؤنج میں ملک شہاب اور سلطان کے علاوہ شیدا بھی موجود تھا۔ شیدا، نادر اور دارا، ملک شہاب کے ان خاص آدمیوں میں شامل تھے جو سفاکی اور درندگی میں اپنا ثانی

لئے ہیر وئن کی ایک بہت بڑی کھپ آرہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“ خیر دین نے کہا۔ ”مگر ملک شہاب کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا پولیس آفیسر بھی اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اس حمام میں تو سب ہی ننگے ہیں پتر۔ جو خود ننگا ہو، دوسروں کی طرف انگلی کیسے اٹھائے گا؟“

”ابھی تو م کا درد رکھنے والے کچھ لوگ باقی ہیں چاچا!“ میں نے کہا۔ ”میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ ملک شہاب پر تو ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا مگر اس کا مال روکا جاسکتا ہے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں کہا۔ ”تمہیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا کارروائی ہوگی۔ جو کچھ بھی ہوگا راوی کے پل کے آس پاس بند روڈ پر ہی ہوگا۔ تمہیں وہاں جا کر کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔“

”چلا جاؤں گا۔“ چاچا خیر دین نے کہا۔ ”ٹرک کس وقت آئے گا؟“

”میری اطلاع کے مطابق ٹرک دس بجے کے قریب لاہور پہنچے گا اور میرا خیال ہے تم آٹھ بجے یہاں سے چلے جاؤ۔“

اور پھر آٹھ بجے کے قریب چاچا خیر دین چلا گیا۔ اس نے صحن والے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ اگر مجھے باہر جانا ہوتا تو میں بیٹھک والا دروازہ استعمال کر سکتا تھا۔ چاچا خیر دین کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر بستر پر لیٹ کر اونگھنے لگا۔

چاچا خیر دین کی واپسی بارہ بجے کے قریب ہوئی تھی۔ اس کی اطلاع بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق پشاور سے آنے والا وہ ٹرک ساڑھے نو بجے کے قریب پہنچا تھا۔ ٹرک جیسے ہی بند روڈ پر مڑا پولیس نے اسے روک کر گھیرے میں لے لیا۔ ڈرائیور کے علاوہ ٹرک پر دو اور آدمی سوار تھے جنہوں نے پولیس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر دونوں پولیس کی جوابی فائرنگ سے زخمی ہو گئے۔

پولیس کے ساتھ اخبارات کے رپورٹرز اور فوٹو گرافر بھی تھے۔ ٹرک پر اسکرپ لدا ہوا تھا جسے پولیس کے جوانوں نے چند منٹ میں ہی اتار کر سڑک کے کنارے پر ڈھیر کر دیا اور پھر ٹرک کو ادھیڑ ڈالا۔ ٹرک کی دوہری دیواروں اور خفیہ خانوں سے ہیر وئن کے لاتعداد پیکٹ برآمد ہوئے۔ ایس پی سعید اخباری نمائندوں کو بتاتا رہا تھا کہ اسے خفیہ ذرائع سے اس ٹرک کے بارے میں اطلاع ملی تھی۔ فوٹو گرافر دھڑا دھڑا تصویریں کھینچنے میں مصروف تھے۔ ڈرائیور نے اخباری نمائندوں کے سامنے یہ بیان بھی دیا کہ یہ ٹرک پشاور کے دل باز خان نامی شخص کی

نہیں رکھتے تھے۔

ان تینوں کی نظریں میری طرف اٹھ گئیں۔ ملک شہاب کی آنکھوں میں خون اتر اہوا تھا۔
”کیا بات ہے ملک جی! خیر تو ہے نا؟ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں۔“ میں نے ملک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ سوال تو تم نے اس طرح کیا ہے جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔“ ملک شہاب کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔ ”مجھے امید نہیں تھی کہ تم یہاں آؤ گے۔ مگر تم میری توقع سے زیادہ چالاک بننے کی کوشش کر رہے ہو اور اپنے آپ کو بہت بہادر بھی سمجھتے ہو۔ لیکن بعض اوقات حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی لے ڈوبتی ہے۔ تم یہاں آؤ گے لیکن واپس نہیں جاسکو گے۔“
”میں سمجھا نہیں ملک جی! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ میں نے اُن بھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ویسے میں بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔

”اچھا، سمجھاتا ہوں۔“ ملک شہاب نے کہا اور پھر شیدے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
”اس کو لے کر آؤ حرا مزادے کو.....“



شیدہ امیری طرف دیکھتا ہوا اندر کے ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ میں چند لمحے ملک کی طرف دیکھتا رہا پھر سلطان کی طرف گھوم گیا۔ اس کی آنکھیں بھی شعلے اگل رہی تھیں۔ شدید غصے کے باعث اس کا چہرہ کچھ اور بھی بگڑ گیا تھا۔

”کل میری موجودگی میں ملک صاحب نے تم سے کہا تھا کہ انہیں دھوکے اور فریب سے شدید نفرت ہے۔“ سلطان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کوئی چھوٹی موٹی غلطی تو معاف کی جاسکتی ہے لیکن اتنا بڑا دھوکا..... اس کی معافی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے ملک صاحب سے پہلے بھی کہا تھا کہ تم جیسے لوگوں کو منہ نہ لگائیں۔ گندی نالی کے کیڑے کو گندگی ہی میں رہنا چاہئے۔ لیکن انہوں نے میری بات نہ مانی اور اتنا بڑا راز تمہارے سامنے اگل دیا۔“
”لیکن ہوا کیا ہے سرجی! میں نے کیا، کیا ہے؟ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے؟“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”تم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہوتی تو میں تمہیں معاف کر سکتا تھا۔“ اس مرتبہ ملک شہاب بولا۔ ”لیکن مجھے ساری رپورٹ مل چکی ہے۔ ایک ایک بات کا پتہ چل گیا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”میں نے تو تمہارے لئے کچھ اور منصوبہ بنایا تھا۔ اس طرح ہمیں نہ صرف تم سے نجات مل جاتی بلکہ دوسرے ٹرک میں ہمارا مال بھی کراچی پہنچ جاتا۔ تمہیں اعتماد میں لینے کے لئے میں نے پشاور سے آنے والے ٹرک کے بارے میں بھی بتا دیا تھا اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی جس کا خسارہ آج مجھے اربوں روپے کے نقصان کی صورت میں اٹھانا پڑا۔ یہ نقصان تو میں اگلی کسی بھی کھیپ میں پورا کر لوں گا لیکن تمہاری زندگی آج پوری ہو گئی۔“
”آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک جی؟“ میں نے کہا۔ ”میں نے آپ پر مکمل اعتماد کیا تھا اور آپ نے مجھے مروانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ میں تو.....“

”میرا وہ منصوبہ تو ناکام ہو گیا۔ لیکن اب تم نہیں بچ سکو گے۔“ ملک نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اور پھر اسی لمحہ اندرونی دروازے کے پردے کے پیچھے سے کراہنے کی آواز سن کر میں نے

ہو۔“ میں ایک لمحہ کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”یہ درست ہے کہ میں جرائم پیشہ ہوں لیکن میں نے اس سرزمین کی مٹی سے جنم لیا ہے۔ یہ دھرتی مجھے وراثت میں ملی ہے اور میں اپنی اس دھرتی سے ندراری کا تصور بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی تم جیسے بے غیرت لوگوں کو اس کی اجازت دے سکتا ہوں۔“

”بہت محبت وطن ہو۔“ ملک شہاب بولا۔ ”تمہاری حب الوطنی تو میں ابھی نکالتا ہوں۔“

”رونی باؤ!“ مہجیا چیخا۔ آواز اس کے حلق سے اٹک کر نکل رہی تھی۔ ”بھاگ جاؤ یہاں سے رونی باؤ!..... یہ جلا تہمیں مار ڈالیں گے۔“

شیدے نے مجھے کودھکا دے کر گرا دیا اور میری طرف بڑھنے لگا۔ میں بھی آہستہ آہستہ پیچھے سرکنے لگا۔ مجھے صورتحال کا اندازہ تھا۔ یہاں سے زندہ بچ نکلتا واقعی مشکل نظر آ رہا تھا۔ یہ تین آدمی اندر تھے اور دو خونخوار درندے باہر لان میں بھی ٹہل رہے تھے۔

میرے دائیں طرف سلطان کھڑا تھا۔ وہ اگرچہ ادھیڑ عمر تھا اور بظاہر لڑائی بھڑائی والا آدمی نہیں لگتا تھا۔ مگر جب ایسی صورتحال ہو تو ہاتھ پیر ہلانے ہی پڑتے ہیں۔ سلطان کے تیور بھی خطرناک نظر آ رہے تھے۔

میں نے اچانک ہی سلطان پر چھلانگ لگا دی۔ میرے پیر کی ٹھوکرا اس کے پیٹ پر پڑی۔ میرا یہ حملہ اس کے لئے واقعی غیر متوقع تھا۔ وہ بلبلا تا ہوا دوہرا ہو گیا۔ اس وقت شیدے نے مجھے پر چھلانگ لگائی تھی۔ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ شیدا، سلطان سے ٹکرایا اور وہ دونوں صوفے پر گرے۔ صوفہ الٹ گیا۔ سلطان الٹی قلابازی کھاتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ اس کے منہ سے ایک بہت ہی غلیظ گالی نکل گئی تھی۔

شیدا ابھی صوفے کے پچھلی طرف گرا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر دو تین ٹھوکریں رسید کر دیں۔

ملک شہاب چیخ چیخ کر نادر اور دار کو پکار رہا تھا۔ میں نے اچھل کر ملک شہاب کے پیٹ میں زوردار ٹھوکرا رسید کر دی۔ وہ چیختا ہوا دوہرا ہو گیا۔ میری دوسری ٹھوکرا اس کے کولہوں پر پڑی۔ وہ منہ کے بل گرا۔

میں نے سنبھل کر ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے والے دروازے سے باہر نکلنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس وقت شیدا ابھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اندرونی راہداری کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میرا اندازہ تھا کہ پچھلی طرف بھی باہر نکلنے کا دروازہ ضرور ہوگا۔ اس طرف دوڑ لگا کر میں

اس طرف دیکھا۔ پردہ ہٹا اور رشید ایک آدمی کو گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا۔

وہ مہجیا تھا۔ اسے دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ اس کے جسم پر صرف پتلون تھی جو خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ جسم کا بالائی حصہ زخموں سے چور تھا۔ میں کوشش بھی کرتا تو ان زخموں کی تعداد نہیں گن سکتا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ شیدے نے پکڑ رکھا تھا اور دوسرا بازو پہلو میں جھول رہا تھا۔ وہ بازو بھی زخمی تھا۔ اور غالباً کندھے کا جوڑا کھاڑ دیا گیا تھا۔ اس کے جسم کا بوجھ ایک ٹانگ پر تھا۔ دوسری ٹانگ کو وہ بمشکل تھمٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ..... ناقابل شناخت ہو چکا تھا۔ نچلا ہونٹ اس طرح کٹا ہوا تھا کہ ٹھوڑی تک کا گوشت نظر آ رہا تھا۔ ایک رخسار کا گوشت ادھر اہوا تھا۔

مجھے کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اور مجھے حیرت تھی کہ وہ اب تک زندہ کیسے تھا؟

”یکل رات جب تمہارے ساتھ گیا تھا تو مجھے اسی وقت شبہ ہو گیا تھا۔“ ملک شہاب میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اور پھر یہ آج دوپہر بھی تم سے ملا تھا۔ مجھے شبہ تو ہو رہا تھا لیکن یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ حرازدہ اتنا بڑا قدم اٹھائے گا۔ آج جب مجھے ٹرک پکڑے جانے کی اطلاع ملی تو میرا دھیان فوراً ہی اس طرف گیا تھا۔ اس نے آسانی سے تو زبان نہیں کھولی تھی۔ مگر دیکھ لو اس کا حشر کیا ہوا ہے۔ بالآخر اس نے سب کچھ اگل دیا۔ اور اب تم.....“ وہ خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ”میں تمہارے جسم کے اتنے ہی ٹکڑے کروں گا جتنی اس ٹرک میں بہروئن کی تھیلیاں تھیں۔ اس طرح میرے نقصان کا ازالہ تو نہیں ہوگا مگر تمہارے حشر سے دوسرے ضرور عبرت پکڑیں گے کہ ملک شہاب جیسے شخص سے ٹکرانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے ملک!“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”بے ایمانی میرے نہیں، تمہارے دل میں تھی۔ تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی لیکن خود اس کا شکار ہو گئے۔ تم واقعی دنیا کے سب سے بڑے احمق ہو۔ مجھے اچھی طرح جاننے کے بعد بھی تم نے یہ غلطی کی کہ مجھے اپنے ایک راز سے آگاہ کر دیا۔ ابھی تو صرف پچاس من بہروئن کی بات ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم یہ نقصان آسانی سے برداشت کر لو گے۔ لیکن یہ ابھی شرعات ہیں۔ ابھی آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

”تم یہاں سے زندہ نکل سکو گے تو کچھ کرو گے۔“ ملک شہاب بولا۔

مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ مگر تم نہیں بچ سکو گے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ بے ضمیر اور وطن فروش بھی تمہارے کسی کام نہیں آسکے گا۔“ میں نے سلطان کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس جیسے بے ضمیر ہمارے معاشرے اور وطن کی نیک نامی پر کلنک ہیں۔ گندگی کے کیڑے تو دراصل یہ ہیں۔ ان کا وجود کھن کی طرح اس ملک کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا ہے۔ مجھے گندگی کا کیڑا کہتے

اور دوڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اس طرف ایک کشادہ گلی تھی۔ یہاں کی کوٹھیوں میں فائرنگ سے کچھ معمولی سی ہینل نظر آتی تھی لیکن اس کے بعد جو کچھ بھی میں نے دیکھا وہ میرے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ کسی کوٹھی کے چوکیدار نے بھی باہر جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔

موت کے وہ فرشتے تقریباً ایک گھنٹے تک میرا پیچھا کرتے رہے اور میں گلیوں میں ان کے ساتھ آنکھ بھولی کھیلتا ہوا اس کوٹھی میں داخل ہو گیا جہاں ایک گن مین اور ایک حسین عورت کی لاش میری منتظر تھی۔ اس کوٹھی سے کروڑوں کی دولت میرے ہاتھ لگی جسے میں نے مال غنیمت سمجھ کر اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ اور پھر میں اپنے اس مکان تک کس طرح پہنچا وہ تو میں بتا ہی چکا ہوں۔

میری چائے ختم ہو چکی تھی۔ میں نے خالی کپ میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر برآمدے میں آ گیا۔ دھوپ پھیل رہی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ جیسے جیسے دھوپ تیز ہوتی جائے گی اس کی تپش بھی بڑھتی جائے گی۔ میں چند منٹ وہاں کھڑا رہا۔ میری نظریں بائیں جانب اٹھ گئیں۔ میرے ساتھ والا پلاٹ خالی تھا۔ اس سے اگلے پلاٹ پر ایک مکان زیر تعمیر تھا۔ دیواریں چند فٹ اوپر تک اٹھا کر کسی وجہ سے تعمیر کا کام روک دیا گیا تھا۔ اس سے آگے والا مکان آباد ہو چکا تھا اور اس وقت ایک عورت اس مکان کی چھت پر کپڑے سوکھنے کو ڈال رہی تھی۔

میں توجہ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کوئی جوان عورت تھی۔ اور حسین بھی۔ اس کے سر پر کوئی دپٹہ وغیرہ نہیں تھا۔ وہ قدرے اوپر بندھی ہوئی رتی پر کپڑے ڈالنے کے لئے دونوں بازو اوپر اٹھائی تو اس کے سینے میں تناؤ سا پیدا ہو جاتا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود وہ دلکش نظارہ دیکھ کر میرے سینے میں پھلپھل سی پیدا ہونے لگی۔

اس عورت نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ اور پھر میری طرف پشت کر کے اپنے کام میں مصروف رہی۔ آخری کپڑا رتی پر ڈال کر اس نے جھک کر خالی بالٹی اٹھالی۔ مڑ کر میری طرف دیکھا اور بیڑھوں کی طرف چلی گئی۔ بیڑھیاں اترنے سے پہلے اس نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا تھا۔ اور میرے خیال میں اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی آئی تھی۔ میرے منہ سے سبب اختیار گہرا سانس نکل گیا اور میں اندر آ گیا۔

دروازہ لاک کر کے میں بیڈروم میں آ گیا۔ وہ بیگ بستر ہی پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے بیگ اٹھا کر کسی پر ڈال دیا اور بستر پر لیٹتے ہوئے مجھے دفعۃً اس لاکٹ کا خیال آ گیا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنے گلے میں پہنچ گیا۔ وہ لاکٹ گلے میں نہیں تھا۔ پھر دفعۃً مجھے یاد آ گیا کہ میں نے

نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ اگر اس طرف کوئی راستہ نہ ہوا تو یہ لوگ واقعی خونخوار درندوں کی طرح مجھے جیر پھاڑ ڈالیں گے۔ لیکن میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ اس طرف بھی ایک عقبی دروازہ موجود تھا جو اتفاق سے کھلا ہوا تھا۔ میں دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کوٹھی کی فضا فائر کی آواز سے گونگٹھی۔ گولی میرے سر کے چند انچ اوپر سے گزر گئی تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ شیدا تھا جس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دروازے کے باہر چھلانگ لگا دی۔ وہ مڑ کر دائیں طرف دوڑتا چلا گیا۔ اس لمحہ دوسرا فائر ہوا تھا۔ عقبی لان بھی بہت وسیع و عریض تھا۔ ملک شہاب کی اس کوٹھی کے پچھلی طرف کوئی اور کوٹھی تھی۔ دونوں کے بیچ کی دیوار پانچ فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ پودوں کی کیاری تھی۔ میں دوڑتا ہوا اسپرنگ کی طرح اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اسی وقت ایک اور گولی چلی تھی جس نے دیوار کی سب سے اوپر والی ایک اینٹ کا ایک ٹکڑا اڑا دیا تھا۔ اگر میں دوسری طرف چھلانگ نہ لگا چکا ہوتا تو شاید میرے جسم کا کوئی ٹکڑا اڑ گیا ہوتا۔

دوسری طرف بھی نیچے پودوں کی کیاری اور اس سے آگے لان تھا۔ یہ دوسری کوٹھی کا عقبی نان تھا۔

اس وقت رات کے پونے دو بجنے والے تھے۔ اس کوٹھی کے کمین خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے لیکن فائرنگ اور بھاگ دوڑ کی آوازیں سن کر اٹھ گئے۔

ملک شہاب کے دو آدمیوں نے بھی چیختے ہوئے میرے پیچھے دیوار پر چڑھ کر اس کوٹھی میں چھلانگ لگا دی تھی۔

فائرنگ اور شور کی آواز سن کر اس کوٹھی کے جاگ جانے والے کمین چیختے لگے۔ میں دوڑتا ہوا کوٹھی کے سامنے والے گیٹ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یہاں ایک عدد چوکیدار موجود تھا جو لائٹ سنبلالے اپنے کمین میں کھڑا جھانک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ ظاہر ہے جہاں فائرنگ ہو رہی ہو وہاں اس بیچارے کی لائٹھی کیا کر سکتی تھی۔ میں چوکیدار کو نظر انداز کرتا ہوا گیٹ پر چڑھنے لگا۔ چوکیدار غالباً یہ سمجھا تھا کہ کوٹھی میں ڈاکو گھس آئے ہیں اور گھر والوں کے جاگ جانے سے بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے گیٹ پر چڑھتے دیکھ کر اس میں شاید کچھ ہمت پیدا ہوئی۔ اس نے کمین سے نکل کر مجھ پر لائٹھی سے حملہ کر دیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کا نشانہ خطا گیا اور لائٹھی گیٹ پر لگی۔ اس دوران میں دوسری طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ گیٹ کے اندر سے شیدے اور اس کے دوسرے ساتھی کے شور مچانے

جس کی چھت پر وہ جوان اور حسین عورت ڈھلے ہوئے کپڑے رتی پر ڈال رہی تھی۔ اس عورت نے میری طرف دیکھا۔ اس کے نازک سے شیریں ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بڑی زلفیں بکریاں مسکراہٹ..... اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر آواز بڑی دلکش تھی۔ لگتا تھا جیسے میرے کانوں میں نفرتی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ کتنی بھلی لگ رہی تھی سماعت کو نفرتی گھنٹیوں کی یہ آواز۔ جلتنگ سے بج رہے تھے۔ اور پھر آواز تیز ہوتی چلی گئی۔

جلتنگ کا تاثر دینے والی نفرتی گھنٹیوں کی وہ آواز اب سمع خراشی کرنے لگی۔ جلتنگ جیسی اس آواز میں کرتنگی بڑھتی چلی گئی۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے لیکن وہ کرت اور تیز آواز میری سماعت سے ٹکراتی رہی۔

میں بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میرے دونوں ہاتھ کانوں پر تھے۔ مگر وہ کرت آواز اب بھی میری سماعت سے ٹکراتی رہی تھی۔

وہ ڈوریل کی آواز تھی۔ میں نے کانوں سے ہاتھ ہٹائے۔ دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ نیند کا خمار اب بھی طاری تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہو سکتا ہے؟

دفعۃً میرے دماغ میں ایک اور دھماکہ ہوا۔ گزشتہ رات ملک شہاب کے آدمی شکاری کتوں کی طرح تعاقب میں لگے ہوئے تھے جن سے بچنے کے لئے میں اس کٹھی میں گھس گیا تھا جہاں سے کروڑوں کی دولت اٹھالایا تھا۔

گھنٹی کی آواز رہ رہ کر گونج رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا ان لوگوں نے میرا سراغ لگالیا ہے؟ کیا ملک شہاب کے شکاری کتے میری بوسو گھستے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں؟

دفعۃً میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں دھمکے، میں اُس عورت کو یہی نام دوں گا جس کا لاکٹ میرے پاس تھا، کی کٹھی سے اس کی ہوٹا اکارڈ کار پر فرار ہوا تھا۔ اور وہ کار میں نے وحدت روڈ کی ایک ذیلی سڑک پر چھوڑ دی تھی۔ وہ جگہ اگرچہ یہاں سے تقریباً دو میل دور تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ کہیں پولیس نے تو کسی طرح میرا سراغ نہیں لگالیا؟

میں اچھل کر بستر سے اتر گیا۔ کرسی پر پڑا ہوا بیگ اٹھا کر الماری میں سب سے نچلے خانے میں رکھ کر اس پر دو تین کپڑے ڈال دیئے۔ الماری بند کر کے ایک چادر اوڑھ لی اور لوگر پستول اٹھالیا اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر آ گیا۔ کال بیل اب بھی وقفے وقفے سے بج رہی تھی۔

دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے لاؤنج کی کھڑکی کا پردہ ذرا ساسر کا کر باہر جھانکا۔ ڈوریل اس وقت بھی بج رہی تھی مگر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گیٹ اگرچہ تقریباً پانچ فٹ اونچا تھا۔

نہاتے ہوئے وہ لاکٹ اتار کر غسل خانے میں کھونٹی پر ٹانگ دیا تھا۔ میں اٹھ کر ہاتھ روم سے دو لاکٹ لے آیا اور بستر پر لیٹ کر اسے کھول لیا اور وہ کانڈ نکال کر ایک بار پھر اس پر کھسے ہوئے نمبروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ کوئی تعویذ تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنے ماڈرن قسم کے لوگ تعویذ گنڈوں پر یقین نہیں رکھتے۔ ان نمبروں کا مطلب کچھ اور تھا۔ اور یہ نمبر یقیناً اتنے اہم تھے کہ انہیں سینے سے لگا کر رکھا گیا تھا۔

کانڈ اسی طرح تہہ کر کے دوبارہ رکھتے ہوئے میری نظر لاکٹ کے اندر بائیں طرف والے حصے پر جم گئی۔ پہلی مرتبہ اس کٹھی میں جب میں نے لاکٹ کھولا تھا تو اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اُس وقت تو میری تمام تر توجہ اس کانڈ پر تھی۔ اور اب میری نظر اس پر پڑ گئی تھی۔ چمک کی وجہ سے وہ کندہ تحریر صاف طور پر نہیں پڑھی جا رہی تھی۔ میں لاکٹ کو ہولے ہولے حرکت دینے ہوئے اسے پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ تحریر انگریزی میں تھی۔ اور بالآخر میں اسے پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

”دھمکے!“

میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ یہ اس عورت کا نام تھا یا اس کے معنی کچھ اور تھے۔ میں کتنی دیر تک غور کرتا رہا اور بالآخر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دھمکے اس عورت کا نام تھا جس کے گلے سے میں نے یہ لاکٹ اتارا تھا۔ اور اگر واقعی یہ کوئی نام تھا تو میرے لئے حیران کن تھا۔ ایسا نام پہلی مرتبہ سننے میں آیا تھا۔ لیکن میرے خیال میں مجھے حیران ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج کل لوگوں کو نئے نام رکھنے کا خبط تھا۔ ایسے نام جن کے معنی وہ خود بھی نہ جانتے ہوں۔ دوسرے کیا سمجھیں گے۔

میں نے لاکٹ نکلیے کے نیچے رکھ دیا اور اٹھ کر بتی بجھا دی۔ اس وقت میری آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی اور میں کم از کم تین چار گھنٹوں کے لئے سو جانا چاہتا تھا۔ آنکھیں بند کر کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

یہ شاید ذہنی اور جسمانی تھکن کا اثر تھا کہ میں نیند میں بھی بے چین رہا۔ میں عجیب ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا۔ جیسے خونخوار بھیڑیے لمبے نوکیلے دانت نکالے میرا پیچھا کر رہے ہوں۔ ان کے منہ سے خون ٹپک رہا تھا۔ کبھی میں اپنے آپ کو آگ میں گھرا ہوا پاتا۔ میرے چاروں طرف آگ ہی آگ تھی۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلے۔ میں کبھی ایک طرف دوڑتا اور کبھی دوسری طرف، مگر اس آگ سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اور کبھی میں اپنے آپ کو پانی میں گھرے ہوئے پاتا۔ تا حد نگاہ پانی ہی پانی..... اور پھر اس پانی میں مجھے وہ مکان نظر آتا

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ بچی میرے ساتھ ہی اندر آگئی۔ میں نے کچن میں آکر اپنی پلیٹ نکالی، سویاں اس میں پلیٹ دیں اور وہ پلیٹ دھو کر دوسری پلیٹ کے ساتھ ٹرے میں رکھ دی اور ٹرے بچی کے حوالے کر دی۔

”آپ کی آغوش میں ہیں انکل؟“ بچی نے پوچھا۔

میں مسکرا دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی تھی۔

”نہیں بیٹا! میرے گھر میں کوئی آغوش نہیں ہیں۔ میں یہاں اکیلا ہی رہتا ہوں۔“ میں نے

جواب دیا۔

”تو پھر میں خالہ کو یہاں بھیج دوں گی۔ وہ آپ کے لئے کھانا بھی پکا دیا کریں گی۔“ بچی نے

کہا۔

میں چونک گیا۔ وہ بہت معصوم بچی تھی۔ اگر سمجھ دار ہوتی تو ایسی بات نہ کہتی۔

میں دروازے تک اسے چھوڑنے کے لئے باہر آیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک وہ بچی اپنے مکان کے سامنے نہ پہنچ گئی۔ اور پھر اس وقت اس عورت نے دروازے سے باہر جھانکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی مگر اس مرتبہ اس نے ہاتھ نہیں ہلایا۔ بچی دروازے میں داخل ہوئی تو وہ بھی پیچھے ہٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

میں گیٹ کا ذیلی دروازہ بند کر کے اندر آ گیا۔ برآمدے والا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔ لاؤنج میں داخل ہو کر سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کے ڈھانکی بج رہے تھے۔ میں صبح سات بجے کے قریب بستر پر لیٹا تھا اور پانچ چھ گھنٹوں تک سوتا رہا تھا اور اب مجھے بھوک کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

نہا کر میں اپنے آپ کو کچھ تازہ دم محسوس کرنے لگا۔ میں کچن سے پلیٹ اور چمچ لے کر دوبارہ لاؤنج میں آ گیا۔ ناشتے کا انتظام ہو گیا تھا۔ چاولوں کی طرح ہاتھ کی بنی ہوئی سویاں تھیں جن پر شکر ڈال کر دودھ ڈال دیا گیا تھا۔

سویاں کھاتے ہوئے مجھے ہیر رانجھے کی داستان یاد آگئی۔ اس موضوع پر میں نے اعجاز اور فردوس کی قلم بھی دیکھی تھی۔ ہیر کس طرح اپنے رانجھے کو گھر والوں سے چوری چھپے چوری کھلایا کرتی تھی۔ لیکن کھلانے والی ہیر تھی اور کھانے والا رانجھا..... اور میں رانجھا نہیں تھا اور نہ وہ ہیر تھی جس نے سویاں بنا کر بھیجی تھیں۔ میں نے تو آج صبح اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ کر خفیف سے انداز سے مسکرائی تھی۔ اور اب یہ سویاں.....! ہو سکتا ہے پڑوسی ہونے کے ناتے خیر سگالی کے جذبے کے تحت بھیجی گئی ہوں۔ بہر حال مجھے کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے

اس مکان کی چوکی زمین کی سطح سے تقریباً تین فٹ اونچی تھی۔ باہر کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کو گیٹ کے اوپر سے دیکھا جاسکتا تھا۔

گھنٹی کی آواز رک گئی۔ اور پھر گیٹ کھٹکھٹایا گیا۔ آواز زیادہ زوردار نہیں تھی۔ اس وقت گیٹ کی جھری میں سے کوئی رنگین کپڑا بھی دکھائی دیا۔ وہ شاید کوئی بچہ تھا۔

میں دروازہ کھول کر برآمدے میں آ گیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس بچے نے ہاتھ روک لیا تھا کیونکہ اب گیٹ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں برآمدے سے اتر کر گیٹ کی طرف چلنے لگا۔ اگر واقعی پولیس یا ملک شہاب کے آدمی یہاں تک پہنچ گئے تھے تو یہ ان کی کوئی چال بھی ہو سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ سائینڈ میں کھڑے ہوں اور دروازہ کھلوانے کے لئے کسی بچے کو آگے کر دیا ہو۔

میں نے چادر کے نیچے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا سیفٹی کیچ بٹا دیا اور گیٹ کی جھری سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ وہ آٹھ نو سال کی بچی تھی جس نے خوبصورت فراک پہن رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ٹرے تھے جس میں رکھی ہوئی ایک پلیٹ دوسری پلیٹ سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ ٹرے اس نے ابھی ابھی نیچے سے اٹھائی تھی۔ غالباً تیل بجانے اور گیٹ کھٹکھٹانے کے لئے اس نے ٹرے نیچے رکھ دی تھی۔

”انکل! آپ سو رہے تھے کیا؟ میں اتنی دیر سے تیل بجا رہی تھی کہ میرا ہاتھ تھک گیا۔“ اس بچی نے کہا۔ لہجے میں بے پناہ معصومیت تھی۔ اور وہ بچی تھی بھی بہت پیاری۔

”سوری بیٹے!“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ کیا ہے؟ آپ کہاں سے آئی ہیں اور کس کے گھر جانا ہے آپ کو؟“

”خالہ نے سویاں بھیجی ہیں۔“ بچی نے کہتے ہوئے گردن سے دائیں طرف اشارہ کیا۔ میں نے گیٹ سے گردن نکال کر اس طرف دیکھا اور چونک گیا۔ وہ عورت اپنے مکان کے دروازے میں کھڑی تھی جسے صبح میں نے چھت پر پکڑے ڈالتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اس کے جسم کا اوپر کا حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلچسپ مسکراہٹ تھی۔ اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے ہاتھ ہلا دیا اور دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔

”شکریہ بیٹے!“ میں نے بچی کے ہاتھوں سے ٹرے لیتے ہوئے کہا۔ ”اپنی خالہ کا شکریہ ادا کرنا اور یہ برتن بعد میں کسی وقت لے جانا۔“

”خالہ نے کہا تھا کہ میں برتن لے کر آؤں۔ اور گھر میں کسی کو نہ بتاؤں کہ آپ کو سویاں بھیجی تھیں۔“ بچی نے معصومیت سے کہا۔

کی ضرورت نہیں تھی۔

نہ تو میں عاشق مزاج ہوں اور نہ ہی دل پھینک۔ ایسا خشک بھی نہیں کہ صنف نازک سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ میں عیاش نہیں مگر آسانی سے ہاتھ آنے والی چیز کو چھوڑنا بھی نہیں۔ میری زندگی میں کئی حسین عورتیں آئی تھیں مگر ان میں سے بہت کم ایسی تھیں جنہیں میں نے اپنی خلوت گاہ میں آنے کا موقع دیا ہو۔

ازدواجی ناٹے کے علاوہ کوئی عورت کسی مرد کی زندگی میں اس صورت میں داخل ہوتی ہے جب مرد دولت مند ہو، اتنا خوب رو کہ صنف نازک بے اختیار اس کی طرف کھینچی چلی آئے۔ عشق و محبت کا میں قائل نہیں۔ میری شکل و صورت بھی بس واجبی سی ہے۔ البتہ جسمانی لحاظ سے میں آج کل کے نوجوانوں کے مقابلے میں خاصا مضبوط ہوں۔ کچھ زندگی کے نشیب و فراز نے بھی میرے انداز میں طاقت بھر دی کہ بیک وقت تین چار بٹے کئے آدمیوں سے نمٹنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔

عام حالات میں، میں بھی سڑک چھاپ غنڈوں سے مختلف نہیں ہوتا۔ اس صورت میں کوئی عورت شاید میری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرتی ہو لیکن جب میرے پاس پیسہ ہوتا تو صورتحال مختلف ہوتی۔ قیمتی لباس، شاعرانہ کار، فانیو اشار اور دیگر بڑے بڑے ہوٹلوں میں آمد و رفت..... لوگ مجھے کوئی رئیس زادہ سمجھتے۔ حسین اور دولت مند خواتین خود بخود میری طرف کھینچی چلی آتیں۔ لیکن..... آج جو صورتحال سامنے آئی تھی وہ بہت مختلف تھی۔ اس عورت کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور وہ بھی دور سے۔ جب میں نے اسے چھت پر کپڑے ڈالتے دیکھا تھا تو میری نیت میں کوئی فتور نہیں تھا۔ محض اتفاقاً نظریں اس طرف اٹھ گئی تھیں اور دل میں کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔

میں بیٹھے میں ایک آدھ مرتبہ اس کوٹھی میں ضرور آتا تھا اور وہ بھی رات کے وقت۔ دن کے وقت تو میں کبھی یہاں سے باہر بھی نہیں نکلتا تھا۔ البتہ کبھی برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس عورت نے اپنے مکان کی چھت سے پہلے بھی مجھے دیکھا ہو۔ لیکن میری نظروں میں وہ پہلی بار آئی تھی۔ کوئی اشارہ کنایہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے سویاں بھجوا دی تھیں۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ مجھ پر عاشق ہو گئی تھی۔ اس گلی میں چار چھ مکان ہی آباد تھے۔ ہو سکتا ہے اس نے یہ سوچ کر سویاں بھجوا دی ہوں کہ اس طرح پڑوس کے کسی گھر میں آنے جانے کا موقع ملے گا۔ لیکن شاید اسے یہ معلوم نہ ہو گا کہ اس گھر میں کوئی پڑوس نہیں رہتی۔ اور اب بچی نے جا کر بتایا ہو گا کہ اس گھر میں کوئی آنٹی نہیں ہیں تو خیر سگالی کا یہ سلسلہ شروع ہونے کے

ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔

سویاں کھاتے ہوئے میرا ذہن ماضی میں پہنچ گیا۔ اٹھارہ سال پہلے کا وہ منظر اب بھی میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ وہ ایک منظر کیا، ماضی کی ایک ایک یاد میرے ذہن پر نقش تھی۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ محفوظ تھا۔ میں کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا۔

اس وقت میری عمر آٹھ سال تھی۔ میں سیالکوٹ کے ایک بازار میں کسی ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے جسم پر کھدر کا پٹٹا پرانا اور میلا پھیلا سا کرتہ تھا۔ نیچے میں نے نیکر پہن رکھی تھی۔ وہ بھی پھٹی ہوئی اور بہت میل تھی۔ یہ کپڑے شاید کئی مہینوں سے میرے جسم سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ میرے پیر ٹخنوں تک کچھڑ میں تھڑے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی پشت اور بازوؤں پر میل جمی ہوئی تھی۔ میں نے شاید کئی روز سے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ سر کے بال بے حجام شاہو بھے ہوئے اور الجھے ہوئے تھے۔ آٹھ سال کے بچے کو اپنا ہوش کب ہوتا ہے۔ اس کے ذہن میں صرف دو باتیں ہوتی ہیں۔ کھیل اور کھانا پینا۔ اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری تو ماں باپ کی ہوتی ہے۔ جس کے ماں باپ نہ ہوں، گھر کے دوسرے افراد اس کا خیال رکھتے ہیں۔ میں یتیم نہیں تھا مگر یتیموں سے زیادہ بدتر اور کمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ کسی اور رشتہ دار کے بارے میں، میں کچھ جانتا نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رشتے ناٹے کیا ہوتے ہیں۔

ہاں، تو میں اس روز کی بات کر رہا تھا جب میں ہوٹل کے سامنے والے فٹ پاتھ پر بیٹھا لپٹائی ہوئی نظروں سے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس وقت دوپہر ہو رہی تھی۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آٹھ سالہ بچہ جو سولہ سترہ گھنٹوں سے بھوکا ہو، ایک کھیل تک اڑ کر اس کے منہ میں نہ گئی ہو، اس کی کیا حالت ہوگی۔

مجھ پر نقاہت سی طاری تھی۔ پیٹ میں اٹٹھن ہو رہی تھی۔ آنٹوں میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔ سامنے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کھانا کھاتے دیکھ کر میری حالت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی تو میں اس طرح منہ چلانے لگتا تھا جیسے کھانا کوئی اور نہیں، میں کھا رہا ہوں۔

دروازے کے قریب والی میز پر بیٹھا ہوا ایک آدمی کھانا کھاتے ہوئے بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ ہوٹل بھی بس ایویں سا تھا۔ گاہکوں کا تعلق بھی نچلے طبقے سے تھا۔ زیادہ تر مزدور پیشہ لوگ تھے جو یہاں آ کر کھانا کھاتے، دروازے کے قریب کاؤنٹر پر پیسے دیتے اور چلے جاتے۔ کسی گاہک نے آتے جاتے میری طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ لیکن وہ شخص کھانا کھاتے

کی کوشش کی تھی مگر مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ مجھے تھانے میں تین چار گھنٹوں تک بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ پولیس والے مجھ سے میرے ماں باپ اور دوسرے گھر والوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ایک دو پولیس والوں نے مجھے تھپڑ بھی لگائے تھے۔ لیکن میں نے اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

مجھے ایک یتیم خانے میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں بھی رات تک میں بھوکا ہی رہا۔ مجھے دوسرے بچوں کے ساتھ ایک بڑے سے کمرے میں فرش پر بٹھا دیا گیا اور ہمیں کھانا اس طرح دیا گیا جیسے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے بھکاریوں کی جھولی میں روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جاتا ہے۔ مٹی کے کنوڑے میں گدے لے پانی جیسی پتلی سی دال اور تندور کی ایک روٹی، آدمی جلی آدمی کچی۔

رات کو سونے کے لئے بچوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح کمروں میں بھر دیا گیا۔ مجھے جس کمرے میں دھکیلا گیا وہاں میں بچے اور تھے۔ کوئی میری عمر کا، کوئی مجھ سے چھوٹا اور کوئی بڑا۔ فرش پر بکجور کے پتوں کی چٹائی بچھی ہوئی تھی جو جگہ جگہ سے اڑھڑی ہوئی تھی۔ اوڑھنے کے لئے پھٹے پرانے اور میلے کپڑے تھے۔ دو دو لڑکوں کو ایک ایک کبل دیا گیا تھا۔ مجھے بھی ایک لڑکے کے ساتھ کبل میں حصے دار بنا دیا گیا۔ وہ لڑکا عمر میں مجھ سے بڑا تھا اور بہت خزانٹ بھی۔ رات بھر ہم میں کبل کے لئے کھینچنا تانی ہوتی رہی۔ کبل زیادہ تر اس لڑکے کے قبضے میں رہا تھا اور میں سردی میں ٹھہرتا رہا۔

میرا منہ دھلایا گیا۔ پہننے کو دوسرے کپڑے دیئے گئے جو اگرچہ پرانے تھے مگر صاف ستھرے تھے۔ سر پر ہرے رنگ کی ایک میلی سی ٹوپی بھی پہنا دی گئی۔ ہلکے پیلے رنگ کی شلوار قمیض اور ہری ٹوپی۔ یہ اس یتیم خانے کے بچوں کی وردی تھی۔

سورج نکلنے ہی ہمیں دس دس کی ٹولیوں میں یتیم خانے سے نکال دیا گیا۔ کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا گیا۔ کہا گیا کہ ہم کچھ جمع کر کے لائیں گے تو کھانے کو ملے گا۔

ہم سیالکوٹ کی گلیوں اور سڑکوں پر گھومتے رہے اور صدا لگاتے رہے۔

”ہم ہیں یتیم بچے۔ کوئی نہیں ہمارا۔“

ممکن ہے دوسرے بچے یتیم ہوں مگر میں یتیم نہیں تھا۔ میرا باپ بھی زندہ تھا اور ماں بھی۔ حالات کی ستم ظریفی نے مجھے ان سے اس طرح الگ کر دیا تھا کہ میں نہ صرف دنیا کی ہر نعمت سے بلکہ باپ کی شفقت اور ماں کی محبت سے بھی محروم ہو گیا تھا اور تقدیر مجھے یتیم خانے میں لے آئی تھی۔

میری ماں بھی اسی شہر میں تھی اور باپ بھی۔ لیکن یہ کتنی ستم ظریفی تھی کہ میں زندگی کی چلچلاتی

ہوئے بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔ لباس اور حلیے سے وہ بھی کوئی مزدور پیشہ ہی لگتا تھا۔ اس کی پلیٹ میں کچھ روٹی بچ گئی تھی۔ سالن ختم ہو گیا تھا۔ شاید اس کا پیٹ بھی بھر گیا تھا کیونکہ دوسرے گاہکوں کی طرح باقی روٹی ختم کرنے کے لئے اس نے گریوی نہیں منگوائی تھی۔ اس نے پلیٹ اپنے سامنے سے سرکادی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ اس نے بچی ہوئی روٹی اٹھائی اور باہر آ کر وہ روٹی میری جھولی میں اس طرح پھینک دی جیسے کتے کے سامنے ہڈی ڈالی جاتی ہے۔

روٹی کا وہ ٹکڑا میرے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ اس سے میری بھوک تو نہیں مٹی لیکن پیٹ کی اٹھن کسی حد تک کم ہو گئی تھی۔ میں کچھ دیر اور وہاں بیٹھا رہا کہ شاید کوئی اور گاہک میری جھولی میں روٹی کا کوئی ٹکڑا ڈال دے۔ مگر کسی نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔

میں اٹھ کر ایک طرف چلنے لگا۔ ایک نلکے سے پانی پیا اور پھر چلا رہا۔ وہ سردیوں کا موسم تھا۔ اگرچہ تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر اس میں ابھی تپش نہیں تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ بظلوں میں دبار کھے تھے مگر اس طرح سردی کم تو نہیں ہو جاتی۔

میں ایک جگہ رُک گیا۔ سامنے کچھوں کی ایک دکان تھی۔ دو تین گاہک بھی کھڑے تھے۔ تندورچی لوہے کی سلاخوں سے کچے تندور سے نکال کر ایک ٹوکڑے میں ڈالتا جا رہا تھا۔ گرم گرم کچھوں کی اشتہا آمیز خوشبو سے میری بھوک ایک بار پھر چمک اٹھی۔ میں آگے بڑھ کر ان آدمیوں کے بیچ میں کھڑا ہو گیا اور موقع ملنے ہی کچھوں سے بھرے ہوئے ٹوکڑے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ تندورچی نے مجھے دیکھ لیا۔ میرا ایک ہاتھ کچے تک پہنچا ہی تھا کہ لوہے کی سلاخ زور سے میرے ہاتھ پر لگی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی لیکن میں نے کچے نہیں چھوڑا اور پلٹ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک آدمی پکڑ پکڑو کا شور مچاتا ہوا میرے پیچھے لپکا بھی تھا مگر میں تیزی سے دوڑتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا اور پھر کئی گلیوں سے ہوتا ہوا ایک درخت کے نیچے رُک گیا۔ اس طرح بے تحاشہ دوڑنے سے میرا سانس پھول گیا تھا۔

میں اب بھی خوفزدہ سی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب کوئی مجھے پکڑنے کے لئے نہیں آ رہا تو درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور کچے کھانے لگا۔

وہ میری زندگی کی پہلی چوری تھی جو میں نے آٹھ سال کی عمر میں بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر کی تھی۔ اس سے اگلے روز ایسی ہی حرکت کرتے ہوئے میں پکڑا گیا۔ اس وقت بھی میں بھوک سے بے حال تھا اور میں نے پیٹ کی بھڑکتی ہوئی آگ بجھانے کے لئے ایک روٹی چرانے

پہلے ہی بھارت کی طرف سے ہوتی تھی۔ سرحد کے علاقوں پر فائرنگ شروع کر دیتے جس کا جواب پاکستانی فوجیوں کو بھی دینا پڑتا تھا۔ اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ بھارت کی طرف سے بلا جواز پہلے ہلکے ہتھیاروں سے فائرنگ ہوئی، پھر گولوں اور توپوں سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ دو گولے ٹانہ میں گر کر پھٹے۔ دوائی برکتے سمیت گاؤں کے چار اور باشندے لقمہ اجل بن گئے۔ کئی زخمی ہوئے۔ پاکستانی فوجی دستوں کی جوابی فائرنگ سے بھارتی فوجی اپنے مورچے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ روشن بی بی صرف تین دن کے لئے گاؤں گئی تھی۔

زنگ کا کورس کرنے کے بعد اُسے سیالکوٹ ہی کے سرکاری ہسپتال میں نوکری مل گئی اور وہ مریضوں کی خدمت کرنے لگی۔ ہمدردی کا اور خدمت کا مادہ اس کے سینے میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ بہت جلد ہسپتال میں مشہور ہو گئی۔ مریضوں کی خدمت میں وہ اس طرح کھو جاتی کہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتی۔

ان دنوں روشن بی بی کی ڈیوٹی میڈیکل وارڈ میں تھی۔ اس روز صبح سویرے ہی وارڈ میں ایک بیمار لیض آیا تھا۔ احمد علی کی عمر تیس بیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ بڑا کڑیل جوان تھا۔ بے حد خمبو۔ اس میں جنس مخالف کے لئے بے پناہ کشش تھی۔

زہر خورانی کا کیس تھا۔ احمد علی کے کسی دوست نے اسے زہر دے دیا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بروقت ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ اور مزید خوش قسمتی یہ کہ اس وقت روشن بی بی ڈیوٹی پر تھی۔

احمد علی کو بچالیا گیا۔ پولیس نے بھی کیس رجسٹر کر لیا تھا۔ لیکن احمد علی کا دوست فرار ہو گیا تھا جس نے کسی پرانی دشمنی کا بدلہ لینے کے لئے زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔

زہر کا اثر توفرت رفتہ زائل ہو گیا تھا لیکن دو چار روز بعد اس کے ذیلی اثرات ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اسے نہ صرف تیز بخار رہنے لگا بلکہ اس کے پورے جسم پر چھوٹے چھوٹے دانے بھی نکل آئے تھے۔

نرس روشن بی بی یوں تو ہر مریض کی دل و جان سے خدمت کرتی تھی لیکن احمد علی کی خدمت اور دیکھ بھال میں تو وہ حد سے گزر گئی تھی۔ وہ فارغ وقت میں اس کے بیڈ کے پاس نظر آتی۔ نہ صرف مریضوں میں بلکہ اسٹاف میں بھی اس کے بارے میں چرچے مگوئیاں ہونے لگیں۔

احمد علی تقریباً ایک مہینہ ہسپتال میں رہا اور پھر اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ روشن بی بی اس روز انفرماری میں تھی اور خوش بھی۔ انفرماری کے لئے کہ اب وہ احمد علی کے پاس بیٹھ کر باتیں نہیں کر سکتی تھی اور خوشی اس بات کی تھی کہ اس کا ایک مریض صحت یاب ہو کر جا رہا تھا جس کے زعمہ پہنچنے

دھوپ میں باپ کی شفقت کے سائے سے اور ٹھنڈے والی سردی میں ممتا کی آغوش کی حد سے خروم تھا۔

باپ کے بارے میں، میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا اور سیالکوٹ میں کب اور کیسے آکر آباد ہوا تھا۔ لیکن میری ماں سیالکوٹ کے ایک سرحدی گاؤں کی رہنے والی تھی۔

ٹانہ عین سرحدی پٹی پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس کے ساتھ ہی سرحد کے دوسری طرف جوں کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ سرحد کے دوسری طرف بھی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ان دونوں بستیوں کے درمیان فاصلہ بس اتنا ہے کہ دس گیارہ سال کی عمر کا بچہ اپنے گاؤں میں کھڑے ہو کر پتھر پھینکتے تو وہ سرحد کے دوسری طرف والے گاؤں میں جا کرے گا۔

میری نانی دوائی برکت بی بی ٹانہ کی بہت معروف ہستی تھی۔ آس پاس کی بستیوں کے لوگ بھی اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ دن ہو یا رات، قلفی جمادینے والی سردی ہو یا دماغ بکھا دینے والی چلچلاتی دھوپ، دوائی برکتے نے کبھی خدمت سے انکار نہیں کیا تھا۔ ٹانہ اور آس پاس کی بستیوں کے آدمے سے زیادہ بچوں کی ولادت اس کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

میری ماں روشن بی بی نے پرانری تک کی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں حاصل کی تھی۔ پھر سیالکوٹ اپنے ماموں کے پاس آ گئی۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا۔ اس کی مامی اگرچہ بڑی ظالم عورت تھی مگر روشن بی بی اس کی سختیاں برداشت کرتی رہی اور تعلیم حاصل کرتی رہی۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ گاؤں واپس آ گئی۔

وہ اٹھارہ سال کی الہردو شیرہ تھی۔ اونچی لمبی، صحت مند، نہایت حسین۔ گاؤں کے لوگ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ روشن کو بھی اپنی ماں کی طرح خدمتِ خلق کا شوق تھا۔ اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے دوائی برکتے نے اسے بھی اپنا کام سکھا دیا۔ روشن کچھ عرصہ تک تو اپنی ماں کے ساتھ ہی جابا کرتی تھی پھر وہ اکیلی جانے لگی۔ بہت کم عرصہ میں وہ اپنے کام میں ماہر ہو گئی اور آس پاس کے دیہاتوں میں دوائی روشن کے نام سے مشہور ہو گئی۔

روشن بی بی صرف دوائی نہیں رہتا چاہتی تھی۔ وہ نرس بننا چاہتی تھی۔ گاؤں میں رہ کر تو وہ صرف زچکیاں ہی کروا سکتی تھی۔ وہ گاؤں چھوڑ کر پھر سیالکوٹ آ گئی جہاں تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد اسے نرسنگ سکول میں داخلہ مل گیا اور رہائش کے لئے ہوسٹل میں جگہ بھی۔

ابھی وہ نرسنگ کا کورس کر رہی تھی کہ گاؤں میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ دوائی برکتے اکیلی نہیں مری تھی، اس روز گاؤں کے کئی لوگ موت کا شکار ہوئے تھے اور کئی زخمی ہوئے تھے۔ سرحدی علاقوں میں انڈین اور پاکستانی فوجی دستوں میں جھڑپیں روز کا معمول بن چکا تھا۔

ہار میر بھی کام چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اور پھر ایک روز احمد علی نے روشن کو مار کر گھر سے نکال دیا۔ روشن اپنے بچے کو سینے سے لگائے دوبارہ ہوشل میں آگئی۔ چند روز تک کسی طرح گزارا۔ پھر مگر ایک شیر خوار بچے کے ساتھ ہسپتال کی ڈیوٹی دینا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے بچے کو ایک نرسنگ ہوم میں داخل کرادیا۔

وہ بچہ میں تھا۔ عبدالرؤف۔ جسے روشن بی بی پیار سے رونی کہا کرتی تھی۔

میری ماں روشن۔ میرے لئے سب کچھ تھی۔ ماں بھی، باپ بھی۔ اس نے مجھے ماما بھی یہ تھی اور باپ کی شفقت بھی۔ اسے جب بھی وقت ملتا نرسنگ ہوم آ جاتی۔ کبھی مجھے گود میں لئے وہیں بیٹھی رہتی، کبھی گھمانے کے لئے باہر لے جاتی۔ میرا باپ احمد علی ایک مرتبہ بھی دیکھنے کے لئے نرسنگ ہوم نہیں آیا تھا۔ میں صرف ایک ہی چہرہ پہچانتا تھا۔ اپنی ماں کا۔ ماما کے نور سے روشن چہرہ۔ باپ تو میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔

پانچ سال گزر گئے۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں کئی خشیب و فراز آئے۔ میں ہوشل ہی میں تھا۔ میرا اسکول میں بھی داخلہ کرادیا گیا تھا۔ اس عرصہ میں میرے ماں باپ کے بیچ کئی مرتبہ صلح ہوئی اور کئی مرتبہ جھگڑا ہوا۔ صلح کے دنوں میں اماں مجھے لے کر احمد علی کے ہاں چلی جاتی۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ وہ میرا باپ ہے۔ مگر مجھے اس کے چہرے پر کبھی شفقت اور اپنے لئے محبت نظر نہیں آئی تھی۔ میں ہمک کر اس کی طرف لپکتا اور وہ مجھے دھتکار دیتا۔

ماں اور باپ کے بیچ صلح و دشمنی کا دور کبھی بھی ہفتہ دس دن سے زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا تھا۔ اس کا دل بھر جاتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے لڑ جھگڑ کر ماں کو گھر سے نکال دیتا۔

میں پانچ سال کا ہو چکا تھا۔ ماں نے اب احمد علی کے ہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔

انہی دنوں ایک بڑا سرکاری آفیسر بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوا۔ اماں کی ڈیوٹی بھی ان دنوں آپشٹل وارڈ میں تھی۔ یہ آپشٹل وارڈ الگ الگ کمروں پر مشتمل تھا۔ یہاں صرف دولت مند لوگ ہی داخل ہوتے تھے۔ انہیں کمروں میں ہر سہولت مہیا کی جاتی اور ان کی ضروریات کا خیال رکھا جاتا۔

ادویز عمر کا وہ سرکاری آفیسر توفیق احمد دو سال پہلے لاہور سے ٹرانسفر ہو کر آیا تھا۔ اسے رہائش کے لئے انہی تک کوئی جگہ نہیں ملا تھا اس لئے وہ شہر کے پوش علاقے میں واقع ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹنڈھرا ہوا تھا۔ یہ بھی جگہ ہی تھا اور یہاں اسے گھر جیسی سہولت حاصل تھی۔

توفیق احمد کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت گیا ہوا تھا۔

کی کوئی امید نہیں تھی۔

ہسپتال میں مریض آتے رہے اور صحت یاب ہو کر جاتے رہے۔ مریض کے رخصت ہوجانے کے بعد ڈاکٹر اور نرسیں بھی اسے بھول جاتیں اور مریض بھی انہیں فراموش کر دیتا۔ لیکن احمد علی کے بارے میں بات کچھ مختلف ثابت ہوئی تھی۔ وہ ہسپتال سے رخصت ہونے کے بعد بھی نرس روشن بی بی سے ملنے کے لئے وہاں آتا رہا۔ اس طرح ان کے بارے میں مختلف باتیں پھیلنے لگیں۔

روشن بی بی آوارہ یا بد چلن نہیں تھی۔ وہ گاؤں کی ایک سیدھی سادھی لڑکی تھی جو خدمت کا جذبہ لے کر شہر آئی تھی اور نرس بن کر ڈکھی انسانیت کی مسیحا بن کر رہی تھی۔ اس نے ہسپتال میں آنے والے ہزاروں لوگوں کی دل و جان سے خدمت کی تھی۔ ان میں غریب بھی تھے اور دولت مند بھی۔ بوڑھے بھی، جوان بھی۔ بد صورت بھی اور خوبصورت بھی۔ لیکن کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی کہ کسی کو روشن کی طرف انگلی اٹھانے کا موقع ملتا۔ لیکن احمد علی کی خدمت اور تیار داری کرنے ہوئے وہ اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھی۔ اس کے قدم ڈمک گئے۔

کچھ عرصہ بعد جب روشن کو پتہ چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو وہ بدحواس ہو گئی۔ احمد علی بڑی مشکل سے شادی پر آمادہ ہوا تھا۔ پہلے تو اس نے صاف انکار کر دیا لیکن جب روشن نے اسے دھمکیاں دیں تو وہ شادی کے لئے تیار ہو گیا۔

روشن کے ہاں پہلے بچے کی ولادت ہوئی تو احمد علی نے اسے اپنی اولاد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ آوارگی اور بد چلنی کے الزام نے روشن کو پاگل کر دیا۔ وہ احمد علی پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑی۔ کوئی بھی شریف عورت شوہر کا ہر ظلم برداشت کر سکتی ہے۔ بھوکی رہ لیتی ہے، مار کھا سکتی ہے مگر بد چلنی کا الزام برداشت نہیں کر سکتی۔

احمد علی جفت سازی کا کام کرتا تھا۔ اس کی دکان شہر کے ایک بارونق علاقے میں تھی۔ دکان کے پیچھے رہائش کے لئے بھی ایک کمرہ تھا جس کے ساتھ ایک بہت چھوٹا سامن بھی تھا۔ اس رہائشی حصے میں آمدورفت کے لئے دکان کے اندر سے بھی راستہ تھا اور بنگلی گلی میں بھی ایک دروازہ تھا۔

احمد علی نے اپنی مدد کے لئے دکان پر ایک کاریگر بھی رکھا ہوا تھا۔ روشن نے ہسپتال کا ہوشل چھوڑ کر دکان کے عقبی حصے میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس پہلے ہنگامے کے بعد ان کی محبت میں دراڑیں پڑ گئیں۔ روز روز جھگڑے ہونے لگے۔ ان جھگڑوں کا اثر احمد علی کے کاروبار پر بھی پڑا۔ وہ نئے جوتے بنا کر فروخت کیا کرتا تھا۔ مگر اب گاہک اس کے کام میں نقص نکالنے لگے۔

راستہ ہر کے لئے بھی لے جانا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے میں کار پر اسکول آیا جایا کرتا تھا، پھر مجھے تاکہ گلوادیا گیا جس پر اسکول کے اور بھی بہت سے بچے ہوتے تھے۔

توفیق احمد گھر سے باہر ہوتا تو ماں مجھے آغوش میں سمیٹ کر خوب پیار کرتی۔ میرا منہ چومتی۔ یہی تو ایک ہستی تھی جسے مجھے سے پیار تھا۔

ایک روز توفیق احمد کسی بات پر مجھ پر بہت بگڑا۔ اس نے مجھے ایک زوردار طمانچہ بھی رسید کر دیا۔ ماں تڑپ اٹھی۔ اس نے پہلی بار توفیق احمد کے سامنے تیز لہجے میں بات کی تو موصوف نے اسے بھی تھپڑ رسید کر دیا۔ ماں مجھے لے کر اپنے کمرے میں کھس گئی اور ہم ماں بیٹا دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے آنسو بہاتے رہے۔

توفیق احمد سے شادی کے بعد اس کی ضد پر ماں نے ہسپتال کی نوکری بھی چھوڑ دی تھی۔ اور اب مجبوری یہ تھی کہ وہ مجھے لے کر کہیں جا بھی نہیں سکتی تھی۔ ہم ماں بیٹا اس ظالم و جاہل شخص کے رحم و کرم پر تھے جسے ہم نے اپنا سب کچھ سمجھا تھا۔ احمد علی میری ماں سے لڑتا جھگڑتا ضرور تھا لیکن اس نے بھی ماں پر اس طرح ہاتھ نہیں اٹھایا تھا اور نہ ہی کبھی میرے ساتھ ایسی کوئی زیادتی کی تھی۔

ماں اور توفیق احمد میں آئے دن جھگڑے ہونے لگے اور ان جھگڑوں کی بنیاد ہمیشہ میں ہی بنتا۔ توفیق احمد اکثر مجھے موچی کا بیٹا کہا کرتا تھا اور میری وجہ سے ماں کو بھی طعنے دیا کرتا تھا۔

اور پھر ایک روز مجھے ہوسٹل میں داخل کروادیا گیا۔ ماں پہلے ہر دوسرے تیسرے دن مجھ سے ملنے کے لئے آتی رہی۔ پھر ہفتے میں ایک دن آنے لگی۔ اور پھر یہ وقفہ بڑھتا چلا گیا۔

توفیق احمد ایک مرتبہ بھی مجھ سے ملنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ وہ کیوں آتا؟ وہ تو میرا سوتیلا باپ تھا۔ اس نے مجھے بیٹے کی حیثیت سے قبول نہیں کیا تھا۔ میرے سگے باپ احمد علی نے بھی مجھے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کیا تھا تو سوتیلا باپ کیسے مجھے اپنا بیٹا مان لیتا۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ میرے ہوسٹل، اسکول کی فیس اور دیگر اخراجات دے رہا تھا۔

مجھے گھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ماں اب مہینے میں صرف ایک مرتبہ مجھ سے ملنے کے لئے آتی تھی۔ میں نے ہمیشہ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی دیکھی تھیں۔ وہ پہلے سے کچھ ڈبلی ہو گئی تھی۔ شاید بیمار بننے لگی تھی۔

تین سال گزر گئے۔ اور پھر اچانک ماں نے مجھ سے ملنے کے لئے ہوسٹل آنا بند کر دیا۔ چار مہینے گزر گئے۔ میں انتظار کرتا رہا لیکن ماں نے نہ آنا تھا نہ آئی۔

اور پھر ایک روز مجھے ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔ اسکول سے بھی میرا نام کٹ گیا تھا۔ یہ

ماں نے حسب معمول دوسرے مریضوں کی طرح توفیق احمد کی بھی دل لگا کر خدمت اور تیار داری کی۔ توفیق احمد جلد ہی روشن سے بے شکف ہو گیا اور ہسپتال سے جانے کے بعد بھی وہ اس سے ملتا رہا۔ ماں اسے اپنا ہمدرد سمجھی۔ وہ کئی مرتبہ مجھے بھی ساتھ لے کر ریٹ ہاؤس گئی تھی۔ توفیق احمد مجھے بہت پیار کرتا۔ اس نے مجھ سے بہت سارے کھلونے لے کر دیئے۔ ہمیں کار پر بٹھا کر گھمانے لے جاتا۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ کاش! یہ میرا باپ ہوتا۔ کتنی محبت تھی اسے مجھ سے۔ توفیق احمد یہی سمجھتا رہا کہ میری ماں بیوہ ہے۔ ایک روز اس نے ماں کو شادی کی پیشکش کر دی۔ ماں نے اس روز پہلی مرتبہ اسے علی احمد کے بارے میں بتایا۔ توفیق احمد ایک بہت بڑا سرکاری آفیسر تھا۔ اس کے بہت تعلقات تھے۔ وہ میری ماں کو اپنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے علی احمد کی گردن ناپ لی اور اسے روشن بی بی کو طلاق دینے پر مجبور کر دیا۔

ہمارے معاشرے میں سانس لینے والی عورت کتنی ہی مجبور اور بے بس کیوں نہ ہو، شوہر کتنا ہی ظالم، جاہل، آوارہ اور بد چلن کیوں نہ ہو، عورت اس سے طلاق کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ شوہر کی چوکھٹ پر گھٹ گھٹ کر دم توڑ دے گی مگر طلاق کا مطالبہ نہیں کرے گی۔ شوہر طلاق دے بھی دے تو اپنے آپ کو زعمہ و درگور سمجھنے لگتی ہے۔ مگر احمد علی سے طلاق ملنے پر میری ماں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ شاید اسے ایک عذاب سے نجات مل گئی تھی۔

احمد علی سے طلاق کے چار مہینے بعد ماں نے توفیق احمد سے عقد ثانی کر لیا اور وہ مجھے لے کر نرسنگ ہوسٹل سے ریٹ ہاؤس میں منتقل ہو گئی۔ بہت بڑا بنگلہ نما یہ ریٹ ہاؤس کئی کمروں پر مشتمل تھا۔ یہاں دورے پر آنے والے اور بھی سرکاری آفیسر ٹھہرا کرتے تھے۔ مگر توفیق احمد کی شادی کے بعد یہ سرکاری ریٹ ہاؤس پرائیویٹ بنگلہ بن گیا۔ دوسرے افسروں کے لئے کئی دوسرے ڈاک بنگلے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔

ماں خوش تھی۔ میں بھی بہت خوش تھا۔ توفیق احمد کو دیکھ کر ایک مرتبہ میرے دل میں یہ خواہش ابھری تھی کہ کاش یہ میرا باپ ہوتا۔ میری یہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ مجھے ماں کی مانتا کے ساتھ شفقت پوری بھی مل گئی تھی۔

لیکن میری یہ خوش فہمی بھی جلد ہی دور ہو گئی۔ توفیق احمد کا رویہ آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگا۔ پہلے وہ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ ماں کی شرارت پر مجھے ڈانٹتی تو وہ اسے ڈانٹ دیتا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ اب وہ مجھے پیار سے نہیں بلاتا تھا۔ بات بات پر ڈانٹ دیتا۔ ماں یہ سب کچھ دیکھتی اور دل تمام کر رہ جاتی۔ اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ مجھے ڈانٹ پڑنے پر اس پر کیا گزرتی تھی۔ توفیق احمد نے اب مجھے اپنے

مجھے چھوڑا اور اب تمہیں بھی چھوڑ گئی۔ لیکن تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟“
 ”میں کہاں جاؤں ابا؟ مجھے ہوسٹل سے بھی نکال دیا گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ مجھے کھانا کون کھلائے گا؟ میں کہاں جاؤں گا؟“

”کہیں بھی جا۔ میرے پاس مت آنا۔“ ابا نے جواب دیا۔ وہ فرش پر پچھی ہوئی ایک بوری پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بوری کا ایک کونا اٹھا کر اس کے نیچے سے دو اٹھدیاں نکال کر میری طرف پھینک دیں۔ ”یہ پیسے لے جا۔ روٹی لے کر کھا لینا۔ اور بھاگ جا یہاں سے۔ آئندہ میرے پاس مت آنا۔“

”مجھے اپنے پاس رکھ لو ابا! میں تمہارے پاس رہنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔
 ”ابے چل بھاگ یہاں سے۔“ ابا نے ایک ٹوٹا ہوا چھتر اٹھا لیا اور میرے چہرے کے سامنے ہلاتے ہوئے بولا۔ ”چل بھاگ یہاں سے۔ آئندہ اس طرف آیا تو چھری ادھیڑ دوں گا۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں بیٹگی ہوئی آنکھوں سے دیر تک اپنے بے رحم باپ کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے مجھ پر ذرا بھی ترس نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دونوں اٹھدیاں اٹھا کر جیب میں ڈال لیں اور وہاں سے چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ میرا باپ مجھے آواز دے کر روک لے گا۔ دوڑ کر مجھے گلے سے لپٹا لے گا۔ لیکن وہ ظالم اور بے رحم آدمی تھا۔ اس نے تو دوبارہ میری طرف دیکھا تک نہیں۔

سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا۔ میں اپنی ماں کو تلاش کر رہا تھا مگر میری ماں مجھ سے بہت دور اسلام آباد میں تھی۔ باپ میرے آس پاس تھا مگر اس کے دل میں میرے لئے ذرہ برابر بھی محبت نہیں تھی۔ وہ مجھے قریب بھی نہیں پھینکنے دیتا تھا۔ میں کئی مرتبہ اس کے پاس گیا لیکن اس نے ہمیشہ مجھے دھتکار دیا۔

سیالکوٹ کی سڑکوں پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے تین سال گزر گئے۔ اور یہ عرصہ میں نے کس طرح گزارا تھا، مجھے یاد نہیں۔ اور پھر ایک روز میں اسلام آباد پہنچ گیا۔ میں مختلف ٹرینوں پر سفر کرتا ہوا اولپنڈی پہنچا تھا۔ بغیر ٹکٹ سفر کرنے پر راستے میں ایک مرتبہ پکڑا بھی گیا تھا۔ مگر وہ ٹی ٹی شریف آدمی تھا۔ اس نے مجھے ایک اسٹیشن پر اتار دیا۔ دو گھنٹوں بعد میں دوسری ٹرین پر بیٹھ گیا

میں نے سیالکوٹ کے سرکاری ریست ہاؤس کے چوکیدار سے اپنے سوتیلے باپ توفیق احمد کا اسلام آباد کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ اسلام آباد پہنچ کر میں کئی گھنٹوں تک سڑکوں پر پھرتا رہا اور

انکشاف میرے لئے بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا کہ پچھلے تین مہینوں سے میری اسکول اور ہوسٹل کی فیس ادا نہیں کی گئی تھی۔ جس وقت مجھے ہوسٹل سے نکالا گیا تھا اس وقت میں نے ٹیکر اور کھدرا سفید کرتے پہن رکھا تھا۔ بیروں میں سلپہر تھے۔ مجھے ہوسٹل سے اپنا سامان بھی نہیں لینے دیا گیا۔ میں ریست ہاؤس پہنچا تو یہ انکشاف مزید سنسنی خیز ثابت ہوا کہ میرے سوتیلے باپ توفیق احمد کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا تھا اور چار مہینے پہلے وہ میری ماں کو لے کر یہاں سے چلا گیا تھا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ پچھلے چار مہینوں سے ماں مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئی تھی اور میرے اسکول اور ہوسٹل کی فیس ادا کیوں نہیں کی گئی تھی۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے ہوسٹل سے نکالے جانے کا افسوس نہیں تھا۔ ڈکھ تو ماں کے بچھڑنے کا تھا۔ وہی تو ایک ایسی ہستی تھی جس کے دل میں میرے لئے پیار تھا، محبت تھی۔ اور وہ بھی مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔

اپنے سوتیلے باپ توفیق احمد سے نفرت تو اسی روز ہو گئی تھی جب اس نے میری ماں کو تھپڑ مارا تھا اور پھر مجھے ہوسٹل میں داخل کر کے مجھ سے الگ کر دیا تھا۔ اور اب وہ میری ماں کو مجھ سے چھین کر درور لے گیا تھا۔

میں شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتا ہوا اس بازار میں پہنچ گیا جہاں میرے باپ احمد علی کی دکان تھی۔ دکان اُڑ چکی تھی۔ ایک طرف پھٹے پرانے جوتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور باپ دروازے کے اندر کی طرف اپنے اڈے پر بیٹھا پرانے جوتے گانڈھ رہا تھا۔

ان تین سالوں کے دوران میرا کبھی بکھار اپنے اس باپ سے آسنا سامنا ہو جاتا تھا لیکن اس کے رویے سے ہمیشہ میری دل شکنی ہوتی تھی۔ اور اس دل شکنی کے باوجود میں نے کبھی اس کا خیال ذہن سے نہیں نکالا تھا۔ آخر کو وہ میرا باپ تھا۔

احمد علی نے کام کرتے ہوئے ہاتھ روک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ماتھے پر ایک شکنیں اُبھر آئیں۔ چہرے کے تاثرات میں سردمہری نمایاں طور پر نظر آنے لگی۔

”کیا بات ہے..... کیوں آئے ہو یہاں.....؟“ اس کے لہجے میں بھی سردمہری تھی۔

”مجھے اسکول اور ہوسٹل سے نکال دیا گیا ہے ابا!“ میں نے ہولے سے کہا۔

”تو پھر میں کیا کروں؟“ اس نے مجھے گھورا۔ ”اپنی ماں کو جا کر بتا اور اس باپ کو جرنے.....“

”اماں اس کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔ پتہ نہیں کہاں۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”اوہ۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ ابا نے کہا۔ ”وہ اپنے عاشق کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔“

وقت کا منہ زور دھارا مجھے دھکیلا رہا۔ مجھے پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ میرے پاس اگرچہ رہنے کا ٹھکانہ تک نہیں تھا مگر پڑھائی سے میری دلچسپی کم نہیں ہوئی۔ پیٹ بھرنے کے لئے میں نے کچھ راتے تلاش کر لئے تھے۔ کبھی منڈی میں پانڈی گیری کرتا اور کبھی کسی ہوٹل میں برتن دھونے لگتا۔ اس طرح مجھے دو وقت کی روٹی تو مل جاتی۔

میں محبت کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔ کبھی باپ کے پاس، کبھی ماما کے پاس جا کر ان کے دلوں میں اپنے لئے جگہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا اور کبھی اسلام آباد پہنچ جاتا جہاں میرے سوتیلے باپ نے گھر میں میرے داخلے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ اس کے دل میں بھی میرے لئے کوئی جگہ پیدا نہیں ہو سکی تھی بلکہ اب تو وہ میری شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔ اس کے لئے میرے دل میں بھی نفرت بڑھتی جا رہی تھی اور اب میں کبھی کبھار اپنی اس نفرت کا اظہار بھی کرنے لگا تھا۔ اس نے میری ماں کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے نفرت کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

میں اٹھارہ سال کا ہو گیا تھا۔ میٹرک کا پرائیویٹ امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ اور یہ عرصہ میں نے کس طرح گزارا تھا یہ میں ہی جانتا تھا۔ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کبھی کبھار چھوٹے موٹے جرائم بھی کرنے پڑتے۔ ایک مرتبہ میں پکڑا بھی گیا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ ایک مرتبہ پولیس کی نظروں میں آ جانے کے بعد کوئی شخص شرافت کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ پولیس مجھے بھی اس دلدل کی طرف دھکیلتی رہی جس سے میں بچنا چاہتا تھا۔

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب میں اسلام آباد پہنچا تو میری ماں بہت بیمار تھی۔ اس کی جان لیوں پرانگی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس نے زندگی میں کتنے دکھ اٹھائے تھے۔

اسلام آباد پہنچ کر جب مجھے ماں کی بیماری کا پتہ چلا تو میں توفیق احمد کی پرواہ کئے بغیر بنگلہ میں گھس گیا۔ ماں کو دیکھ کر مجھے سینے میں سانس زکٹا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ لب گور تھی۔ چند سانس شاید میرے ہی انتظار میں آئی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ اور پھر چند منٹ بعد ہی اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ ہمیشہ کے لئے۔

توفیق احمد اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ لیکن چند منٹ بعد وہ بھی پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس روز پہلی مرتبہ میں نے اس کے سامنے زبان کھولی۔ اس نے مجھے دھکے دے کر گھر سے نکالنے کی کوشش کی تو میں نے ہاتھ اٹھا دیا۔

اس نے میری ماں کو مجھ سے چھینا تھا۔ میری ماں نے گھٹ گھٹ کر زندگی گزاری تھی اور بالآخر خود توڑ دیا تھا۔ وہ میری ماں کا قاتل تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھایا تو وہ اپنے کمرے سے پستول

بالآخر بنگلہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس وقت میری ماں کے علاوہ گھر میں صرف ایک نوکرانی تھی۔ ماں مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹے دیر تک روتے رہے۔

ماں نے مجھے نہلا دھلا کر اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں ماں کے ساتھ لیٹ کر سو گیا۔ مجھے کتنا سکون ملا تھا اس روز۔ اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔

میری آنکھ شور کی آواز سے کھلی تھی۔ ماں میرے ساتھ بستر پر نہیں تھی۔ دوسرے کمرے سے میرے سوتیلے باپ توفیق احمد کے چیخنے دھاڑنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں اٹھ کر اس کمرے کے دروازے پر آ گیا۔ میری ماں سہمی ہوئی توفیق احمد کے سامنے کھڑی تھی اور توفیق احمد کا چہرہ غصے سے لال سمجھوکا ہو رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرے دل میں اس سے زیادہ نفرت تھی۔ مگر میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

میں تین دن وہاں رہا اور اس دوران توفیق احمد مسلسل میری ماں سے لڑتا رہا۔ وہ مجھے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں تھا۔ بالآخر ماں نے سینے پر پتھر کی سل رکھ کر مجھے رخصت کر دیا۔

”اپنے باپ کے پاس چلا جا۔ شاید اسے تم پر رحم آ جائے۔“ ماں نے کہا۔ رخصت ہونے وقت اس نے مجھے پانچ سو روپے دیئے تھے اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

سیالکوٹ میں، میں سیدھا اپنے باپ کے پاس پہنچا۔ میرے پاس نوٹ دیکھ کر احمد علی کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اس نے روپے مجھ سے لے لئے۔ دو دن اپنے پاس رکھا اور دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔

”تو اپنے ماما کے پاس کیوں نہیں چلا جاتا۔“ اس نے کہا تھا۔ ”ٹائڈہ میں اس کی زمیندار ہے۔ ڈھور ڈنگر سمجھ کر تمہیں بھی اپنے پاس رکھ لے گا۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔“

مجھے ماں نے بتایا تھا کہ ٹائڈہ میں میرا ماما رہتا ہے جس کی تھوڑی بہت کھیتی باڑی ہے۔ جب ماں نے احمد علی سے شادی کی تھی تو وہ بھی ناراض ہو گیا تھا اور بہن سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ میں نے ماما کو صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا اور اب تو اس کی شکل بھی بھول گیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ لیکن بہر حال ایک امید لے کر میں ٹائڈہ پہنچ گیا۔ وہاں وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی۔ ماما نے مجھے پہچان تو لیا لیکن مجھے اپنے پاس رکھنے صاف انکار کر دیا۔ میں دوبارہ سیالکوٹ آ گیا۔

”تو سمجھو ہو گیا بندوبست۔“ پرویز نے کہا۔ ”میں بھی اکیلا ہی رہتا ہوں یا! میرے ساتھ رہنا اور رکشہ چلانا۔ عیش کرتا۔“

”مگر مجھے تو رکشہ چلانا نہیں آتا۔“ میں نے کہا۔

”یہ کون سا مشکل کام ہے۔“ پرویز بولا۔ ”میں سکھا دوں گا تمہیں۔ دو تین دن میں سیکھ جاؤ گے۔“

لاہور میں ہم مینار پاکستان والے چوک پر اتر گئے۔ ایک طرف منٹو پارک میں مینار پاکستان اور سامنے بادشاہی مسجد اور قلعہ۔ میرا خیال تھا کہ یہاں سے ہم رکشہ یا ٹانگے پر کہیں جائیں گے۔ ہم چوک پارک کے لیڈی ونگٹن ہسپتال کی طرف آ گئے اور ٹیکسالی گیٹ میں داخل ہو گئے۔ میں پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا۔ میرے لئے یہاں کی ہر چیز حیرت انگیز تھی۔ تنگ سی گلیاں، سرخ اینٹوں کی پرانی عمارتیں۔ بعض عمارتیں تو اس قدر پرانی تھیں کہ ان کے کسی بھی وقت ڈھیر ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ مگر ان میں بھی لوگ آباد تھے۔

پرویز ایک نسبتاً کشادہ گلی میں داخل ہو گیا اور تقریباً پچاس گز چلنے کے بعد رک گیا۔ یہ کوئی بہت ہی پرانا مکان تھا۔ لکڑی کا گیٹ نما وہ دروازہ اتنا کشادہ تھا کہ ایک ٹانگہ آسانی سے داخل ہو سکتا تھا۔ اوپر تک نما کنڈا لگا ہوا تھا۔ پرویز نے کنڈا کھول دیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ بہت لمبا چوڑا صحن تھا جو کسی طویلے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ لید کی بو آرہی تھی۔ ایک طرف دو ٹوٹے پھوٹے ٹانگے کھڑے تھے۔ دیوار کے ساتھ گھوڑوں کو پانی پلانے کے لئے حوض بنا ہوا تھا۔

اس احاطے میں ایک طرف تین کمرے تھے اور اس کے ساتھ دوسری طرف دو کمرے۔ ان دونوں کمروں کی اصل چھتیں عرصہ پہلے ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ ان کی جگہ ٹین کی چھتیں ڈال دی گئی تھیں اور دروازے بھی توڑ کر کشادہ کر دیئے گئے تھے۔ ایک حصے میں ایک رکشہ کھڑا تھا جبکہ دوسرا حصہ خالی تھا۔ دائیں طرف والے تین کمرے البتہ کچھ بہتر حالت میں تھے۔ دو کمروں کو تالا لگا ہوا تھا، ایک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہماری آواز سن کر اس کمرے سے ایک بوڑھا آدمی باہر آ گیا۔ اس نے صرف دھوتی پہن رکھی تھی۔

”چاچا! میں پرویز ہوں۔“ پرویز نے اسے آواز دے کر کہا۔ ”میرے ساتھ ایک پروہنا بھی ہے۔ تم مانجھے کی دکان سے دو گلاس چائے لے کر آؤ۔“

وہ بوڑھا باہر کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ پرویز نے ایک کمرے کا تالا کھولا اور مجھے اشارہ کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

نکل لایا۔ اس نے گولی بھی چلائی مگر اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ نشانہ خطا ہو گیا۔ میں نے اسے دوسرا ناز کرنے کا موقع نہیں دیا اور پستول چھین کر اس کے سینے میں دو گولیاں اتار دیں اور پھر میں دوڑتا ہوا اپنی ماں کے کمرے میں پہنچ گیا۔ جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

اب وہاں رکنا میرے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں دوڑتا ہوا بنگلے سے باہر نکل گیا۔ مجھے گھر کی ملازمہ کے سوا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ پولیس کو میرا طریقہ دے گی اور میری تلاش شروع ہو جائے گی۔

وہ میرے ہاتھوں ہونے والا پہلا قتل تھا اور مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ البتہ کراہ جانے کا خوف تھا۔ دو گھنٹوں بعد میں راولپنڈی میں تھا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھے سیالکوٹ جانے والی بس بھی مل گئی۔

توفیق احمد کا پستول میرے پاس ہی تھا جسے میں نے پتلون کی جیب میں چھپا لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب مجھے اس پستول کی ضرورت پیش آئے گی اس لئے میں نے اسے چھینکا نہیں تھا۔ مجھے افسوس اس بات کا تھا کہ جس ماں نے مجھے نو سینے پیٹ میں اٹھائے رکھا تھا، جس کے لئے اتنے دکھ جھیلے تھے، میں اس کے جنازے کو کندھا بھی نہیں دے سکا تھا۔ پولیس میری تلاش میں اگلے ہی روز سیالکوٹ پہنچ گئی۔ میری قسمت اچھی تھی کہ پولیس کے آنے سے صرف آدھ گھنٹہ پہلے میں اس کھولی سے نکل گیا تھا جہاں پچھلے دو سال سے رہائش پذیر تھا۔ اب سیالکوٹ میں رہنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں لاہور جانے والی بس پر سوار ہو گیا۔

میرے پاس تھوڑی بہت رقم تھی اور میرا خیال تھا کہ مجھے لاہور میں کہیں نہ کہیں کوئی کام مل جائے گا۔ اتفاق سے مجھے بس میں ایک ایسا آدمی مل گیا جس سے مجھے بے تکلفی ہو گئی۔ پرانا نام کا وہ آدمی گوجرانوالہ سے بس پر سوار ہوا تھا۔ وہ لاہور میں رکشہ چلاتا تھا۔ اس کے پاس ایک دو رکشے تھے۔ ایک وہ خود چلاتا تھا اور دوسرا کرائے پر دے رکھا تھا۔ میں نے اپنے بارے میں اسے بتایا کہ میٹرک کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔ سیالکوٹ بھی اس سلسلے میں گیا تھا مگر کام نہیں بنا۔ اب لاہور واپس جا رہا ہوں۔

”لاہور میں کہاں رہتے ہو؟“ پرویز نے پوچھا۔

”میں دراصل ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ لاہور بھی پہلی مرتبہ جا رہا ہوں۔ وہاں نہ تو کوئی جاننے والا ہے اور نہ ہی کوئی ٹھکانہ۔ مگر ظاہر ہے کوئی نہ کوئی بندوبست تو کرنا ہی پڑے گا میں نے جواب دیا۔

جانا چھوڑ دیا۔

میں نے پرویز کو چھوڑ کر الگ ہونا چاہا تو یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ میری شرک۔ اس کی گرفت میں تھی۔

”تم جیسے ہی چھوڑ کر جاؤ گے پکڑے جاؤ گے رونی باؤ!“ وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تم پر اسی وقت شبہ ہو گیا تھا جب بس میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ تمہاری باتوں اور چہرے کی گھبراہٹ سے میں سمجھ گیا تھا کہ تم کوئی سنگین جرم کر کے بھاگے ہوئے ہو۔ مجھے تمہارے جیسے آدمی کی ضرورت تھی اس لئے میں ہمدرد بن کر تمہیں اپنے ساتھ لے آیا۔ اگلے ہی دن میں نے اپنا ایک بندہ سیالکوٹ بھیج دیا تھا جس نے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا۔ تم اسلام آباد میں اپنے سوتیلے باپ کو قتل کر کے بھاگے تھے۔ پولیس تمہارے پیچھے سیالکوٹ پہنچ گئی تھی۔ تم تو بھاگ نکلے، پولیس نے تمہارے سکے باپ کو پکڑ لیا۔ تمہارا پوچھنے کے لئے اسے اتنی مار لگائی کہ وہ تھانے ہی میں مر گیا۔ پولیس نے اس کی موت کو ہارٹ ٹیل قرار دے کر لاش ایک سماجی ادارے کے حوالے کر دی۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اپنے باپ کی موت کا سن کر مجھے ذرا بھی دکھ نہیں ہوا تھا۔ وہ ایسی ہی سزا کا مستحق تھا۔ اس نے میری ماں کو برباد کیا تھا۔ اگر وہ میری ماں پر بد چلتی کا الزام نہ لگاتا اور اسے دھکے دے کر گھر سے نہ نکالتا تو آج میں بھی اس طرح پرویز جیسے آدمی کے چنگل میں نہ پھنسا ہوتا۔

”ویسے تم نے جانا کہا ہے رونی باؤ؟“ پرویز کہہ رہا تھا۔ ”تمہارا آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں۔ پولیس کے خوف سے بھاگے پھرو گے۔ کہیں بھی چند روز سے زیادہ نہیں ٹک سکو گے۔ یہیں نکلے روہمرے پاس۔ دھندہ کرو اور عیش کرو۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گا۔“

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ پرویز نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں جہاں بھی جاؤں گا، پکڑے جانے کا خوف سائے کی طرح میرا پیچھا کرے گا اور میں خوف کے سائے میں زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ یہاں کم از کم یہ تو تھا کہ مجھے پرویز جیسے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل ہوں گی۔ یہ جرائم پیشہ لوگ تھے۔ پولیس سے ان کا یارا نہ تھا۔ یہ لوگ مجھے پولیس سے بچا سکتے تھے۔ ان کا ساتھ چھوڑ کر میں ان کی بھی دشمنی مول نہیں لیتا چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ”لیکن میں عورتوں کے دھندے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں اپنے آپ کو عورتوں کا دلال نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔“

”خوش کیا ای رونی باؤ!“ پرویز کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”ہمارے پاس اور

کافی کشادہ کمرہ تھا۔ ایک طرف چار پائی بچھی ہوئی تھی۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ دو تیز کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی میز تھی۔ کھونٹوں پر کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بھارتی، پاکستانی اور ہالی وڈ کی ایکٹرسوں کی تصویریں چسپاں تھیں۔ بغیر دروازوں والی ایک الماری کے نچلے خانے میں ایک ٹرک اور اوپر والے دو خانوں میں تہہ کے ہوئے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔

”رونی باؤ..... یہ ہے میرا غریب خانہ۔“ پرویز میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دادے پر دادے کی جائیداد ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اسے بیچ دوں اور کسی ایسے علاقے میں کوئی چھوٹا سا مکان خرید لوں۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد بولہ چائے لے آیا۔

پرویز نے مجھے ایک کمرہ دے دیا۔ اس میں ایک چار پائی تھی جس پر میلا سا بستر بچھا ہوا تھا۔ میری وہ رات بے چینی میں گزری تھی۔ ذہن پر یہی خوف سوار تھا کہ مجھے پکڑنے کے لئے پولیس نہ یہاں پہنچ جائے۔

اگلے دو تین دن بھی کچھ بے چینی ہی میں گزرے۔ پکڑے جانے کا خوف ہر وقت ذہن پر سوار رہتا۔ اس خوف کی وجہ سے دو دن تو میں احاطے سے باہر ہی نہیں نکلا تھا۔

اگلے تین چار روز میں پرویز نے مجھے رکشہ چلانا سکھا دیا اور اس کے بعد مجھے شہر کے مختلف علاقوں میں گھماتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مجھے کرائے کے حساب اور پولیس والوں سے نمٹنے کے گُر بھی سمجھاتا رہا۔

اب میں باقاعدہ رکشہ ڈرائیور بن گیا تھا۔ پہلے روز جو کچھ کمایا وہ پرویز کے سامنے رکھ دیا۔ لیکن اس نے ایک پیسہ بھی لینے سے انکار کر دیا۔

”یہ سب تمہارا ہے رونی باؤ!“ اس نے کہا۔ ”مجھے تم سے کوئی لالچ نہیں ہے۔ تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ تو مجھے خوشی ہوگی۔“

پرویز کے اس طرز عمل پر مجھے خوشی ہوئی۔ دنیا میں کوئی تو ایسا تھا جسے مجھ جیسے لاوارث سے ہمدردی تھی۔ لیکن ڈیڑھ ہفتے بعد میری یہ خوش فہمی بھی دور ہو گئی۔ اس نے کسی ہمدردی کی وجہ سے مجھے سہارا نہیں دیا تھا۔ وہ منشیات فروش تھا۔ اور بعض مخصوص گاہکوں کو عورتیں بھی سپلائی کرتا تھا۔ ہماری رہائش سے ذرا آگے بازار حسن تھا۔ پرویز کے وہاں بڑے تعلقات تھے اور اپنے کاروبار کے سلسلے میں ہر رات وہاں جاتا تھا۔ ایک دوسرے مجھے بھی ساتھ لے گیا تھا۔ لیکن پھر میں نے

اس زمانے میں میرے پاس ایک بہت شاندار گاڑی ہوا کرتی تھی۔ میں نے اس نوجوان کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈالا۔ بوڑھے باپ کو بھی ساتھ بٹھالیا اور سمن آباد کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں لے گیا جہاں صرف منشیات کے عادی افراد کا علاج ہوتا تھا۔

”خارج کی پرواہ نہیں کرنا۔“ میں نے ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اس نوجوان کی زندگی لوٹانی ہے۔ اسے پہلے کی طرح معاشرے کا ایک معزز شہری بنانا ہے۔“

علاج پر جو کچھ خرچ ہوگا، میں دواں گا۔“

ڈاکٹر کے کہنے پر میں نے دس ہزار روپے کاؤنٹر پر جمع کروادئے۔ نوجوان کو ہسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ اس کے بوڑھے باپ کو میں نے گلشن راوی میں اس کے گھر پہنچا دیا۔ وہ بوڑھا مجھے ہزاروں دعائیں دے رہا تھا۔ مجھے فرشتہ سمجھتا تھا۔ جو اس کے بیٹے کی جان بچانے کے لئے آگیا تھا۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ اس کے جوان بیٹے کو موت کے منہ میں دھکیلنے والا بھی میں ہی ہوں۔

اس روز سے مجھے ہیر وئن سے نفرت ہو گئی۔

میں مکمل طور پر جرائم کی دلدل میں دھنس چکا تھا جس سے نکلتا اب میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ لوگ مجھے خونخوار بھیڑیا اور درندہ سمجھتے تھے۔ میں خود بھی اپنے آپ کو حیوان سمجھتا تھا۔ لیکن اس کا ذمہ دار کون تھا؟ میں خود؟ معاشرہ؟ میرا وہ باپ جو اس دنیا میں میرے آنے کا باعث بنا تھا لیکن اس نے میری ماں کو بد چلن کہہ کر گھر سے نکال دیا تھا؟ یا وہ سوتیلا باپ جو میری ماں کے سُن و شباب پر تو مرنا تھا لیکن اس نے مجھے بیٹے کی حیثیت سے قبول نہیں کیا تھا؟ میں باپ کی شفقت اور محبت کے لئے کیسے کیسے تڑپا تھا۔ لیکن مجھے ہر مرتبہ دھتکار دیا گیا۔ اگر مجھے باپ کی شفقت ملتی تو آج میں وہ نہ ہوتا جو اس وقت ہوں۔ اور آپ بھی میری یہ کہانی نہ پڑھ رہے ہوتے۔ میں بھی ان چودہ کروڑ میں سے ایک ہوتا جس سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔

ماضی کو یاد کر کے میرے دل کے زخم ہرے ہو گئے۔ میرے سامنے سو یوں کی پلیٹ رکھی تھی جو پڑوں نے نجانے کیا سمجھ کر بھیجی تھی۔ اب سویاں کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

میں اٹھ کر کمرے میں آگیا اور الماری میں سے بیگ نکال کر اس دولت کا جائزہ لینے لگا جو مفت میں میرے ہاتھ لگی تھی۔ رقم میں نے گنتے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی لیکن میرے اندازے کے مطابق وہ مجموعی طور پر ایک کروڑ سے زیادہ کی دولت تھی۔

میں دھکے نامی اس عورت کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کون تھی اور اس کے پاس اتنی دولت کہاں۔ سے آئی تھی؟ میں دیر تک ان زیورات کا معائنہ کرتا رہا اور پھر انہیں بیگ میں ڈال

بھی بہت سے دھندے ہیں۔ تم فکر مت کرو۔ اور ہاں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ بڑے بڑے پولیس افسر ہمیں سلام کرتے ہیں۔ یہ سارے دھندے مل جل کر ہی ہوتے ہیں۔ پولیس کے تعاون کے بغیر کوئی یہاں بڑھک بھی نہیں مار سکتا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔“ اس نے میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”بھاگنے یا ہمیں دھوکا دینے کی کوشش مت کرنا۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ میں نے سر ہلا دیا۔

اور پھر میں نے دانستہ طور پر اس دلدل میں پہلا قدم رکھ دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا حوصلہ بڑھتا گیا۔ دو سال بعد پرویز ایک مخالف پارٹی کے ساتھ لڑائی میں مارا گیا۔ میں بھی بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اور پھر ایسا ہوا کہ وقت کے طوفانی تھیڑے مجھے رگیدتے چلے گئے۔ میں اپنے مخالفین کی موت بن گیا۔ زیر زمین دنیا میں میرے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ مجھے خونخوار بھیڑیے اور درندے کے نام سے پکارا جانے لگا۔ میں واقعی درندہ تھا۔ کئی لوگ میرے ہاتھوں سے مارے جاتے تھے۔ میں قاتل تھا۔ لیکن میں نے کبھی اپنے جرم کا ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ پولیس کو مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی حسرت ہی رہی۔

اور پھر ایک روز میں نے وہ خوفناک منظر دیکھا کہ میرا دل کانپ اٹھا۔ وہ ایک شریف گھرانے کا پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ لیکن ہیر وئن کے نشے نے نہ صرف اس کی زندگی برباد کر دی تھی بلکہ اس کے ماں باپ کی زندگی میں بھی اندھیرا بھر دیا تھا۔

زخموں سے چورہ نوجوان فٹ پاتھ پر پڑا ہوا تھا۔ کپڑے میلے کچیلے اور پٹھے ہوئے تھے۔ بال اُلجھے ہوئے تھے۔ اس کی عمر پچیس چھپیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ ہیر وئن نے اسے کھنڈا بنا کر رکھ دیا تھا۔ ایک بوڑھا اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ بال برف کی طرح سفید اور چہرے پر بے پناہ کرب تھا۔

وہ بوڑھا اس نوجوان کا باپ تھا۔

لوگ دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس بوڑھے کی مدد کرنے کی بجائے اس نوجوان کو گالیاں دے رہے تھے جو اپنے ہی ہاتھ جبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے بازوؤں کو دانتوں سے بھینچوڑ رہا تھا۔

میں یہ سب کچھ دیکھ کر کانپ اٹھا۔ ہیر وئن کی بربادی میں نے پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔

اخبار کی اطلاع کے مطابق دھکے سفارتی فرائض کے سلسلے میں پچھلے دس سال سے پاکستان میں مقیم تھی۔ وہ زیادہ تر اسلام آباد میں ہی رہتی تھی لیکن مبینہ میں ایک ہفتے کے لئے لاہور آ جاتی تھی جہاں گلبرگ میں اس نے کوٹھی کرائے پر لے رکھی تھی۔ لاہور میں اس کی مصروفیات بالکل ذاتی نوعیت کی ہوتی تھیں۔ حکومت پاکستان کو اس کی کوٹھی کا بھی علم تھا اور اس کی لاہور آمد و رفت بھی حکومت کے علم میں رہتی تھی۔ غیر ملکی سفارت کاروں کی حفاظت کی ذمہ دار حکومت ہی ہوتی ہے۔ اسلام آباد میں دھکے کو سفارتی قواعد و ضوابط کے مطابق تمام ضروری سہولتیں اور محافظ فراہم کئے گئے تھے لیکن لاہور کے لئے دھکے نے گارڈ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے حکومت پاکستان کو باقاعدہ طور پر آگاہ کیا تھا کہ چونکہ لاہور اس کی آمد و رفت بالکل ذاتی نوعیت کی ہوتی ہے اس لئے وہ سرکاری محافظ لینا ضروری نہیں سمجھتی۔ اس نے کوٹھی پر ایک مسلح چوکیدار رکھا ہوا تھا۔ پولیس نے اسے ذکیقتی کی واردات قرار دیا تھا۔ نامعلوم ڈاکو، چوکیدار اور مادام دھکے کو قتل کر کے لاکھوں روپے کی نقدی اور زیورات لے گئے تھے۔

ان ایونٹ پیپرز نے دھکے کے قتل کے حوالے سے اور بھی بہت سی خبریں شائع کی تھیں۔ ملک شہاب کے بارے میں بھی بہت سی خبریں تھیں۔

اب کچھ روز تک میرا اس کوٹھی سے باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پولیس مشتبہ افراد کی تلاش میں چھاپے مار رہی تھی اور میں زیر زمین دنیا کا بدنام ترین آدمی تھا۔

مجھے اس کوٹھی میں پناہ لئے ہوئے بارہ دن گزر گئے۔ اس دوران میں ضرورت کی چیزیں لینے کے لئے صرف دو مرتبہ گھر سے باہر نکلا تھا۔ میں نے اخبار والے سے کہہ دیا تھا۔ وہ ہر صبح باقاعدگی سے اخبار ڈال جاتا تھا۔ ان اخبارات کے ذریعے میں حالات سے آگاہ ہو رہا تھا۔

صبح اور سہ پہر میں برآمدے میں کرسی پر بیٹھتا تو وہ حسینہ بھی اپنے مکان کی چھت پر نظر آ جاتی۔ میں نے کبھی اسے کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ کوئی ایسی حرکت کر کے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس طرح اندیشہ تھا کہ وہ آگے چل کر میرے لئے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔ لیکن وہ بھی بڑی ثابت قدم نکلی تھی۔ اس کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی بھانجی کے ہاتھ ہر روز میرے لئے کوئی نہ کوئی چیز بھیج دیتی۔

دو دن اور گزر گئے۔ پولیس کی سرگرمیاں اب ماند پڑ گئی تھیں۔ اس طوفان سے جو دھول اٹھ چکی تھی، وہ آہستہ آہستہ بیٹھ رہی تھی۔ اور پھر میں نے گھر سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن مجھے اس بیک کی فکر تھی جسے نہ میں یہاں چھوڑ سکتا تھا اور نہ اپنے ساتھ لے جاسکتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد ایک ترکیب میری سمجھ میں آ گئی۔

کر دو بارہ الماری میں رکھ دیا اور پھر وہیں بستر پر لیٹے لیٹے اوٹ گھسنے لگا۔

دو بارہ جب باہر نکلا تو شام ڈھل رہی تھی۔ میں برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں غیر ارادی طور پر اس مکان کی چھت کی طرف اٹھ گئیں۔ کپڑے ابھی تک رسیوں پر لٹکے ہوئے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی میں نے دروازے کو تالا لگا دیا اور باہر نکلتے ہوئے ایک بار پھر اس چھت کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں موجود تھی۔ مجھے گیٹ سے باہر نکلتے دیکھ کر وہ تیزی سے سڑھیوں کی طرف لپکی تھی۔

میں نے گیٹ کو تالا لگایا اور گلی میں اس مکان کی طرف چلنے لگا۔ وہ اپنے مکان کے دروازے میں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور سیدھا آگے نکل گیا۔

دو تین گلیوں میں گھوم کر میں، مین روڈ پر آ گیا جہاں دکانیں تھیں۔ اخبار والا بھی ابھی تک بیٹھا ہوا تھا۔ تختے پر اخبارات پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں دو تین ایونٹ پیپر بھی تھے۔ میں نے دو تین اخبار لے لئے۔ ساتھ والی بیکری سے اتنی چیزیں خرید لیں کہ تین چار دن استعمال کر سکوں۔ تندر سے کچھ روٹیاں اور سالن بھی خرید لیا۔ واپسی کے لئے میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا تاکہ مجھے اس مکان کے سامنے سے نہ گزرنا پڑے۔

گھر آ کر میں نے اطمینان سے کھانا کھایا اور پھر اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ مارننگ پیپر ہیرڈن کے ٹرک اور ملک شہاب کے حوالے سے خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہیڈ لائن ملک شہاب کے حوالے سے تھی۔ ان خبروں کے ساتھ ملک شہاب اور ٹرک اور ٹرک سے برآمد ہونے والی ہیرڈن کے تھیلوں کی بھی کئی تصویریں تھیں۔

میں ایک ایک کر کے خبریں پڑھتا گیا۔ ملک شہاب رات کے آخری پہر اپنی کوٹھی سے فرار ہو گیا تھا۔ اخبار نے خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ یا تو لاہور ہی میں کہیں روپوش ہو گیا ہے یا اسلام آباد کی طرف فرار ہو گیا ہے تاکہ اوپر کی سطح پر رابطہ قائم کر کے گرفتاری سے بچ سکے۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ بالآخر میں نے ملک شہاب جیسے شخص کو کبھی بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

صبح کے اخبار میں کوٹھی میں دھکے نامی عورت اور اس کے چوکیدار کی کوئی خبر نہیں تھی۔ البتہ ایونٹ پیپر ان خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ میرا خیال درست نکلا۔ اس عورت کا نام دھکے ہی تھا۔ لیکن اس ہیڈ لائن نے مجھے بری طرح چونکا دیا تھا۔ دھکے اسلام آباد میں لبنان کی تفصیلت تھی۔ میں پوری خبر پڑھتا چلا گیا۔

میں آ رہے تھے۔ یہ قتل اس کی دولت کے لئے نہیں کیا گیا تھا۔ قاتل دولت چھوڑ گئے تھے۔ وہ صرف قتل کرنے آئے تھے اور اپنا کام کر کے اطمینان سے چلے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے اس واردات کا کوئی سیاسی پس منظر ہو۔ لبنان اور اسرائیل میں برسوں سے سیاسی جھگڑے چلے آ رہے تھے۔ کئی بڑی جنگیں بھی ہو چکی تھیں۔ اسرائیل نے لبنان کو کھنڈر بنا دیا تھا۔ لیکن ان دونوں ملکوں کی جنگ اب بھی جاری تھی۔ بیرونی ممالک میں بھی ایک دوسرے کے سفارت کاروں کو نشانہ بنایا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی کوئی ایسا ہی چکر ہو۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ میں نے کمرے کی بجلی بجھا رکھی تھی۔ کروٹ بدل کر آنکھیں بند کرنے لگا تو پیٹ میں کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ باتھ روم میں داخل ہو کر سوچنے لگا تو کیا جی نہیں جلی۔ شاید بلب فیوز ہو گیا تھا۔ میں نے دروازہ چند انچ کے قریب کھلا رہنے دیا۔

چند منٹ بعد میں باہر نکلنے کے لئے باتھ روم کا دروازہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ دھب دھب کی آوازیں سن کر میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں ایک دم دروازے کی آڑ میں ہو گیا۔ جھانک کر دیکھا تو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ دو آدمی تھے جو دیوار پچاند کر اندر آئے تھے۔ گلی میں کسی کعبے پر چلنے والے بلب کی روشنی مکان کے صحن میں آ رہی تھی اور میں نے ان دونوں میں سے ایک کو پہچان لیا۔

وہ ملک شہاب کا خونخوار کارندہ شیدا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ دوسرے آدمی کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ وہ دونوں دبے قدموں میرے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔

میں باتھ روم میں پھنس گیا۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے اپنا سانس تک روک لیا۔ موت مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔

وہ دونوں میرے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شیدے کا دوسرا ساتھی بھی اب روشنی میں آ گیا تھا۔ وہ تار تھا۔

میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ میرے پاس اس وقت کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ بستر پر لیٹتے وقت میں نے اپنا پستول پتلون کی جیب سے نکال کر پلنگ کے قریب چھوٹی میز پر رکھ دیا تھا۔ ظاہر ہے مجھے باتھ روم میں پستول کی ضرورت نہیں پڑ سکتی تھی اس لئے کمرے سے نکلنے وقت میں نے میز سے پستول اٹھانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ لیکن اب مجھے بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ باتھ روم میں بھی کسی وقت ہتھیار کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

میں نے کمرے سے باہر آتے وقت جی نہیں جلائی تھی اور دروازہ بھی ایسے ہی بھڑ دیا تھا۔

اس بیگ کو میں نے پلاسٹک کے ایک تھیلے میں لپیٹ کر تھیلے کا منہ اس طرح بند کر دیا کہ پانی اندر نہ جاسکے۔ اور پھر شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد میں نے وہ تھیلا ایک رستی میں باندھ کر برآمدے کے ساتھ دائیں طرف کھلی جگہ پر پانی کے زیر زمین ٹینک میں لٹکا دیا اور دھلن بند کر دیا۔ ایسے علاقوں میں چوری چکاری کا اندیشہ تو رہتا ہی تھا۔ مگر وہ بیگ اب محفوظ ہو گیا تھا۔ اور پھر اس کے تھوڑی دیر بعد میں دروازوں کو تالا لگا کر گھر سے نکل گیا۔

میں روڈ پر تھوڑی ہی دیر بعد مجھے رکشہ مل گیا۔

مال روڈ پر ریگل چوک کے قریب میں نے رکشہ چھوڑ دیا اور سڑک پار کر کے بیڈن روڈ پر داخل ہو گیا۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ بہت سی دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سڑک پر بہر حال گاڑیوں کی ابھی آمد و رفت تھی اور پیدل چلنے والوں کی بھی۔ میں محتاط انداز میں چڑھا۔ اپنے مکان والی گلی میں داخل ہو گیا۔

کال بیل کے جواب میں چاچا خیر دین نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔

”یہاں کی کوئی خبر خیر چاچا؟“ میں نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

”جس رات ٹرک پکڑا گیا تھا اس کے اگلے روز میں نے ملک شہاب کے ایک بندے کو یہاں آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بعد تو کوئی نظر نہیں آیا۔“ چاچا خیر دین نے جواب دیا۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ چاچا خیر دین نے یہ نہیں پوچھا کہ میں اتنے دن کہاں رہا۔ عادی ہو گیا تھا۔ میں اسی طرح کئی کئی روز غائب رہتا تھا۔ چاچا خیر دین مجھے کمرے میں چھوڑ کر حسب معمول چائے بنانے کے لئے کچن میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد وہ چائے بنا کر لے آیا۔

”بڑا مال پکڑا گیا تھا رونی پتر اس ٹرک سے۔“ چاچا خیر دین نے درمی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”پر تم اس دن یہاں سے گئے تو کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”میں نے بتایا تو تھا کہ ملک شہاب کی کوشی جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ اور پھر اسے رات کے واقعہ کی تفصیل بتانے لگا۔ مادام دھکے کے جگہ والی بات میں گول کر گیا۔

رات بارہ بجے تک چاچا خیر دین میرے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں گیا۔

میں بستر پر لیٹا گزشتہ واقعات کے بارے میں سوچتا رہا۔ مادام دھکے کا خیال کسی طرح بچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اس کے قتل کے بارے میں اب طرح طرح کے خیالات میرے ذہن

اندر داخل ہو گیا تھا۔ کمرے کے دروازے کھلے ہوں تو باہر گلی میں بجلی کے کھمبے پر جلنے والے بلب کی بہت مدھم روشنی کمرے کے اندر بھی پہنچتی تھی۔ میں اس مدھم سی روشنی میں شیدے کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے میرے پٹنگ کی طرف پستول تانے کھڑا تھا۔ پھر میں نے مدھم سی روشنی میں اس کے چہرے پر شدید الجھن کے تاثرات نمودار ہوتے دیکھے۔ دوسرے ہی لمحے وہ جھک گیا اور غالباً پٹنگ کے نیچے جھانکنے کے بعد ایک جھٹکے سے سیدھا کھڑا ہو گیا اور اچھل کر کمرے سے باہر آ گیا۔

چاچا خیر دین رات کو سوتے وقت کمرے کا دروازہ بند کر کے رکھا کرتا تھا لیکن اندر سے کبھی کنڈا نہیں لگایا تھا۔ نادر نے بھی اس کمرے کا دروازہ ٹھوکر مار کر کھول دیا تھا اور وہ پستول تانے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ تقریباً اسی لمحے شیدا میرے کمرے سے نکل کر دوڑتا ہوا دوسرے کمرے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

”نادر.....! وہ اس کمرے میں نہیں ہے۔“ اس نے چیخنے والے انداز میں اپنے ساتھی کو بتایا۔

نادر کے جواب دینے سے پہلے چاچا خیر دین کی آواز سنائی دی۔

”اوئے..... اوئے..... کون ہو تم لوگ..... تمہارا بیڑا غرق.....“

چٹاخ کی آواز ابھری اور چاچا خیر دین کی آواز کراہ میں بدل گئی۔ نادر نے اس کے منہ پر زوردار ٹھٹھرا مارا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بھیڑیے جیسی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”بتاؤ کہاں ہے روٹی؟“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں جانتا ہوں تم اپنے زمانے کے بہت بڑے بد معاش رہ چکے ہو۔ لیکن میں تمہاری بد معاشی ایک منٹ میں ناک کے راستے نکال دوں گا۔ بتاؤ، روٹی کہاں ہے؟“

”میرے اندر سوئے ہوئے حیوان کو نہ جگاؤ نادر!“ یہ چاچا خیر دین کی آواز تھی۔ اس نے نادر کو نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے جانتا تھا۔ ”اگر میرے اندر کا حیوان جاگ گیا تو ملک تو کیا دنیا کی کوئی طاقت تمہیں نہیں بچا سکے گی۔“

”اس وقت تو تم میرے رحم و کرم پر ہو۔ مجھ سے بچو گے تو.....“ نادر کہتے کہتے رک گیا۔ پھر شیدے کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”شیدے! ہماری آخری اطلاع کے مطابق وہ یہاں آنے کے بعد مکان سے باہر نہیں نکلا۔ تلاش کرو اسے۔ وہ مکان کے اندر ہی کہیں چھپا ہوا ہوگا۔ اس بڑے بد معاش کو میں دیکھتا ہوں۔“

شیدا تیزی سے چلتا ہوا ایک بار پھر میرے کمرے میں گھس گیا۔ اس مرتبہ اس نے

میں نے ہاتھ روم کے دروازے سے ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ وہ دونوں میرے کمرے سے فاصلے پر رک گئے تھے اور شاید یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں دونوں کمرے سے کس میں ہو سکتا ہوں۔

پھر شیدے نے نادر کو اشارہ کیا اور وہ چاچا خیر دین والے کمرے کے دروازے کی طرز بڑھ گیا۔ شیدا اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

میں واقعی پھنس گیا تھا۔ مختصر سا ہاتھ روم میرے لئے چوہے دان بن کر رہ گیا تھا۔ اس میں کوئی روشن دان بھی نہیں تھا۔ اگر روشن دان ہوتا بھی تو اتنا مختصر ہوتا کہ مجھ جیسا ہنا کٹا آدمی اس سے نہیں نکل سکتا تھا۔ دروازے سے نکلتا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

مکان سے باہر نکلنے کا دروازہ ہاتھ روم سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر تھا اور سامنے گز کے دوسری طرف اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ ہاتھ روم اور ان سیڑھیوں کے درمیان ہی تقریباً پندرہ فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ کسی طرف بھی جانے کے لئے محن میں آنا ضروری تھا اور گلی میں آکر ان کی نظروں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ کوئی معمولی سی آہٹ بھی انہیں میری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔

بظاہر بچاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن میں مایوس نہیں تھا۔ میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایک خیال یہ تھا کہ میں غسل خانے میں دبا کر ہوں۔ لیکن مجھے کمرے میں نہ پا کر وہ باور پچی خانے اور غسل خانے کو بھی چیک کریں گے اور میں چوہے کی طرح پکڑا جاؤں گا۔

چاچا خیر دین نے بتایا تھا کہ جس رات بند روڈ پر ملک شہاب کا ٹرک پکڑا گیا تھا اس سے اگلے ہی روز ملک شہاب کے ایک آدمی کو یہاں آس پاس پھرتے ہوئے دیکھا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں میرے اس ٹھکانے کا علم تھا اور انہوں نے فوراً ہی اس کی نگرانی شروع کر دی تھی۔ چاچا خیر دین کے کہنے کے مطابق پہلے روز کے بعد کوئی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ میں چودہ پندرہ روز بعد یہاں آیا تھا اور ان لوگوں نے فوراً ہی دھاوا بول دیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ یہاں کی باقاعدہ نگرانی ہوتی رہی تھی۔ نگرانی کرنے والے ایسے لگ ہوں گے جنہیں چاہے خیر دین بھی نہیں پہچانتا ہوگا۔ اور وہ لوگ بھی خاصے محتاط رہے ہوں گے۔ میرے یہاں آنے ہی ان لوگوں نے ملک شہاب کو اطلاع دے دی اور اس کے بیچے ہوئے موت کے یہ دو فرشتے حساب کتاب لینے کے لئے یہاں پہنچ گئے۔

دھڑکی آواز سن کر میں چونک گیا۔ ہاتھ روم کے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ شیدے نے زوردار ٹھوکر مار کر میرے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا اور پستول تانے تیزی سے

سے کم ایک ڈیڑھ باشت کے قریب مزید کھل سکتا تھا۔ اگر پورا دروازہ کھولنے کی کوشش کی جاتی تو وہ میرے جسم سے الگ کر رک جاتا۔

غسل خانے کی بنی کا سوچ بچا رہی تھا۔ شیدے نے آن آف کیا مگر ظاہر ہے بلب فیوز تھا۔ اس نے دروازے کو آہستگی سے دھکا دے کر مزید کھول دیا اور پھر اس کا ایک ہاتھ اندر داخل ہوا۔ اس ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول میرے چہرے سے آٹھ دس انچ کے فاصلے پر تھا۔ میرے جسم کے مسام پینے اُگلنے لگے۔ میرے دماغ میں جھماکہ سا ہوا۔ اب یا کبھی نہیں..... اس وقت صرف یہی ایک خیال میرے ذہن میں لپکا تھا۔

پستول والا ہاتھ چند انچ اور آگے بڑھا۔ میرا اندازہ تھا کہ شیدا اس طرح بہت مختاط انداز میں آگے بڑھ کر غسل خانہ چپک کرنا چاہتا تھا اور میرے خیال میں اس کا یہ طریقہ بہت ہی احتیاط تھا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو پستول والا ہاتھ اس طرح آگے بڑھانے کی بجائے پیر کی ٹھوک مار کر پورا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا۔

میری نظریں پستول پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا رخ سامنے کی دیوار کی طرف تھا۔ شیدے کی انگلی ٹرائیگر پر تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے اپنا سیدھا ہاتھ اوپر اٹھایا اور دوسرے ہی لمحے شیدے کی کلائی میری گرفت میں تھی۔

اس اچانک افتاد پر شیدا پہلے تو شاید کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔ لیکن پھر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے اس کے سمجھنے سے پہلے دوسرا ہاتھ بھی اس کی کلائی پر جما کر زوردار جھکا دیا۔ وہ دروازے سے نکل گیا۔ اس کے منہ سے ایک اور چیخ نکل گئی تھی۔

میں دروازے کے پیچھے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ شیدے کی کلائی اس طرح گرفت میں لے رکھی تھی کہ اگر انگلی سے ٹرائیگر دب بھی جائے تو گولی مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

شیدا اب سنبھل گیا تھا تاہم میں نے اسے غسل خانے کے اندر کھینچ لیا تھا۔ وہ اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر میری گرفت آہنی شکنجے سے بھی زیادہ مضبوط تھی۔ میں نے اپنے انگوٹھے کا ناخن بھی اس کی کلائی کی نس میں پیوست کر رکھا تھا۔ یہ تکلیف اس کے لئے زیادہ ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

میں نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ اس زور آزمائی کے ساتھ ہی میں اسے دیوار سے لگانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ غسل خانے میں کم جگہ ہونے کی وجہ سے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے میں خاصی دشواری بھی پیش آرہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کلائی پر میرے ہاتھوں کا دباؤ کم کرنے کے لئے پہلے تو وہ دوسرے ہاتھ سے میری گرفت

دروازے کے قریب ہی دیوار پر سوچ ٹٹول کر بنی جلا دی۔ اس نے سب سے پہلے جھک کر پلڑے کے نیچے دیکھا پھر بستر کی پیادراٹھادی۔ مجھے اس کی حرکت پر ہنسی آگئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید چادر میں چھپا ہوں گا۔ اس نے پلنگ کے سامنے پڑے ہوئے میرے جوتوں کو بھی ٹھوک کر ایک طرف اچھال دیا تھا اور پھر میز پر پڑا ہوا میرا پستول بھی اٹھا کر جیب میں ٹھونس لیا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں گھس گیا۔ چٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس نے بنی جلائی تھی۔ جس کی روشنی باہر صحن میں بھی پڑ رہی تھی۔

یہ میرے لئے بہترین موقع تھا۔ میں غسل خانے سے نکل کر بڑی آسانی سے صحن کا خارجہ دروازہ کھول کر باہر نکل سکتا تھا۔ لیکن اب میں نے فرار کا خیال ذہن سے نکال دیا تھا۔ میں چاہے خیر دین کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لئے نہیں بھاگ سکتا تھا۔

شیدا کچن سے نکل کر تیزی سے بیٹھک والے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے اس کمرے کی بھی بنی جلا دی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ لیکن واپس آنے میں بھی چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وہ بیٹھک والے دروازے کے سامنے کھڑا اوپر جانے والی میزھیوں کی طرف دیکھتا تھا۔

میں غسل خانے کا دروازے ایک باشت کے قریب کھلا چھوڑ کر اس کے پیچھے ہو گیا اور بنی والی جھری سے شیدے کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

چاچا خیر دین والے کمرے سے مار پیٹ اور زور زور سے بولنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یہ نادر کی آواز تھی جو غالباً چاچا خیر دین کو گھونے اور ٹھوکریں مارتے ہوئے گنڈا گالیاں بک رہا تھا۔ چاچا خیر دین کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ اس عمر میں بھی نادر کا شیدے جیسے دو آدمیوں کو لپیٹ سکتا تھا۔ مگر وہ عرصہ پہلے بد معاشی چھوڑ چکا تھا۔ پولیس نے کئی مرتبہ اسے اپنے لئے کام پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پولیس کی مار سہہ کی تھی۔ چھوڑے ہوئے راستے پر چلنے کے لئے تیار نہیں ہوا تھا اور اب بھی وہ نادر سے مار کھا رہا تھا۔ غالباً اس نے ابھی تک اپنے بچاؤ کے لئے بھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ اگر اب مرتبہ چاچا خیر دین کا ہاتھ اٹھ گیا تو اسے قابو میں کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اور نادر اس خوش فہمی سے جتنا تھا کہ وہ ماضی کے ایک بہت بڑے بد معاش کی ٹھکانی کر رہا ہے۔

قدموں کی آہٹ سن کر میں چونک گیا اور دروازے کی درز سے باہر جھانکنے لگا۔ اس ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ شیدا اب غسل خانے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے والی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس طرح دروازہ اندر کی طرف

ہوا تھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ میں شدید شیدے کو چھوڑ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ لیکن میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ نادر نے ابھی تک اس طرف توجہ کیوں نہیں دی تھی۔ یا تو اس نے شیدے کی آوازیں نہیں سنی تھیں یا وہ چاچا خیر دین سے الجھا ہوا تھا۔ میں نے فرش پر ٹٹول کر شیدے کا پستول اٹھالیا۔ اس کی پتلون کی جیب سے اپنا پستول بھی سمجھ لیا اور غسل خانے سے باہر نکل آیا۔ چاچا خیر دین والے کمرے سے ایسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے وہ اور نادر آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہوں۔ میں پستول سنبھالے تیزی سے چلا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔

میرا خیال درست نکلا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو رگید رہے تھے۔ نادر کا پستول ایک طرف پڑا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ چاچا خیر دین نے نادر کے ہاتھوں پٹنے کے بعد اپنے دفاع کا فیصلہ کر لیا تھا۔ نادر کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی جبکہ چاچا خیر دین پچاس سے اوپر تھا۔ مگر اب بھی اس میں اتنی طاقت تھی کہ نادر جیسے مستندے سے منٹ سکے۔ بالآخر نادر کی گردن چاچا خیر دین کی گرفت میں آگئی اور پھر ایک زوردار جھٹکے نے نادر کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ چاچا خیر دین نے نادر کے بے جان جسم کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور اٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں نے چاچا خیر دین کو اس کی جوانی میں نہیں دیکھا تھا۔ لیکن سنا تھا کہ وہ نادر جیسے چار چھ غنڈوں کو بیک وقت دھنک کر رکھ دیا کرتا تھا۔ اور آج میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ اس نے نادر کی گردن کس طرح مروڑی تھی۔ چاچا خیر دین کو لڑائی جھگڑوں سے کنارہ کش ہونے لگی سال ہو چکے تھے۔ دو سال سے تو وہ میرے ساتھ رہ رہا تھا۔ میں نے کبھی اسے کسی کے ساتھ لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آج طویل عرصہ بعد اس نے تنگ آمد بنگ آمد کے مصداق لڑائی میں ہاتھ ڈالا تھا اور بڑی آسانی سے نادر کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو رہی پتر؟“ چاچا خیر دین نے اپنی دھوئی ٹھیک کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اس کا سانس اب بھی کچھ پھولا ہوا تھا۔

”ہاں چاچا! میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟“
”مجھے کیا چوٹ آئے گی۔“ چاچا خیر دین بولا۔ ”پانی چوٹوں نے جسم کو اتنا مضبوط کر دیا ہے کہ اب کی چوٹ کا اثر نہیں ہوتا۔ اوئے ہاں، اس کے ساتھ ایک اور بھی تھا۔ وہ.....“
”وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے چاچا! بالکل اسی طرح۔“ میں نے اس کی بات کاٹنے

چھڑوانے کی کوشش کرتا رہا مگر اس میں ناکام ہو کر اس نے میری ایک بغل میں زوردار گھونسا دیا۔ لیکن میں وہ تکلیف برداشت کر گیا۔

میں اب شیدے کو زیادہ وقت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کے حلق سے بدستور غراہٹیں نکل رہی تھیں اور اندیشہ تھا کہ اس کی آوازیں نادر بھی اس طرف نہ آجائے۔ ایسی صورت میں میرے لئے دشواری پیدا ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ بلبلاتا ہوا جھک گیا۔ اس کا آزاد ہاتھ اپنی ٹانگوں کے بیچ میں پہنچ گیا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے پستول بھی چھوٹ کر زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گرا۔ میں نے اس کے بازو کو زوردار جھکایا۔ وہ لڑکھڑایا تو اس کا پیرش میں پھنس گیا۔

اب میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور دونوں ہاتھ اس کے گلے پر جما کر اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میرے دونوں انگوٹھے اس کے زرخرے پر تھے اور میرے جسم کا سارا زور بچہ ہاتھوں کی انگلیوں اور انگوٹھوں میں سمٹ آیا تھا۔ شیدے نے پہلے میرے پیٹ پر گھونے مارنا کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کی قوت مدافعت کمزور پڑتی گئی۔

مجھ پر جیسے جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ میں اس شخص کے ساتھ کوئی رعایت برتنے کو تیار نہیں تھا جو مجھے زندگی سے محروم کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کے زرخرے پر میرے انگوٹھوں کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے ایک گھٹنے سے اس کے پیٹ کو بھی دبا رکھا تھا تاکہ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے۔

شیدے کے حلق سے زک زک کر خرخراہٹ کی ہلکی ہلکی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے دونوں بازو بھی پہلوؤں میں جھول گئے تھے اور جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ لیکن میں نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔

دفعۃً اس کے حلق سے خرخراہٹ کی ایک اور آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی وہ پھٹنے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھ میری کلائیوں پر رکھ دیئے اور گرفت چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ یہ شاید بھڑکتے چراغ کی لوکا آخری جھونکا تھا۔ اس کے دونوں بازو ایک بار پھر نیچے جھول گئے۔ جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اب اس میں مزاحمت نام کی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے اس کے پیٹ سے اپنا گھٹنا ہٹا لیا۔ لیکن گلے پر گرفت ڈھیلی نہیں کی۔ اس کا زور دیوار کے ساتھ رگڑکھاتا ہوا آہستہ آہستہ نیچے جھکنے لگا۔ میں نے اس کے گلے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ دیوار کے ساتھ رگڑکھاتا ہوا گندے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا ایک پیر اب بھی فلش میں

چاچا خیر دین نے مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود باہر نکل گیا۔ میں دروازے میں کھڑا باہر دیکھتا رہا۔

چاچا خیر دین گلی سے نکل کر بائیں طرف سڑک پر مڑ گیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ دوبارہ سڑک کے موڑ پر نمودار ہوا۔ اس کا اشارہ پاتے ہی میں نے شیدے کی لاش کندھے پر لادی اور دروازے سے نکل کر تیز تیز قدموں سے گلی میں چلنے لگا۔ اس مختصر سی گلی میں سناٹا تھا۔ گھروں میں تو لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی جاگ گیا ہو اور اس وقت باہر نکل آئے تو ہمارا یہ بھید کھل جائے گا۔

چاچا خیر دین گلی کے موڑ پر کھڑا تھا۔ وہ مجھے اشارہ کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سڑک پر پہنچ کر اس طرف مڑ گیا جہاں سرخ رنگ کی ایک شیور لیٹ کار کھڑی تھی۔ کار کی ڈکی کھلی ہوئی تھی اور چاچا خیر دین قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے شیدے کی لاش ڈکی میں ڈال دی۔ چاچا خیر دین نے ڈکی بند کر دی اور گلی کے موڑ پر آ کر کھڑا ہو گیا اور میں تیزی سے چلتا ہوا مکان میں آ گیا۔

نادر، شیدے سے زیادہ تنومند تھا۔ اس کی لاش بھی زیادہ بھاری تھی۔ لیکن بہر حال اسے کندھے پر لاد کر باہر تو لانا ہی پڑا تھا۔ چاچا خیر دین نے ایک بار پھر ڈکی کھول دی۔ ڈکی خاصی بڑی تھی۔ میں نے نادر کی لاش بھی اس میں ٹھونس دی اور ڈکی بند کر کے چابی نکال لی۔

”تم اب دو چار دن یہاں مت آنا۔“ چاچا خیر دین نے کہا۔ ”یہ لوگ جب واپس نہیں پہنچیں گے تو ان کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی یہاں ضرور آئے گا۔ تم دو چار دن کہیں اور گزار لو۔ صورتحال بہتر ہو تو واپس آ جانا۔“

”اور تم.....؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہارا یہاں رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔“

”مجھے کیا ہوگا۔“ چاچا خیر دین نے کہا۔ ”تم جاؤ..... مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں یہاں سب کچھ سنبھال لوں گا۔“

میں نے کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا اور اسے رائل پارک کی طرف دوڑا دیا۔ تھوڑا ہی آگے ایک چھوٹا سا چوراہا تھا جہاں سے ایک سڑک تو سیدھی کشمی چوک کی طرف چلی گئی تھی، دوسری رائل پارک کے اندرونی حصے کی طرف اور ایک سڑک بائیں طرف خم کھاتی ہوئی چرچ کے ساتھ میکلڈ روڈ سے جا ملتی تھی۔ میں نے کار اس طرف موڑ دی۔

اس سڑک پر بھی اگرچہ دونوں طرف عمارتیں تھیں مگر یہاں بھی سناٹا تھا۔ میں نے کار چرچ

ہوئے جواب دیا۔ ”اس کی لاش غسل خانے میں پڑی ہے۔“

”غسل خانے میں؟“ چاچا خیر دین کے لمبے مٹر حیرت تھی۔ ”کیا وہ مرنے سے پہلے اپنی میت کو غسل دینے کے لئے وہاں گیا تھا؟“

”یہی سمجھ لو چاچا!“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر اسے بتانے لگا کہ شیدے کی لاش غسل خانے میں کیوں تھی۔ ”اگر میرے پیٹ میں گڑبڑ نہ ہوتی تو آج پھنس ہی نہ ہوتے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ ہمیں سوتے ہی میں اتنی گہری نیند سلا دیتے کہ قیامت تک ان کا نام نہ لیتے۔“

”چلو..... اب تو یہ خود ہی سو گئے ہیں۔ اب قیامت کے دن ہی انھیں گے۔“ چاچا خیر نے کہا۔ وہ چند لمبے فرش پر پڑی ہوئی نادر کی لاش کی طرف دیکھتا رہا پھر کمرے سے باہر نکل اور منہ اٹھا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی کمرے سے باہر آ گیا تھا۔

”سب لوگ سو رہے ہیں۔“ چاچا خیر دین بولا۔ ”کسی کو ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ یہاں ہوا ہے۔“

”سازھے تین بج رہے ہیں چاچا!“ میں نے کہا۔ ”دن بھر کے کام کاج سے تھکے ہو۔ لوگ رات کو سوتے ہیں تو ان کی آنکھ صبح سے پہلے نہیں کھلتی۔ اور پھر یہاں زیادہ شور بھی تو نہیں ہوا۔ جو کچھ بھی ہوا، کمرے اور غسل خانے میں ہوا۔ اس وقت لوگ گہری نیند میں ہوتے ہیں۔ آواز بھی کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی ہوگی۔ لیکن اب ان لاشوں کا کیا، کیا جائے؟“

”یہ لوگ پیدل تو نہیں آئے ہوں گے۔“ چاچا خیر دین نے کہا۔ ”ان کی گاڑی باہر سڑک موجود ہوگی۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔“

میں بھی چاچا خیر دین کے ساتھ ہی باہر والے دروازے تک آیا تھا۔ چاچا خیر دین آہستگی سے دروازہ کھول کر گلی میں نکل گیا۔ میں دروازہ بھیڑ کر قریب ہی کھڑا رہا۔ چاچا خیر دین کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔

”سڑک کے موڑ پر میرے پھسے سے دس پندرہ گز آگے ایک شیور لیٹ کار کھڑی ہے۔“

چاچا خیر دین نے کہا۔ ”کار کا دروازہ لاک نہیں ہے۔ انجین میں چابی بھی لگی ہوئی ہے۔ خیال ہے یہ انہی کی کار ہے۔ میرا خیال ہے ان دونوں لاشوں کو کار میں ڈال کر کہیں دور لے آؤ۔“

”ان سے نجات حاصل کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔“ میں نے کہا۔

غسل خانے اور کمرے سے لاشیں نکال کر صحن میں دروازے کے قریب ڈال دی۔

ہوں۔ میں پوری طرح مطمئن اور ہنس مکھ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی وجہ میرا ماضی تھا۔ میرے ساتھ زندگی میں جو کچھ ہوا تھا وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ میں بیدائش سے اب تک محبت کو ترستا رہا ہوں۔ میرے باپ نے مجھے کبھی قبول نہیں کیا۔ میری ماں کو مجھ سے جھین لیا گیا۔ مجھے ہر چیز سے محروم کر دیا گیا۔ میرا بچپن جس کسمپرسی میں گزرا، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ دھکے اور ٹھوکریں ہی ملیں جس سے میرے دل میں بھی دوسروں کے لئے نفرت بڑھتی گئی۔ اور جب میں اپنے چچوں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوا تو میں نے بھی اپنے اندر چھپی ہوئی نفرت کا اظہار شروع کر دیا۔ جولاہا برسوں سے میرے سینے میں کھول رہا تھا، وہ آہستہ آہستہ باہر آنے لگا اور میں اس راستے پر گامزن ہو گیا جس پر نہیں چلنا چاہتا تھا۔

میں ساری زندگی ظلم اور زیادتیاں برداشت کرتا آیا تھا۔ محرومیوں کا شکار رہا تھا۔ کسی کو کبھی مجھ پر ترس نہیں آیا تھا۔ اور شاید یہ انہی مظالم اور سختیوں کا نتیجہ تھا کہ اب مجھے بھی کسی پر ترس نہیں آتا تھا۔ میرے اندر ہمدردی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں اس جذبے سے قطعی نا آشنا تھا۔ ہمدردی کے نام پر مجھے دھوکے دیئے گئے تھے۔ میری بوٹیاں نوچی گئی تھیں۔ مجھ سے جرائم کروائے گئے تھے۔ اپنے گناہوں کے مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اب میں کسی سے ہمدردی کیسے کر سکتا تھا؟ مجھے کسی پر رحم نہیں آتا تھا۔ میں اس قدر سنگدل ہو گیا تھا کہ کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد بھی مجھے یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ میں نے کس قدر سنگین جرم کیا ہے۔ اور ان لوگوں کو تو میں زندہ چھوڑنے کا قائل ہی نہیں تھا جو میری زندگی کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے ہوں۔ اگر لوگ مجھے خونخوار بھیڑیا اور درندہ کہتے تھے تو غلط نہیں کہتے تھے۔ میں کچھ دیر پہلے ہی دولاٹھیں ٹھکانے لگا کر آیا تھا مگر میں اس طرح ہنس مکھ تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میرا دماغ پھر کی طرح گھوم رہا تھا۔ سوچوں کی یلغار تھی جس نے میرے دماغ کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ چودہ پندرہ دن پہلے میں نے ملک شہاب کا ٹرک پکڑ لیا تھا۔ ٹرک میں پوشیدہ کروڑوں روپے کی ہیر و من پکڑی گئی تھی۔ ملک شہاب کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اسے یہ پتہ چل گیا تھا کہ ٹرک پر چھاپ پڑوانے میں میرا ہاتھ ہے اور مجھے ٹرک کی خبری بھیجے نے کی تھی۔ انہوں نے مجھے کا جو حشر کیا تھا وہ میں دیکھ چکا تھا۔ ملک شہاب نے مجھے بھی اس انجام سے بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک انجام سے دوچار کرنا تھا۔ لیکن میں بھاگ نکلتا تھا۔

تقریباً چودہ دن میں ایجوکیشن ٹاؤن والے مکان میں روپوش رہا تھا۔ اس دوران اخبارات کے ذریعے مجھے حالات کا پتہ چلتا رہا تھا۔ ایس پی سعید واقعی ایک فرض شناس پولیس آفیسر ثابت

کی دیوار کے قریب روک دی تھی اور انجن بند کر کے رومال سے اسٹیرنگ وغیرہ پر اپنی انگلیوں کے نشان صاف کرنے لگا۔ کار سے اتر کر میں نے دروازے پر بھی اپنی انگلیوں کے نشان صاف کئے اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میکلورڈ پر آگیا اور لکشمی چوک کی طرف چلنے لگا۔

لکشمی چوک پر رات ایک ڈیڑھ بجے تک رونق رہا کرتی تھی لیکن اس وقت یہ جگہ بھی سناں بڑی تھی۔ کنگ سرکل ہوٹل کے آس پاس نئے کباب اور کڑا ہی گوشت کی دکانیں سجا کر تھیں۔ اور اس وقت تین چار کتے زمین پر بکھری ہوئی ہڈیاں چچوڑ رہے تھے۔ لکشمی چوک ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہر وقت پولیس کی کوئی نہ کوئی پارٹی موجود رہا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت کوئی پولیس والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر کوئی ہو گا بھی تو کہیں دبک کر نیند پوری کر رہا ہو گا۔

نسبت رڈ کی طرف سے ایک تانگے کو آتے دیکھ کر میں رک گیا۔ میں نے تانگے کو روکے اشارہ کیا۔ پچھلی سیٹ پر برقعے میں لپٹی ہوئی دو عورتیں، اگلی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر آدمی اور بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ سامان بھی رکھا ہوا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ لوگ ریلوے اسٹیشن جا رہے تھے۔ میں بھی اگلی سیٹ پر بچوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ اس وقت ایجوکیشن ٹاؤن والے مکان پر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ ریلوے اسٹیشن ایک ایسی جگہ تھی جہاں کچھ وقت گزارا جا سکتا تھا۔ اسٹیشن کے آس پاس لاتعداد چارپائی ہوٹل تھے۔ بسوں کے گاڑے بھی تھے جن کی وجہ سے یہاں چوبیس گھنٹے رونق رہتی تھی اور ہوٹل بھی رات بھر کھلے رہتے تھے۔ جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں ان دنوں رات گزارنے کے لئے پانچ روپے میں آٹا پاس کے کسی بھی ہوٹل میں چارپائی بستر کرائے پر مل جایا کرتا تھا۔ رات کے وقت دوسرے شہروں سے آنے والے بیشتر لوگ ان ہوٹلوں میں رات گزار لیا کرتے تھے۔ شہر میں مزدوری کرنے والے بے گھر لوگ بھی انہی ہوٹلوں میں رات گزارا کرتے تھے۔

اسٹیشن کے سامنے تانگے سے اتر کر میں ایک چارپائی ہوٹل کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابھی بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں دن کا سا سماں تھا۔ اس علاقے کو دیکھ کر یہ کچھ مشکل تھا کہ اس وقت رات کا آخری پہر ہے۔

میں نے چائے منگوا لی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے آج کے واقعہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں ابھی ابھی دولاٹھوں کو ٹھکانے لگا کر آیا تھا۔ ان میں سے ایک میرے ہاتھوں پر گیا تھا لیکن میرے اندر کوئی معمولی سی تبدیلی بھی نہیں آئی تھی۔ نہ کسی قسم کی گھبراہٹ تھی اور نہ خوف..... مجھے دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ میں ابھی ابھی کسی کو قتل کر کے

”ب خبر کرے۔ پتہ نہیں آج سورج کدھر سے چڑھے گا۔“ ویثر نے ایک بار پھر حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ”زنگی بھر دوسروں سے چھین اور مانگ کر کھانے والا آج اٹنی بخشش میں دے رہا ہے سو کیرے سو کیرے.....“

”بکواس نہ کراوئے۔“ وہ غنڈہ جسے سولجر کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، ویٹر کی طرف دیکھ کر

جسے کر لئے اور چائے میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگا۔ اس نے کچھے والی پلیٹ میری طرف بھی بڑھائی تھی مگر میں نے انکار کر دیا۔

”کیا نام ہے تمہارا اور کیا کرتے ہو؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”نام تو سولجر ہے اور کام.....“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”کام وہی ہے جو ہم جیسے لوگ کرتے ہیں۔“

”یعنی منشیات فروشی.....؟“ میں نے اسے گھورا۔ ”آج کل تو تم جیسا ہر شخص یہی کام کر رہا ہے۔ کیونکہ اس میں کمائی بہت ہے۔“

”لغت سمجھو اس کام پر رونی باؤ!“ اس نے پہلی مرتبہ میری طرف دیکھا۔ ”کسی کی زندگی میں زہر گھول کر چار پیسے کماتا کوئی اچھی بات نہیں۔ اس پیسے سے تو خریدی ہوئی روٹی بھی میرے جیسے لوگوں کے لئے زہر بن جاتی ہے۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”کسی کی جان لینی ہے تو اسے لکار کر مارو۔ مقابلہ کرو۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کسی کے خون میں ہیروئن کا زہر گھول کر اس کی پوری نسل ہی برباد کر دی۔ رونی باؤ! یہ لڑکے ہی تو ہمارا سرمایہ ہیں۔ انہوں نے ہی تو بڑے ہو کر ملک سنبھالنا ہے۔ اگر ہم انہیں ہیروئن کا زہر پلا کر مفلوج کر دیں گے تو یہ کیا کریں گے؟ یہ تو اپنے آپ کو بھی نہیں سنبھال سکیں گے۔ ایسے لوگوں کو تو گولی مار دینی چاہئے جو نشے کی چیزیں پیستے ہیں۔ پر کیا کریں رونی باؤ۔“ اس نے ایک گہرا سانس لیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”دکھ کی سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں منشیات پھیلانے میں ان لوگوں کا بڑا ہاتھ ہے جنہیں اس کی روک تھام کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ارے یہ پولیس والے۔ انہی کی وجہ سے تو ہیروئن اس ملک میں کینسر کی طرح پھیلی ہے۔ پولیس والے رشوت لینا چھوڑ دیں تو پورے ملک میں کہیں بھی ہیروئن کی ایک پڑیا نہ پک سکے۔ مگر کیا کریں جی۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ یہاں جتنے بھی اس قسم کے ہوٹل ہیں نا۔“ اس نے ہاتھ سے چاروں طرف اشارہ کیا۔ ”ہر جگہ ہیروئن بکتی ہے۔ ہیروئن پیچنے والے بڑی آزادی سے گھوم پھر کر اپنا دھندہ کرتے ہیں اور پولیس والے دیکھتے رہتے ہیں مگر کوئی انہیں روکتا نہیں، پکڑتا نہیں۔ کیوں پکڑیں۔ ہیروئن پیچنے والوں کی طرف سے تھانے والوں کو ہر ہفتے لاکھوں روپے کا ہتھ ملتا ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو رونی باؤ.....“ وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ ”مجھ جیسا ہر شخص یہی دھندہ کر رہا ہے۔ بڑی کمائی ہے اس میں۔ مگر میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی کمائی پر جو دوسروں کی جان لے لے..... اگر میں بھی یہ دھندہ کر رہا ہوتا تو مجھے ہوٹل کے دو کتے کے ملازم کی باتیں نہ سنی پڑتیں۔“

”جایا..... میرا ہاتھ تپا سویرے سویرے۔“ سولجر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
 میں بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ویٹر کے جانے کے بعد سولجر نامی غنڈہ باز ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے چائے کا ایک کپ اٹھایا اور قدرے آگے جھک کر میرے سامنے رکھ دیا۔
 ”لو رونی باؤ..... چائے پیو۔ سولجر کی طرف سے.....“

میں اس کے منہ سے اپنا نام سن کر اچھل پڑا اور گھور کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا ہاتھ ایک دم پتلون کی جیب پر پہنچ گیا تھا۔

”پریشان کیوں ہو گئے رونی باؤ!“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے نہیں جانتے تو کیا میں تو تمہیں جانتا ہوں نا..... اور اپنا ہاتھ جیب سے ہٹا لو..... میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ دشمن اتنے پیار سے کسی کو چائے پیش نہیں کرتا۔“

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ یہ درست ہے کہ میں سب لوگوں کو نہیں جانتا تھا۔ زیر زمین دنیا سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ مجھ سے واقف تھے۔ میرے نام کی کچھ ہی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ چھوٹے موٹے غنڈے تو مجھے دیکھ کر دور سے ہی راستہ بدل پاتے تھے۔ لیکن ہر جگہ پہچان لیا جانا میرے حق میں اچھا نہیں تھا۔ مجھے پولیس کا کوئی خوف نہیں تھا۔ میں نے کبھی اپنے جرم کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ پولیس کبھی مجھے کسی جرم کے شبہ میں پکڑ لیتی تو چند گھنٹوں بعد ہی انہیں مجھے چھوڑنا پڑتا۔ تاہم مجھے اپنے دشمنوں سے محتاط رہنا پڑتا۔ آج کل تو ملک شہاب سے غصی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا اور اسے آدی مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مجھے اس طرح کھلے عام نہیں پھرتا چاہئے تھا۔

”تم واقعی بہت دیدہ دلیر قسم کے بندے ہو رونی باؤ!“ سولجر میری طرف دیکھتے ہوئے رہا تھا۔ ”ملک شہاب پاگل ہو رہا ہے۔ اس کے آدی شکاری کتوں کی طرح پورے شہر میں تھپا ہوسکتے پھر رہے ہیں اور تم اس طرح دیدہ دلیری سے گھوم پھر رہے ہو۔ یہ تمہارا ہی جگر ہے۔ چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

میں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چیز تھی۔ وہ اگرچہ شکل و صورت اور لباس سے سڑک چھاپ غنڈہ ہی لگ رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں خلوص کی جھلک تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھا۔ مگر اس نے چائے کا کپ پیش کر کے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔
 میں نے پتلون کی جیب پر رکھا ہوا ہاتھ ہٹا کر چائے کا کپ اٹھالیا۔ سولجر نے کچھے

بس اس طرح کام چل رہا ہے۔ تمہاری دعا سے اس علاقے میں بڑا ٹھک ہے اپنا۔ میرا نام تو محمد امین ہے۔ لیکن پولیس کی نوکری کی وجہ سے لوگ مجھے سولجر کہتے ہیں۔“ اس نے خاموش ہو کر میز پر رکھے ہوئے دو سگریٹوں میں سے ایک سگریٹ اٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے انکار کر دیا تو اس نے وہ سگریٹ کان میں اڑس لیا اور دوسرا سگریٹ سلگا کر کش لگاتے ہوئے بولا۔

”اپنے سارے کام مفتے میں چل جاتے ہیں اور اس طرح کی باتیں بھی سننی پڑتی ہیں جیسی ابھی تم نے بھی سنی تھیں۔“

میں سولجر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری طرح اسے بھی ہیروئن سے نفرت تھی۔ میں اس کی باتوں سے اندازہ لگا چکا تھا کہ اس پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ مجھے ایسے ہی تخلص اور قابل اعتماد آدمی کی ضرورت بھی تھی۔

اس وقت ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ رات کا اندھیرا رخصت ہو چکا تھا۔ دن کا اُجالا پھیل رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کچھ دیر اور یہاں وقت گزار کر کسی رکشے پر انجکشن ٹاؤن چلا جاؤں گا۔ میں نے بعد میں کسی وقت سولجر سے دوبارہ ملنے کا بھی پروگرام بنالیا تھا۔ ہم دونوں ابھی بائیں کر رہے تھے کہ ایک اسی ٹائپ کا آدمی ہماری میز کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پہلے میری طرف دیکھا، پھر جھک کر سولجر کے کان میں کچھ کہا۔ وہ ایک دم سیدھا ہو گیا۔ وہ آدمی فوراً ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش کی لہر بھی اُبھر آئی تھی۔

”یہاں سے پھوٹ لورونی باؤ!“ سولجر نے کہا۔ ”میکلوڈ روڈ پر کھڑی ہوئی ایک لاوارث کار سے دولاٹیں ملی ہیں۔ وہ علاقہ گوجرنگھ تھانے کی حدود میں ہے۔ پولیس نے مشتبہ لوگوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی ہے۔ اس لئے یہاں سے پھوٹ لینا ہی بہتر ہے۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پولیس کو وہ لاشیں سوا چار بجے کے قریب ملی ہیں۔“ سولجر نے جواب دیا۔ ”ویسے بڑی بھرتی دکھارہے ہیں وہ لوگ۔“

”تم کہاں جاؤ گے؟“ میں نے پوچھا۔

”سلطان پورے میں کھولی ہے اپنی۔ تم بھی چلو۔ آج کا دن میرے ساتھ۔“

”چلو۔“ میں اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اٹھ گیا۔

ہم دونوں ریلوے اسٹیشن کے تھرو کلاس والے مسافر خانے میں آ گئے۔ یہ مسافر خانہ بھی

سولجر ایک سڑک چھاپ غنڈہ تھا مگر اس کی یہ باتیں سن کر میں کانپ اٹھا۔ اسے بھی احساس تھا کہ ہیروئن کا نشا انسان کو مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ نو جوان نسل مفلوج ہو گئی تو کل کو ملک کا بوجھ کون سنبھالے گا۔ اور میرے خیال میں ایسی سوچ رکھ والوں کو تو بہت کچھ کرنا چاہئے۔ مگر یہ سڑک چھاپ غنڈہ کیوں ہے۔

”تو پھر تم کام کیا کرتے ہو؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”زمہ رہنے کا کوئی ذریعہ تو ہو گا؟“

”پولیس والوں کی طرح مجھے بھی حرام کھانے کی لت لگ گئی ہے۔“ سولجر نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا۔ آٹھ جماعت پاس ہوں۔ چار سال کا ٹینیل رہا۔ پھر مجھے نوکری سے نکال دیا گیا۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے ایک تھانیدار کی ٹھکانی کر دی تھی۔“ سولجر نے جواب دیا۔ ”بات وہی ہیروئن کی تھی۔“ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک ہیروئن فروش کو پکڑا تھا۔ ایک کو ہیروئن برآمد ہوئی تھی اس کے قبضے سے۔ میں بہت خوش تھا کہ اس کا رانا ہے پر میری ترقی ہوئی اور مجھے ہیڈ کا ٹینیل بنا دیا جائے گا۔ مگر تھانیدار نے طزم کے وارثوں سے سودے بازی شروع کر دی۔ مجھے پتہ چلا تو میں تھانیدار سے بھڑ گیا۔ پہلے تو اسے سمجھاتا رہا کہ سرجی اس کے خلاف رپٹ درج کی جائے۔ مگر وہ نہیں مانا۔ اسے پچاس ہزار مل رہے تھے۔ اس نے پانچ ہزار سے میرا بھی منہ بند رکھنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی ٹھکانی کر دی جس کے نتیجے میں میرا خلاف کیس بن گیا۔ تھانیدار کو ایک ہفتہ ہسپتال میں اور مجھے تین ہفتے جیل میں گزارنے پڑے تھے۔ مجھے نوکری سے بھی برطرف کر دیا گیا۔“

”تم نے عدالت کو اصل بات نہیں بتائی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”بتائی تھی رونی باؤ!“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک معمولی کا ٹینیل کے مقابلے میں تھانیدار کے بیان کو زیادہ معتبر سمجھا گیا۔ مجھ پر تو یہ الزام لگا دیا گیا تھا کہ تھانیدار نے مجھے لوگوں سے رشوت لینے سے منع کیا تھا جس پر میں نے اس کی پٹائی کر دی۔“

”اور اس کے بعد؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس کے بعد میں نے دادا گیری شروع کر دی۔“ سولجر نے جواب دیا۔ ”پولیس کی نوکری کرتے ہوئے حرام کھانے کی عادت پڑ گئی تھی اس لئے کوئی کام دھندہ کرنے کو دل نہیں چاہا۔ ایک دو غنڈوں سے دوستی یاری تھی۔ ان کے ساتھ مل کر علاقے میں دادا گیری شروع کر دی۔“

اشارہ کیا۔ عارضی دیواریں کھڑی کر کے پوری کا پردہ تان دیا گیا تھا۔ اس نے آمنے سامنے والے دونوں کمروں کے دروازے کھول دیئے۔ ایک کمرے میں چٹائی چھٹی ہوئی تھی اور دوسرے کمرے میں آمنے سامنے دو چار پائیاں چھٹی ہوئی تھیں جن پر بلے سے بستر تھے۔ ایک چار پائی کے نیچے لوہے کا پرانا سا ٹریک رکھا ہوا تھا۔ دیواروں کی کھوئیوں پر کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک دیوار پر مسرت شاہین کا کسی پشتو فلم کا بہت بڑا فلمی پوسٹر لگا ہوا تھا۔

رقص کا بہت خوفناک قسم کا پوز تھا۔ اس پوسٹر کے علاوہ بھی مسرت شاہین کی اور بہت سی تصویریں دیوار پر چسکی ہوئی تھیں۔

”مسرت شاہین تمہیں بہت اچھی لگتی ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے سو لجر کی طرف دیکھا۔

”دل بہلانے کے لئے کوئی نہ کوئی خیال تو چاہئے نارونی باؤ!“ سو لجر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”ظالم جب ڈانس کرتی ہے تو دل کھینچ لیتی ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”رونی باؤ..... تم بھی شاید رات بھر جاگے ہو۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتماد ہو تو آرام سے اس چار پائی پر سو جاؤ۔ یہاں کوئی ڈر خوف نہیں ہے۔“

”اعتماد نہ ہوتا تو میں تمہارے ساتھ یہاں بھی نہ آتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہاری باتوں ہی سے اندازہ لگالیا تھا کہ تم غلط اور قابل اعتماد آدمی ہو۔ میں کسی کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتا۔ میرے ساتھ کام کرو گے؟“

”تمہارے ساتھ کام؟“ سو لجر کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ ”یہ تو میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے تو تمہارے بارے میں پہلے ہی بہت کچھ سن رکھا ہے۔ تمہیں دور سے دیکھا ضرور تھا پر کبھی قریب آنے کا موقع نہیں ملا..... جو شخص ملک شہاب جیسے شخص سے پنگالے سکتا ہے وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ آج سے تم مجھے اپنا غلام ہی سمجھو۔ میں تمہارے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔“

”میرے ساتھ عیش کرو گے لیکن.....“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”لیکن دھوکا اور فریب.....“

”اپنی کتاب میں یہ ورق ہی نہیں ہے رونی باؤ!“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”کبھی تمہیں مجھ پر معمولی سا بھی شبہ ہو تو گولی مار دیتا۔“

”تو پھر ملاؤ ہاتھ۔“ میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

بے گھر لوگوں اور بھکاریوں کے لئے رات گزارنے کا ایک ٹھکانہ تھا۔ درجنوں لوگ ابھی فرش پر اڈھرا ڈھرا پڑے ہوئے تھے۔ ہم ان لوگوں سے بچتے ہوئے سیڑھیوں پر آگے طویل پل ریلوے لائنوں کے اوپر سے ہوتا ہوا دوسری طرف جی ٹی روڈ سے جا ملتا تھا۔ اس کو ٹرین بھی آئی تھی اور اس پل پر بھی مسافروں کا رش تھا۔ ہم دونوں تیز تیز چلتے رہے۔ دوسری طرف جی ٹی روڈ پر پل کی سیڑھیوں کے سامنے لالہ ادا تانگے کھڑے تھے۔ کوچان سیڑھیوں سے اترنے والے مسافروں کی طرف لپک رہے تھے۔ بعض کو باغبانپورہ اور تیزاب احاطہ گھوڑے شاہ اور میراں دی کھوئی کی آواز بھی لگا رہے تھے۔ ہم جمائی روڈ پار کر کے سامنے والی سڑک پر داخل ہو گئے۔ یہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ دونوں طرف عمارتیں تھیں۔ نیچے ڈکانیں اور اوپر رہائشی یونٹ تھے۔ سڑک بے حد ٹوٹی ہوئی تھی۔ جا بجا پانی جمع تھا۔

سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ سڑک پر اکاؤ کا پیدل چلنے والوں اور سائیکل سواروں کی آمد و رفت تھی۔ ڈکانیں ابھی بند تھیں تاہم کہیں کہیں دودھ اور چائے کی ڈکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ میں سو لجر سے دو قدم پیچھے چل رہا تھا۔ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بائیں طرف ایک گلی میں مڑ گیا۔ یہ گلی تقریباً دس فٹ چوڑی تھی۔ دونوں طرف پرانے طرز مکان تھے۔ گلی کا فرش سرخ اینٹوں کی سولنگ سے بنایا گیا تھا اور جگہ جگہ ہے اینٹیں ٹوٹی ہوئی تھیں جہاں پانی جمع تھا۔ میں کچھ اور پانی سے بچتا ہوا سو لجر کے پیچھے چلا رہا۔

تقریباً پچاس گز آگے جا کر یہ گلی دائیں طرف مڑ گئی تھی۔ اس گلی میں مڑتے ہی کارندہ دوسرے مکان کے سامنے وہ رک گیا۔ دروازے کے اوپر زنجیر والے کنڈے میں تالا لگا ہوا اس نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

اندروں پانچ چھ فٹ لمبی ڈیوڑھی تھی جس سے آگے کشادہ مچن تھا۔ بائیں طرف بلے کا ڈبہ ہوا تھا اور اس سے آگے ایک کمرہ تھا۔ دائیں طرف بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ ایک کمرہ کا ڈھیر تھا اور دوسرا کمرہ رہائش کے قابل تھا جس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔

”رونی باؤ.....“ سو لجر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ کھنڈر میرے چاچا کی ملکیت ہے۔ وہ بچپن سے تو مر گیا مگر مرنے سے پہلے اس نے یہ نیکی کی کہ یہ کھنڈر میرے نام کر دیا۔ میرے آدمی اسے بنانے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بس اس میں گزارہ کر رہا ہوں۔ بارش میں تکلیف ہوتی ہے۔ دونوں کمروں کی چھتیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ ویسے یہاں ساری سہولتیں ہیں۔ پانی کے لئے وہ ہینڈ پمپ لگا ہوا ہے۔ اور وہ اس طرف لیٹرین ہے۔“ اس نے ایک

”امیر جنسی کے لئے میں تھوڑی بہت رقم رکھتا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
 ”تقریباً دو سو روپے رکھے ہوئے تھے۔ تمہیں بھوکا تو نہیں رکھ سکتا تھا روٹی باؤ! اس لئے میں نے
 دوپے ٹرک سے نکال لئے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”ویسے میں اس محلے میں
 بہت شرافت کی زندگی گزار رہا ہوں۔ میری بد معاشی ریلوے اسٹیشن کے دوسری طرف تک محدود
 ہے۔ یہاں کے لوگ مجھے بہت شریف سمجھتے ہیں۔ اور یہاں تو میں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں چلتا۔“
 ”اچھی بات ہے۔ کہیں تو شرافت کا اظہار ہونا چاہئے۔ لیکن تم یہ لباس بھی بدل ڈالو تو اچھا
 ہے۔ تم جیسے شریف آدمی پر یہ لباس اچھا نہیں لگتا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے روٹی باؤ! میں کل سے پینٹ شرٹ پہنا کر دوں گا۔ میرے پاس ٹرک میں دو
 تین جوڑے رکھے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی پہن لیتا ہوں۔“ اس نے بڑی سعادت مندی سے
 جواب دیا۔

”کل سے نہیں، آج سے ہی۔“ میں نے کہا۔ ”میں شام کے وقت تمہیں ایک کام سے بھیجتا
 چاہتا ہوں۔ اور تم یہ کپڑے پہن کر نہیں جاؤ گے۔ اور سنو، خرچ کی اب تمہیں فکر نہیں کرنی
 چاہئے۔ میں دو چار دن یہاں رہوں گا۔ کل تم بازار سے تھوڑے سے برتن بھی لے آنا تاکہ
 چائے وغیرہ پینا کی جاسکے۔“

”دو سو روپے میں سے پندرہ بیس روپے ہی خرچ ہوئے ہیں۔ باقی پیسے میرے پاس ہیں۔
 میں آج ہی برتن لے آؤں گا۔“ سو لجر نے جواب دیا۔
 میں نے کھانے سے ہاتھ روک کر پتلون کی کچھلی جیب سے نوٹوں کا بندل نکالا اور اس میں
 سے دو ہزار روپے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

”احتیاط سے خرچ کرنا۔ فضول خرچی کرو گے تو لوگوں کو شبہ ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔
 ”یہ تم زیادتی کر رہے ہو روٹی باؤ..... تم سے پیسے لیتے ہوئے مجھے شرم نہ آئے گی؟“ میں
 نے کہا۔

”اس میں شرم کی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب ہم تم ایک ہیں۔ اخراجات کے
 معاملے میں تمہیں شرم نہیں کرنی چاہئے۔“

کھانے کے بعد ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سو لجر مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ اس
 کی کہانی سن کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی داستان بھی مجھ سے کچھ ملتی جلتی تھی۔
 محمد امین عرف سو لجر کی ماں کا تعلق فیصل آباد کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ ان کی رہائش
 فیصل آباد کے علاقے غلام محمد آباد میں تھی۔ وہ ایک جگہ اپنی ماں کے ساتھ کام کرنے جایا کرتی

سو لجر نے بڑی گرجموشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا اور اس طرح سو لجر سے میری دوستی ہوئی۔
 اس سے دوستی کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ میں ان دنوں جس قسم کے حالات سے دوچار تھا
 سے نبرد آزما ہونے کے لئے مجھے ایک وفادار اور مخلص دوست کی ضرورت تھی جس پر میں
 اعتماد کر سکوں۔ اور مجھے یقین تھا کہ سو لجر میرے اس معیار پر پورا اترے گا۔ دوسری وجہ یہ تھی
 چاچا خیر دین والا ٹھکانہ ملک شہاب کی نظروں میں آ جانے کے بعد مجھے ایک اور فحشہ ٹھکانہ
 ضرورت تھی اور میرے خیال میں یہ کھنڈر کسی ہنگامی صورتحال میں میرے لئے بہترین پناہ
 ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کی بیرونی دیوار کے پیچھے ایک وسیع میدان تھا جس کے گرد اگرچہ
 دیواری بنی ہوئی تھی مگر کسی ہنگامی صورت حال میں اس میدان میں کود کر کسی بھی طرف نکلا جا
 تھا۔

میں سو لجر پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لئے میں نے فی الحال ایجوکیشن ٹاؤن کی
 طرف جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور دو چار دن یہیں رہنے کا فیصلہ کیا۔ میں جو تے اتار کر
 چار پائی پر لیٹ گیا۔ سو لجر بھی سامنے والی چار پائی پر بیٹھ چکا تھا۔ کچھ دیر تک ہم باتیں کرتے
 رہے اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

سہ پہر چار بجے کے قریب میری آنکھ کھلی۔ دماغ میں سنسنی سی ہو رہی تھی۔ میں اس
 طرح گھوڑے سچ کر سویا تھا کہ اگر کوئی میرا گلا بھی کاٹ دیتا تو مجھے پتہ نہ چلتا۔

کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ مگر سو لجر اپنی چار پائی پر موجود نہیں تھا۔ اس کے
 نیچے پر ایک کاغذ رکھا ہوا تھا جسے میں نے اٹھا لیا۔ کاغذ پر پینسل سے شکستہ سی ہینڈ رائٹنگ میں لکھ
 ہوا تھا۔

”میں کھانا لینے بازار جا رہا ہوں..... سو لجر۔“
 میں نے کاغذ دوبارہ اسی جگہ رکھ دیا۔ کچھ دیر بستر پر لیٹا رہا، پھر اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔
 سامنے ہینڈ پمپ کے نیچے بالٹی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ہینڈ پمپ چلا کر بالٹی بھری اور
 ہاتھ دھونے لگا۔ اور تقریباً اسی وقت باہر کا دروازہ کھلا۔

وہ سو لجر تھا جس نے ہاتھ میں اخبار میں لپٹا ہوا پیکٹ اٹھا رکھا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس
 نے دروازہ بند کر دیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی کمرے میں آ گیا۔ اس نے سالنور وہی ایک
 چھوٹی میز کھینچ کر کرسیوں کے سچ رکھ لی اور پیکٹ کھول کر پھیلا دیا۔ تندوری روٹیاں اور کھجور
 نکلے تھے جو بڑی طرح سخت تھے۔

”تمہارے پاس تو پیسے نہیں تھے۔ یہ کہاں سے لائے؟“ میں نے پوچھا۔

اسے تین مہینوں کی سزا بھی بھگتنی پڑی تھی۔ جیل سے نکل کر اس نے بد معاشی شروع کر دی۔ وہ چھوٹے موٹے جرائم کرتا رہا لیکن منشیات کے دھندے سے اسے اب بھی شدید نفرت تھی۔ اور اس کی یہی بات مجھے زیادہ پسند آئی تھی۔

”شام ہو چکی ہے روئی باؤ! تم مجھے کس کام سے بھیجتا چاہتے تھے؟“ اس نے کہا۔
مجھے چاچا خیر وین کی فکر تھی۔ سب سے پہلے میں اس کی خبر لینا چاہتا تھا۔ میں نے سو لجر کو سہارا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ چاچا خیر دین کا نام سن کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔

”چاچا خیر دین۔“ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”وہ تو اپنے وقت کا بہت بڑا بد معاش تھا۔ تمہارے طفیل کبھی اس سے بھی ملنے کا موقع مل جائے گا۔“

”میرے ساتھ رہ کر بڑے بڑے بد معاشوں اور بڑے بڑے لوگوں سے ملو گے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس وقت میں نے جو باتیں کہی ہیں ان کا خیال رکھنا۔ اب جاؤ۔“

سو لجر تھوڑی دیر بعد ہی رخصت ہو گیا۔ میں ڈیوڑھی والے دروازے کو کنڈالگا کر کمرے میں آ گیا۔ گرمی کا موسم تھا۔ کمرے کی چھت سے ایک پرانا سا پنکھا لٹکا ہوا تھا۔ لیکن وہ ہوا کم دیتا اور شور زیادہ مچاتا تھا۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ سو لجر والی چارپائی پر سر ہانے کی طرف چادر کے نیچے ایک اخبار کا کونہ جھانک رہا تھا۔ میں نے وہ اخبار بھی نکال لیا۔

وہ ایک ہفتہ پرانا اخبار تھا۔ میں وقت گزارنے کے لئے خبریں پڑھنے لگا۔ آخری صفحہ پر باکس میں سنگل کالم کی ایک خبر پڑھ کر میں چونک گیا۔ یہ خبر دھمکے نامی اس لبنانی عورت کے بارے میں تھی جس کی لاش نے مجھ سے معافہ کرنے کی کوشش کی تھی اور میں اس کی کوشش سے کروڑوں کی دولت اڑا لیا تھا۔

دھمکے کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ایجوکیشن ٹاؤن والے مکان میں میرے پاس جو اخبار آتا تھا اس میں یہ خبر نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے یہ خبر چھپی بھی ہو لیکن میری نظروں سے نہ گزری ہو۔

اس خبر کے مطابق بیروت سے تین انٹیلی جنس افسروں پر مشتمل ایک پارٹی اسلام آباد پہنچ رہی تھی جسے مقامی پولیس کے تعاون سے دھمکے کے قتل کی تحقیقات کرنا تھی۔ ایک دن اسلام آباد میں قیام کے بعد اس تحقیقاتی پارٹی کو لاہور آنا تھا جہاں باضابطہ طور پر اپنا کام شروع کرنا تھا۔ میں نے اخبار تہہ کر کے رکھ دیا۔ میرا ایک ہاتھ بے اختیار گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ پر پڑ گیا اور میں دھمکے کے بارے میں سوچنے لگا۔

تھی جہاں صدیقی نامی ایک شخص سے عشق ہو گیا۔ ماں کی سخت نگرانی کے باوجود ان کا عشق بڑھ رہا اور بالآخر نذیراں (سو لجر) کی ماں صدیقی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ انہوں نے لاہور کرشادی کر لی۔ نذیراں گھر سے ماں کے ایک دو زور اور تھوڑی سی نقدی چرا کر لائی تھی۔ یہ نقدی صدیقی کے پاس بھی تھی۔ اور جب یہ سب کچھ ختم ہو گیا تو انہیں مستقبل کی فکر ہوئی۔ اس دوران صدیقی کی ملاقات عبداللہ نامی ایک شخص سے ہو گئی۔ وہ انہیں اپنے گھر لے آیا۔ عبداللہ نے نہ صرف انہیں رہائش کا ٹھکانہ فراہم کر دیا بلکہ صدیقی کو ایک دکان پر نوکری بھی دلادی۔ ایک سال کے اندر ہی نذیراں ماں بن گئی۔ وہ بچہ محمد امین تھا۔ وہ ابھی چند مہینوں کا تھا کہ صدیقی نے نذیراں کو طلاق دے دی اور شہر چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔

عبداللہ اور اس کی بیوی بہت ہمدرد ثابت ہوئے۔ نذیراں کے لئے زندگی گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ عبداللہ غریب آدمی تھا۔ یہ اس کا مکان تھا جس میں ہم اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی مگر آمدنی بہت کم تھی۔ ان میاں بیوی کا گزارا بھی بہت مشکل سے ہو رہا تھا۔ نذیراں اور اس کے بچے کا بوجھ بھی پڑ گیا۔

محمد امین ایک سال کا تھا کہ نذیراں نے ٹرین کے نیچے آ کر خود کشی کر لی۔ امین کو عبداللہ اور اس کی بیوی نے گود لے لیا اور اس کی پرورش کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد عبداللہ کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ عبداللہ نے بڑی محنت سے امین کی پرورش کی۔ اسے آٹھویں جماعت تک تعلیم دی۔ دلواری مگر آگے پڑھانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ عبداللہ نے اسے بھی اپنے ساتھ کام پر لایا۔ عبداللہ ٹھیلے پر موسم کے لحاظ سے مختلف چیزیں بیچا کرتا تھا۔ امین کی وجہ سے اس کو بڑا سہولت مل گئی تھی۔

چند سال پہلے عبداللہ بیمار ہو گیا۔ محمد امین نے اس کی بڑی خدمت کی۔ عبداللہ بھی اسے اولاد کی طرح چاہتا تھا۔ اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ اب اس کی زندگی کے دن پورے رہے ہیں۔ ایک روز کچہری جا کر اس نے اپنا یہ مکان محمد امین کے نام کر دیا۔ اس کے چند دن بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

عبداللہ کے انتقال کے بعد محمد امین کچھ عرصہ ٹھیلے پر مختلف دھندے کرتا رہا، پھر اس نے کام چھوڑ دیا۔ اس میں خواری زیادہ اور آمدنی کم تھی۔ وہ پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ چار سال ملازمت کے دوران اس نے پولیس والوں کے تمام ہتھکنڈے سیکھ لئے۔ وہ چھوٹے موٹے جرائم کے سلسلے میں لوگوں سے رشوت ضرور لیتا تھا لیکن منشیات فروشوں سے اسے شدید نفرت تھی۔ اور پھر منشیات ہی کی وجہ سے اس کی نوکری بھی چھوٹ گئی اور تھانیدار کی پٹائی کے جرم

میں کمرے سے باہر آ گیا اور دبے قدموں چلتا ہوا ڈیوڑھی والے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ دروازے کی جبری سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن باہر گلی میں بھی اندھیرا تھا۔ بہت ہلکی سی دستک ایک بار پھر ہوئی۔ میں نے آہستگی سے کنڈا ہٹا دیا۔ کنڈے کی آواز سننے ہی باہر سے آہستگی سے دھکیل کر دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے اندر داخل ہو کر پہلے دروازہ بند کر کے کنڈا لگایا اور پھر میری طرف گھومتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ اس کی گرفت بہت پُر جوش و خروش تھی۔ مگر میرے لئے تنگی کی بات یہ تھی کہ وہ کوئی مرد نہیں، عورت تھی.....!

اندھیرے میں وہ سایہ مجھ سے لپٹا تو میں بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ میں نے پستول نکالنے کے لئے ایک ہاتھ پتلون کی جیب کی طرف بڑھانے کی کوشش کی مگر میرے دونوں ہاتھ تو اس کی چھٹی کی لپیٹ میں تھے۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اس احساس نے مجھے مزید بدحواس کر دیا کہ وہ کوئی مرد نہیں، عورت تھی جو بڑے پُر جوش انداز میں مجھ سے لپٹی جا رہی تھی۔ میں منہ سے آواز نکالنے بغیر اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ جو یک کی طرح مجھ سے لپٹی جا رہی تھی۔ میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ جسم کے مسام پسینہ اُگلنے لگے تھے۔ میرے ذہن میں وہ واقعہ گھوم گیا جب چند روز پہلے میں نے ایک کونٹھی میں داخل ہو کر الماری کا دروازہ کھولا تھا تو ایک لاش مجھ سے لپٹ گئی تھی اور آج میں نے دستک پر دروازہ کھولا تو ایک زندہ عورت مجھ سے لپٹ رہی تھی۔

”اے کون ہوں تم..... چھوڑو مجھے.....“ یہ الفاظ بڑی مشکل سے میرے منہ سے نکلے تھے۔
 ”نہیں..... آج تو.....“ اس عورت نے بھی جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر وہ جملہ پورا نہ کر سکی۔ اور پھر ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ ہو گئی اور دھڑ سے دروازے سے نکل گئی۔
 ”محمد امین تم..... نہیں..... تم محمد امین نہیں ہو..... کک..... کون.....؟“
 ”میں محمد امین نہیں، اس کا دوست ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مگر تم کون ہو؟ ادھر روشنی میں آؤ۔ ذرا چہرہ تو کراؤ۔“

دھکے کے قتل کے اگلے روز اخبارات سے پتہ چل گیا تھا کہ وہ پاکستان میں لبنان کی بڑی تھی۔ اسے لاہور پسند آ گیا تھا اس لئے اس نے یہاں بھی ایک کونٹھی کرائے پر لے رکھی تھی۔ مہینے میں ایک ہفتہ لاہور میں قیام کرتی تھی اور یہاں اس کی مصروفیات بالکل نئی ہوتی تھیں۔ اخبارات نے ان دنوں اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا اور اس واردات کو ڈیکوریشن واردات لکھا تھا۔ لیکن پولیس والے یا اخبارات یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ ڈاکو دھکے کی کونٹھی سے کچھ لے گئے تھے۔

اور اب میں بھی پہلی بار یہ سوچ رہا تھا کہ دھکے اگر صرف ایک ہفتے کے لئے لاہور آئی تھی اسے اپنے پاس کروڑوں روپے کی نقدی اور زیورات رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ جو لوگ اسے چوکیدار کو قتل کر گئے تھے انہوں نے بھی ان قیمتی زیورات اور نقدی کو ہاتھ نہیں لگایا تھا جس کا پکا ہی مطلب تھا کہ قتل کا مقصد کچھ اور تھا جو اتنی دولت سے بھی زیادہ اہم ہو سکتا تھا۔

یہ ایک ہفتہ پرانا اخبار تھا اور مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ بیروت کی تحقیقاتی ٹیم نے یہاں کون کی تحقیقات کی تھی۔ وہ لوگ ابھی لاہور ہی میں تھے یا واپس جا چکے تھے۔ لیکن یہ بات میں جانتا تھا کہ اس قسم کی باتیں آسانی سے نہیں دہتی تھیں۔ سفارتی معاملات بہت دور تک پہنچتے تھے۔

میں ابھی یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ باہر والے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ سو لچرنا جلدی واپس نہیں آ سکتا تھا۔ اسے تو گئے ہوئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا۔ دستک کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ بہت ہلکے ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹایا گیا تھا۔ میرا خیال میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ پولیس ہوتی تو دروازہ اس طرح پیار سے نہ کھٹکھٹاتا۔



”اُسے واپس آنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگیں گے۔ اور ظاہر ہے تم اتنی دیر یہاں نہیں رُک سکتیں۔ ٹھیک ہے۔ میں اُسے بتا دوں گا۔“

وہ کمرے سے نکل گئی اور وحشی ہرنی کی طرح تیز تیز چلتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں جب کمرے سے باہر نکلا تو وہ بیرونی دروازہ کھول کر باہر جھانک رہی تھی۔ اور پھر وہ دروازہ پوری طرح کھول کر باہر نکل گئی۔ میں نے تِلے قدم اٹھاتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب پہنچ گیا اور دروازے کے پٹ سے باہر جھانکنے لگا۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ شبنم سامنے والی رو کے تیسرے مکان میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر اندر غائب ہو گئی۔

میں نے دروازہ بند کر کے کنڈا لگا دیا اور کمرے میں آ کر چار پائی پر لیٹ گیا۔ محمد امین اور شبنم ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ دونوں کا تعلق ایک ہی طبقے سے تھا۔ دونوں جوان تھے۔ سولجر بھی خود تھا اور شبنم بھی حسین۔ اس طرح گلی میں آتے جاتے ایک دوسرے کو دیکھ کر پسند کر لینا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ایسی خود رو بلیں مشکل ہی سے منڈھے چڑھتی ہیں۔ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو پسند تو کرتے ہیں لیکن ان کی چاہت سات پردوں کے پیچھے چھپی ہوتی ہے۔ خصوصاً لڑکی کے والدین تو قطعی بے خبر ہوتے ہیں کہ ان کی بیٹی کسی کے عشق میں مبتلا ہو چکی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر بیٹی کا رشتہ کہیں اور طے کر دیتے ہیں۔ لڑکی دلہن بن کر کسی اور دل کی ملکہ بن جاتی ہے اور لڑکا کچھ عرصہ گھرے سانس لیتا ہے اور پھر اسے بھول جاتا ہے۔

شبنم بھی چوری چھپے سولجر سے ملنے آتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے بیچ تعلقات کس نوعیت کے تھے۔ سولجر کے بارے میں، میں اتنا جان چکا تھا کہ وہ غنڈہ اور بد معاش ہونے کے باوجود شریف آدمی ہے۔ کم از کم اس محلے میں وہ شرافت کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ شبنم سے ملاقاتوں میں ہوس کو بھی کوئی دخل ہوگا۔

میں یہی سب کچھ سوچتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔ اور پھر میرے ذہن میں اچانک ہی اس لڑکی کا خیال ابھر آیا جس نے مجھے سویاں بھیجی تھیں۔ شاید اس طرح شبنم اور سولجر میں رومان شروع ہوا ہوگا۔ میں ایجوکیشن ٹاؤن والی لڑکی کی حوصلہ افزائی کروں تو وہاں بھی ایک ایسی ہی کہانی شروع ہو سکتی ہے۔ مگر میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری کوئی معمولی سی غفلت مجھے لے ڈوبے۔ سولجر کی بات مختلف تھی۔ وہ بہت معمولی درجے کا بد معاش تھا۔ نہ تو وہ پولیس کو مطلوب تھا اور نہ ہی اس کے گرد دشمنوں کا حصار تھا۔ وہ ایک بہت معمولی بد معاش تھا۔ بلکہ میرے خیال میں تو اسے بد معاش کہنا بھی

میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا کمرے کے سامنے لے آیا۔ کھلے دروازے سے روشنی آ رہی تھی اور اس روشنی میں اسے دیکھ کر میں واقعی پلک پلکنا بھول گیا۔ کی عمر چوبیس پچیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دراز قامت، سمدول جسم اور چہرے کے خطوط بڑے دلکش تھے۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے شلوار قمیض پہنی تھی۔ دوپٹہ گلے کا ہار بنا ہوا تھا۔ سینے کا اتار چڑھاؤ اس کی گھبراہٹ یا کسی بے نام غریب عکاسی کر رہا تھا۔ وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اس نے دروازے کے قریب جس طرح محمد امین کا نام لیا تھا اس سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ سولجر کی دوست تھی۔ اور شاید، نہیں، یقیناً اسی گلی میں رہتی تھی۔ وہ دروازہ کھلتے ہی اندر داخل ہو کر جس طرح مجھ سے لپٹی تھی اس۔ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ داستان عشق اس کچی بستی میں اندر ہی اندر خاموشی۔ رقم ہو رہی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے حد حسین تھی۔ کسی بڑے گھرانے میں ہوتی تو اس کا حسن بڑھ کر تارتا۔ لیکن شاید اس غربت میں وہ زیادہ حسین تھی۔ گدڑی میں لعل شاید اسی کو کہتے ہیں۔ ”گھبراؤ نہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں محمد امین کا دوست ہوں۔ آج صبح ہی یہاں آیا ہوں۔ تم کون ہو، کیا نام ہے تمہارا اور محمد امین سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ ”وہ جی.....“ وہ ہٹلا کر رہ گئی۔ اس طرح پکڑے جانے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”ہاں..... ہاں، ڈرو نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آؤ..... اندر آ جاؤ۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ محمد امین بھی آنے والا ہی ہوگا۔“

وہ صحن میں کھڑی ہوئی بھی کسی انجانے خوف میں مبتلا تھی۔ کمرے میں آتے ہوئے اور اندر رہی تھی۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر کمرے میں لے آیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھرا ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”اور بتاؤ تم کون ہو؟ محمد امین سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ ”میرا نام شبنم ہے جی اور میں محمد امین کی..... مم..... میرا مطلب ہے میں اسی گلی میں رہتی ہوں جی۔“ وہ رُک رُک کر بات کر رہی تھی۔

”اوہ، سمجھ گیا۔“ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ ”امین کی دوست ہو۔ پیار کرنا ہو اس سے۔“

”جی وہ.....“ وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں چلتی ہوں جی! محمد امین پتہ نہیں آئے۔“

”کون ہو..... رُک جاؤ۔“

”میں ہوں روٹی باؤ!“ سو لجر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور میں نے پستول مچے کر لیا۔ سو لجر نے وہاں کوئی بات نہیں کی۔ ہم دونوں کمرے میں آگئے۔ اس نے اخبار میں لپٹا ہوا ایک بڈل میز پر رکھ دیا۔

”بہت دیر لگادی تم نے۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”پریشانی کیسی روٹی باؤ!“ وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اپنے پرکون ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں سے پنکا کوئی نہیں لیتا۔ ویسے خبریں بہت گرما گرم ہیں۔“

میں اس کی پنکا لینے والی بات پر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ میں اپنے آپ کو بہت بڑا دادا سمجھتا تھا۔ لوگ مجھے خنخورا بھیڑیا کہتے تھے اور میں اپنی جان کے خوف سے چھپا پھر رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو دہلا کبھی نہیں سمجھا تھا۔ ہمیشہ نہلا ہی سمجھتا رہا تھا۔ اور میرے اوپر ملک شہاب جیسے دہلے بھی تھے جو اس وقت مجھ پر حاوی ہو رہے تھے اور یہ سڑک چھاپ بہتہ گیر اپنے آپ کو سب کا باپ سمجھ بیٹھا تھا اور اس کی اس بات پر میں دل ہی دل میں مسکرا دیا تھا۔

”ہاں..... کیا خبریں ہیں؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم تو سارا دن یہاں آرام سے سوتے رہے اور پورے شہر میں تھر تھلی سی مچی ہوئی ہے۔ کم از کم اس علاقے کے درجنوں بد معاشوں کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا ہے۔“ سو لجر نے کہا۔

میں سو لجر سے پہلی ہی ملاقات میں یہ بھی جان چکا تھا کہ وہ باتونی اور شیخی خورہ ہے۔ بات کو گھما پھرا کر کرنے کا عادی ہے۔ اس لئے مجھے اس سے اصل بات جاننے کے لئے صبر سے کام لیتا ہوں۔

اس نے بات آگے بڑھانے کی بجائے میز پر رکھا ہوا اخبار والا پیکٹ کھول لیا جس میں چغہ، نان اور سلاڈ وغیرہ تھے۔ اس نے ساری چیزیں اخبار میں ہی پھیلا دیں اور پانی کے دو گلاس بھر کر لے آیا۔

”واپس آتے ہوئے میں نے لکشی سے یہ چغہ لے لیا تھا۔ تمہیں بھی بھوک لگ رہی ہوگی نا روٹی باؤ..... کھانا شروع کرو..... میں تمہیں بتاتا رہوں گا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔“

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ بھوک تو مجھے بھی لگ رہی تھی لیکن میں چاہتا تھا کہ پہلے بات سن لی جائے، پھر کھانا کھایا جائے۔ لیکن سو لجر بھی اپنی قسم کا ایک ہی آدمی ثابت ہوا تھا اس لئے مجھے مزید صبر کرنا پڑا۔ اس نے کھانے کے دوران جو کچھ بھی بتایا، اس کا خلاصہ

بد معاشی کی توہین تھی۔ وہ اپنے سے کمزور لوگوں کو ذرا دھمکا کر بہتہ وصول کرتا تھا جس سے اس کا کام چل رہا تھا۔ اسے کسی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے گلی کی ایک لڑکی سے عشق لڑانے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھا تھا۔ لیکن میں فی الحال اس قسم کی عیاشیوں کا مشغل نہیں رہ سکتا تھا۔ سو لجر کو گئے ہوئے تقریباً تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ بیڈن روڈ زیادہ دور تو نہیں تھا۔ اب تک آ جانا چاہئے تھا۔ میں اپنے آپ میں کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ اور پھر اس کمرے سے باہر آ گیا۔ تازہ ہوا سے میرے دماغ کی تپش ذرا کم ہوئی۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ سو لجر کسی معاملے میں مداخلت نہ کر بیٹھا ہو۔ اور کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پولیس کسی بھی مشتبہ شخص کو دھر سکتی تھی۔ سو لجر کا شمار شرعاً میں تو نہیں ہوتا تھا۔ وہ پولیس سے نکالا ہوا سزا یافتہ آدمی تھا۔ پولیس اس کے بازے میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بد معاشی کرتا ہے۔ ایسے لوگ تو ہر علاقہ کی پولیس کے لئے جانے پہچانے ہوتے ہیں۔ اُنہ اندیشہ تھا کہ اس علاقے میں گھومتے دیکھ کر پولیس نے اسے بھی شے میں نہ دھر لیا ہو۔

سو لجر سے میری چند گھنٹوں کی ملاقات تھی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میرا مطلب ہے اس کے سامنے اپنا کوئی راز ظاہر نہیں کیا تھا۔ تاہم وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ دھر لئے جانے کی صورت میں وہ پولیس کو میرے بارے میں بھی کچھ بتا سکتا تھا۔ کبھی میں سوچتا کہ اس کے ساتھ یہاں آ کر میں نے غلطی کی تھی اور اس سے بڑی غلطی ٹپا۔ یہ کی تھی کہ اسے معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ اور کبھی میں سوچنے لگتا کہ وہ قابل اعتماد آدمی ہے۔ پکڑا بھی گیا تو میرے بارے میں زبان نہیں کھولے گا۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں ہلکے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔ قدموں کی آواز اس طرف آ رہی تھی۔ یہ اس گلی کا آخری مکان تھا۔ اس سے آگے کوئی راستہ بھی نہیں تھا جس سے یہ سوچا جاسکتا کہ کوئی راہگیر ہوگا..... اور پھر وہ آواز رک گئی۔

میں نے جیب سے پستول نکال لیا اور انتظار کرنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہی باہر سے دروازے کی زنجیر بجائی گئی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اندر سے زنجیر ہٹادی اور دروازے کے پیچھے دبا کے ساتھ چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ باہر جو کوئی بھی تھا اس نے اندر سے زنجیر گرائے جانے کی آواز نہ لی تھی۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے دروازہ آہستگی سے کھل گیا تھا۔ ایک تاریک ہیولہ اندر داخل ہوا۔ میں نے مڑ کر دروازہ بند کیا اور جیسے ہی مڑا، میں نے اسے پستول کی زد میں لیتے ہوئے سڑک کی۔

”چلیا ہے۔“ سو لجر نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں اکٹھے ہی پولیس میں بھرتی ہوئے تھے۔ چار سال بعد میری تو چھٹی ہو گئی۔ وہ ابھی تک کانٹیل کے عہدے پر اٹکا ہوا ہے۔“ کانٹیل کے عہدے والی بات سن کر میں دل ہی دل میں سکرادیا۔

”اس سے کیا باتیں معلوم ہوئیں؟“ میں نے پوچھا۔

”پولیس کو گناہ طریقے سے یہ پیغام پہنچایا گیا ہے کہ چونکہ آج کل ملک شہاب اور رونی کے سچ نسل چل رہی ہے اس لئے شیدے اور نادر کے قتل میں رونی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ پولیس کو یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ کل رات رونی کو یعنی تمہیں بیڈن روڈ کے آس پاس دیکھا گیا تھا۔ چاچا خیر دین کے بیان کے مطابق پولیس والے پہلے ہی یہ معلوم کر چکے ہیں کہ تم کئی روز سے اس طرف نہیں آئے۔ لیکن یہ گناہ اطلاع ملنے کبید پولیس نے خفیہ طور پر تمہارے بارے میں تحقیقات شروع کر دی ہیں۔“

”ہوں.....“ میں نے گہرا سانس لیا۔ ”اور کوئی خاص خبر؟“

”اور خاص خبر یہ ہے رونی باؤ! کہ ملک شہاب کے آدمی بھی علاقے میں گھوم پھر رہے ہیں۔ تاجے کو تو میں نے خود دیکھا تھا۔“ سو لجر نے بتایا۔

”تاجا؟“ میں نے کہا۔ ”وہ ملک شہاب کا ڈرائیور تھا۔ مگر میں نے تو سنا ہے اسے نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔“

”یہ ڈراے چلتے رہتے ہیں رونی باؤ!“ سو لجر نے کہا۔ ”نکالے جانے کے بعد بھی ایسے لوگ ملک شہاب کے وفادار رہتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ملک شہاب لاہور ہی میں ہے اور گرفتاری کے خوف سے خود سامنے آنے کی بجائے اس نے اپنے آدمیوں کو ادھر ادھر پھیلادیا ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں چھپا بیٹھا ہے۔“

”معلوم ہو جائے گا رونی باؤ! بس آج کی رات ٹھہر جاؤ۔“ سو لجر نے کہا۔

میں کھانا ختم کر چکا تھا جبکہ سو لجر ابھی تک ہڈیاں چجوڑ رہا تھا۔ صبح اس نے چائے کے ساتھ کچھ کھایا تھا اور میرا خیال ہے ایسا اچھا کھانا اسے کئی روز بعد کھانے کو ملا تھا اور وہ ہڈیوں سے گوشت کا ایک ایک ریشہ نوج لینا چاہتا تھا۔

”صبح تم کیا کرو گے؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کوئی نہ کوئی رستہ نکال ہی لوں گا رونی باؤ!“ اس نے بالآخر چرغے کی بجی کچھ ہڈیاں اخبار میں پیٹتے ہوئے کہا۔ ”تاجے سے میری تھوڑی بہت سلام دعا ہے۔ اگر صبح وہ کہیں مل گیا تو اس

کچھ یوں تھا۔

صبح چرچ کے قریب والی سڑک پر شیور لیٹ کار سے دو لاشیں برآمد ہونے کے بعد پولیس ایکٹو ہو گئی تھی۔ ان دونوں میں سے شیدانامی آدمی کی لاش پولیس نے شناخت کر لی تھی۔ وہ ملک شہاب کا آدمی تھا۔ پولیس نے ملک شہاب سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکی کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے روپوش تھا۔ تاہم اس کے آدمیوں سے شیدے کی لاش کی شناخت کی تصدیق ہو گئی۔ انہوں نے دوسری لاش کو بھی شناخت کر لیا۔ وہ بھی ملک شہاب کا آدمی نادر تھا۔ لاشوں کی شناخت ہونے کے بعد پولیس ضرورت سے زیادہ سرگرم ہو گئی۔ ملک شہاب کے بارے میں کون نہیں جانتا تھا۔ راشی اور بہت سے بدعنوان پولیس آفیسرز کا ان دا تا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بندر روڈ والے ٹرک پر پڑنے والے چھاپے کے بعد ایس پی سعید نے اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ روپوش ہو گیا تھا۔ راشی پولیس آفیسر یہ بھی جانتے تھے کہ ملک شہاب زیادہ دنوں تک روپوش نہیں رہے گا۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ روپوشی میں بھی آرام سے نہیں بیٹھا ہوگا۔ وہ ایس پی سعید کا پیہ ضرور کٹوائے گا۔ اور اس کے بعد پھر وہی ہوگا جو ملک شہاب چاہے گا۔ اس لئے یہ راشی پولیس آفیسر ملک شہاب کے آدمیوں کے قاتلوں کی تلاش میں کچھ زیادہ ہی سرگرم ہو گئے تھے۔

علاقے کے بد معاشوں کو پکڑ پکڑ کر بند کیا جا رہا تھا۔ پولیس نے چاچا خیر دین کو بھی پکڑ لیا تھا۔ تھانے میں تقریباً چار گھنٹوں تک اس سے پوچھ گچھ ہوئی رہی۔ اس پر کچھ تشدد بھی کیا تھا مگر چاچا خیر دین نے زبان نہیں کھولی۔ اس کا صرف ایک ہی جواب تھا کہ وہ اس واردات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

چار گھنٹوں بعد پولیس نے چاچا خیر دین کو چھوڑ دیا۔ پولیس والے یہ جانتے تھے کہ جس مکان میں وہ رہ رہا ہے وہ میں نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ اس لئے پولیس چاچا خیر دین سے میرے بارے میں بھی پوچھتی رہی تھی۔ مگر چاچا خیر دین نے انہیں بتا دیا کہ میں کئی دنوں سے اس مکان پر نہیں آیا۔ اس کی تصدیق پولیس نے دوسرے ذرائع سے بھی کر لی تھی کہ میں واقعی کئی روز سے اس مکان کے آس پاس نہیں دیکھا گیا۔

”پھر میں ادھر چلا گیا جی۔ لکشی چوک کی طرف۔“ سو لجر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

کھانا بھی وہ بڑے اطمینان سے ہر نوالہ چبا چکا کر کھا رہا تھا۔ ”وہاں طفیل سے ملاقات ہو گئی۔ اس سے کچھ کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔“

”طفیل کون ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

انسان سے رابطہ کر کے اپنے بچاؤ کی کوشش کر رہا ہو گا اور دوسری طرف مجھے پھنسانے کی بھی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بیڈن روڈ والے مکان پر حملہ تو مجھے ہی امر دانے کے لئے کیا تھا مگر اپنے ہی دو آدمیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میرے بچ نکلنے کے بعد وہ گناہ کاٹر کے ذریعے پولیس کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان دو آدمیوں کے قتل میں میرا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ گویا اس طرح وہ پولیس کو میرے پیچھے لگانے کی کوشش میں تھا۔ اس کا خیال ہو گا کہ اگر مجھے پولیس کے چکر میں پھنسا دیا جائے تو اسے مجھ سے خود بخود نجات مل جائے گی۔ لیکن میں ایسا بیوقوف نہیں تھا کہ اس کی چال کو نہ سمجھ سکوں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد سولجر چائے لے کر آ گیا۔ اتنی دور سے آتے ہوئے چائے اگرچہ ٹھنڈی ہو چکی تھی لیکن اچھی چائے تھی۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بھی ہم ملک شہاب کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اگرچہ سولجر کو نہیں بتایا تھا کہ پشاور سے آنے والا ملک شہاب کا مال میں نے پکڑ دیا تھا جس وجہ سے وہ میرا دشمن ہو گیا تھا لیکن ایسی باتیں چھپی تو نہیں رہتیں۔ یہ بات تو انہی دنوں مشہور ہو گئی تھی کہ اس ٹرک کے بارے میں پولیس کو خبری میں نے کی تھی۔ سولجر بھی اسی زیر زمین دنیا کا باسی تھا۔ ایسی باتیں تو اس نے بھی سنی ہوں گی۔ میرے خیال میں وہ قابل اعتماد تو تھا لیکن میں اپنا کوئی راز اس وقت تک اسے نہیں بتا سکتا تھا جب تک اسے آ زمانہ لیتا۔

سولجر صبح دس بجے کے قریب ناشتہ کرتے ہی گھر سے نکل گیا۔ جانے سے پہلے وہ میرے دوپہر کے کھانے کے لئے کچھ چیزیں لے کر دے گیا تھا تاکہ بعد میں مجھے کوئی پریشانی نہ ہو۔ اس مرتبہ وہ ڈیوڈی والے دروازے کو بھی باہر سے تالا لگا گیا تھا اور اخبار بھی لے کر دے گیا تھا۔

اخبار میں گزشتہ روز کے واقعہ کی خبریں بڑی تفصیل سے شائع ہوئی تھیں۔ ملک شہاب کا ذکر بھی نمایاں طور پر کیا گیا تھا مگر میرا کہیں تذکرہ نہیں تھا۔

میں دن بھر کمرے میں پڑا رہا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں سو گیا تھا۔ اور پھر آہٹ کن کر میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ سولجر دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ اس کے قریب زمین پر کچھ چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ ضرورت کے کچھ برتن اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر آیا تھا۔

برتن اور چیزیں سنبھالنے میں چند منٹ لگ گئے اور پھر وہ محن میں اینٹوں کا چولہا بنا کر چائے بنانے بیٹھ گیا۔ ٹیبلٹ کی غنی کیتلی چند منٹ میں ہی دھوئیں سے کالی ہو گئی۔ چائے میں بھی

سے ساری کہانی معلوم کر لوں گا۔

”اگر اسے کوئی شبہ ہو گیا تو؟“ میں نے کہا۔

”شبہ کیسے ہو گا؟“ سولجر نے کہا۔ ”اسے کیا پتہ کہ میں تمہیں جانتا ہوں یا تم آج کل میرے ساتھ رہ رہے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کام تو اب صبح ہی ہو گا۔ لیکن اس وقت چائے کا کیا ہو جائے؟“

”چائے میں بازار سے لے کر آتا ہوں۔ تیزاب احاطے والے چوک کی طرف سارا رات رونق رہتی ہے۔ چائے کی دو تین دکانیں بھی کھلی ہوتی ہیں۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔“ اس نے یہ کیا ہوا اخبار کمرے سے باہر اینٹوں کے ڈھیر کی طرف پھینک دیا اور گلاس اٹھا کر باہر جانے لگا تو میں نے پوچھ لیا۔

”شبہ کون ہے؟“

”شبہ؟“ اس نے میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”کیا وہ یہاں آئی تھی؟“

”ہاں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہ یہاں آئی تھی۔ کون ہے وہ؟“

”اپنی دوست ہے رونی باؤ۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔“ سولجر نے جواب دیا۔ ”اس کا باپ ریلوے مال گودام میں فٹنی ہے۔ غریب آدمی ہے۔ اور رونی باؤ۔ غریب ہی غریب کا خیال رکھتا ہے۔ میرا کچھ پوچھا تھا اس نے؟“

”ظاہر ہے تمہیں ہی پوچھنے آئی تھی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے اسے بتایا تھا کہ تمہارا دوست ہوں اور آج ہی آیا ہوں۔ اور میرا خیال ہے اس کا باپ بھی یہاں آتا ہو گا۔“

”چاچا عبداللہ جب زندہ تھا تو روزانہ رات کو ان کی بیٹھک جستی تھی۔“ سولجر نے جواب دیا۔ ”اب تو وہ کبھی کبھار ہی یہاں آتا ہے۔ البتہ شبہ کون کب بھی موقع ملتا ہے یہاں آ جاتی ہے۔ اچھا، میں چائے لے آؤں پھر باتیں کریں گے۔“

سولجر چلا گیا۔ اس مرتبہ میں نے بیرونی دروازے کو اندر سے بند نہیں کیا۔ وہ باہر سے زنجیر چڑھا گیا تھا۔

میں سولجر کی بتائی ہوئی باتوں پر غور کرنے لگا۔ چاچا خیر دین والے مکان پر حملے اور سولجر باتوں سے ثابت ہو گیا تھا کہ ملک شہاب لاہور میں ہی کسی جگہ روپوش ہے۔ ایک طرف وہ

کیا تم اس کو بھی کی نشاندہی کر سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

کر کے تمہارے ساتھ آگیا۔“

”اگر یہاں تمہارے ساتھ کوئی دھوکا ہوتا..... میرا مطلب ہے کہ میں بھی تمہیں کسی چکر میں

پھنسا کر.....“

”سولجر!“ میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ”میری زندگی اسی دشت میں گزری ہے۔ کسی کا چہرہ دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ وہ کسی قماش کا آدمی ہے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”جب تم نے مجھ سے پوچھے بغیر میرے لئے چائے منگوائی تھی تو میں نے اسی وقت تمہارے اندر جھانک لیا تھا۔ تمہارا تعلق اس برادری سے ضرور ہے لیکن تمہارے اندر کھوٹ نہیں ہے۔ اور پھر جب تم نے یہ بتایا کہ ہیروئن کے چکر میں ایک تھانیدار کی پٹائی کر کے نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھے ہو اور تین مہینے کی سزا بھی کاٹ آئے ہو تو میں نے اسی وقت تم پر اعتماد کر لیا تھا اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر مجھے کسی قابل اعتماد آدمی کی ضرورت پڑی تو تم سے رابطہ کروں گا۔ اور اتفاق سے اس کے فوراً ہی بعد صورتحال کچھ ایسی پیدا ہو گئی کہ میں تمہارے ساتھ یہاں آگیا۔ اگر مجھے تم پر اعتماد نہ ہوتا تو تمہارے ساتھ کبھی نہ آتا۔ اور اگر تم مجھے دھوکا دینے کی کوشش کرتے تو تم اب تک اپنے انجام کو پہنچ چکے ہوتے۔ ویسے ایک بات بتا دوں کہ تم غنڈے اور بد معاش ضرور ہو مگر کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتے۔“

”خوش کیا ای رونی باؤ!“ سولجر نے آگے جھک کر میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ ”میں اپنے بارے میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ میری پرورش غربت اور بہت شریفانہ ماحول میں ہوئی ہے۔ چاچا عبداللہ تو مجھے پڑھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا مگر اس کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے۔ وہ خود محنت کرتا تھا۔ اس نے مجھے بھی محنت کرنا سکھایا۔ وہ تو براہو پولیس کی نوکری کا جس نے میرے منہ کو حرام لگا دیا۔ تم خود ہی سوچو رونی باؤ! اگر میں اندر سے برا ہوتا تو ہیروئن کے مسئلے پر تھانیدار سے میری لڑائی کیوں ہوتی؟ میں اس کی پٹائی کیوں کرتا اور نوکری سے ہاتھ دھو کر جیل کیوں جاتا؟ یقین کرو رونی باؤ!“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ میرا باپ کون تھا۔ میں نے تو اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے یہ حماقت ضرور کی تھی کہ میری ماں کو بھاگ کر لایا تھا اور پھر اسے بے سہارا چھوڑ کر چلا گیا۔ لیکن اس کا خون گندا نہیں تھا۔ اگر میرے ماں باپ کا خون گندا ہوتا تو میں بچپن ہی سے غلط راستے پر چل نکلتا ہوتا۔ میں نے تو اچھی نیت سے پولیس کی نوکری کی تھی۔ اور پھر ٹیک نیٹی ہی سے تھانیدار کو ہیروئن والے مسئلے پر روکنے کی کوشش کی تھی۔ اگر میرے اندر یہ ای ہوئی تو میں مخالفت کرنے کی بجائے تھانیدار سے ہاتھ بڑا دوں پے قبول کر لیتا اور آسہ بھی میرا یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ رونی باؤ!“ وہ چند لمحوں کی

خطرے میں کود رہے ہو۔“

”اب تک خطرہ تو کھینٹا آیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ویسے مجھے اب بہت آرام ہو چکا ہے۔ اس طرح چھپ کر بیٹھے رہنے سے تو کوئی بات نہیں بنے گی۔“

”ایک بات بتاؤ رونی باؤ!“ وہ بدستور میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”مناظر کہ ملک شہاب کے ٹرک کی مجبری تم نے کی تھی جس وجہ سے وہ تمہارا دشمن ہو گیا۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں..... یہ سچ ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ اس وقت میں نے اسے اعتماد میں لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ”تم جانتے ہو مجھے ہیروئن سے شدید نفرت ہے۔ میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں۔ میں گلے تک جرائم کی دلدل میں پھنسا ہوا ہوں۔ لیکن ہیروئن اور ہیروئن کا دھندہ کرنے والوں سے مجھے شدید نفرت ہے۔ یہ بات ملک شہاب بھی جانتا ہے۔ مجھے اپنے لئے خطرہ سمجھتا تھا اور اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کے لئے ایک خوفناک منصوبہ بنایا تھا۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ اسلئے میں نے اسے مزہ پکھانے کا فیصلہ کر لیا اور کسی طرح یہ معلوم کر لیا کہ پشاور سے اس کا ٹرک کب اور کتنا مال لے کر آ رہا ہے۔ میں نے اُس کی مجبری کر دی۔ اس طرح میرے خلاف تو اس کا منصوبہ بیکار کیا کامیاب ہوتا، وہ میرے ہاتھوں مار کھا گیا۔ اس کے بعد بھی اس نے مجھے دھوکے سے مروانے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ آج تک اس کے بندے مجھے تلاش کرتے رہے ہیں مگر وہ میرا سراغ نہیں لگا سکے۔“

”ایک بات اور بتاؤ رونی باؤ!“ سولجر نے کہا۔ ”کل صبح تم مجھے ریلوے اسٹیشن کے ہال ملے تھے۔ میکلوڈ روڈ وہاں سے زیادہ دور تو نہیں جہاں ایک کار میں ملک شہاب کے دو آدمی کی لاشیں ملی تھیں۔ کیا وہ دونوں تمہارے ہاتھوں.....“

”نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ویسے وہ اپنے طور پر بالکل صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”اس وقت میں باغبانپورہ سے آیا تھا اور کچلی شخص جانے کا ارادہ تھا۔ اتنا چونکہ اس طرف کوئی بس نہیں جاتی اس لئے میں وقت گزارنے کے لئے اسٹیشن والے ہوٹل میں بیٹھ گیا تھا اور اس دوران تم سے ملاقات ہو گئی۔ اور پھر تمہارے ہی کسی بندے نے میکلوڈ روڈ کار میں ملنے والی لاشوں کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ تم نے اپنے ساتھ آنے کی پیشکش کی میں فوراً ہی تیار ہو گیا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ بس کے لئے مجھے کم از کم ایک گھنٹہ مزید انتظار کرے گا۔ اور اس دوران ظاہر ہے پولیس سے سامنا ہو جاتا اور اس طرح بلاوجہ کی بد مزگی پہنچنے کے لئے بلاوجہ کی انجمنیں پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں تمہاری پیشکش

خاموشی کے بعد بولا۔ ”ملک شہاب سے تمہاری دشمنی کی وجہ میری سمجھ میں آگئی ہے۔ تم کچھ مت کرو۔ سو لجر تمہارے ساتھ ہے۔ سو لجر جان بھی دے دے گا مگر اس مشن میں تم سے تمہارا نہیں کرے گا۔ آج سے ہمارا امرنا جیتنا ساتھ ہوگا۔“

”گنڈ۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی بھی آدمی اکیلا کوئی جنگ نہیں لڑ سکتا۔ اسے کچھ مخلص اور قابل اعتماد ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے میں اکیلا تھا۔ اب تم میرے ساتھ مل گئے ہو۔ دونوں مل کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“

”ضرور کریں گے روٹی باؤ!“ سو لجر نے کہا۔ ”بس تم ذرا مجھے گائیڈ کرتے رہنا۔ پھر ذرا سو لجر کیا کرتا ہے۔“

ہم میں دیر تک اس موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سو لجر ایک با پھر چائے بنانے کی تیاری کرنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔

”چائے نہیں۔ اب تو کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔“ میں نے کہا۔

”کھانا تو بازار سے ہی لانا پڑے گا۔ آج نان اور مرغ چھوٹے چلیں گے۔ تیز اب احاطے والے چوک پر بابا کریم بخش بہت اچھے مرغ چھوٹے.....“

وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ باہر والے دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز سنائی دی تھی۔ وہ مجھے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

چند منٹ بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ایک ہاتھ میں پلیٹ تھی جو دوڑا پلیٹ سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پلیٹ میز پر رکھ دی اور پروالی پلیٹ اٹھا دی۔

زردہ تھا، گرم گرم۔ جس میں سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔

”لو روٹی باؤ..... منہ میٹھا کر لو۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ابھی ہم بات کر رہے تھے تاکہ اس برائی کا خاتمہ کر کے ہی رہیں گے۔ رب نے ہمارا منہ میٹھا کر دیا۔ سمجھو اب اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔“

”یہ شبنم لے آئی ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہی تو ایک ہے جسے میرا اتنا خیال رہتا ہے۔“ سو لجر نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ اندر نہیں آئی۔ اسے پتہ تھا کہ تم اندر بیٹھے ہوئے ہو۔ اس لئے دروازے ہی سے داخل چلی گئی۔ بڑی شرمیلی ہے۔ دو چار دفعہ آئے گی تو اس کی جھجک بھی ختم ہو جائے گی۔“

سو لجر بازار سے برتنوں کے ساتھ کچھ چھپچھپ بھی خرید کر لایا تھا۔ وہ دو چھپچھا لایا۔ ایک

میری طرف بڑھا دیا اور دوسرے چھپچھ سے خود کھانے لگا۔ میں نے صرف دونوں ہی لئے۔ ”ڈھک کر رکھ دو۔ کھانے کے بعد کھائیں گے۔“ میں نے کہا۔

اس نے چاول اپنی پلیٹ میں ڈال کر ڈھک دیئے اور خالی پلیٹیں اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”میں کھانا لینے جا رہا ہوں۔ یہ پلیٹیں شبنم کے گھر دیتا جاؤں گا۔“

”تم تو مرغ چھوٹے لانے کو کہہ رہے تھے۔ کوئی برتن تو لے جاؤ یا جیب میں ڈال کر لاؤ گے؟“ میں نے کہا۔

اس نے ایک طرف پڑے ہوئے برتنوں میں سے پلاسٹک کا پیالہ اٹھالیا اور باہر چلا گیا۔ میں شبنم کے بارے میں سوچنے لگا۔ سو لجر کے لئے چاول وہ گھر والوں سے چوری چھپے تو نہیں لائی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس کے ماں باپ کو بھی ان دونوں کی ملاقاتوں کا علم ہو۔ سو لجر کی پوری زندگی یہیں گزری تھی۔ شبنم کے والدین بھی اسی گلی میں رہتے تھے۔ سو لجر کے گھر والے زندہ تھے تو دونوں گھرانوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔ ان دونوں کا بچپن اکٹھے ہی گزرا تھا۔ ہو سکتا ہے بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں۔

میں جیسے جیسے ان کے بارے میں سوچتا رہا، میری بے چینی بڑھتی گئی۔ میں بچپن ہی سے انہوں کی محبت سے محروم رہا تھا۔ باپ نے دھکا کر دیا۔ ماں کی مامتا مجھ سے چھین لی گئی۔ اور کسی رشتے سے میں واقف نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس محرومی کا احساس بھی بڑھتا رہا۔ جوان ہوا تو زندگی میں پہلی بار ایک عورت کو اپنے اتنا قریب پایا کہ میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور بھیڑیے کی طرح اسے بھنبھوڑ ڈالا۔ وہ جتنی رہی لیکن مجھے اس کی بے بسی کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ یہ کئی سال پہلے کی بات تھی۔ جب میں ہیرا منڈی کے علاقے میں رکشہ ڈرائیور پرویز کے ساتھ رہتا تھا۔ پرویز مخالف پارٹی کے ساتھ جھڑپ میں مارا گیا تو میں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور ٹھوکر نیاز بیگ کے علاقے میں اپنے ایک قابل اعتماد دوست کے پاس آ گیا۔ وہ میرے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر میں مخالف پارٹی کے ہاتھ لگ گیا تو وہ لوگ مجھے بھی مار ڈالیں گے۔ میں تقریباً پندرہ دن اس کے گھر پر روپوش رہا تھا۔ اس دوران میرے دوست ہی نے مخالف پارٹی کے آدمیوں سے مل کر معاملہ رفع دفع کرانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس کے بعد بھی میں نے رہائش اپنے دوست ہی کے ہاں رکھی تھی لیکن مجھے گھونسنے پھرنے کی آزادی مل گئی تھی۔ ان دنوں میرے پاس پیسہ بہت تھا۔ میرے دوست رفیق کے پاس بھی

چلیں گے۔ ویسے تمہیں ان دونوں میں سے کون سی اچھی لگی ہے؟“ رفیق نے کہا۔
 ”نیلے سوٹ والی۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”لیکن.....“

”ؤن۔“ رفیق نے میری بات کاٹ دی۔ ”وہ تمہاری ہوئی۔ میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے اسے گھورا۔ ”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے.....“

”آرام سے بیٹھے رہو۔ وہ آرہی ہے۔“ رفیق نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔

وہ دونوں لڑکیاں میز سے اٹھ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا وہ باہر چلی جائیں گی۔ لیکن جب وہ دونوں اپنے اپنے پرس اٹھائے ہماری طرف آنے لگیں تو میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں دل ہی دل میں جل تو جلال تو پڑھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ قریب آتے ہی وہ ہم دونوں کے گریبانوں پر ہاتھ ڈال دیں گی اور پھر جو تماشا ہو گا وہ قابل دید ہو گا۔

لیکن..... ہماری میز کے قریب آتے ہی ان دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”ہلو!“ نیلے سوٹ والی نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں۔“ رفیق جلدی سے بولا۔

”ایسی جگہوں پر کمپنی نہ ہو تو بڑی بوریت ہوتی ہے۔“ یہ جملہ بھی نیلے سوٹ والی نے کہا تھا۔ اس مرتبہ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔“ رفیق بولا۔ ”گپ شپ ہوتی رہے تو وقت اچھا کاٹ جاتا ہے۔ اب بتائیے کیا لیں گی آپ لوگ؟ کافی، چائے یا کچھ ٹھنڈا چلے گا؟“

”آپ لوگ کافی پی رہے ہیں۔ کافی ہی چلے گی۔“ دوسری لڑکی نے کہا۔ اس نے گلابی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔

رفیق نے ویٹر کو بلا کر ان کے لئے کافی کا آرڈر دیا اور گلابی لباس والی سے باتیں کرنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ میں کن آنکھیں سے سامنے بیٹھی ہوئی نیلے لباس والی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ گوری رنگت اور چہرے کے نقوش بڑے دلقریب تھے۔ اس کی نمیش کا گلا خاصا فراخ تھا۔ دوپٹہ ہار کی طرح گلے میں لٹکا ہوا تھا۔

”دوسری لڑکی بھی اس کی تقریباً ہم عمر ہی تھی اور وہ بھی خاصی حسین تھی۔ کچھ دیر بعد ویٹر نے ان کے سامنے کافی سرو کر دی۔ وہ دونوں چمک چمک کر باتیں کر رہی تھیں لیکن میں خاموش بیٹھا

پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس کے پاس ایک چمچاتی کار تھی اور مکان بھی بہت شاندار تھا بلکہ وہ ایک خوبصورت کونکھی تھی۔ بہت وسیع و عریض لان تھا۔ گھر کی دیکھ بھال اور کام کرنے کے لئے مرمر ایک نوکر تھا۔ گھر کے سارے کام بھی وہی کرتا تھا اور کھانا بھی وہی پکاتا تھا۔

جب تک میں اس مکان میں روپوشی کے دن گزارتا رہا، رفیق بھی لئے دیئے رہا۔ مگر مخالف پارٹی سے راضی نامہ ہوتے ہی وہ کھل گیا اور دو دن بعد ہی ایک عورت کو لے آیا۔ مگر بان بوجھ کر وہاں سے نکل گیا اور وہ رات میں نے راوی روڈ پر اپنے ایک اور جاننے والے کے گھر پر گزاری تھی۔

اس کے تقریباً ایک ہفتہ بعد میں اور رفیق مال روڈ کے ایک شاندار ریسٹورنٹ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ اس قسم کے ریسٹورنٹ میں صرف وہی لوگ آتے تھے جن کے پاس شاندار کاری اور جبینوں نوٹوں سے بھری ہوتی تھیں۔ میں یہ اعتراف کروں گا کہ ایسے ریسٹورانوں میں، میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

کافی پیتے ہوئے رفیق کی نظریں بار بار دوسری میز پر بیٹھی ہوئی دو لڑکیوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ان کے لباس، انداز گفتگو اور رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا تعلق کسی بڑے گھرانے سے ہے۔ رفیق جس طرح انہیں گھور رہا تھا، مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ لڑکیاں اٹھ کر ہم پر چھترول نہ شروع کر دیں۔ اگر کوئی ایسی صورت حال ہوئی تو ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے سب ہی لوگ ان لڑکیوں ہی کی حمایت کریں گے۔ میں کن آنکھیں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ریسٹورنٹ کی مختلف میزوں پر کچھ اور عورتیں بھی نظر آ رہی تھیں مگر ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی مرد ضرور تھا۔

”اٹھو رفیق! کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔“ میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... یہاں کیا ہے؟“ رفیق بولا۔

”وہ لڑکیاں اب ہمیں گھورنے لگی ہیں۔ اگر تم نے کوئی اور حرکت کی تو وہ اٹھ کر ہماری طرف شروع کر دیں گی اور یہ سب لوگ ان کا ساتھ دیں گے۔ ہمیں اتنی بے بھاد کی پڑیں گی کہ.....“

”بڑے بزدل ہو یا!“ رفیق نے میری بات کاٹ دی۔

”میں بزدل نہیں ہوں۔ تم جانتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس طرح عورتوں کے ہاتھوں ذلیل ہونا کتنے شرم کی بات ہوگی۔“

”آرام سے بیٹھے رہو۔ اب وہ لڑکیاں ہماری میز پر آنے والی ہیں۔ انہیں ساتھ لے

چہرے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن حیوانیت پوری طرح مجھ پر غالب ہو چکی تھی۔ وہ چڑیا کی طرح ہنسنے لگی تھی۔ بے بسی سے ہاتھ پیر مارتی اور جھنجھٹا پٹاتی رہی لیکن اپنے آپ کو اس حیوان سے نہ بچا سکی۔

اور پھر میرا راستہ بدل گیا۔ میں وہ بھیڑیا بن گیا جس کے منہ کو خون لگ چکا تھا۔ یہاں میں اپنی صفائی میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے کسی لڑکی کی طرف کبھی پیش قدمی نہیں کی تھی۔ صرف ان لڑکیوں پر ہاتھ ڈالتا تھا جو اپنے آپ کو خود میرے قدموں پر گر آتی تھیں۔ ظاہر ہے ان میں سے کسی کو مجھ سے محبت نہیں تھی۔ میں تو محبت کے لئے ترستا ہی رہا۔ یہ خوبصورت لڑکیاں تو میری دولت کے لئے میرے قدموں پر جھک جاتی تھیں۔ اور جب میں فلاں ہوتا تو یہی لڑکیاں مجھے دور ہی سے ٹھینکا دکھا دیتیں۔

اور اب شبنم اور سولجر کو دیکھ کر میں کچھ عجیب سا محسوس کرنے لگتا تھا۔ سولجر کے پاس دولت نہیں تھی۔ وہ فلاں تھا۔ غنڈہ گردی اور بد معاشی اس کی روزی کا وسیلہ تھا۔ شبنم کو اس سے کوئی لاچ نہیں تھا پھر بھی وہ رات کی تاریکی میں چوری جیسے اس سے ملنے آتی تھی۔ وہ محبت کا جذبہ تھا جس سے میں محروم تھا۔ میرے امداد تو اس جذبے کو بچپن ہی میں کچل دیا گیا تھا۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ سولجر کھانا لے کر آ گیا۔ میں ان خیالات کو ذہن سے جھٹک کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

کھانے کے بعد میں اور سولجر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ باتوں کے لئے ہمارے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا۔ ملک شہاب..... گھوم پھر کر وہی زیر بحث آ رہا تھا۔

اگلے روز شام کا امداد میرا پھیلنے کے فوراً ہی بعد میں اور سولجر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ میں نے پستول پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا کہ نجانے کب اس کی ضرورت پڑ جائے۔

ریلوے اسٹیشن کی سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے ہم اسٹیشن کے سامنے کی طرف آ گئے۔ وہاں سے ہمیں فوراً ہی رکشل گیا۔ ہم شاہراہ قائد اعظم اور فاطمہ جناح روڈ سے ہوتے ہوئے گلبرگ روڈ پر آ گئے۔ اس سڑک پر کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد رکشہ شادمان کالونی کی طرف مڑ گیا اور من روڈ پر ہوتے ہوئے شاہ جمال کے مزار کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔

اس سے آگے دور تک شاہ جمال کالونی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ غالباً لاہور کا سب سے قدیم ماڈرن علاقہ تھا۔ زیادہ تر پرانے طرز کی وسیع و عریض کوٹھیاں تھیں۔ اب ماڈرن قسم کی عمارتیں بھی نظر آرہی تھیں۔ ہم نے رکشہ وہیں چھوڑ دیا۔ کچھ دور تک پیدل چلتے رہے اور پھر ہمارے راستے الگ الگ ہو گئے۔

ہوا تھا۔ آپ کو حیرت ہوگا کہ مجھ جیسا شخص جو طویل عرصہ سے جرائم کی دنیا میں سانس لے رہا تھا ان حسین لڑکیوں کو اپنے قریب دیکھ کر اس کی سانس کیوں رکے لگی تھی۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ میں جرائم میں ملوث ضرور رہا ہوں لیکن عورت کی طرف میرا دل دھیان نہیں گیا تھا۔ میں اگرچہ تقریباً دو سال تک پرویز کے ساتھ ہیرامندی کے علاقے میں تھا۔ وہاں اکثر طوائفوں کو لائن میں کھڑے دیکھتا تھا مگر میرے ذہن میں کبھی ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ شکاری عورتوں کے بارے میں سنا بھی تھا اور اکثر انہیں دیکھا بھی تھا لیکن کبھی سوچا نہیں تھا کہ کوئی عورت میرے اتنا قریب آ سکتی ہے۔

آدھے گھنٹے بعد جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو وہ دونوں حسین لڑکیاں بھی ہمارے ساتھ کار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ گلابی لباس والی آگے تھی اور نیلے لباس والی پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔ میں سرکتا ہوا دروازے کے ساتھ لگ گیا تھا اور وہ مسلسل مجھے دبائے جا رہی تھی۔

رفیق شراب نوشی کا عادی تھا۔ ان دنوں میں بھی کبھی کبھار پی لیا کرتا تھا۔ اس رات بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ان لڑکیوں نے جب شراب نوشی کی تو مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ شرکاری لڑکیاں تھیں۔ اس قسم کے داؤ بیچ نہ کھیلیں تو شکار کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ ہی تھا۔ گلابی لباس والی لڑکی زیادہ ہی پھیلنے لگی تھی۔ اس کی حرکتوں سے میں خجالت سی محسوس کرتا تھا۔ میری زندگی میں کبھی کوئی عورت نہیں آئی تھی اور میں ایسی باتوں کا عادی بھی نہیں تھا۔ ان لئے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں نے کئی روز بعد شراب پی تھی۔ انگلش دہسکی اعصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ میں نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرا خیال تھا سو جاؤں گا تو غنودگی کی یہ کیفیت خود بخود ختم ہو جائے گی۔

ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ اپنے سینے پر بوجھ محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں اور اس کے ساتھ ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ نیلے لباس والی وہ لڑکی میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔

میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ کوئی لڑکی کبھی میرے اتنا قریب بھی نہیں بیٹھی تھی۔ وہ جوان حسین لڑکی برائے نام لباس میں میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ میرا دماغ پھر کی طرح گھومنے لگا۔ پورے جسم پر سنسنی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اور پھر میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔ پہلے تو وہ لڑکی مجھ سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ لیکن جب میرے امداد کا حیوان جاگ گیا تو وہ مجھ سے

مارکیٹ سے نکل کر ایک گلی کے موڑ پر میں نے اسے جالیا۔ سو لجر میرے انتظار میں وہاں رک گیا تھا۔

”تمہارا اندازہ درست نکلا رو فی باؤ!“ سو لجر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ملک شہاب اس کوٹھی میں ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں۔ ایک پشاور سے آیا ہوا ہے۔“

”تمہاری نوکری کا کیا بنا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے دو دن بعد بلایا ہے لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”دو دن بعد وہ مجھے کام بتائے گا۔ لیکن وہ مجھ سے مختلف لوگوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ خاص طور پر تمہارے بارے میں۔“

”اور تم نے کیا بتایا؟“

”تمہارا نام سننے ہی میں غصے میں آ گیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں تو پہلے ہی تمہیں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ تم کہیں مل جاؤ تو میں تمہاری گردن مروڑ دوں۔ ملک شہاب نے کہا کہ میں تمہاری گردن مروڑ دوں بلکہ اگر تم کہیں نظر آ جاؤ تو اسے اطلاع دے دوں۔ باقی کام وہ خود سنبھال لے گا۔“

”اب کیا پروگرام ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”واپس چلیں۔“ سو لجر نے کہا۔

”ابھی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ٹیلی فون ہو؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ سو لجر مجھے مارکیٹ کے پچھلی طرف ایک اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر میں لے گیا۔ راستے میں اس نے مجھے ملک شہاب کی کوٹھی کا نمبر وغیرہ بتا دیا تھا۔

اسٹیٹ ایجنسی میں ایک ادھیڑ عمر بڑا پتلا سا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے لٹھے کی میٹلی سی دھوتی اور میلا سا کرتہ پہن رکھا تھا۔ دو تین دن کا شیو بھی بڑھا ہوا تھا۔

میں نے اس سے فون کرنے کی اجازت طلب کی اور فون میز کے ایک کونے پر سرکا لیا۔ سو لجر نے بوڑھے کو باتوں میں الجھا دیا اور میں ایس پی سعید کے دفتر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ایس پی سعید اس وقت اپنے دفتر میں موجود تھا۔ میں نے پہلے اسے اپنے بارے میں بتایا، پھر کہا۔

”ملک شہاب کے بارے میں کیا خیال ہے سرجی؟“

”وہ لاہور ہی میں کسی جگہ روپوش ہے۔ اور اس کی تلاش جاری ہے۔ تم فکر مت کرو۔ وہ جلد

میں ایک طویل چکر کاٹا ہوا مین مارکیٹ کی طرف آ گیا۔ میرے سامنے ہی دربار ریٹورنڈ تھا۔ میں اس کے سامنے واقع ایک اور ریٹورنڈ میں گھس گیا اور ایک ایسی جگہ پر بیٹھ گیا جہاں سے دربار ریٹورنڈ میں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ صرف دو منٹ بعد میں نے سو لجر کو دربار ریٹورنڈ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔

دربار ریٹورنڈ ایک کھلے ہال کی طرح تھا۔ دروازے یا شیشے وغیرہ نہیں لگے ہوئے تھے۔ اس طرح اندر بیٹھا ہوا ہر شخص میری نظروں میں تھا۔ جبکہ میں جس ریٹورنڈ میں بیٹھا تھا وہ دربار ریٹورنڈ کے مقابلہ میں قدرے معیاری تھا۔ اس میں شیشے کے دروازے لگے ہوئے تھے۔ میں جس میز پر بیٹھا تھا وہ دروازے کے قریب تھی۔ سو لجر نے بتایا تھا کہ ملک شہاب والی کوٹھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی اور اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ میں اس کے کسی آدمی کی نظروں میں نہ آ جاؤں۔

اس وقت سو سات بجے تھے۔ میں چائے کی چسکیاں لیتا ہوا نہ صرف سامنے والے ریٹورنڈ پر نگاہ رکھے ہوئے تھا بلکہ محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر بھی دیکھ رہا تھا۔

ساڑھے سات بجے کے قریب دربار ریٹورنڈ میں داخل ہونے والا ایک آدمی سو لجر کی میز کے سامنے رک گیا۔ سو لجر نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا تھا جس سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ملک شہاب کا ڈرائیور تھا۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ دراز قامت، کسرتی بدن اور کلین شیو۔ ٹھوڑی پروائیں طرف زخم کا تقریباً ایک انچ لمبا پرانا نشان تھا جو دوری سے نظر آ رہا تھا۔ مجموعی طور پر وہ شکل سے ہی کچھ اچھا آدمی نہیں لگتا تھا۔

وہ سو لجر کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ دونوں اٹھ کر ریٹورنڈ سے باہر نکل گئے۔ سو لجر نے دروازے کے قریب کاؤنٹر پر رک کر اپنی چائے کا بل ادا کر دیا تھا۔

میں وہاں بیٹھا سو لجر کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا اور پھر گزرنے والے ہر لمحہ کے ساتھ میری بے چینی بھی بڑھنے لگی۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔

پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ اور پھر سو لجر کو ریٹورنڈ کے سامنے دیکھ کر میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ سو لجر چند لمحوں وہاں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر ایک طرف چل پڑا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر چائے کا بل ادا کیا اور ریٹورنڈ سے نکل کر سو لجر کے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھ سے تقریباً بیس گز آگے نکل چکا تھا۔

”ضرور آؤں گا چاچا!“ سولجر نے جواب دیا۔ ”ایسے آدمیوں سے بات کرنے میں مزہ آتا ہے۔ تمہاری طرح سیاست کی اونچ نیچ کو سمجھتے ہوں۔ ویسے تم آئندہ الیکشن میں کھڑے کیوں نہیں ہو جاتے چاچا! کنٹرولر بن ہی جاؤ گے۔“

”یہ سیاست بڑی گندی چیز ہے پتر! اچھے بھلے شریف آدمی کو بھی گندا کر دیتی ہے۔“

بوزھے نے جواب دیا اور میز کے پیچھے سے نکل کر دروازے کے قریب آگیا۔

گویا بوزھے نے وہاں رکنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے جب سے پانچ کا نوٹ نکال کر بوزھے کی طرف بڑھا دیا۔

”اچھا چاچا! بہت بہت شکریہ۔ یہ ٹیلی فون کے پیسے تو لے لو۔“

بوزھے نے نوٹ لے کر جیب میں ڈال لیا اور ہم سے پہلے دروازے سے باہر پہنچ گیا۔ ہم بھی دروازے سے نکل آئے اور ٹھیلنے والے انداز میں ایک طرف چلنے لگے۔

”تم وہیں دربار ہوٹل میں چل کر بیٹھو۔ میں بھی آس پاس موجود ہوں گا۔“ میں نے سولجر سے کہا۔

ہمارے راستے ایک بار پھر الگ ہو گئے اور ہم ایک بار پھر اپنی اپنی جگہوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

یعنی سولجر دربار ہوٹل میں اور میں سامنے والے ریسٹورنٹ میں۔

اس وقت ریسٹورنٹ میں پہلے سے زیادہ رونق تھی۔ علاقے کے بے فکرے نوجوان چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اپنے اپنے پسندیدہ موضوعات پر باتیں کر رہے تھے۔ اتفاق سے مجھے

دروازے کے قریب اس میز پر ایک سیٹ خالی مل گئی۔ اس میز پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تو ادھڑا عمر تھا جو غالباً کیلا ہی تھا اور دونو جوان تھے جو کسی کرکٹ میچ کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ میں نے خالی کرسی پر بیٹھنے ہوئے ویز کو چائے لانے کا اشارہ کر دیا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے تقریباً پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ اور پھر ریسٹورنٹ کے سامنے ملک

شہاب کے ڈرائیور تاجے کو دیکھ کر چونک گیا۔ وہ ریسٹورنٹ کے دروازے کے ساتھ سگریٹ کے کین کے قریب رکھا تھا۔ اس نے صرف ایک سگریٹ خریدی۔ کین کے ساتھ ہی ایک رشی ٹنگی ہوئی تھی جس کا نیچے لٹکا ہوا سر اسٹک رہا تھا۔ یہ رشی گاؤں کی سہولت کے لئے سلگائی گئی تھی۔

تاجے نے رشی کا سلگتا ہوا سر ہاتھ میں پکڑ لیا اور ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ سلگانے لگا۔ اس دوران اس کی نظریں میری طرف اٹھ گئیں۔

مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا تھا۔ میں نے ایسا انداز اختیار کر لیا جیسے اسے دیکھا ہی نہیں۔ وہاں بیٹھے رہتا میرے لئے خطرناک ہو سکتا تھا۔ میں نے اٹھ کر کاؤنٹر پر پیسے دیئے اور

ہی ہماری گرفت میں آجائے گا۔“ جواب ملا۔

”میں نے اس کا ٹھکانہ معلوم کر لیا ہے سرجی!“ میں نے کہا۔

”کیا..... کہاں ہے وہ؟“ ایس پی سعید جیسے چونک گیا۔

”آپ پتہ نوٹ کر لیں اور آج ہی.....“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے کٹھی کے

بارے میں بتانے لگا۔

”کیا یہ اطلاع درست ہے؟“ ایس پی سعید نے پوچھا۔

”کیا ٹرک والی اطلاع غلط تھی؟“ میں نے کہا۔ ”میں اس جگہ کے قریب ہی موجود ہوں!“

سرجی۔ آپ.....“

”ٹھیک ہے۔“ دوسری طرف سے میری بات کاٹ دی گئی اور پھر ایس پی سعید تقریباً پانچ منٹ تک باتیں کرتا رہا، پھر فون بند کر دیا۔

میں نے ریسپور رکھ کر بوزھے کی طرف دیکھا۔ سولجر بہت عقلمند ثابت ہوا تھا۔ اس نے بوزھے کو اس طرح باتوں میں الجھا رکھا تھا کہ وہ میری فون پر ہونے والی گفتگو پر توجہ نہیں دے

سکا تھا۔ میں بھی ان کی باتوں میں شامل ہو گیا۔ سولجر اس سے اس علاقے میں پراپرٹی کے آثار چھانڈنے کے بارے پوچھ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس علاقے میں کوئی کوٹھی کرائے پر

لینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

میرا خیال تھا کہ ایس پی سعید کو ملک شہاب کی کٹھی پر چھاپہ مارنے میں کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹے

ضرور لگیں گے اور میں زیادہ سے زیادہ دیر تک یہاں بیٹھنا چاہتا تھا کہ اگر بالفرض اس بوزھے نے میری کوئی بات سن بھی لی تھی تو اس وقت تک یہاں بیٹھا رہے جب تک کٹھی پر چھاپہ نہیں پڑ

جاتا۔

تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ بوزھا کچھ بے چین ہونے لگا تھا۔ اس نے دوسریہ کہا بھی تھا کہ وہ اپنی دکان بند کرنا چاہتا ہے مگر سولجر اسے پھر باتوں میں الجھا لیتا۔ اس نے بوزھے کی دکانی

رگ پکڑ لی تھی۔ بوزھے کو سیاست پر بات کرنے کا شوق تھا اور سولجر اس موضوع کو طویل دیتا رہا تھا۔

ساڑھے دس بج گئے۔ بوزھے کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ بالآخر اس نے ایک میز کی دروازے

چابیوں کا کچھا نکال لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”پتر! اب مجھے دکان بند کرنی ہے۔“ وہ سولجر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ویسے تم میری پسند کے آدمی ہو۔ دن کے وقت کسی دن آنا تو تم سے باتیں ہوں گی۔“

آواز سے گونج اٹھی۔ تاجا بری طرح بدحواس ہو گیا۔

”گھبراؤ نہیں۔ تم بالکل محفوظ ہو۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ملک شہاب اور اس کے آدمی اس وقت پولیس کے گھیرے میں آچکے ہیں۔ جو بھی بھاگنے کی کوشش کرے گا، مارا جائے گا۔ تم خوش قسمت ہو کہ میں نے تمہیں اس طرف جانے سے روک دیا تھا۔“

”پپ..... پولیس۔“ تاجا ہلکا گیا۔ ”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ پولیس ہے؟“

”مجھے نہیں تو کیا تمہیں پتہ ہوتا؟“ میں نے کہا۔ ”یہاں رکنے کی ضرورت نہیں۔ آگے چلتے رہو۔“

ایک کوٹھی کے برآمدے میں چلنے والے بلب کی مدھم سی روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ تاجا کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

فائرنگ کی آواز بھی بدستور آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ ملک شہاب کے آدمی پوری طرح مسلح تھے اور انہوں نے پولیس سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔ اب مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایس پی سعید کتنی نفی لے کر آیا تھا۔ اگر ملک شہاب بچ کر نکل گیا تو مجھے انفسوس ہوگا۔

میں تاجا کو پستول کی زد پر لے گیاں میں گھومتا رہا۔ دوبارہ مارکیٹ کی طرف آ گیا۔ فائرنگ کی آوازیں اس طرف بھی آرہی تھیں اور بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ دربار ہوٹل بھی دیران ہو گیا تھا۔ سامنے والی ریسٹورنٹ میں بھی کوئی گاہک نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں تاجا کو لے کر گلی کے موڑ پر کھڑا رہا۔

”مجھے جانے دو روونی باؤ..... اگر پولیس نے مجھے پکڑ لیا تو میرے نکلے بچے بھوکے مر جائیں گے۔“ تاجا نے گھگھکی ہوئی آواز میں کہا۔

”بہت خیال ہے اپنے نکلے بچوں کا۔“ میں نے ایک گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”جب دسروں کے گھرا جاؤ تو اس وقت تم لوگوں کو ان کے نکلے بچوں کا خیال نہیں آتا۔ لیکن اطمینان رکھو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ تم سے تو میں نے اور بہت سی باتیں معلوم کرنی ہیں۔“

تاجا مسلسل گھگھکیا رہا تھا اور مجھ پر بری طرح جھنجھلاہٹ طاری ہو رہی تھی۔ اس جھنجھلاہٹ میں، میں نے تاجا کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مار دیا۔ طمانچہ پڑتے ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میرا خیال تھا اب وہ خاموشی سے کھڑا رہے گا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا پستول والا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ میرے ہاتھ کو موڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت سولجر کسی طرف سے دوڑتا ہوا وہاں پہنچ

باہر آ گیا۔ تاجا اس دوران وہاں سے چند قدم آگے جا چکا تھا۔ میں بھی تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے پہلے مڑ کر دیکھا اور مجھے اپنے قریب دیکھ کر غالباً دوڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بظاہر میرا انداز دوستانہ تھا مگر گرفت بڑی مضبوط تھی۔

”میرا دوسرا ہاتھ جیب میں رکھے ہوئے پستول پر ہے۔“ میں مدھم لہجے میں بولا۔ ”اگر بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔ خاموشی سے میرے ساتھ چلتے رہو۔“

”تم نے اس علاقے میں آکر بہت بڑی غلطی کی ہے روونی باؤ!“ تاجا نے کہا۔

”تم لوگ مجھے بیڈن روڈ کے آس پاس تلاش کر رہے تھے۔ میں نے سوچا خود ہی یہاں چلا آؤں تاکہ تم لوگوں کو مزید زحمت نہ ہو۔ اب دائیں طرف گلی میں مڑ جاؤ۔“ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”تم آگے ہو تو زندہ واپس نہیں جاؤ گے۔ ملک شہاب کے کئی آدمی اس طرف موجود ہیں۔ وہ تمہیں گھیر کر کتے کی موت مار ڈالیں گے۔“ تاجا نے گلی میں مڑتے ہوئے کہا۔

وہ کافی کشادہ گلی تھی۔ دونوں طرف پرانی طرز کے بڑے بڑے بنگلے تھے اور گلی سنسان تھی۔ میں نے پستول جیب سے نکال لیا جو تاجا نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اگر اس کا بھاگنے کا کوئی ارادہ تھا تو پستول دیکھ کر بدل دیا ہوگا۔

”ابھی کچھ دیر میں ملک شہاب اور اس کے آدمی پاگل کتوں ہی کی طرح بھاگنے کی کوشش کریں گے مگر انہیں کسی طرف راستہ نہیں ملے گا۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔

”مطلب تھوڑی دیر میں تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ اس وقت تک ہم انہی گلیوں میں ٹپتے رہیں گے۔ ویسے اس وقت کوٹھی میں ملک شہاب کے ساتھ کون کون ہے؟ اور جو آدمی پشاور سے آیا ہوا ہے وہ کون ہے؟“

”کیا.....؟“ وہ بری طرح اچھل پڑا۔ ”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ملک شہاب یہاں کسی کوٹھی میں ہے اور اس کے پاس پشاور سے بھی کوئی مہمان آیا ہوا ہے؟“

”میں تمہیں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ ملک شہاب نے رات کے کھانے میں کیا کھا یا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ملک کے آدمی شکاری کتوں کی طرح مجھے پورے شہر میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ لوگ تو میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکے لیکن میں نے ملک کے بارے میں بہت کچھ.....“

میرا جملہ مکمل نہیں ہو سکا۔ پیچھے کسی گلی میں پہلے ایک فائر ہوا اور پھر فضا مسلسل ترنزاہٹ کی

بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ انہیں تو گولی مار دینی چاہئے۔ ہیروئن کی لعنت پھیلا کر انہوں نے قوم کا بڑا غرق کر دیا ہے۔ حد ہو گئی یار۔ وہ پندرہ دن سے یہاں رہ رہا تھا۔ محلے کے سارے ہی لوگ جانتے تھے مگر علاقے کی پولیس ہی بے خبر تھی۔“

پولیس کو سب کچھ معلوم ہوتا ہے بھائی صاحب!“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ دُبنے تو ملک شہاب جیسے اسکولوں کی خیرات پر ہی پل رہے ہیں۔ یہ قانون سے زیادہ جرائم پیشہ لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر یہاں چھاپہ کس نے مارا تھا، دوسرے علاقے کی پولیس نے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آہوجی۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”انہوں نے پکڑ لیا تا ملک شہاب کو۔ مگر میں دعوے سے کہتا ہوں جی کہ وہ آج ہی رات چھوٹ کر بھی آ جائے گا۔ مک مکا ہو جائے گا۔ ملک جیسے لوگوں کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آسانی سے قانون کی گرفت میں نہیں آتے۔“

”کتنے آدمی پکڑے گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”چار پانچ پکڑے گئے ہیں جن میں دو زخمی ہوئے ہیں، کچھ بھاگ گئے ہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”کیا آپ کہیں قریب ہی رہتے ہیں؟“ میں نے پھر سوال کیا۔

”اس گلی میں تیسرے نمبر کی میری کونٹھی ہے۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”ملک شہاب والی کونٹھی تو اسکول کا اذہ بنی ہوئی ہے۔ یہاں وہ لوگ کتنیوں کو بھی لے کر آتے ہیں، شرابی پیتے ہیں۔ ساری ساری رات ہنگامے کرتے ہیں۔ ہم نے کئی مرتبہ تھانے والوں کو اطلاع دی مگر کوئی ہماری سنتا ہی نہیں۔ آج پتہ نہیں پولیس نے کیسے چھاپہ مار دیا۔“

”کیا پہلے بھی.....؟“

”کئی سال سے باؤ جی!“ اس شخص نے میری بات کاٹ دی۔ ”اعظم مارکیٹ میں میری کپڑے کی دکان ہے۔ میرے والد صاحب نے یہ کونٹھی بنوائی تھی جہاں ہم رہ رہے ہیں۔ اس زمانے میں بڑا اچھا ماحول تھا یہاں کا۔ مگر جب سے ملک شہاب نے وہ کونٹھی خریدی ہے اس وقت سے یہاں گند پھیلنا شروع ہوا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں اپنی کونٹھی بچ کر کہیں اور چلے جائیں۔ پر کوئی ڈھنگ کا گاہک ہی نہیں ملتا۔“

”اب شاید آپ کو کہیں اور نہیں جانا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔

”یہ شاید تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ آج ملک شہاب پکڑا گیا ہے۔“ اس شخص نے کہا۔ ”مگر دیکھو کیا وہ آج ہی رات چھوٹ جائے گا اور اس کے بعد پھر وہی سب کچھ ہوتا رہے گا جو ہوتا رہا

گیا۔ اس نے آتے ہی تاجے کی گردن پر زور دار ہاتھ رسید کر دیا۔ تاجا جیج کر نیچے گرا۔ لیکن میرا ہتھول والا ہاتھ اب بھی اس نے گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کو زوردار ہتھول دیا۔

میری انگلی ٹرائیگر پر تھی۔ جھٹکا لگنے سے ٹرائیگر دب گیا۔ گولی تاجے کی ٹانگ پر لگی۔ دوپچ اٹھا۔ میرا ہاتھ اس کی گرفت سے چھوٹ گیا۔ میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ اسی وقت گلی کے دائیں موڑ کی طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے سو لجر کو اشارہ کیا کہ تاجے کو وہیں چوڑ کر دوسری طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ اگلا موڑ گھومتے ہی ہم ایک بنگلے کی دیوار پھاندا کر اندر گھس گئے۔

یہ بنگلہ یا تو خالی تھا یا کینوں نے خوف کے مارے ساری بتیاں بجھا رکھی تھیں۔ ہم دونوں پودوں کی آڑ میں دب کر رہے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دو آدمی گلی میں دوڑتے ہوئے بنگلے کے سامنے سے گزر گئے۔ میں نے سو لجر کو اشارہ کیا اور ہم دونوں دیوار پھاندا کر دوبارہ گلی میں آ گئے اور تیز تیز قدموں سے اس طرف چلنے لگے جہاں تاجے کو چھوڑا تھا۔

تاجا غائب ہو چکا تھا۔

فائرنگ کی آوازیں اب نہیں آرہی تھیں۔ ہم دونوں چلتے ہوئے مارکیٹ کی طرف آ گئے۔ جس ریسٹورنٹ میں، میں نے چائے پی تھی اس کے ایک دروازے کا شٹر اُدھا اٹھا ہوا تھا۔ میں نے سو لجر کو اشارہ کیا۔ وہ جھک کر اندر داخل ہو گیا اور صرف ایک منٹ بعد واپس آ گیا۔

”اندرو کوئی گاہک نہیں ہے۔ ہوٹل والوں کو خود بھی معلوم نہیں کہ فائرنگ کیوں اور کہاں ہوئی تھی۔ انہوں نے ڈر کے مارے شٹر گرا دیئے تھے۔“ سو لجر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اب مارکیٹ کے علاقے میں اکاؤ کا لوگ نظر آرہے تھے۔ کچھ دکانیں بھی کھلنے لگی تھیں۔ گیارہ بجتے والے تھے۔ اس وقت عام طور پر دکانیں بند ہو جاتی تھیں اس لئے اب صرف چند ایک دکانیں ہی کھلی تھیں۔ البتہ مارکیٹ کے علاقے میں واقع تین چار ریسٹورنٹ کھل گئے تھے اور کچھ لوگ بھی نظر آرہے تھے۔

”ایک منٹ بھائی صاحب!“ میں نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک آدمی کو روک لیا۔

”کیا معاملہ ہے۔ یہ فائرنگ کہاں سے ہوئی تھی؟ کوئی ڈاکو وغیرہ یا.....؟“

وہ ادھیڑ عمر بھاری بھر کم آدمی تھا۔ اس نے پہلے تو مشکوک نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھا پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

پولیس نے ایک کونٹھی پر چھاپہ مارا ہے جہاں ملک شہاب چھاپا ہوا تھا۔ یہ لوگ تو ڈاکوؤں سے

ہے۔

”پولیس ان لوگوں کو لے گئی یا ابھی تک وہیں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی تک تو کوٹھی میں ہیں۔ شاید یہیں پر ننگ مٹکا ہو جائے۔“ اس شخص نے کہا۔

”دیکھیں جی آگے کیا ہوتا ہے۔“ میں نے کہا اور اس شخص سے ہاتھ ملا کر سو لجر کو اشارہ کیا۔

ہم دونوں ایک طرف چلنے لگے اور گھوم پھر کر دوبارہ اس ریستورنٹ میں آ گئے۔

دو تین ریستورنٹس پھر سے آباد ہو گئے تھے۔ باہر بھی لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے تھے۔

صورت حال پر تبصرے کر رہے تھے۔ ریستورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا موضوع بھی یہی تھا۔

میں بڑی توجہ سے لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ لوگوں کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس ملک میں

ملک شہاب کی موجودگی کے بارے میں اس علاقے کے بہت سے لوگ جانتے تھے۔

پولیس بھی واقف تھی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ بند روڈ پر ٹرک کے چھاپے کے بعد ملک شہاب

فرار ہو گیا تھا۔ ایس پی سعید کو اس کی تلاش تھی۔ ملک شہاب اس دن سے اس کوٹھی میں رہ رہا تھا۔

یہاں کی پولیس اس کے بارے میں جانتی تھی لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی بجائے اس کو تحفظ فراہم کیا جا رہا تھا۔

ہمیں ریستورنٹ میں بیٹھے ہوئے آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اور پھر سائرن کی آواز سن کر میں نے

فورا ہی کرسی چھوڑ دی اور ریستورنٹ سے نکل کر باہر آ گیا۔ سو لجر بھی چائے کے پیسے دے کر باہر

آ گیا تھا۔ باہر اب بھی لوگ ٹولیوں کی صورت میں جمع تھے۔ باتیں طرف کسی گلی سے پولیس کے

سائرن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر وہ آواز بندرتج دور ہوتی چلی گئی۔

دو تین آدمی اس گلی کی طرف جا رہے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ چل پڑے۔

ملک شہاب کی کوٹھی والی گلی میں اب بھی کچھ لوگ جمع تھے۔ یہاں ہمیں وہ آدمی بھی نظر آیا

جس سے مارکیٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہوا بابا جی؟“ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ ”ملک کو لے گئے یا ننگ؟“

”لے گئے جی۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”وہ ہے سامنے والی کوٹھی جہاں دو پولیس والے

کھڑے ہیں۔“

پرانے طرز کی وہ کوٹھی بہت بڑی تھی۔ باہر کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ سامنے پورچ تھا

ایک پولیس والا کھڑا تھا جبکہ دو پولیس والے گیٹ کے اندر کی طرف کھڑے تھے۔

”اب دیکھیں جی کیا ہوتا ہے۔“ اس شخص نے کہا۔ ”پولیس اسے لے تو گئی ہے لیکن

یقیناً ہے کہ وہ رات ہی رات چھوٹ جائے گا۔“

میں چند منٹ مزید وہاں کھڑا رہا، پھر سو لجر کو اشارہ کرتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔ لوگ بھی

اب چھٹنے لگے تھے۔ میں اور سو لجر باتیں کرتے ہوئے گلی میں چلتے رہے۔ چند گز چلنے کے بعد

ایک اور آدمی ہمارے ساتھ مل گیا۔ میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا مگر زیادہ توجہ نہیں دی۔

”رونی باؤ!“ میں اس شخص کی آواز سن کر چونک گیا۔ ”اب پتہ چل گیا ہے کہ یہ کس کی

شرارت تھی۔ لیکن یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔“

”اوئے..... کون ہو تم؟“ میں نے فوراً ہی جیب سے پستول نکال لیا۔ اس کے منہ سے اپنا

نام سن کر مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ ملک شہاب ہی کا کوئی آدمی ہے۔

”پستول کو جب میں رکھ لو رونی باؤ!“ اس شخص نے کہا۔ ”پستول میرے پاس بھی ہے۔

میں اگر چاہتا تو تم دونوں کو بڑے آرام سے گولیوں سے جھینلی کر دیتا۔ مگر میں پیچھے سے وار

کرنے والا نہیں ہوں۔ سامنے سے لٹاکر دشمن پر حملہ کرتا ہوں۔ اور ویسے میری تمہاری کوئی

ذاتی دشمنی تو نہیں ہے۔ دشمنی تو تمہاری ملک سے ہے۔ میں کیوں اپنے ہاتھ خون سے رنگوں؟“

”کون ہو تم؟“ میں نے اسے گھورا۔ ہم چلتے چلتے گلی کے موڑ پر ٹرک گئے تھے۔

”چلتے رہو رونی باؤ!“ اس شخص نے کہا۔ ”میرا نام لطیف ہے۔ ملک کے لئے ہی کام کرتا

ہوں۔ مگر رب جانتا ہے میں نے آج تک کسی کا خون نہیں کیا۔ پیسے کی ہوس ہی ملک جیسے لوگوں

کے لئے کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ دشمنیاں پالنا تو بڑے لوگوں کا کھیل ہے۔ ملک جیسے

آدمی کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی تم نے اس سے پنگے بازی شروع کر دی۔ اس پر تو بڑے

بڑے پولیس افسر بھی ہاتھ ڈالنے سے گھبراتے ہیں۔ مگر تم نے پہلے اس کا ٹرک پکڑ دیا اور اب

اسے بھی پکڑ دیا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اسے جیل میں بند کر دیا جائے گا؟ نہیں رونی باؤ!“ وہ ایک

لوگو کا خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”وہ تو پہلے ہی اسلام آباد والوں سے رابطہ

کر چکا تھا۔ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ کوئی اس پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ وہ چند روزہ دن سے اس کوٹھی

میں رہ رہا تھا۔ علاقے کے تھانے کو اس کا پتہ تھا مگر اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ ایس

پی سعید نے چھاپ مار کر اسے پکڑ لیا ہے تو کوئی کمال نہیں کیا۔ اس نے چھاپ بھی غیر قانونی طور پر

مارا ہے۔ یہاں کی پولیس کو تو اس کا پتہ ہی نہیں تھا۔ ایس پی سعید ملک کو باندھ کر لے تو گیا ہے

مگر وہ صبح ہونے سے پہلے چھوٹ جائے گا۔ اور ایس پی سعید کے ساتھ جو کچھ ہو گا وہ بھی تم دیکھ

لو گے۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ ”اور تم کسی خوش فہمی میں مبتلا مت رہنا۔ ملک شہاب کو یہ

بھی پتہ چل جائے گا کہ اس کوٹھی میں اس کی موجودگی کی خبری کرنے والے بھی تم ہو۔ اس طرح

”کہاں جاؤ گے روئی باؤ؟“ سو لجر نے پوچھا۔

”میں یہاں سے دھدت کالونی کی طرف جاؤں گا۔ ایک دوست کے پاس۔ کئی روز سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک دو دن بعد میں تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“ میں نے کہتے ہوئے سو لجر سے ہاتھ ملایا اور رکشے سے دور ہٹ گیا۔

میں اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک وہ رکشہ اگلے موڑ پر ٹکا ہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ سڑک پار کر کے میں اس طرف آ گیا جہاں دو تین ریستورنٹ، نکلے کباب اور آئس کریم کی کئی دکانیں تھیں۔ یہ تمام دکانیں رات دیر تک کھلی رہتی تھیں۔ اس وقت اگرچہ ساڑھے بارہ بجے تھے مگر یہاں دن کا سماں تھا۔ بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ میں نے ایک ریستورنٹ میں بیٹھ کر چائے کا آخری کپ پیا اور پھر ایک رکشے میں بیٹھ گیا۔

رکشہ منصورہ کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گیا۔ یہ سڑک منصورہ اور ایجوکیشن ٹاؤن سے ہوتی ہوئی آگے جا کر ملتان روڈ سے مل گئی تھی۔

منصورہ سے آگے نکلنے ہی ایجوکیشن والے اسٹاپ پر میں نے رکشہ رکوا لیا اور ڈرائیور کو پیسے دے کر وہیں کھڑا رہا۔

یہاں تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ میں دکانوں کے ساتھ والی گلی میں داخل ہو گیا اور پھر مختلف گلیوں میں گھومتا ہوا اپنی گولٹھی پر پہنچ گیا۔

سو لجر کے ہاں دو تین دن بڑی بوریٹ اور بے چینی میں گزرے تھے۔ یہاں آ کر مجھے سکون سا مل گیا۔ میں دو تین دن سے نہ پایا بھی نہیں تھا۔ اندر آتے ہی میں ہاتھ روم میں گھس گیا۔ نہا کر کپڑے بدلے اور بستر پر گر گیا۔ شام کے بعد کی بھاگ دوڑ سے میں بری طرح تھک گیا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔

میں صبح نو بجے کے قریب بیدار ہوا۔ کچھ دیر بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا، پھر کچن میں آ کر چائے بنائی اور برآمدے میں آ گیا۔ اتفاق سے میں جس کرسی پر بیٹھا تھا اس کا رخ اس مکان کی طرف تھا جہاں کئی روز پہلے اس مکان کی چھت پر ایک خوبصورت لڑکی کودیکھا تھا جس نے میرے لئے سویاں بھجوائی تھیں۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے میری نظریں غیر ارادی طور پر اس چھت کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اور پھر گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے چونک جانا پڑا۔ گیٹ کے قریب ہی اندر کی طرف تین چار دنوں کے اخبار پڑے ہوئے تھے۔ مجھے یاد آ گیا کہ اس روز یہاں سے جانے سے پہلے میں نے اخبار والے کو منع نہیں کیا تھا اور وہ گیٹ پر تالا ہونے کے باوجود روزانہ

تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے بارے میں اس کے جذبات کیا ہوں گے۔“

”مجھے یہاں دیکھ کر شاید تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس کی تہری میں نے کی ہے۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”اس میں شک کی کیا بات ہے۔“ لطیف نے جواب دیا۔ ”یہاں تمہاری موجودگی یہ ثابت کر رہی ہے کہ اس کی تجہری کرنے والے تم ہو۔ اور تم یہاں صرف اس لئے نظر آ رہے ہو کہ چھاپے کے بارے میں اپنی تسلی کر لینا چاہتے تھے۔“

”تو پھر سمجھ لو۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ مجھ سے تمہاری ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میری بھی تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ لیکن میں ہر اس شخص کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں جو ملک شہاب کے لئے کام کر رہا ہے۔ اس وقت تم نے دوستانہ ماحول میں از خود سے رابطہ کیا ہے۔ اگر ہم ویسے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے ہوتے تو صورت حال مختلف ہوتی۔ جہر حال، تمہیں امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ ملک شہاب آج ہی رات چھوٹ جا گا۔ اور ظاہر ہے تمہاری بھی اس سے ملاقات ہوگی۔ اسے میرا پیغام دے دینا کہ اگر پولیس پہنچ گیا تو مجھ سے نہیں بچ سکے گا۔ اس نے مجھے مارنے یا پکڑنے کے لئے جو دو کتے بھیجے تھے، ان کا حشر وہ دیکھ چکا ہے۔ مجھے شکار کرنے کے لئے جو بھی آئے گا خود شکار ہو جائے گا۔ اور اب سے بھی میری ملاقات مختلف انداز میں ہوگی۔ اب تم جاسکتے ہو۔“ میں نے اس کی طرف براہ راست بڑھا دیا۔

لطیف نے میرا ہاتھ پکڑ کر اس طرح دبا یا جیسے اپنی طاقت کا احساس دلانا چاہتا ہو۔ پھر ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور سو لجر سے ہاتھ ملائے بغیر دوسری گلی میں مڑ گیا۔

”اسے جانتے ہو تم؟“ میں نے سو لجر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں روئی باؤ! پہلی مرتبہ دیکھا ہے اسے۔“ سو لجر نے جواب دیا۔

ہم دونوں گلیوں میں گھومتے ہوئے دوبارہ مارکیٹ کی طرف آ گئے۔ وہاں اب ریستورنٹس اور کھانے پینے والی دکانیں ہی کھلی ہوئی تھیں۔ نکلے کباب والی ایک دکان پر ہم نے کھانا کھایا اور سڑک پر اس جگہ آ گئے جہاں کوئی سواری ملنے کی توقع ہو سکتی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک رکشہ مل گیا۔

اچھرہ موڑ پر میں نے رکشہ رکوا لیا۔

”ٹھیک ہے سو لجر! تم گھر چلو۔ میں ایک دو دن بعد تم سے رابطہ کروں گا۔“ میں نے اسے اترتے ہوئے کہا۔

نہیں کرتے ہوئے ایک غیر قانونی حرکت کا ارتکاب کیا تھا۔

یہ خبر پڑھ کر بھی میں مسکرائے بغیر نہیں رہا تھا۔ شاہ جمال کے تھانہ انچارج کو اصولی طور پر اپنے علاقے کے اعلیٰ انسران اور ڈی آئی جی سے شکایت کرنی چاہئے تھی مگر اس نے یہ رپورٹ براہ راست وزارت داخلہ کو بھجوائی تھی اور اس میں بڑی جلدت سے کام لیا تھا۔

جیسا کہ مجھے گزشتہ رات ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اس علاقے کے تھانہ انچارج کو معلوم تھا کہ ملک شہاب اس کے علاقے میں روپوش ہے جبکہ پورے شہر میں اسے تلاش کیا جا رہا تھا۔ مگر یہ تھانہ انچارج اس کے بارے میں نہ صرف بجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے تھا بلکہ اسے تحفظ بھی فراہم کر رہا تھا۔ اگر اسے قبل از وقت پتہ چل جاتا کہ اس کو کٹھی پر چھاپہ پڑنے والا ہے تو وہ یقیناً ملک شہاب کو وہاں سے فرار کر دیتا۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ پولیس کے انسران اعلیٰ کے بجائے وزارت داخلہ کو رپورٹ کیوں بھیجی گئی تھی۔ پہلے روز گلبرگ والی کوٹھی میں ملک شہاب سے میری ملاقات ہوئی تھی تو وہاں وزارت داخلہ کا سیکرٹری سلمان بھی موجود تھا۔ رپورٹ اس لئے وزارت داخلہ کو بھجوائی گئی تھی تاکہ ایس پی سعید کے خلاف کارروائی کی راہ ہموار کی جاسکے۔

اخبار پڑھتے ہوئے میں چائے کو بھول گیا تھا۔ میں نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹا کر کرسی کے قریب فرش پر رکھا ہوا چائے کا کپ اٹھالیا۔ گھونٹ بھرتے ہوئے میری نظریں بے اختیار اس مکان کی طرف اٹھ گئیں اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ چھت پر کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے ہاتھ ہلایا اور میز ہیوں پر غائب ہو گئی۔

میں کچھ دیر تک چھت کی طرف دیکھتا رہا پھر دوبارہ اخبار پڑھنے لگا۔ اندر کے صفحہ پر ایک خبر دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

دھکے کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ خبر کی سرخی میں مادام دھکے کا نام پڑھتے ہی میرا ہاتھ بے اختیار گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ پر پہنچ گیا۔ میں وہ خبر پڑھنے لگا۔ اس خبر کے مطابق لبنان سے آنے والے تحقیقاتی مشن نے مادام دھکے کے قتل کو حکومت پاکستان کی غفلت کا نتیجہ قرار دیا تھا اور اسے ذہنیاتی کی واردات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اسے ایک سیاسی قتل قرار دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی حکومت پاکستان سے از سر نو اس قتل کی تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا۔

خبر پڑھنے کے بعد میں نے اخبار بند کر دیا اور گلے سے لاکٹ اتار کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں اس صورت حال کے بارے میں بھی سوچنے لگا۔

اخبار ڈالتا رہا تھا۔

میں نے چائے کا کپ کرسی کے قریب فرش پر رکھ دیا اور اٹھ کر تمام اخبار جمع کر لئے۔ میں آج کا اخبار بھی تھا۔ اخبار کے پہلے صفحہ پر ملک شہاب کی گرفتاری کے حوالے سے تین کاپی سرخی پڑھ کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ میں وہ خبر پڑھتا چلا گیا۔

رات بارہ بجے ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں ایس پی سعید نے ملک شہاب کی گرفتاری کا اعلان کیا تھا اور بند روڈ پر ٹرک پر چھاپے کے بعد ملک شہاب کی روپوشی سے لے کر گزشتہ رات چھاپے کے وقت اس کی گرفتاری تک کی تفصیلات بتائی تھیں۔ اس نے ملک شہاب اور اس کے ساتھ گرفتار ہونے والے بعض دوسرے لوگوں کو بھی صحافیوں کے سامنے پیش کیا تھا۔

ملک شہاب اور اس کے ساتھ گرفتار ہونے والے دوسرے آدمیوں کی تصویریں چھپی تھیں۔ ملک شہاب کے ہاتھوں میں جھنڈی تھی اور پیشانی اور ایک بازو پر بینڈج لگی ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں ایس پی سعید نے بتایا تھا کہ گرفتاری کے وقت ملک شہاب اور اس کے آدمیوں نے مزاحمت کی تھی۔ فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا جس کے نتیجے میں ملک شہاب کا ایک کارندہ اور پولیس کے دو کانسیبل گولیاں لگنے سے زخمی ہوئے تھے۔ کانسیبلوں سے ہاتھ پائی کے دوران ملک شہاب کو بھی معمولی چوٹیں آئی تھیں۔

ایس پی سعید نے پریس کانفرنس میں یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ شاہ جمال کی اس کوٹھی میں ملک شہاب کی موجودگی کی اطلاع اسی منجر نے دی تھی جس کی اطلاع پر چند روز پہلے ٹرک پر چھاپہ مارا گیا تھا اور پچاس کلو ہیر وٹن پکڑی گئی تھی۔ اخبارات کے رپورٹروں نے اس منجر کا نام جاننے پر اصرار کیا تھا مگر ایس پی سعید نے اس کی شناخت کو صیغہ راز میں ہی رکھا تھا۔

ملک شہاب کی گرفتاری کے حوالے سے تین چار اور چھوٹی خبریں بھی تھیں۔ بعض خبریں اسلام آباد کی ڈیٹ لائن سے تھیں۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ ملک شہاب کی رہائی کے لئے اعلیٰ سطح پر کوششیں شروع ہو چکی تھیں اور ایس پی سعید پر بھی اوپر سے دباؤ پڑ رہا تھا۔ لیکن اچھی بات یہ تھی کہ آئی جی، ایس پی سعید کی فیور میں تھا۔ اس نے اوپر سے کسی قسم کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح ایس پی سعید کا کیس کافی مضبوط ہو گیا تھا۔ لیکن کچھ خبریں ایس پی سعید کے خلاف بھی تھیں۔ شاہ جمال تھانے کے انچارج نے وزارت داخلہ کو براہ راست رپورٹ بھیج دی تھی کہ ایس پی سعید نے ملک شہاب کی گرفتاری کے لئے جس کوٹھی پر چھاپہ مارا تھا وہ اس کے دائرہ اختیار میں نہیں تھی۔ چھاپہ مارنے سے پہلے اس نے نہ تو اس علاقے کی پولیس سے رابطہ کیا تھا اور نہ ہی انہیں اعتماد میں لیا تھا۔ اس طرح اس نے اپنے اختیارات سے

مشن کا حصہ تھی؟ کیا وہ اپنے ملک کے لئے کسی خفیہ مشن پر کام کر رہی تھی؟
میں کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے مادام دھکے کچھ ایسی ہی پراسرار سرگرمیوں میں
مصرف ہو اور کوٹھی میں اتنی بڑی رقم کی موجودگی بھی میرے ان خیالات کی تصدیق کرتی تھی۔
ایک عورت کو گھر میں اتنی بڑی رقم رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔
لیکن اس کا اگر کوئی خفیہ مشن تھا تو وہ کیا تھا؟ وہ اسرائیل کے خلاف کس مشن پر کام کر رہی تھی
اور کس کی نظروں میں آگئی تھی؟

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ باہر والے گیٹ پر دستک کی ہلکی سی آواز سن کر چونک گیا۔
یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بچہ گیٹ کھٹکھٹا رہا ہو۔

میرا خیال درست نکلا۔ گیٹ کی تقریباً نصف اونچ جھری سے نیلے رنگ کے فرائک کی جھلک
نظر آ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر محتاط انداز میں گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول دیا۔ وہی بچی تھی جو پہلی
مرتبہ سویاں اور بعد میں اور چیزیں بھی لے کر آتی رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک
پلیٹ پکڑ رکھی تھی جسے دوسری پلیٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔

”انکل..... یہ خالہ نے آپ کے لئے بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ نے ابھی تک
ناشتہ نہیں کیا۔“ بچی نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

میں اُسے اندر لے آیا۔ کچن میں آ کر اوپر والی پلیٹ اٹھا دی۔ نیچے والی پلیٹ میں گرم گرم
فرنج ٹوسٹ رکھے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ پوری ڈبل روٹی کے فرنج ٹوسٹ بنا کر بھیج
دئے گئے تھے۔ ان میں نمکین بھی تھے اور میٹھے بھی۔

بچی کا نام ٹونی تھا۔ اسے رخصت کرتے ہوئے میں نے گیٹ سے باہر جھانکا، وہ حسینہ اپنے
مکان کے دروازے میں کھڑی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے
ہاتھ ہلا دیا اور اندر چلی گئی۔

میں نے گیٹ بند کر دیا اور کچن میں آ گیا۔ فرنج ٹوسٹ میں نے اپنی پلیٹ میں رکھ لئے
تھے۔ میں نے ایک ٹکڑا تو ڈکرنہ میں ڈالا اور پلیٹ ڈھک کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ آج کے
ناشتے کا بندوبست بھی ہو گیا تھا۔ میں ہاتھ روم میں کھس کر منہ ہاتھ دھوئے لگا۔

ناشتہ کرتے ہوئے میں ایک بار پھر اسی لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ
میری عدم موجودگی میں وہ دن میں کئی مرتبہ چھت پر آتی ہوگی۔ وہ ٹونی کو بھی بار بار بھیجتی ہوگی
یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میں گھر پر موجود ہوں یا نہیں۔ آج صبح ہوسکتا ہے ٹونی ہی نے اسے
بتایا ہو کہ گیٹ کا تالا کھلا ہوا ہے یا چھت پر سے میرا حلیہ دیکھ کر وہ سمجھ گئی ہوگی کہ میں نے ابھی

مادام دھکے نے حکومت پاکستان کو لکھ کر دے رکھا تھا کہ اس کی لاہور آمد و رفت سو فیصد ڈانٹ
معاملہ ہے اس لئے اسے سرکاری محافظوں کی ضرورت نہیں۔ یہاں اس نے اپنی حفاظت کے
لئے کوٹھی پر صرف ایک گن مین رکھا ہوا تھا جو ظاہر ہے صرف کوٹھی کی حفاظت کے لئے تھا۔
جب باہر جاتی ہوگی تو یہ گن مین اس کے ساتھ تو نہیں ہوتا ہوگا۔ لیکن دلچسپی کی بات یہ تھی کہ
مادام دھکے کو کوٹھی میں قتل کیا گیا تھا اور کوٹھی ہی میں گن مین کی لاش بھی ملی تھی۔ میں نے جس مرد
اور عورت کو کار پر کوٹھی سے نکلنے دیکھا تھا وہ یقیناً اس کے جانے والے تھے اور ان دونوں کو قتل
کرنے کے بعد بڑے اطمینان سے رخصت ہو گئے تھے۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ وہ اس کی
ساری دولت چھوڑ گئے تھے۔ اس دنیا میں دولت ہی کے لئے سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن ان کا
مقصد یقیناً اس دولت سے بھی زیادہ اہم تھا۔

کیا یہ واقعی سیاسی قتل تھا؟

مادام دھکے ایک سفارت کار تھی۔ میری معلومات کے مطابق لبنان اور پاکستان کے سفارتی
تعلقات بھی بڑے خوشگوار تھے۔ البتہ اسرائیل اور لبنان کی برسوں پرانی دشمنی تھی۔ لبنان میں آٹا
دم ختم نہیں تھا۔ البتہ اسرائیل اب بھی لبنان پر حملے کرتا رہتا تھا۔ لیکن لاہور میں مادام دھکے کا قتل
میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں جیسے جیسے سوچتا رہا میرا ذہن الجھتا گیا۔ مادام دھکے کو اپنے سفارتی فرائض کی ادائیگی کے
سلسلے میں اسلام آباد میں رہنا چاہئے تھا مگر اسے لاہور پسند تھا۔ وہ مبینے میں ایک ہفتے کے لئے
لاہور آتی تھی۔ حکومت پاکستان بھی اس سے واقف تھی۔ لیکن کیا یہاں مادام دھکے کی سرگرمیوں
پر نگاہ رکھی جاتی تھی؟ ہوسکتا ہے یہاں اس کی سرگرمیاں مشکوک ہوں۔

دفعۃً ایک اور بات میرے ذہن میں آگئی۔ اسرائیل اور ہندوستان میں گہری دوستی تھی۔ یہ
دونوں ملک پاکستان کے خلاف بھی سرگرم تھے۔ بھارت تو پاکستان کو نقصان پہنچانے کا کوئی
موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ بھارت نے پاکستان کو نقصان پہنچانے کے کئی خفیہ منصوبے
بنائے تھے اور ایسے ہر منصوبے کے پیچھے اسرائیل کا ہاتھ ضرور ہوتا تھا۔ چند سال پہلے اسلام آباد
کے قریب کہوڑ کے ایٹمی پلانٹ کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ یہ سازش بھی بھارت
اسرائیل نے مشترکہ طور پر تیار کی تھی۔ بھارت کے جیکو اڑتارے اسرائیلی پائلٹوں کے ساتھ
سری نگر کے ہوائی اڈے پر بالکل تیار کھڑے تھے۔ لیکن عین وقت پر اس سازش کا راز فاش
ہو گیا اور بھارت اور اسرائیل کا یہ مشترکہ گناہ نا منصوبہ خاک میں مل گیا۔

اس وقت میرا ذہن کسی اور رخ پر سوچ رہا تھا۔ کیا مادام دھکے کی لاہور آمد و رفت کسی اہم

مک ناشتہ نہیں کیا۔ اس لئے اُس نے فریج ٹوسٹ بنا کر بھیج دیئے۔
یہ دل کی لگی بھی عجیب چیز ہے۔ شبنم اور سولجر کی بات تو سمجھ میں آتی تھی۔ وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے قریب رہے تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے اس لئے ایک دوسرے کو پہنہ کرنے لگے تھے۔ لیکن یہ لڑکی، جس نے مجھے اپنے مکان کی چھت سے دیکھا تھا، مجھ پر مڑی تھی، محض میری صورت دیکھ کر۔ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی کہ میں کون ہوں۔ اگر اسے پتہ چل جائے تو شاید میرے سائے سے بھی دور بھاگنے لگے۔
ناشتہ کرنے کے بعد میں پچھلے دنوں کے اخبار لے کر بیٹھ گیا اور وقت گزاری کے لئے اخباروں کا مطالعہ کرنے لگا۔

وہ دن اسی طرح گزر گیا۔ میں باہر نہیں نکلا تھا۔ باہر کے حالات معلوم کرنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اگر اس مکان میں ٹیلی فون ہوتا تو کسی سے رابطہ کر کے صورت حال معلوم کی جاسکتی تھی۔
مجھے دو چیزوں کی سخت ضرورت تھی۔ ایک کار اور دوسرا ٹیلی فون..... کار کا انتظام تو کیا جاسکتا تھا مگر ٹیلی فون کا انتظام ہونا ممکن نہیں تھا۔ رقم کے بل بوتے پر اگرچہ دو دن کے اندر اندر اس کوٹھی میں ٹیلی فون بھی لگ سکتا تھا مگر اس طرح میں نظروں میں آجاتا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ میں کوٹھی کی مالکہ رضیہ بیگم سے ٹیلی فون کے لئے درخواست دوادیتا اور اس کے ذریعے کوٹش کرتا۔ لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ فوری طور پر تو اس کا کوئی بندوبست نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ رقم کی میرے پاس کی نہیں تھی اور کار کا تو آج ہی انتظام ہو سکتا تھا۔ مگر کم از کم آج کا دن میں کوٹھی سے نہیں نکلتا چاہتا تھا۔

شام کی چائے بھی میں نے اندر ہی بیٹھ کر پی تھی اور جان بوجھ کر برآمدے میں نہیں آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکی دن میں کئی مرتبہ چھت پر آئی ہوگی اور مجھے نہ دیکھ کر اسے ہر مرتبہ بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ جیسا کہ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ نبانے کتنے لوگوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ لاہور کے جرائم پیشہ لوگوں کی فہرست میں میرا نام سب سے اوپر ہو سکتا ہے۔ لیکن میں عیاش نہیں ہوں۔ عورتوں کے پیچھے کبھی نہیں بھاگا۔ محنت کے بغیر کوئی ہاتھ آجائے تو اسے چھوڑتا بھی نہیں۔ لیکن یہ لڑکیاں بھی وہ ہوتی تھیں جنہیں اپنی عزت کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ چند روپوں کی خاطر کسی کے ساتھ بھی جانے کو تیار ہوتی ہیں۔ لیکن یہ لڑکی..... اس کا تعلق ایک شریف گھرانے سے تھا۔ میں نے ایک دو مرتبہ اس گھر کے سربراہ کو دیکھا تھا۔ دُبلّا پتلا، دراز قامت، عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہو

مک ناشتہ نہیں کیا۔ اس لئے اُس نے فریج ٹوسٹ بنا کر بھیج دیئے۔
یہ دل کی لگی بھی عجیب چیز ہے۔ شبنم اور سولجر کی بات تو سمجھ میں آتی تھی۔ وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کے قریب رہے تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے اس لئے ایک دوسرے کو پہنہ کرنے لگے تھے۔ لیکن یہ لڑکی، جس نے مجھے اپنے مکان کی چھت سے دیکھا تھا، مجھ پر مڑی تھی، محض میری صورت دیکھ کر۔ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی کہ میں کون ہوں۔ اگر اسے پتہ چل جائے تو شاید میرے سائے سے بھی دور بھاگنے لگے۔
ناشتہ کرنے کے بعد میں پچھلے دنوں کے اخبار لے کر بیٹھ گیا اور وقت گزاری کے لئے اخباروں کا مطالعہ کرنے لگا۔

رات نوبے کے قریب میں باہر دکان پر جا کر رات کے لئے کھانا اور کل دن کے لئے بھی کھانے پینے کی چیزیں لے آیا۔
رات گیارہ بجے کے قریب میں برآمدے میں آ گیا۔ غیر ارادی طور پر میری نظریں اس مکان کی چھت کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو اندھیرے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے برآمدے کی جتی بجھا رکھی تھی تاہم لاؤنج میں جلنے والی جتی کی روشنی باہر تک آرہی تھی۔ میں نے وہ جتی بھی بجھا دی اور دوبارہ برآمدے میں آ گیا۔
میں نے کل کوئی گاڑی خریدنے کا ارادہ کر لیا تھا اور اس کے لئے صبح رقم کی ضرورت تھی۔ میرے پاس الماری میں اگرچہ رقم موجود تھی مگر وہ بیس پچیس ہزار روپے سے زیادہ نہیں تھی جبکہ کار خریدنے کے لئے زیادہ رقم کی ضرورت تھی اور میں نے پانی کے انڈر گراؤنڈ ٹینک میں چھپایا ہوا بیگ نکال کر اس میں سے کچھ رقم نکالنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں برآمدے سے اتر کر پانی کے ٹینک کے قریب آ گیا۔ پہلے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کسی مکان کی چھت سے بھی ٹینک والی جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے جھک کر ٹینک کا کنکریٹ کا ڈھکنا اٹھا دیا۔
پلاسٹک میں لپٹا ہوا بیگ پانی کے اندر ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی رستی ٹینک کے اندر لگے ہوئے ایک آہنی ہگ سے بندھی ہوئی تھی۔
میں رستی پکڑ کر پانی میں لٹکے ہوئے بیگ کو اوپر کھینچنے لگا اور بالآخر اسے ٹینک ہول کے کنارے پر رکھ دیا۔ وہ پانی میں بھگا ہوا تھا اور پانی فرش پر بہہ رہا تھا۔
میں بیگ کے ساتھ رستی کی گرہیں کھول رہا تھا کہ گیٹ پر ہلکی سی دستک کی آوازیں کر میں اچھل پڑا۔ مجھ سے تباہ کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا اور سینے میں سانس رکنے لگا۔

میں چند لمحے تاریکی میں اسے گھورتا رہا اور برآمدے کی طرف چل پڑا۔ اس نسوانی سرگوشی نے میرے دل کی دھڑکن تیز کر دی تھی۔ وہ کوئی عورت تھی اور آواز سے جوان ہی لگتی تھی۔ لیکن میں اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کون ہے۔ ذہن میں ایک ہی خیال ابھرا تھا۔ ممکن ہے وہ غنڈوں سے بھاگ کر آئی ہو اور پناہ لینے کے لئے میرا دروازہ کھٹکھٹا دیا ہو۔

برآمدے میں آکر میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بلا جھجک اندر داخل ہو گئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور بتی جلادی۔ روشنی ہوتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ میری پڑوسن تھی جسے میں نے آج تک صرف چھت پر ہی دیکھا تھا یا گلی میں سے گزرتے ہوئے ایک آدھ دفعہ اس پر نظر پڑ گئی تھی۔ لیکن میں نے آج تک کبھی بھی نظر بھر کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اور اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ صرف ایک فٹ کے فاصلے پر!

اس کی عمر چوبیس بچیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ بے حد حسین، سڈول اور گداز جسم، نگرز تو قیامت خیز تھے۔ وہ گھر سے چوری چھپے آئی تھی لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ اس کے برعکس ہونٹوں پر بڑی خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے برعکس میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہو رہی تھی اور کنشیاں سلگ رہی تھیں۔

”میں..... میں رختی ہوں۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی ہکلاہٹ تھی۔

”میں نے پہچان لیا ہے تمہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”لیکن آدھی رات کے وقت تم یہاں کیوں آئی ہو؟ تمہارے گھر والوں کو پتہ چل گیا تو.....“

”میرے گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”مہجرات میں عزیز بھائی کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ شام کو اطلاع ملی تھی اور وہ اسی وقت چلے گئے تھے۔

ٹوٹی کو تیز بخار ہو رہا تھا اس لئے ہم ان کے ساتھ نہیں جاسکے۔ انہوں نے جاتے وقت سامنے شاخ صاحب کے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ ہمارا خیال رکھیں۔ ٹوٹی اس وقت سو رہی ہے۔ اس لئے میں موقع پا کر آپ سے ملنے کے لئے یہاں آ گئی۔

”بہت غلط کیا تم نے۔“ میں نے کہا۔ ”کسی اجنبی کے گھر میں، جہاں کوئی عورت بھی نہ ہو،

اس طرح بے دھڑک چلے آنا ٹھیک نہیں ہے۔“

”تم میرے لئے اچھی نہیں ہو۔“ رختی نے کہا۔

”کیا؟“ میں رختی کی بات پر چونک گیا۔ درحقیقت یہ سوچ کر میرا دماغ گھوم گیا تھا کہ وہ

میرے بارے میں کیا جانتی تھی۔ ”کیا جانتی ہو میرے بارے میں؟ ہم تو کبھی ایک دوسرے سے

ملے بھی نہیں۔ اور میرا خیال ہے تم تو میرا نام بھی نہیں جانتیں۔“

میں نے بیٹھے بیٹھے مڑ کر دیکھا۔ اس دوران دستک کی آواز ایک بار پھر ابھری۔ لوہے کی گیٹ اگرچہ آہستگی سے کھٹکھٹایا گیا تھا لیکن رات کے سناٹے میں آواز دور تک سنی جاسکتی تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے کنارے پر پڑے ہوئے بیک کو دھکا دیا۔ بیک شراپ کی آواز ساتھ پانی میں جاگرا اور پھر اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کنکر گیت کا ڈھول اٹھا کر ہول پر رکھ دیا۔ میں نے تو ڈھٹکا بہت آہستگی سے رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن آخری لمحہ کا ایک کونا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دھڑکی آواز پھیل گئی۔ اور ٹھیک اسی لمحہ گیت کھٹکھٹا کی آواز ایک بار پھر ابھری۔

میرے پاس اس وقت ہسپتال نہیں تھا۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا گیت والی دیوار کے قریب آ گیا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ باہر کون ہو سکتا ہے۔ پولیس کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا۔ پولیس والے اس طرح آرام سے کسی کے دروازے پر دستک نہیں دیتے تھے۔ میرے ذہن میں اچانک ہی سولجر کا خیال ابھرا۔ لیکن اس خیال کو ذہن سے جھک دیا۔ سولجر تو مجھے اچھرہ موڑ پر اتار کر اسی رکشے پر آگے چلا گیا تھا اور میں کافی دیر تک اچھرہ کے پاکہ ریسٹورنٹ میں بیٹھا رہا تھا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سولجر میرا ٹھکانہ معلوم کرنے کے لئے چھپ کر میری نگرانی کر رہا تھا تو ایسا بھی ممکن نہیں تھا۔ ایسی کوشش کرتے ہوئے وہ میری نظر میں آ جاتا۔ اور پھر جب میں اچھرہ موڑ سے رکشے پر اس طرف آیا تھا تو میں نے اپنے نقاب کا خیال رکھا تھا۔ میرے پیچھے سڑک پر دور تک کوئی رکشہ یا کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ تو پھر یہ کون سا سکتا تھا؟

میں نے گیت کی جھری میں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ مگر تاریکی میں کوئی نظر نہیں آیا۔ لمحہ چھینک کی سی آواز ابھری اور دروازہ ایک بار پھر کھٹکھٹایا گیا۔ چھینک کی اس آواز نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ذیلی دروازے کا بولٹ بڑی آہستگی سے سرکا دیا۔ میں کوشش تو کی تھی کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔ لیکن لوہے کا ایک انچ مونا بولٹ ہٹانے میں ہلکے کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی تھی۔ اور پھر جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا ایک ہیولا اندر گھس آیا اور نے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

”اے..... کون ہو تم؟“ میں کسی قدر بدحواس سا ہو گیا۔ ایک نہایت خوشگوار مہک میرے

نہنوں سے نکل رہی تھی اور لباس سے بھی میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔

”مم..... میں ہوں..... باؤ جی.....“ ایک ہکلاتی ہوئی نسوانی سرگوشی میری سماعت

نکرائی۔ ”یہاں کھڑے ہونا مناسب نہیں۔ اندر چلو..... میں بتاتی ہوں۔“

میں اس کے پیچھے پیچھے ہی گیٹ تک آیا۔ رخصی نے گیٹ کھول کر باہر جھانکا اور پھر باہر نکل گئی۔ میں نے گیٹ بند کر دیا اور اندر آ گیا۔

میں کتنی دیر تک اپنی جگہ پر کھڑا صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ جس لڑکی کو دور سے دیکھ کر بہت معصوم اور بھولی بھالی سمجھتا تھا، وہ بہت خراٹ ثابت ہو رہی تھی۔ وہ جس انداز سے بات کر رہی تھی اس سے لگتا تھا جیسے وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ مجھ سے بہت بے تکلف ہو اور مجھ پر کسی قسم کا حق رکھتی ہو۔ اس نے بڑے فیصلہ کن انداز میں مجھے اپنے گھر آنے کو کہا تھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر چلی گئی تھی۔ اور اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اس کے گھر جانا چاہئے یا نہیں۔

آدمی رات کے وقت رخصی کے گھر جانا خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس کا بہنوئی گجرات چلا گیا تھا اور پڑوسیوں سے کہہ گیا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں گھر کا دھیان رکھا جائے۔ اگر کسی نے مجھے اس گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا تو گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ لیکن میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کی صورت میں رخصی کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اور اگر وہ بگڑ گئی تو میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کا بات کرنے کا انداز بھی کچھ عجیب سا تھا۔

پانچ منٹ گزر گئے اور بالآخر میں نے رخصی کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر وہ عورت ہو کر اتنی بے باکی کا مظاہرہ کر رہی تھی تو مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔

وائرٹنگ سے بیگ نکالنے کا فیصلہ میں نے ملتوی کر دیا۔

احتیاطاً پستول چٹلون کی جیب میں ڈال لیا۔ باہر نکل کر برآمدے والے دروازے کو تالا لگا دیا اور گیٹ سے باہر نکل کر گلی میں کھڑا ہو گیا۔ گیٹ کو تالا لگانے کی ضرورت نہیں سمجھتی تھی۔ کڈا لگا دیا تھا۔

بائیں طرف سے کوئی سائیکل سوار آ رہا تھا۔ تاریکی میں اس کا صرف ہیولہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ کچے راستے پر جھٹکے لگنے سے سائیکل کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں اپنے گیٹ کے سامنے کھڑا رہا۔

تقریباً ایک منٹ کے بعد وہ سائیکل سوار میرے سامنے سے گزر گیا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اور جب وہ سائیکل سوار آگے جا کر بائیں طرف ایک اور گلی میں مڑ گیا تو میں نے گردن گھما کر رخصی کے مکان کی طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی دروازے سے سر نکالے باہر جھانک رہا ہو۔ میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا اس مکان کی طرف چلنے لگا۔

”میں تمہارا نام بھی جانتی ہوں رونی باؤ! اور تمہارے بارے میں اور بھی بہت کچھ جانتی ہوں۔“ رخصی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

رخصی کے منہ سے اپنا نام سن کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے اسے دلفریب بانہوں سے پکڑ لیا اور اپنے قریب کھینچ کر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

”کیا جانتی ہو میرے بارے میں؟“

”بہت کچھ۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ ”مگر یہاں نہیں۔ بخار میں سو رہی ہے۔ وہ گھر میں اکیلی ہے۔ اگر جاگ گئی تو مجھے نہ پا کر پریشان ہوگی۔ تم میرے گھر آ جاؤ۔ وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ ساری رات.....“

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ گردن پر چیونٹیاں سی ریگنے لگی تھیں۔ اس نے جب چیزیں بھیجنا شروع کی تھیں تو میں یہی سمجھا تھا کہ جوانی کا جوش ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ لڑکائی تھی اور اس طرح چیزیں بھیج کر تعلقات استوار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن یہاں بات کچھ اور نکلی تھی۔ میں اب تک اس کی حوصلہ شکنی کرتا رہا تھا تاکہ تعلقات زیادہ نہ بڑھ سکیں۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر تعلقات بڑھ گئے تو بعد میں کسی وقت یہ لڑکی میرے لئے الجھن کا باعث بن سکتی تھی۔ لیکن میں اس حقیقت سے بے خبر ہی تھا کہ وہ میرا نام ہی نہیں بلکہ میرے بارے میں اور بھی بہت کچھ جانتی تھی۔ وہ جس طرح بے باکی سے یہاں چلی آئی تھی اس پر مجھے شدید حیرت تھی اور مزید حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس کی اس بے باکی سے میں اس کے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو رونی!“

اس کی آواز سن کر میرے خیالات منتشر ہو گئے۔

”اوہ..... کچھ نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کیا مجھے اپنے گھر بلا کر تمہیں ڈرنے لگے گا؟“

”ڈر؟“ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”ڈر تو مجھے اب لگ رہا ہے۔ اُٹا ہوں نا..... تم آ جاؤ گے تو مجھے ڈر کیوں لگے گا۔“

”لیکن.....“

”میں کوئی عذر نہیں سننا چاہتی۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”میں جا رہی ہوں۔“

دروازہ کھلا رہے گا۔ دستک دیئے بغیر اندر آ جانا..... اور زیادہ انتظار مت کرنا مجھے۔ ہاں۔“

نے ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکا اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

رہی میں تمہیں نظر انداز کرتا رہا۔“

”ایک منٹ۔“ رخشی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”تم یہاں بیٹھو..... میں ٹوٹی کو دیکھ آؤں۔“

”وہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ساتھ والے کمرے میں۔ میں اسے دیکھ کر ابھی آتی ہوں۔“ رخشی نے کہا اور میرے

جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گئی۔

میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ تقریباً دو منٹ بعد

میں نے رخشی کو دروازے کے سامنے سے دوسری طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ اس مرتبہ اس کی

واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چائے کے دو کپ اٹھا رکھے

تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر دونوں کپ ڈرینگ ٹیبل پر رکھ دیئے۔

”اس وقت تو میں تمہیں چائے ہی پلا سکتی ہوں۔ اگر کچھ کھانے کا موڈ ہو تو بلاؤں؟“ وہ

کہتے ہوئے میرے سامنے بیڈ پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

”ٹوٹی کیسی ہے؟ کیا ہوا ہے اسے؟“ میں نے پوچھا۔

”دوپہر کے بعد اچانک ہی تیز بخار ہو گیا تھا۔ شام کو عزیز بھائی اسے ڈاکٹر کے پاس لے

گئے تھے۔ اس وقت انجکشن لگا دیا تھا۔ دوا بھی استعمال کرنے کو دی تھی۔ اس کے تقریباً آدھے

گھنٹے بعد عزیز بھائی کی والدہ کے انتقال کی اطلاع آ گئی۔ وہ فوراً ہی روانہ ہو گئے۔ ٹوٹی ٹھیک

ہوتی تو ہم بھی جاتے مگر ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے ہوانہ لگنے دی جائے ورنہ طبیعت بگڑ سکتی ہے۔“

میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ اس نے اب تک

جس بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا اس پر مجھے شدید حیرت ہوئی تھی۔ کسی اجنبی مرد سے بات چیت

کرتے ہوئے نوجوان لڑکیوں کے منہ سے آواز تک نہیں نکلتی تھی۔ وہ مجھے آدھی رات کے وقت

اپنے گھر میں لے آئی تھی اور اس وقت تو اس نے دوپٹہ بھی نہیں لے رکھا تھا۔

”تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”میں اکیلی تھی۔ اور مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ اس لئے میں نے تمہیں بلایا۔“ اس نے جواب

دیا۔

”تم میرے بارے میں بہت کچھ جاننے کا دعویٰ بھی کرتی ہو۔ اور اس کے باوجود مجھے

یہاں.....“

”تم مجھے کھانہ نہیں جاؤ گے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”لیکن مجھے حیرت ہے کہ لوگ

تمہیں اتنا برا کیوں سمجھتے ہیں۔ اگر تم میں کوئی برائی ہوتی تو پہلے ہی روز جب میں نے تمہیں

وہ سردرازے میں غائب ہو چکا تھا۔ میں دروازے کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر کمرے

دروازہ ایک انچ کے قریب کھٹکا ہوا تھا۔ میں نے سامنے والے مکان کی طرف دیکھا۔ اس

میں اندر کہیں روشنی ہو رہی تھی مگر کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ آہستگی سے کھٹکا چلا گیا۔ رخشی

دروازے کے اندر قریب ہی کھڑی تھی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے بڑی آہستگی

دروازہ بند کر کے بولٹ لگا دیا۔

”اس طرف آ جاؤ۔“ رخشی کی سرگوشی۔ نائی دی۔

میں آہستگی سے اس طرف مڑ گیا۔ یہ کبھی بھی میرے والی کوشی ہی کی طرح تھی۔ رقبہ بھی

اتنا ہی تھا۔ گیٹ سے آگے پختہ صحن تھا اور پھر برآمدہ۔ برآمدے سے ملحق کمرے کی بٹیاں

ہوئی تھیں جس سے اس طرف گہرا اندھیرا دور ہا تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر رخشی نے دروازہ کھول دیا۔ پہلے مجھے اندر داخل ہونے کا موقع ملا

پھر خود اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ یہ غالباً لاؤنج تھا اور یہاں بھی اندھیرا تھا۔ البتہ آگ

دائیں طرف سے مدھم سی روشنی اس طرف پہنچ رہی تھی۔ رخشی اس طرف بڑھی تو میں بھی اس

پچھے چلتا ہوا راہداری میں مڑ گیا اور اس کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔

یہ بیڈ روم تھا۔ پلنگ پر آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف ڈرینگ ٹیبل تھی اور اس کے

قریب ہی دو کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اس کمرے کا فرنیچر دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ

کا تعلق متوسط درجے سے ہے۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے رخشی کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی گہرا

مسکراہٹ تھی۔

”میں تو سمجھی تھی کہ تم نہیں آؤ گے۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

”میں خود بھی تم سے ملنا چاہتا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پہلی مرتبہ تمہیں چھت پر دیکھا

تو دھیان نہیں دیا تھا لیکن تم نے مجھے چیزیں بھیجنا شروع کر دیں تو میرے دل میں جنس

ہو۔ میں تم سے مل کر ان باتوں سے منع کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ کئی میں کسی کو پتہ چل جائے تو بات

بٹنگل بن سکتا ہے۔ ویسے بھی میں بہت.....“

”شریف آدمی ہوں۔“ رخشی نے مسکراتے ہوئے میرا جملہ کھل کر دیا۔

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

شرافت کا اندازہ اس بات سے بھی لگا سکتی ہو کہ تم جیسی حسین لڑکی کی طرف سے حوصلہ افزائی

کے بعد میں کئی مرتبہ چھت پر گئی۔ دروازے میں کھڑے ہو کر تمہیں دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرف سے حوصلہ افزائی پا کر تم بھی کسی قسم کی پیش قدمی کرو گے۔ لیکن پیش قدمی تو کیا ہوئی نہ تھی میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کئی مرتبہ تو مجھے یہ خیال آیا کہ شاید میری دوست کے شوہر نے تمہارے بارے میں جھوٹ کہا تھا۔

”کیا نام ہے تمہاری دوست کے شوہر کا اور وہ کیا کام کرتا ہے؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پہلی بار پوچھا۔

”اس کا نام جاوید ہے۔ میری دوست سے اس کی شادی تقریباً دو سال پہلے ہوئی تھی۔ لیکن شادی کے ایک ہفتے بعد ہی پولیس نے اسے منشیات فروشی کے الزام میں گرفتار کر لیا اور عدالت سے اسے ایک سال کی سزا ہو گئی۔ اس کی گرفتاری کے وقت ہی یہ انکشاف ہوا تھا کہ اس کا تو دھندہ بھی ہے۔ میری دوست پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ اس کے گھر والے اسے طلاق کے لئے مجبور کرنے لگے مگر وہ جاوید سے طلاق لینے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے عہد کیا تھا کہ جاوید سزا بھگت کر آئے گا تو اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کرے گی۔ وہ جاوید سے ملاقات کے لئے جیل جاتی رہی۔ اور اس دوران وہ اپنی باتوں سے جاوید کی برین واشنگ کی کوشش کرتی رہی۔ اور جب ایک سال بعد جاوید جیل سے رہا ہوا تو وہ ایک بدلا ہوا انسان تھا۔ وہ گہری بکجیٹ تھا۔ بیکاری سے تنگ آ کر اس نے منشیات فروشی کا دھندہ شروع کیا تھا۔ لیکن بیوی کی کوششوں سے وہ بالکل بدل گیا۔ دونوں میاں بیوی نے شاد باغ میں کنڈرگارٹن سکول کھول رکھا ہے اور دونوں بہت مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔“

”جاوید.....“ میں بڑبڑایا۔ ”اُس کے دائیں رخسار پر مسہ تو نہیں؟“

”ہاں..... وہی۔“ زخشی نے جواب دیا۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا اور یہ بھی درست تھا کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد اس کا راستہ بدل گیا تھا اور مجھے خوشی ہوئی تھی کہ ایک آدمی تو برائی کی دلدل سے نکل کر سیدھے راستے پر لگا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ یہاں کبھی اس سے میرا آمناسامنا ہوا ہو۔ لیکن ممکن ہے اس نے مجھے مکان سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔

”جاوید نے میرے بارے میں جو کچھ بھی کہا، غلط نہیں ہے۔“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں واقعی جرم و گناہ کی دلدل میں دھنسا ہوا ہوں۔ لیکن تم..... یہ سب کچھ جاننے کے باوجود بھی.....“

”میں بزدل اور ڈرپوک نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں بھی پڑھی لکھی اور آزاد خیال لڑکی

اشارہ کیا تھا تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ جاتے اور میرا جینا حرام کر دیتے۔ مگر صورت حال کے برعکس رہی۔ تم مجھے مسلسل نظر انداز کرتے رہے اور یہ تمہاری برائی نہیں، شرافت کی ہے۔“

”اور تم مجھے شریف آدمی سمجھ کر بے ہنرک میرے گھر چلی آئیں اور مجھے یہاں بلا لیا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن تمہیں کسی پر اتنا اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ کوئی شریف آدمی بھی ایسے موقع سے غافل اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن بہر حال۔“ میں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”تم میرے بارے میں کیا جانتی ہو اور کیسے.....؟“

”تمہیں یہ مکان کرائے پر لئے ہوئے دو سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔“ زخشی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس دوران تم کبھی بکھار ہی یہاں آ کر رہتے ہو اور ان دنوں میں کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ میں کسی اور کی بات نہیں کرتی لیکن مجھے تم پر شبہ ہوا تھا۔ میں تمہارے ساتھ کسی اور کو بھی کبھی آتے ہوئے نہیں دیکھا نہ کوئی مرد اور نہ کوئی عورت۔ اگر تم غائب ہوتے تو کبھی نہ کبھی تو تم کسی عورت کو لے کر آتے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ انہی باتوں سے میرا نتیجہ پر پہنچی کہ تم یہاں چھپ کر زندگی گزار رہے ہو۔ کیونکہ یہاں تمہاری آمد و رفت بھی نہ کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی ہوتی ہے۔“

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”تقریباً تین مہینے پہلے جب تم صرف چار دن کے لئے یہاں آئے تھے، انہی دنوں ایک شام میری ایک دوست اپنے شوہر کے ساتھ میرے ہاں آئی تھی۔ اس وقت تم اپنی کوٹھی سے نکل کر کہیں جا رہے تھے۔ اس دن اگرچہ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا مگر سامنے والے مکان کے دروازے پر بلب جل رہا تھا۔ میری دوست کے شوہر نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ اس نے تمہارے بارے میں بتایا تھا کہ تم بہت خطرناک جرائم پیشہ آدمی ہو۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت عزیز بھائی گھر پر نہیں تھے ورنہ وہ اس کا تمہارے بارے میں سب کو بتا دیتے۔ میری دوست اور اس کا شوہر عزیز بھائی کے آنے پہلے ہی جا چکے تھے اور میں..... مجھے کسی سے تمہارے بارے میں کہنے کی کیا ضرورت تھی بہر حال مجھے اسی روز سے تم سے دلچسپی ہو گئی تھی۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ خاموشی کا وہ اس بار بھی زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”حالانکہ میں پہلے ہی میں نے کئی مرتبہ تمہیں دیکھا تھا مگر کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن سب کچھ معلوم ہونے کے بعد میں تم میں دلچسپی لینے لگی۔ لیکن پھر یکایک تم غائب ہو گئے۔ پچھلی مرتبہ جب تم میرے آئے تو میں نے تمہیں نہ صرف چھت سے اشارہ کر دیا بلکہ تمہیں سویاں بھی بنا کر بھیج دیں۔“

”بہائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ کینسر کی مریضہ تھیں۔“ رخشی نے گہرا سانس لیتے ہوئے

جواب دیا۔
”بہت افسوس ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے دوسرے گھر والے..... میرا مطلب ہے

والدین یا کوئی بھائی وغیرہ؟“

”صرف والدین ہیں جو ساہیوال کے ایک گاؤں میں رہائش پذیر ہیں۔ والد گاؤں کی مسجد کے پیش امام ہیں۔ انہیں گاؤں سے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ایک بھائی تھا جس کا روڈ ایکسپنڈ میں انتقال ہو گیا۔ اب یہ سمجھو کہ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔“

”عزیز بھائی تمہارے بہنوئی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بہنوئی کے ساتھ اکیلے رہتے ہوئے....“
”مجھے کوئی شرم نہیں آتی۔“ رخشی نے جواب دیا۔ ”عزیز بھائی اے جی آفس میں کلرک ہیں۔ میں ٹوٹی کی وجہ سے ان کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ ویسے یہ مکان تو میرا ہی ہے نا..... مجھے یہاں رہنے سے کون روک سکتا ہے۔ عزیز بھائی ویسے بھی بہت سیدھے سادھے آدمی ہیں اور مجھ سے کچھ ڈرتے بھی ہیں۔“

”تم تو جیڑی ایسی ہو کہ تم سے ڈرنا چاہئے۔“ میں نے پہلی بار مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں کوئی ہتھی نہیں ہوں۔“ اس نے مجھے گھورا۔

”لیکن کسی ہتھی سے زیادہ خطرناک ہو۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال، یہ طے ہو گیا کہ تم بزدل اور ڈرپوک نہیں ہو، بہت بے باک اور نڈر ہو۔ محلے والے بھی تمہارے بارے میں جانتے ہوں گے۔ تمہیں اکیلے پا کر بھی کوئی اس دروازے کے قریب آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ پھر تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟“

”یونہی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم سے باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا۔“
”نڈر اور بے باک ہونے کے باوجود تم ایک عورت ہو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظر کر لیا جاتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ میں بہت خطرناک آدمی ہوں۔ کیا مجھے یہاں بلا کر تم نے غلطی نہیں کی؟“

”کبھی غلطی؟“ اس نے مجھے گھورا۔ ”کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں کوئی آوارہ اور بد چلن عورت نہیں ہوں۔ میں تم میں دلچسپی اس لئے نہیں لے رہی کہ تمہارے حسن و جمال پر سرمٹا ہوں۔ تمہارے بارے میں جاوید کے انکشاف سے پہلے بھی میں نے تمہیں دیکھا تھا لیکن کبھی تم ہاتھ نہیں دیتی تھی۔“

ہوں۔ میری عمر اگرچہ اتنی زیادہ نہیں مگر میں نے تین سال جس شعبے میں ملازمت کی ہے اس سے مجھے بے پناہ تجربات حاصل ہوئے ہیں۔ تمہارے بارے میں سب کچھ سننے کے بعد مجھے بلاوجہ ہی تم سے دلچسپی نہیں ہوئی تھی۔“

”ملازمت؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، میں نے تین سال پولیس کی ملازمت کی ہے۔“ رخشی نے جواب دیا اور میں اچھل پڑا۔ ”میں گریجویٹیشن کے بعد پولیس میں اے ایس آئی بھرتی ہو گئی تھی۔ میں کچھ اور جذبے سے کر اس محکمہ میں آئی تھی مگر مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ اس محکمہ میں لوگ صرف پیسہ کمانے کے لئے آتے ہیں۔ وردی پہن لینے والا ہر شخص اپنے آپ کو قانون سے بالا سمجھنے لگتا ہے۔ دہر چاہے کر لے، اسے ٹکیل ڈالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ رشوت کے بغیر پانی کا گھونٹ بھی ان کے حلق سے نہیں اترتا۔ میں پہلے تو اس قسم کی صورت حال سے بچنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن پھر اسی رنگ میں رکتی چلی گئی۔ رشوت کو میں نے بھی اپنا اصول بنا لیا۔ بے گناہوں کو پکڑ کر حوالات میں بند کروادیتی اور کوئی چارج لگائے بغیر کئی کئی روز تک سلاخوں کے پیچھے بند رکھتی اور بالآخر وارنٹوں سے رشوت لے کر چھوڑ دیتی۔ مجھے رشوت وصول کرنے کے بہت سے راستے معلوم ہو گئے تھے۔ لیکن ایک روز میں خود جال میں پھنس گئی۔ تمام راستے بند ہو گئے۔ میری جیب سے دل ہزار روپے رشوت کے نشان زدہ نوٹ برآمد ہو گئے۔ مجھ پر کیس چلا اور پولیس کی ملازمت سے نکال دیا گیا۔“

”اگر تم پولیس میں تھیں تو تمہیں میرے بارے میں معلوم ہونا چاہئے تھا۔“ میں نے کہا۔
”میں یہاں نہیں، ساہیوال میں تھی۔“ رخشی نے جواب دیا۔ ”میری دوست فائزہ بھی ساہیوال ہی کی رہنے والی ہے۔ اس کی شادی یہاں ہوئی تھی۔ میں نے بھی لاہور آ کر یہ کٹھن بنوائی۔ یہ زمین میں نے پولیس ملازمت کے دوران ہی اپنی بڑی بہن فرخندہ کے نام سے خریدا لی تھی۔ شادمان میں بھی ایک پلاٹ خرید رکھا ہے۔ اگر میں پولیس میں رہتی تو اچھی فائزہ جائیداد بنا لیتی۔“

اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ وہ اتنی بے باک کیوں تھی اور بلا خوف و خطر میرے گھر میں کیوں آگئی تھی اور مجھے یہاں کیوں بلا لیا تھا؟ لیکن ایک بات میں جانتا تھا کہ وہ بھی تو عورت ہی..... اور عورت کتنی ہی بے باک اور نڈر کیوں نہ ہو، رہتی تو مرد کے زیر دست ہی ہے۔
”تو یہ صورت حال ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری باجی کہاں ہیں میں نے تو اس گھر میں تمہارے علاوہ کسی اور عورت کو کبھی نہیں دیکھا۔“

میں لے لیا گیا۔ مقدمہ صرف تین مہینے چلا۔ ڈی ایس پی کے دوست کو قتل کے جرم میں عمر قید اور ڈی ایس پی کو دس سال کی سزا ہو گئی۔ آج کل وہ ساہیوال جیل میں ہے۔ ابھی صرف دو ڈھائی سال ہوئے ہیں۔ میں اس کے بعد کچھ عرصہ ساہیوال میں رہی پھر یہاں آ گئی۔

”اب تمہیں مجھ جیسے آدمی کی ضرورت کیوں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بیانی ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں تہ کیا ہوا ایک اخبار تھا۔ اس نے اخبار کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ اخبار پر انا تھا۔ اس کے پہلے صفحہ پر ایک عورت کی تصویر دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ وہ مادام دھکے کی تصویر تھی۔

”اس عورت کو چند روز پہلے قتل کر دیا گیا ہے۔“ رخصی نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اس کے گھر میں ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں تو کئی روز تک اخباروں میں خبریں چھپتی رہی ہیں۔ یہ شاید پاکستان میں لبنان کی سفیر تھی۔ لیکن تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟“

”سب سے پہلی بات تو یہ کہ اس کے گھر میں ڈکیتی کی واردات نہیں ہوئی تھی۔“ رخصی نے کہا۔ میں اچھل پڑا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”اسے انڈیا کی انٹیلی جنس ایجنسی ”را“ کے ایجنٹوں نے قتل کیا ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ اس کے قاتل کون ہیں۔ مجھے تو اس دولت سے دلچسپی ہے جو اس کی کوشی کے تہ خانے میں پوشیدہ ہے۔“

میرے جسم پر چیونٹیاں سی رہنے لگیں۔ مادام دھکے کے قتل کے بعد اس کوشی میں داخل ہونے والا سب سے پہلا شخص میں تھا۔ اور الماری میں جو دولت تھی وہ میں نکال لایا تھا۔ اور رخصی نے کوشی کے تہ خانے میں پوشیدہ کسی دولت کا انکشاف کیا تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رخصی مادام دھکے کو کیسے جانتی تھی؟ اور اسے کیسے تہ چلا کہ اس کوشی کے نیچے کوئی تہ خانہ بھی موجود ہے جہاں بہت سی دولت چھپائی گئی ہے۔ میں نے یہی سوال رخصی سے کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”ایک سال پہلے مجھے کسی نے بتایا تھا کہ مادام دھکے کو ایک ایسی خاتون کی ضرورت ہے جو لاہور میں اس کی رہائش کے دوران اس کی باڈی گارڈ اور سیکورٹی کے فرائض انجام دے سکے۔ مجھے مادام دھکے کے نام سفارشی چٹھی بھی دی گئی تھی۔ میں فوراً اس کی کوشی پر پہنچ گئی۔ مادام دھکے بہت بدکش شخصیت کی مالک تھی۔ اس نے مجھ سے چند ہر سری سوالات۔ کئے اور مجھے ملازم رکھ

”جاوید کے انکشاف کے بعد میرے اندر تمہیں ایسی کیا بات نظر آ گئی جس نے تمہیں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا؟“ میں نے کہا۔ ”میرے بارے میں جان کر تو تمہیں اور مجھ کو جانا چاہئے تھا۔“

”مجھے تم جیسے ایک آدمی کی تلاش تھی۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم جیسی حسین اور جوان عورت کو کسی مرد کی تلاش اس وقت ہوتی ہے جب وہ شادی کر چاہتی ہو۔ یا۔۔۔۔۔“

”میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”جب میں ملازم میں تھی تو بڑے بڑے پولیس آفیسر میرے پیچھے غرغروں غرغروں کرتے پھرتے تھے۔ ڈی ایس پی اور ایس پی جیسے آفیسر مراے ایس آئز کو چڑھائیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ میں اے ایس آئی تھی۔ مگر یہ آفیسر میرے آگے پیچھے دم ہلاتے پھرتے تھے۔ مجھے شہر کے بہترین ہوٹلوں میں ڈنر کرایا جاتا۔ پارٹیوں میں مدعو کیا جاتا۔ ہر آفیسر میرے قرب کا خواہش مند تھا۔ میں سب جانتی تھی کہ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں۔ میں نے تو ان سے بہت فائدے اٹھائے لیکن ان میں سے کوئی مجھے کبھی چھو نہیں سکا۔“

”تو پھر تمہیں رشوت کے الزام میں کیسے پکڑ لیا گیا؟“ میں نے پوچھا۔ ”تمام آفیسرز میرا مہربان تھے تو انہیں تمہاری فیور کرنی چاہئے تھی۔“

”بات دراصل یہ ہے۔“ رخصی نے کہا۔ ”ایک ڈی ایس پی مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھا۔ وہ ایک پارٹی میں شرکت کے بہانے مجھے شہر سے باہر ایک ڈاک بنگلے میں لے گیا۔ اس ڈاک بنگلے میں اس کے لئے ترنوالہ ثابت ہو گئی۔ لیکن وہ میرے ہاتھوں پٹ گیا۔ اس دن ڈاک بنگلے میں پی ڈیو ڈی کا ایک آفیسر بھی اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھا۔ میرے ہاتھوں نے اس کے بعد ڈی ایس پی مجھ سے بدلے لینے کے لئے موقع کی تلاش میں رہنے لگا اور بالآخر اس نے مجھے رشوت کے چکر میں پھنسایا اور اس طرح مجھے اپنی ملازمت سے بھی ہاتھ دھوئے پڑا۔ لیکن میں بھی آرام سے نہیں بیٹھی رہی۔ اس ڈی ایس پی کا خیال تھا کہ ملازمت ختم ہونے کے بعد میں بالکل بے بس ہو گئی ہوں اور اپنا دفاع بھی نہیں کر سکوں گی۔ ایک موقع پر اس نے میرے ساتھ زیادتی کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ میں نے مزاحمت کی تو ان کے ایک ساتھی نے گولی چلا دی جو اس کے دوسرے ساتھی کو لگی جو موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ اس طرح بات بہت بڑھ گئی۔ ڈی ایس پی اور اس کے دوستوں کے خلاف اغواء، جس بے جاہ رکھنا، اقدام قتل اور قتل کا مقدمہ درج ہو گیا۔ ڈی ایس پی کو ملازمت سے برطرف کر کے حراست

”کونھی کا یہ خانہ بھی محفوظ ہے اور دولت بھی۔“ رخشی نے جواب دیا۔ ”دشکے جیسی عورتیں اپنے سائے سے بھی محتاط رہتی ہیں۔ وہ سفارت کار تھی۔ رازداری ان کی فطرت میں شامل ہوتی ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اس کونھی کے یہ خانے میں اس دولت کی موجودگی کا علم ساراخانہ کے کسی اور آدمی کو بھی نہیں ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ دولت وہاں سے نکالی جا چکی ہوتی۔“

”میں تو تمہیں بہت سیدھی سادھی اور گھریلو قسم کی لڑکی سمجھتا تھا لیکن تم تو بہت خطرناک بات ہو رہی ہو۔“ میں نے کہا۔

”اگر مجھے تمہارے بارے میں معلوم نہ ہوا ہوتا تو تمہارے لئے سیدھی سادی اور گھریلو لڑکی ہی رہتی۔ اگر تم کلی میں دیکھ کر مجھے چھپڑنے کی کوشش کرتے تو تمہاری ٹھکانی کر دیتی۔“ اس نے بری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... یہ بات تو میں بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن بہر حال، جہار اپروگرام کیا ہے؟“

”پروگرام تو تمہیں بتانا پڑے گا۔“ اس نے کہا۔

”اخبار میں پڑھا تھا کہ دشکے گلبرگ میں رہتی تھی اور اس کے ساتھ اس کے محافظ کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ لیکن کیا تمہارے خیال میں اس کونھی کو لاوارث چھوڑ دیا گیا ہوگا؟ حکومت نے اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا ہوگا؟“

”دوسل پولیس والے چوبیس گھنٹے کونھی میں موجود رہتے ہیں۔“ رخشی نے بتایا۔ ”کونھی کے ماتھے والے اور دوسرے دروازے اگر چہ سر بہرہ کر دیئے گئے ہیں مگر ان پولیس والوں نے ماتھے میں ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ پولیس کانسٹیبل دن میں وہاں موجود رہتے ہیں اور رات کو ڈیوٹی دیتے ہیں۔ کوئی منصوبہ بنانے سے پہلے تمہیں باہر سے اس کونھی کا جائزہ لینا ہوگا۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے پتہ چل جائے کہ میں اس کونھی کو نہ صرف باہر سے بلکہ اندر سے بھی اچھی طرح دیکھ چکا ہوں اور وہاں سے بہت سی دولت بھی اڈا لایا ہوں تو اس کا رد عمل کیا ہوگا؟ اس لئے دشکے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے میں بہت محتاط تھا۔

”تمہیک ہے۔ میں اس کونھی کو دیکھ لوں گا۔ لیکن کیا تم اس منصوبے میں میرا ساتھ دو گی؟“ میں نے کہا۔ ”اور ہمارا آپس کا حساب کیا ہوگا؟“

”اس منصوبے میں تین افراد شامل ہوں گے اور تینوں کو برابر برابر حصہ ملے گا۔“ رخشی نے

لیا۔ ”مہینے میں صرف ایک ہفتہ ڈیوٹی دینی تھی جن دنوں وہ لاہور آیا کرتی تھی۔ دو مہینے فخریہ سے گزر گئے۔ میں اس دوران مادام دشکے کے معمولات سے واقف ہو چکی تھی۔ اس دوران میں سنہنی نیز انکشافات بھی ہوئے تھے۔ ایک انکشاف تو یہ تھا کہ کونھی کے یہ خانے میں دو لاکھ روپے کی اینٹیں بھری ہوئی تھیں۔ لاکھوں روپے کے کرنسی نوٹ بھی ایک الماری میں بھری ہوئے تھے۔ ان میں پاکستانی، بھارتی اور امریکی کرنسی نوٹ شامل تھے۔ دوسرا سنہنی نیز انکشاف یہ تھا کہ مادام دشکے یہاں اسرائیل کے خلاف کسی خفیہ مشن پر کام کر رہی تھی۔ اور اسے اپنی جان کا بھی خطرہ تھا۔“

”اسرائیل کے خلاف یہاں کیا مشن ہو سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اسرائیل اور لبنان میں طویل عرصہ سے شل جاری ہے۔“ رخشی نے کہا۔ ”اسرائیلی انڈیا جنس موساد کے ایجنٹ بھارتی را کے ساتھ مل کر پاکستان میں لبنان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔ دشکے اس منصوبے کا راز معلوم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن موساد کو اس کی خفیہ سرگرمیوں پتہ چل گیا اور اسے را کے ایجنٹوں کے ذریعے قتل کروادیا۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ مادام دشکے کو را کے ایجنٹوں نے قتل کیا تھا؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”مادام دشکے کے ساتھ کام کرتے ہوئے تیسرا مہینہ تھا کہ ایک روز اچانک ہی اس نے بے ملازمت سے برطرف کر دیا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ مجھے رشوت کے الزام میں پولیس کی ملازمت سے نکالا گیا تھا اور یہ کہ میں کسی کیس میں ملوث رہ چکی ہوں۔ اس کے تقریباً چھ ماہ بعد مادام دشکے کو قتل کر دیا گیا۔ جس شخص نے مجھے نوکری کے لئے مادام کے پاس بھیجا تھا اس نے بتایا تھا کہ مادام کے قتل میں را کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“

”وہ شخص کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کوئی بھی ہو، تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہئے۔“ رخشی نے کہا۔ ”میں جس منظم سے تم سے ملی ہوں وہ تمہیں بتا دیا ہے۔ اس سے آگے سوچنا تمہارا کام ہے۔ ویسے ایک بات تمہیں بتا دوں کہ اگر یہ دولت ہمارے ہاتھ لگ گئی تو ہماری آنے والی سلیس بھی عیش کریں گی۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہاری کوئی نسل بھی ہو گی؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ گھور کر رہ گئی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔“ اس واقعہ کوئی روز بیت چکے ہیں۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ بیروت کی تحقیقاتی ٹیم یہاں آئی تھی۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ کونھی کا خانہ ان کی نظروں سے محفوظ رہا ہوگا۔ اور وہ دولت اب بھی وہاں موجود ہو گی؟“

میں کچھ کہتا چاہتا تھا مگر دوسرے کمرے سے ٹوٹی کی آواز سن کر خاموش ہو گیا۔ رخصتی نے بھی نیچے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ٹوٹی جاگ گئی تھی اور رخصتی شاید اسے سنانے کے لئے اس کے ساتھ لیٹ گئی تھی۔ میں کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے میری کمر اکڑ گئی تھی۔

میں نے سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ میں رخصتی کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں اسے سیدھی سادی سی گھریلو لڑکی سمجھتا تھا جس پر عشق کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ لیکن وہ بہت مختلف نکلی تھی۔ بقول اس کے وہ پولیس کی ملازمت کر چکی تھی اور اسے رشوت کے جرم میں ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کی بے باکی اور انداز گفتگو ایسا ہی تھا جو ایک پولیس والی کا ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اور بھی بہت کچھ

تھی۔ کسی غیر ملکی سفارتکار کے بارے میں ایسی باتیں کوئی عام آدمی نہیں جان سکتا تھا۔ یہ درست ہے کہ اس نے مادام دھکے کے پاس کچھ عرصہ ملازمت کی تھی۔ مگر اتنی کم مدت میں کوئی ملازم اپنے آقا کے بارے میں اتنا کچھ نہیں جان سکتا اور نہ ہی نئے ملازموں پر اتنا بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ انہیں اس قسم کی راز کی باتیں بتادی جائیں۔ یہاں تو معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین تھا۔ رخصتی کے کہنے کے مطابق کوشی کے تہ خانے میں دو الماریوں میں سونے کی اینٹیں اور ایک الماری میں انٹرن، پاکستانی اور امریکی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ اور یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی کہ مادام دھکے نے ایک نئی ملازمہ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ یہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ رخصتی وہ نہیں تھی جو خود کو ظاہر کر رہی تھی۔ یہ کوئی لمبا چکر لگ رہا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ میری زندگی جرائم کی دلدل میں گزری تھی۔ لیکن جرائم اور جاسوسی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے، میں نے ایک انگریزی جاسوسی فلم دیکھی تھی۔ اس کا مرکزی کردار ایک ایسی ہی حسین لڑکی تھی جس پر شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ جاسوس ہو سکتی ہے۔

اور پھر مادام دھکے پر بھی اب مجھے شبہ ہونے لگا تھا۔ اس کے بارے میں اخبارات میں یہی لکھا گیا تھا کہ اسے لاہور پسند تھا اور وہ مہینے میں ایک ہفتہ لاہور میں گزارتی تھی۔ یہاں اس کی تمام مصروفیات سو فیصد نجی ہوتی تھیں۔ لیکن اسے اپنے پاس اتنی دولت رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں اس کوشی سے جو دولت لوٹ کے لایا تھا وہ بھی کسی طرح ایک کروڑ سے کم کی نہیں تھی۔ اور رخصتی کے کہنے کے مطابق تہ خانے کی تین الماریاں سونے کی اینٹوں اور کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے یہاں اتنی دولت کیوں رکھی تھی اور وہ کن پراسرار سرگرمیوں میں مصروف تھی؟

کہا۔

تیسرے کے نام پر میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”تیسرا کون ہے؟“ میں نے اسے گھورا۔

”مخدوم۔“ رخصتی نے جواب دیا۔ ”مادام دھکے نے اسی کی سفارش پر مجھے ملازم رکھا اور مجھے مادام کے پاس بھیجا بھی ایک خاص منصوبے کے تحت کیا تھا۔ لیکن مادام کو میرے بارے میں پتہ چل گیا کہ مجھے رشوت لینے کے جرم میں پولیس ملازمت سے نکالا گیا تھا اور میں ایک بار کیس میں بھی ملوث رہی ہوں اس لئے اس نے مجھے اپنی ملازمت سے فارغ کر دیا۔ اس طرح ہمارا منصوبہ بھی کھٹائی میں پڑ گیا۔ لیکن اب جو بھی منصوبہ بنے گا، مخدوم بھی اس میں شریک ہوگا اور برابر کا حصہ دار ہوگا۔“

”مخدوم کون ہے اور کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اسلام آباد میں۔ میں دو تین روز میں اسے یہاں بلالوں گی۔ اس دوران تم دھکے کی ٹوٹی اور اس کے گرد و نواح کا جائزہ لے لو تا کہ مخدوم کے ساتھ مل کر پروگرام بنائیں۔“ رخصتی نے کہا۔
”ایک بات اور۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے ذاتی طور پر تو نہیں جانتیں۔ کسی تیسرے آدمی یعنی جاوید سے میرے بارے میں معلوم ہوا ہے۔ یہ مادام پہلی ملاقات ہے۔ تم نے مجھ پر اس طرح اعتماد کیسے کر لیا؟“

”جاوید نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اصول پرست اور قابل اعتماد ہو۔ میں بھی کئی روز سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ جس طرح راز داران سے تم یہاں رہ رہے ہو اس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے میں نے پہلی ہی ملاقات میں ساری بات تمہیں بتادی۔ اگر تم انکار کرو گے تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ لیکن یہ سوچ لو کہ بات کروڑوں کی ہے۔“

”انسان دولت کے لئے ہی سب کچھ کرتا ہے۔ اور دولت حاصل کرنے کے لئے خطرات مول لینے ہی پڑتے ہیں۔ اگر تم جیسی حسین لڑکی بھی ساتھ ہو تو انکار کی گنجائش کہاں رہتی ہے؟ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس حسین لڑکی کو پانے کا خیال کبھی مجھو لے سے بھی دل میں مت لانا۔“ اس نے گھورنے ہوئے کہا۔ ”میں اس منصوبے کی تکمیل تک تمہارے ساتھ ہوں۔ اس کے بعد ہم پھر ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں گے۔ بلکہ ممکن ہے اس کے بعد میں تمہیں یہاں تو کیا اس شہر ہی سے بھی نظر نہ آؤں۔“

رخشی کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ اگرچہ اب بھی اس نے ایک ہاتھ سے میرے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں انگلیاں پھنسا رکھی تھیں۔ مگر وہ اس طرح بے حس و حرکت ہو گئی تھی جیسے کسی چلنے ہوئے کھلونے کی چابی ختم ہو گئی ہو۔ اس کے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں میری گردن میں جھونکا ہوا ایک لاکٹ تھا۔

اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر بے پناہ وحشت دیکھ کر میں بھی اپنی چوکنی بھول گیا۔ میری گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی۔

”کیا ہوا؟“ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ میرا لاکٹ اب بھی رخشی کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ رخشی کی یہ حالت لاکٹ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ”ایک دم کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ذرکیوں گئیں؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”یہ..... یہ لاکٹ.....“ وہ ہٹلائی۔ اس کے لہجے میں بھی خوف نمایاں تھا۔ ”یہ لاکٹ کہاں سے لیا تم نے؟“

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ابھی کچھ دیر پہلے دھمکے کی باتیں ہو رہی تھیں اور میں نے ایسا انداز اختیار کر رکھا تھا جیسے وہ مکمل طور پر میرے لئے اجنبی ہو اور اگر اس کے بارے میں کچھ جانتا بھی تھا تو وہ معلومات مجھے اخبار کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ اس دھمکے کا لاکٹ میرے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اور رخشی دو تین مہینے دھمکے کے پاس کام کر چکی تھی۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ لاکٹ میری قمیض کے اندر تھا اور رخشی کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔ پھر مجھے سرستی سوچھی اور دھینگا مشتی کے دوران یہ لاکٹ رخشی کی نظروں میں آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی وحشت بھر گئی تھی جیسے اس نے لاکٹ نہیں کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

”کہاں سے لیا تم نے یہ لاکٹ؟“ رخشی ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کہاں سے لیا کا کیا مطلب؟“ میں نے اسے گھورا۔ ”یہ چوری کا نہیں، بازار سے خریدا ہے میں نے۔“

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ رخشی واپس آ گئی۔
”ٹوٹی جاگ گئی تھی۔ میں اسے تھپک کر دوبارہ سلا آئی ہوں۔“ رخشی کہتے ہوئے بے تلم سے میرے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔

میں چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اسے اچانک ہی دونوں ہاتھوں پکڑ کر اپنے اوپر گرا لیا۔

”نہیں..... میں نے تمہیں اس لئے یہاں نہیں بلایا تھا۔“ رخشی کہتے ہوئے اپنے آہ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

مزاحمت کرتے ہوئے وہ پلنگ پر بائیں طرف لڑھک گئی۔ وہ پشت کے بل تھی۔ میں کے اوپر آ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ چھڑا لئے تھے اور میرے ہاتھوں کو گرفت میں لے کر کوشش کر رہی تھی۔ میں اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ میرے گلے میں پڑا ہوا لاکٹ قمیض سے کر نیچے لٹک گیا۔

میرا لاکٹ رخشی کے چہرے کے عین سامنے بھول رہا تھا۔ اس کی نظریں لاکٹ پر تھیں۔ اس کی مزاحمت کمزور پڑ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور لاکٹ کو اپنے ہاتھ میں باندھ دیکھنے لگی۔

میری نظریں رخشی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں وحشت سی پھیلتی چلی گئی.....!



کرنے لگے۔ اس وقت وہ عورت میری گرفت میں تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چڑھایا اور دونوں بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں بھی اس وقت واقعی کچھ بدحواس سا ہو رہا تھا۔ ان کے فرار کے بعد حواس بحال ہوئے تو یہ لاکٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ اس عورت سے شکم گتھا ہونے ہوئے اس کے گلے کا یہ لاکٹ میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑا کر اپنے ساتھی کے ساتھ بھاگ گئی تھی مگر یہ لاکٹ میرے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔ گلی میں مڑنے والی وہ کار میرے قریب آ کر رک گئی۔ میں نے لاکٹ جیب میں ڈال لیا۔ کار میں ایک ادھیڑ عمر عورت، ایک بچہ اور دوسرا مرد تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہ عورت اور مرد مجھے لوٹنا چاہتے تھے۔ مگر ان لوگوں کے بروقت آ جانے سے وہ لوگ بھاگ گئے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے مجھے اپنی کار میں مین روڈ پر چھوڑ دیا۔ یہ لاکٹ اس وقت سے میرے پاس ہے۔ اس کی زنجیر لوٹ گئی تھی جسے میں نے سارے بنوالیا۔ اس واقعہ کو یادگار سمجھ کر یہ لاکٹ اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے۔ مگر تم اسے دیکھ کر وحشت زدہ کیوں ہو گئی ہو؟“ میں خاموش ہو کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ میں نے اسے ایک فرضی کہانی سنا دی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ میری اس کہانی پر یقین نہیں کرے گی۔

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”سچ وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ یہ بتاؤ حقیقت کیا ہے؟ یہ لاکٹ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟“

”جو بچہ تھا میں نے بتا دیا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مگر تم اتنی وحشت زدہ کیوں ہو رہی ہو؟ تمہارا اس لاکٹ سے کیا تعلق ہے؟“

”یہ لاکٹ۔“ وہ بولی۔ ”مادام دھکے کا ہے۔“

”مادام دھکے؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ہاں۔ یہ لاکٹ میں اس کے گلے میں دیکھ چکی ہوں۔“ وہ ایک بار پھر لاکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اسے کھول نہ لے۔ اس طرح وہ کاغذ بھی اس کی نظروں میں آ جاتا جس پر پراسرار ہند سے لکھے ہوئے تھے۔ میں نے بڑی آہستگی سے اس کے ہاتھ سے لاکٹ لے لیا۔ اس نے کوئی مہارت نہیں کی۔

”میں نہیں جانتا کہ یہ لاکٹ مادام دھکے کا ہے یا اس کی مالک کا نام کچھ اور ہے۔ لیکن سچ وہی ہے جو تم کہہ رہی ہو۔“ میں نے اپنی بات پر بے غور رہا۔ میری کوتاہی کسی بڑے مسئلے کو جنم دے سکتی تھی۔

”کیا تم پر حملہ کرنے والی عورت یہی تھی؟“ رخصی نے اخبار اٹھا کر میرے سامنے کر دیا۔

رخصی کی آنکھوں میں وحشت بدستور تھی۔ اور پھر دفعۃً اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

”سوری روئی! مجھے تم سے ایسا سوال نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ اس نے دونوں بازو میرے گریز میں حائل کر دیئے۔

میں سمجھا کہ شاید برف پکھل رہی ہے اور اس کے اندر بھی کوئی چنگاری سلگنے لگی ہے۔ میں نے بھی اسے اپنی بانہوں کی پلیٹ میں لے لیا۔ لیکن بہت جلد میری یہ خوش فہمی دور ہو گئی۔ رخصی نے مجھے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ اور اب میری آنکھوں میں وحشت ابھر آئی تھی۔ میرا لاکٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلا تھا کہ اس نے کب میری گردن سے لاکٹ کی جھری کھول لی تھی۔

وہ لاکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی اور میں وحشت بھری نظروں سے اس کے چہرے کے نیچے جا رہا تھا۔

”یہ لاکٹ کہاں سے لیا ہے تم نے؟“ اس نے ایک بار پھر میرے چہرے پر نظریں دو دیں۔

”کہا تو ہے کہ بازار سے خریدا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں سچ جانتا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جی بات ہے کہ یہ لاکٹ ایک لڑائی کے دوران میرے ہاتھ لگا تھا۔“

”سنائے کہ پہلے زمانے میں جب جنگیں ہوا کرتی تھیں تو شکست کھا جانے والے جو مال اسباب چھوڑ کر بھاگ جایا کرتے تھے، وہ فاتحین کے ہاتھ لگتا تھا جسے مال غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ شاید تم نے بھی کوئی ایسی ہی جنگ لڑی تھی جس کے نتیجے میں یہ لاکٹ تمہارے ہاتھ لگا۔“

”میری دشمن فوج میں صرف دو سپاہی شامل تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ کئی روز پہلے کی بات ہے۔ انہوں نے اچانک ہی مجھے گھیر لیا تھا اور پستول کی زد پر مجھے تاریکی میں لے گئے تھے۔ اس وقت میری جیب میں پچیس تیز ہزار روپے تھے۔ میں سمجھا کہ وہ مجھے لوٹنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں نے انہیں موقع فراہم نہیں کیا اور پستول کی پرواہ کئے بغیر ان پر جھپٹ پڑا۔ میرے پیر کی ٹھوک سے مرد کے ہاتھ سے پستول گر گیا تھا۔ وہ دونوں مجھے لپٹ گئے۔ وہ لوگ مجھے بے بس کر کے اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتے تھے۔ اس دوران مجھے

کے موڑ سے ایک کار گھوی تو وہ دونوں بدحواس ہو گئے اور مجھ سے جان چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی۔

یہ تصویر والے لاکٹ میں بھی نمایاں طور پر نظر آرہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”مان لیتا ہوں کہ یہ لاکٹ مادام دھکے کا ہی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کسی طرح اس عورت کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے بعد اس عورت نے مادام دھکے کے پاس ملازمت کی ہو اور یہ لاکٹ یا کچھ اور چیزیں بھی چوری کر کے بھاگ گئی ہو۔“

”نہیں۔“ رُخشی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرے بعد مادام دھکے نے کسی عورت کو ملازم نہیں رکھا تھا۔ اور یہ لاکٹ بھی قتل سے دو روز پہلے تک اس کے گلے میں دیکھا گیا تھا۔“

”کس نے دیکھا تھا؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے۔“ رُخشی نے جواب دیا۔ ”میں اس روز ٹوٹی کے ساتھ ایمریس روڈ پر اپنے کسی عزیز کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ واپسی پر ریگل چوک تک ہم بیدل آئے تھے۔ ریگل سینا کے ساتھ ہی کتابوں کی ایک بہت بڑی دکان ہے۔ میں نے مادام دھکے کو اس دکان سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے کچھ کتابیں اٹھا رکھی تھیں۔ یہ لاکٹ میں نے اس وقت بھی اس کے گلے میں دیکھا تھا۔“

”تو تمہیں شبہ ہے کہ یہ لاکٹ میں نے اس کے گلے سے اتارا ہو گا؟“ میں نے کہتے ہوئے لاکٹ اٹھا کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔

”میں یہ نہیں کہہ رہی۔“ رُخشی نے جواب دیا۔ ”اس کے دو دن بعد مادام دھکے کو قتل کر دیا گیا تھا۔ پولیس نے اسے ذہنی کی واردات قرار دیا تھا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق کٹھی کے ایک ایک کمرے کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ اب تمہارے پاس یہ لاکٹ دیکھ کر مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ واردات کرنے والوں میں کوئی عورت بھی شامل تھی جس نے مادام دھکے کے گلے سے یہ لاکٹ اتار لیا اور بعد میں کسی وقت وہ عورت تم سے ٹکرائی۔ اس طرح یہ لاکٹ تمہارے ہاتھ لگ گیا۔“

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہوا ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن بہر حال تم نے جو منصوبہ بنایا ہے وہ بہت خطرناک ہے۔ کٹھی کے دروازے سر بہر ہیں اور پولیس کا پہرہ ہے۔ اور میں.....“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”میں چور یا ڈاکو نہیں ہوں۔ میری لائن مختلف ہے۔“

”تم ایک نڈر اور حوصلہ مند آدمی ہو۔“ رُخشی نے کہا۔ ”یہ کام کوئی اکیلا آدمی نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے باقاعدہ پلاننگ کی ضرورت ہوگی اور ایک سے زیادہ ساتھیوں کی بھی۔ میں کل ہی کسی طرح اسلام آباد میں مخدوم کو پیغام بھجوادی تھی۔ وہ آجائے تو ہم کوئی پلان بناتے ہیں۔ اس دوران تم وہ کام کرو جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔“

”یہی مادام دھکے ہے۔ کیا اس عورت نے اس آدمی کے ساتھ مل کر لوٹنے کے لئے تم پر ہتھیار کیا؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”اس تصویر سے پتہ چلتا ہے کہ مادام دھکے اور عورت تھی۔ جبکہ وہ عورت جوان تھی۔ نہیں..... یہ وہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ ایک اور بات مجھ سوچنے کی ہے۔ مادام دھکے سفارت کار تھی۔ تمہارے کہنے کے مطابق اس کی کٹھی میں دروازے کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اسے معمولی ریزروں کی طرح لوٹ مار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لاکٹ کسی اور عورت کے پاس کیسے آیا؟“ رُخشی بولی۔

”ضروری نہیں کہ یہ وہی لاکٹ ہو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے اس سے ملتا جلتا کوئی اور لاکٹ ہو۔ لیکن تمہیں اتنی پریشانی کیوں ہے؟“

”پریشانی اس لئے ہے کہ اگر یہ لاکٹ مادام دھکے ہی کا ہے تو یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ دوسری عورت کے پاس کیسے پہنچا۔“ رُخشی بولی۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ میں نے جھپٹی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بہت فرق پڑتا ہے۔“ رُخشی نے جواب دیا۔ ”مادام دھکے کے قاتلوں کا سراغ نہیں ملے گا۔ لیکن اس لاکٹ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے قاتلوں میں کوئی عورت بھی شامل تھی جس نے مادام دھکے کو موت کے گھاٹ اتار کر اس کے گلے سے لاکٹ اتار لیا۔“

”لیکن اخبارات میں تو کسی لاکٹ کا ذکر نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔

”یہ لاکٹ مادام دھکے ہی کا ہے۔ میں پورے دعوے سے کہہ سکتی ہوں۔ ایک منٹ۔“ رُخشی نے اٹھ کر الماری کھولی۔ اس کے خانوں میں کچھ تلاش کرتی رہی۔ پھر ایک اہم میں سے ایک تصویر نکال کر میرے سامنے کر دی۔ ”یہ دیکھو..... مادام دھکے کی تصویر ہے۔ اس کے گلے لاکٹ بھی ہے۔ ذرا غور سے دیکھو۔ تمہیں دونوں لاکٹوں میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔“

میں نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی اور چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ پوسٹ کارڈ ساز کی رنگین تصویر بالکل ویسی ہی تھی جو میں نے مادام دھکے کے بنگلے میں فریم میں دیکھی تھی۔ صرف سائز کا فرق تھا۔ فریم میں لگی ہوئی وہ تصویر بڑی تھی اور یہ پوسٹ کارڈ سائز کی تھی۔

مادام دھکے نے اس تصویر میں وہی لاکٹ پہن رکھا تھا۔ میں نے اپنے والا لاکٹ بھی ان کے ساتھ رکھ دیا۔ مجھے تو اس لاکٹ کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ بے چینی تو رُخشی تھی۔ اس نے لاکٹ میرے ہاتھ سے لے کر تصویر کے اوپر رکھا اور بولی۔

”دیکھو..... غور سے دیکھو۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لاکٹ پر جو ڈیزائن بنایا

تھا جو کبھی ہیر و من بچا کرتا تھا۔ مگر اس کی بیوی اسے راہ راست پر لے آئی تھی۔

جاوید ہیر و من بچنے والوں کے گینگ میں رہ چکا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو کسی اور کو بھی میرے بارے میں بتا سکتا تھا مگر وہ چونکہ اس کا رو بار سے ہی الگ ہو چکا تھا۔ ہر ایک سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اس لئے شاید اس نے کسی اور سے رابطہ قائم کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ تاہم اس نے رخصتی کو میرے بارے میں بتا دیا تھا اور رخصتی دوسروں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئی تھی۔

رخصتی کی عرا اگرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن پولیس کی تین سالہ ملازمت نے اسے چنٹ بنا دیا تھا۔ میں اسے بہت معصوم اور بھولی بھالی سمجھتا تھا لیکن اس پہلی ہی ملاقات میں وہ جس طرح میرے سامنے کھلی تھی اس سے میں واقعی پریشان ہو گیا تھا اور مجھے اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اگر میں نے اسے قابو میں نہ کیا تو وہ میرے لئے ملک شہاب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

رخصتی کی بے خوفی یا حوصلے کی بھی داد دینی پڑتی تھی کہ اس نے اس طرح آدمی رات کو مجھے اپنے گھر لایا تھا۔ مادام دھکے کی تصویر میں نے ایک طرف رکھ دی اور رخصتی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میرا خیال ہے اب تمہیں چلے جانا چاہئے۔“ رخصتی نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔
”چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک کپ چائے اور پلاؤ۔ چلا جاؤں گا۔“

وہ چند لمحوں میں مجھے گھورتی رہی۔ پھر اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کی واپسی تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔ وہ صرف ایک ہی کپ بنا کر لائی تھی۔ اس نے کپ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا اور ٹونی والے کمرے میں چلی گئی۔ میں اکیلا بیٹھا چائے کی چکیاں لینے لگا۔

چائے ختم کر کے میں نے خالی کپ ڈریسنگ پر رکھ دیا۔ چند منٹ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دیوار گیر گھڑی پونے چار کا وقت بتا رہی تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ مجھے اب چلے جانا چاہئے تھا۔ رخصتی ٹونی کے کمرے میں تھی اور میں اسے بلانے کے لئے اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔

میں دروازے سے نکل کر بائیں طرف مڑ رہا تھا کہ دوسری طرف سے آتی ہوئی رخصتی سے ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے جکی سی چیخ نکل گئی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں غیر ارادی طور پر اس سے لپٹ گیا تھا۔ ایک لمحہ کو تو رخصتی خود بھی کچھ نہیں سمجھ سکی۔ پھر اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا اور اپنے آپ کو چمڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن میں اسے آسانی سے

”یعنی؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مادام دھکے کی کوشی کا جائزہ لے لو۔“ رخصتی نے کہا۔

میں نے جواب دینے کی بجائے مادام دھکے کی تصویر اٹھالی۔ یہ اس کی جوانی کی تصویر تھی بلاشبہ اسے قیامت کہا جاسکتا تھا۔

”تم نے یہ تصویر کہاں سے لی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”تم شاید بھول گئے ہو کہ میں مادام دھکے کے پاس کام کر چکی ہوں۔“ رخصتی نے مجھے گھورا۔ ”انہی دنوں ہی تصویر مجھے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی مل گئی تھی جسے میں نے غیر ارادی طور پر اٹھ کر اپنے پرس میں ڈال لیا تھا۔ اور آج یہ تصویر اس طرح کام آگئی کہ اس سے تمہارے اس لاکٹ کی تصدیق ہو گئی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ ”کیا تم اس عورت کو دوبارہ کب دیکھو تو پہچان لو گے؟“

میں چونک گیا۔ میں نے ایک فرضی کہانی سنائی تھی اور رخصتی نے اسے تسلیم کر لیا تھا اور اس نے یہ بات بھی مان لی تھی کہ مادام دھکے کی کوشی پر واردات کرنے والوں میں کوئی عورت بھی شامل تھی۔ یہ نتیجہ اس نے میری سنائی ہوئی فرضی کہانی سے اخذ کیا تھا۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ اس واردات میں ایک عورت شامل تھی۔ میں نے اس رات ایک مرد اور ایک عورت کو مادام دھکے کی کوشی سے ٹکلتے ہوئے دیکھا تھا اور میں تو یہ بات پورے دثوق سے کہہ سکتا تھا کہ قتل انہی دونوں نے کیا تھا۔ وہ کار جب مادام دھکے کی کوشی سے باہر نکلی تھی تو میں نے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھی ہوئی اس عورت کو دیکھ لیا تھا۔ مرد چونکہ دوسری طرف تھا اس لئے اس کا چہرہ میری نظروں میں نہیں آ سکا تھا۔ وہ کار اگرچہ تیزی سے میرے سامنے سے گزر گئی تھی مگر اس عورت کا چہرہ میرے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ وہ خاصی حسین عورت تھی۔

یہ اتفاق تھا کہ اس کے بعد میں مسلسل ملک شہاب کے کیس میں الجھا رہا تھا۔ اس کے بندے شکاری کتوں کی طرح مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے اور میں اس پناہ گاہ میں دبکا رہا تھا۔ اگر کہیں باہر نکلا ہوتا تو شاید کہیں اس عورت سے آسانا ملنا ہو جاتا۔

ویسے حقیقت یہ ہے کہ اپنے مسائل میں الجھ کر میں نے ان کا خیال ہی ذہن سے نکال دیا تھا اور مادام دھکے کو کبھی بھلا بیٹھا تھا۔ لیکن کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ انسان وقت کو بھول جاتا ہے۔ وقت کسی کو نہیں بھولتا۔

اس جگہ میں پناہ گزین ہو کر میں سمجھتا تھا کہ دشمنوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہوں۔ میں شہ نہیں کہ دشمن مجھے تلاش نہیں کر سکے تھے۔ مگر میں جاوید نامی اس شخص کی نظروں میں

میں نے اس کے ہاتھ سے ریوالتور لے لیا۔ کھول کر دیکھا۔ اس کے تمام جیمبرز بھرے
ہوئے تھے۔

”ہنازک ہاتھوں میں اتنا بھاری کھلوٹا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں تو
کوئی لیڈی آئیڈیل قسم کا پستول رکھنا چاہئے۔“

”پولیس میں رہ کر میں اس کے استعمال کی عادی ہو چکی ہوں۔“ رخی نے جواب دیا۔ ”یہ تو
بہت ہلکا ہے۔ ضرورت پڑنے پر میں ایس ایم جی بھی چلا سکتی ہوں۔“

”مٹھ۔“ میں نے تو صغنی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ریوالتور واپس کر دیا۔ جسے
اس نے دوبارہ ڈریسنگ کی درواز میں رکھ دیا۔

”تم نے ابھی تک اپنے فیصلے سے آگاہ نہیں کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”کیا فیصلہ؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مادام دھکے کے بارے میں۔“ وہ بولی۔

”تمہارے کہنے کے مطابق اس تہہ خانے کے بارے میں کسی اور کو علم نہیں ہے۔ اس میں
جودولت بھری ہوئی ہے وہ تو محفوظ ہے۔ میں ایک دوروز میں تم سے بات کروں گا۔“ میں نے
کہا۔ ”میں دراصل کچھ اور معاملات میں بھی الجھا ہوا ہوں۔ ذرا ان سے منٹ لوں تو پروگرام
بائیں گے۔“

”میں تمہارے دوسرے معاملات سے بھی واقف ہوں۔ اخباروں میں چھپتا رہتا ہے
تمہارے بارے میں۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایس بی بہت ایماندار آفیسر
ہے۔ اس نے ملک شہاب کو سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا ہے۔ اب وہ آسانی سے نہیں چھوٹ سکے
گا۔“

”تم یہ بھی جانتی ہو کہ ملک شہاب کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ
سلاخوں کے پیچھے رہتے ہوئے بھی آرام سے نہیں بیٹھا ہوگا۔ بہر حال، تمہیں میرا فیصلہ جاننے
کے لئے ایک دودن انتظار کرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، میں انتظار کر لوں گی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم کوئی مثبت فیصلہ ہی کرو گے۔“
رخی باہر والے دروازے تک میرے ساتھ آئی تھی۔ میرا آمدے کی جی بھی ہوئی تھی اس لئے
میں اس میں اندر ہی تھا۔ اس نے بڑی آہستگی سے باہر والا دروازہ کھول کر پہلے خود باہر دونوں
طرف جھانکا اور پھر مجھے اشارہ کر دیا۔ میں دروازے سے باہر آ گیا۔

اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔ گلی میں سناٹا تھا۔ دور کہیں کسی اور گلی میں چوکیدار کی

چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

”نہیں روئی! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ اس نے ہلکی آواز میں کہا۔ ”میں نے تمہیں اپنے بارے
میں بہت کچھ بتا دیا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ایک جرم کی منصوبہ بندی کر رہی ہوں۔ اس دوران
بہت سے ایسے مرحلے آئیں گے جب ہمیں اس طرح اکیلے میں ملنے کا موقع ملے گا۔ لیکن اس کا
مطلب یہ نہیں کہ میں کوئی بد چلن لڑکی ہوں۔ اور مناسب یہی ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے
دوستوں کی طرح ملا کریں۔ اچھے دوستوں کی طرح۔“

میری گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ گئی۔ رخی نے اپنے آپ کو مجھ سے الگ کر لیا اور میرا ہاتھ پکڑ
کر دوبارہ کمرے میں لے آئی اور دیر تک اس موضوع پر بات کرتی رہی۔

اس لحاظ سے رخی ان دوسری لڑکیوں سے قدرے مختلف ثابت ہوئی تھی جو میرے پاس آئی
رہی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو پلیٹ میں سجا کر میرے سامنے پیش نہیں کیا۔ اس لئے میرے
جذبات پر بھی اس بڑ گئی تھی۔

رخی یا تو واقعی مضبوط کردار کی مالک تھی یا پہلی ملاقات کی وجہ سے وہ میرے سامنے بن رہی
تھی۔ بہر حال، میں نے بھی اس سلسلے میں اس پر دباؤ نہیں ڈالا تھا۔

ہم ایک بار پھر مادام دھکے کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اس گفتگو کے دوران ملک
شہاب کا بھی ذکر آیا تھا۔ رخی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ میرے اور ملک شہاب کے پھٹے
کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی تھی۔ مگر اس نے جان بوجھ کر تفصیل میں جانے کی ضرورت
نہیں سمجھی تھی۔

ساڑھے چار بجے کے قریب میں کرسی سے اٹھ گیا۔ رخی بھی اٹھ گئی۔ ”تمہیں اکیلے میں ڈر
نہیں لگے گا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ علاقہ ابھی اتنا آباد نہیں ہے۔
یہاں چوریوں کی وارداتیں بھی ہوتی رہتی ہیں اور.....“

”میں بزدل نہیں ہوں۔“ وہ مسکرائی۔ ”ڈر پوک ہوتی تو نہ تو تمہارے گھر جاتی اور نہ ہی
جیسے آدمی کو یہاں لے کر آتی۔ ویسے چوروں سے بچنے کا میں نے بندوبست کر رکھا ہے۔“ اس
نے ڈریسنگ ٹیبل کی اوپر والی درواز کھولی۔ اس میں اعشاریہ تین آٹھ کار ریوالتور رکھا ہوا تھا۔ اس
نے ریوالتور اٹھا لیا۔ ”پولیس سروس کے دوران یہ ریوالتور میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ ساہیوال کے
ایک تھانے میں اس کی غم شدگی کی رپورٹ درج ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن مجھے اس
کی ضرورت پڑے گی اس لئے اسے سنبھال کر رکھا تھا اور وقتاً فوقتاً اس کی صفائی بھی کرتی رہی
ہوں۔ اور اب میرا خیال ہے اس کے استعمال کا وقت آ گیا ہے۔“

نفس واقف ہو سکتا ہے جو بہت قریب رہا ہو اور رخصی نے صرف دو ڈھائی مہینے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دو ڈھائی ہفتے دھکے کے پاس کام کیا تھا اور اس مختصر سے وقت میں وہ اس کے اتنا قریب نہیں آ سکتی تھی کہ اتنے اہم راز سے واقف ہو سکے۔ معاملہ یقیناً کچھ اور تھا اور پھر مخدوم بانی وہ شخص بھی میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ مخدوم اسلام آباد میں تھا اور رخصی اس کے ساتھ مل کر مادام دھکے کی کوٹھی کا تہہ خانہ لوٹنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔

دفعۃ میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ ایسا تو نہیں کہ مخدوم نامی وہ شخص لبنان کے سفارت خانے میں ملازم ہو اور وہ مادام دھکے کے راز سے واقف ہو گیا ہو۔ یقیناً یہی بات ہو گی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ مخدوم اور رخصی میں دوستی کیسے ہوئی تھی۔

میں یہی سب سوچتا رہا۔ پھر رخصی کا سراپا میری نگاہوں میں گھومنے لگا۔ وہ بے حد حسین تھی اور مجھے افسوس ہوتا تھا کہ ایسی حسین لڑکیاں اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہو کر بالاخر اپنی زندگی برباد کر لیتی ہیں۔

دوسری طرف میں اس کے بہنوئی عزیز کے بارے میں سوچتا تو مجھے مزید حیرت ہوتی۔ میں نے اسے جاتے ہوئے دو چار مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ اپنے حلیہ سے وہ شریف آدمی لگتا تھا۔ اس نے عزیز کے بارے میں جو انکشافات کئے تھے وہ بھی میرے لئے خاصے دلچسپ ثابت ہوئے تھے۔ رخصی کے کہنے کے مطابق وہ اس سے ڈرتا تھا۔ اس کی ایک معقول وجہ تھی۔ وہ غریب آدمی تھا۔ سرکاری حکم میں معمولی سا کلرک تھا۔ یہ کوٹھی رخصی کی ملکیت تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر وہ کسی قسم کی اکڑفوں دکھاتا تو رخصی اسے اٹھا کر باہر پھینک دیتی۔ وہ رخصی کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لئے دب کر رہا تھا۔ میں یہی سب کچھ سوچتا رہا اور بالآخر نیند مجھ پر غلبہ پانے لگی۔

میری آنکھ کھلی تو دو بج رہے تھے۔ جاگ جانے کے بعد بھی میں دیر تک بستر پر پڑا رہا۔ اور پھر اٹھ کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں کچن میں آ گیا۔ چائے بنا کر برآمدے میں آ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری نظر گیٹ کے قریب پڑے ہوئے اخبار پر پڑ گئی۔ میں اٹھا لایا۔ کرسی پر بیٹھ کر چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے میں نے اخبار سیدھا کر لیا۔ ہیڈ لائن کی دزیر کے حوالے سے تھی۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے سیاسی خبریں بھی نہیں پڑھتا تھا۔ اور پھر ایک تین کالمی سرخی پر نظر پڑتے ہی میں اچھل پڑا۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ چھٹک گیا۔ کچھ چائے اخبار پر اور میری قمیض پر گر گئی۔ میں نے کپ کرسی کے قریب فرش پر رکھ دیا اور اخبار سیدھا کر کے وہ خبر پڑھنے لگا۔ میرے بدترین خدشات درست نکلے تھے۔

سیٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی کوٹھی کی طرف آ گیا۔ گیٹ سامنے پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا رخصی اب بھی دور اڑے میں کھڑی تھی۔ اس کا بیولا اٹھا دے رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلا دیا۔ وہ اندر چلی گئی۔

میں اپنے گیٹ کو باہر سے کنڈالگا کر گیا تھا۔ آہستہ سے کنڈا کھولا اور اندر داخل ہو کر میرے بند کر دیا اور برآمدے میں آ کر ستون کی آڑ میں کھڑا رہا۔

تقریباً دس منٹ بعد میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور پھر برآمدے سے نکل کر وائزنگ کے ڈھکنے کے قریب آ گیا۔ جھک کر بڑی آہستگی سے ڈھکنے اٹھا کر ایک طرف رکھا اور پانی لٹکا ہوا تھیلہ باہر نکال کر اسے ٹپ سے الگ کر لیا اور ڈھکنے دوبارہ ٹینک پر رکھ دیا۔ چند منٹ بعد میں تھیلے کا پانی خیزنے کا انتظار کرتا رہا پھر تھیلہ اٹھا کر اندر آ گیا۔ اندر داخل ہو کر میں نے دروازے بند کر کے لاک کر دیا اور اپنے کمرے میں آ کر تھیلہ فرش پر رکھ دیا۔ اس پر چڑھے ہوئے پلانک کور سے اب بھی پانی خیز رہا تھا۔

کئی منٹ بعد میں نے تھیلہ کھول کر بڑے نوٹوں کے چند بنڈل نکال لئے اور تھیلہ اسی طرف پیک کر کے دوبارہ پانی کے ٹینک میں لٹکا دیا۔ اس سے محفوظ کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔

دوبارہ کمرے میں آ کر میں نے نوٹوں کے وہ بنڈل الماری میں رکھ دیئے اور بستر پر لیٹ گیا۔ اس وقت اگرچہ صبح ہونے والی تھی۔ میری آنکھوں میں مریچیں بھری ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔

ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

رخصی کے کہنے کے مطابق اس نے دو ڈھائی مہینے مادام دھکے کے پاس ملازمت کی تھی اور اس دوران اسے تہہ خانے اور اس میں بھری ہوئی دولت کا راز معلوم ہوا تھا۔ لیکن یہ بات میرے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ کوئی بھی شخص کسی نئے ملازم پر اس طرح بھروسہ نہیں کر سکتا کہ اسے اپنے اہم راز بتا دے اور پھر دھتکہ تو سفارت کار تھی۔ رازداری ان کی سفارتی زندگی کا خاصا ہوتا ہے۔ اگر محض اتفاق کی بات ہوتی تو رخصی کو سب سے پہلے الماری میں بھری ہوئی دولت کا پتہ ہونا چاہئے تھا لیکن اس کا اس نے ذکر تک نہیں کیا تھا۔

رخصی کے پاس مادام دھکے کی تصویر کی موجودگی بھی اس کے بارے میں شبہات کو جنم دے رہی تھی اور جس طرح اس نے میرے گلے میں لاکٹ کو پہچان لیا تھا۔ وہ بھی حیرت انگیز بات تھی اور پھر اس نے مادام دھکے کی وہ تصویر نکال لی تھی جس کے گلے میں لاکٹ پڑا ہوا تھا۔ تاکہ موازنہ کر کے اس کی تصدیق کی جاسکے۔ کسی چیز کے بارے میں ایسی باریکیوں سے صرف و

جاتا تھا۔ میری جیب گرم ہوتی تھی تو میں بھاؤ تاؤ بھی نہیں کرتا تھا۔ منزل پر پہنچ کر ڈرائیور نے جواگادے دیا۔ اس وقت بھی میں کوئی بات کئے بغیر رکشے میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو سمن آباد موڑ چلے کوکہ دیا۔

”میں روپے ہوں گے باؤ جی۔“ ڈرائیور نے مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”چل یار۔ بیس ہی لے لیتا۔“ میں نے جواب دیا۔ حالانکہ میٹر کے حساب سے دس گیارہ روپے سے زیادہ نہیں بنتے تھے۔

سمن آباد موڑ پر خاصی رونق تھی۔ ٹریفک کا اڑدھام تھا۔ میرا رکشہ بھی ٹریفک جام میں پھنس گیا اور میں رکشے سے اتر کر پیدل چلتا ہوا اس سڑک پر آ گیا جو گلشن راوی کی طرف چلی گئی تھی۔ اخبار میں شائع ہونے والے دونوں پتوں میں گلشن راوی کی مین مارکیٹ کا حوالہ دیا گیا تھا اور وہ مین مارکیٹ وہاں سے کافی دور تھی۔ میں موڑ پر کھڑے ہوئے ایک اور رکشے میں بیٹھ گیا۔ مین مارکیٹ کے سامنے میں نے رکشہ چھوڑ دیا۔ اخبار میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ایک دکاندار سے پہلا پتہ دریافت کیا۔ اتفاق سے وہ مکان مارکیٹ کے پچھلی طرف گلی میں واقع تھا۔ ان اشتہاروں کو چھپے ہوئے دو دن گزر چکے تھے۔ ممکن ہے وہ گاڑیاں اب تک بک چکی ہوں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس قسم کے سودے اتنی جلدی نہیں ہوتے اور یہی امید لے کر میں اپنی تلاش میں نکلا تھا۔

وہ مکان تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ دراصل بیس مرلے پر ایک خوبصورت کٹھی تھی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور اندر دو کاریں آگے پیچھے کھڑی نظر آرہی تھیں۔ میں نے گیٹ کے پہلو پر لگے ہوئے کال نیل کا بٹن دبانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک نوجوان لڑکا برآمد سے سے نکل کر میرے قریب آ گیا۔

”کیا بات ہے انکل۔ کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ اس نے پوچھا۔

”چوہدری اشرف سے۔“ میں نے اسے اخبار دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اتوار کے اخبار میں کار کی فروخت کا اشتہار چھپا تھا۔ وہ گاڑی بک گئی یا.....“

”میں ابو کو بلا کر لاتا ہوں۔“ وہ لڑکا برآمد سے کی طرف دوڑ گیا۔

چوتھ منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی باہر نکلا۔ وہ واقعی چوہدری تھا۔ شاندار ریشمی لاجپا، سلک کا کرتہ اس کے بھاری بھر کم جسم پر خوب بچ رہا تھا۔ اس کے چلنے کی شان بھی نرالی تھی۔

ملک سلیک کے بعد ہم فوراً ہی اصل موضوع پر آ گئے۔ پانچ سال پہلے کے ماڈل کی ٹویوتا کو لا سفید رنگ کی وہ گاڑی سامنے ہی کھڑی تھی۔

ملک شہاب کو رہا کر دیا گیا تھا اور ایس پی سعید کا تبادلہ جھنگ کر دیا گیا تھا۔ ٹرک من بیرین اسٹیل کرنے کے الزام میں البتہ دو آدمیوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور سمنی خیز خبر یہ تھی کہ ملک شہاب نے اپنے آدمیوں کے قتل کی باقاعدہ رپورٹ دی تھی اور شبہ ظاہر کیا تھا کہ ان دونوں آدمیوں کے قتل میں میرا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

یہ خبریں پڑھنے کے بعد میں دانت کچکا کر رہ گیا۔ ملک شہاب نہ صرف خود سلاخوں سے آگیا تھا بلکہ اس نے اپنے راستے کے کانٹے ہٹانے کی کوشش بھی شروع کر دی تھی۔ ایس پی سعید کا تبادلہ ہو گیا تھا اور میرے خلاف رپورٹ درج کروادی گئی تھی۔ میں تو پہلے ہی روپوشی دن گزار رہا تھا۔ اب مجھے مزید محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف رخصتی ایک عجیب اثر میں میرے سامنے آئی تھی۔ وہ مخدوم کے ساتھ مل کر کوئی لمبا منصوبہ بنا رہی تھی اور جاوید میرے بارے میں جاننے کے بعد اس نے مجھے بھی اپنے منصوبے میں شامل کر لیا تھا یا اس کوشش شروع کر دی تھی۔

میں ایک عجیب کنکشن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ رات کو میں نے کار خریدنے کے لئے قلعہ ب سے رقم نکالی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کار خریدنے کا پروگرام کسی اور وقت کے لئے رکھوں لیکن کار میرے لئے بہت ضروری تھی جبکہ کسی شوروم سے کار خریدنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ اخبار میں بھی تو گاڑیوں کی خرید و فروخت کے اشتہار چھپتے رہتے ہیں۔ میں نے کلاسیفائیڈ اشتہارات والا صفحہ نکالا مگر آج کے اخبار میں ایسا کوئی اشتہار نہیں تھا۔

میں اٹھ کر اندر آ گیا۔ پہلے ناشتہ تیار کر کے پیٹ کی آگ بجھائی اور پھر دو دن پہلے (اتوار) کا اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ اس میں ایک پورا صفحہ گاڑیوں کی خرید و فروخت کے اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے تین چار اشتہارات پر نشان لگادیے اور اخبار کا وہ صفحہ الگ کر لیا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے سے تھوڑی دیر پہلے میں تیار ہو کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس وقت ڈنک اپنے مکان کے گیٹ پر کھڑی سامنے والے دروازے میں کھڑی ہوئی عورت سے باتیں کر رہی تھی۔ میں شریف آدمیوں کی طرح سر جھکائے قریب سے گزر گیا۔

میں نے اخبار میں جو نشان لگائے تھے ان میں دو گلشن راوی کے تھے اور ایک بندر روڈ کا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں گلشن راوی سے ہوتا ہوا بندر روڈ کی طرف نکلوں گا۔

سڑک پر آ کر کچھ دور چلنے کے بعد ہی مجھے ایک رکشہ مل گیا۔ لاہور میں بھی اکثر رکشہ انٹیکسیوں پر میٹر کا رواج نہیں تھا۔ میٹر تو لگے ہوتے تھے لیکن محض دکھاوے کے لئے۔ رکشہ انٹیکسیوں کے ڈرائیور کراہ اپنی مرضی سے وصول کرتے تھے۔ بیٹھنے سے پہلے ہی بھاؤ تاؤ کر لیا

”ہم ڈرائنگ روم میں آگئے بہت شاندار ڈرائنگ روم تھا۔ چوہدری اشرف نے اندر داخل ہونے سے پہلے چائے کے لئے بھی کہہ دیا تھا۔

چائے کے دوران باتیں بھی ہوتی رہیں۔ میں نے اپنے بارے میں چوہدری کو بتایا کہ برس سے وابستہ ہوں۔ جب کہ چوہدری اشرف کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ زمیندار ہے۔ لاہور سے شرق پور کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے اس کے دومربعہ اراضی ہے۔ اراضی پر بھی اس نے ایک کوٹھی بنا رکھی ہے اور یہ کوٹھی بھی اس کی اپنی ہے۔ اس کا بڑا بیٹا اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ گیا ہوا ہے۔ ایک بیٹی پنجاب یونیورسٹی میں ہے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی کوئٹہ اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ چوہدری اشرف خود بھی پنجاب یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے وہ خود زیادہ تر زمینوں پر ہی رہتا ہے۔ بچے کبھی اس کوٹھی میں رہتے ہیں اور کبھی گاؤں چلے جاتے ہیں۔

چوہدری اشرف نے گاڑی کے کاغذات میرے سامنے رکھ دیئے۔ یہ کار اس نے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے خریدی تھی۔ کوٹھی میں کھڑی ہوئی دوسری کار مرسڈیز تھی۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ دولت کی ریل چل تھی۔ اس کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ کوئی بھی گاڑی ان کے پاس مال دو سال سے زیادہ نہیں رہتی تھی۔

میں نے دولاکھ کی رقم اس کے سامنے رکھ دی۔

”ایک کچی رسید لکھنے میں آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟“ میں نے کہا۔

”اعتراض کیسا؟ رسید تو آپ کا حق ہے۔“ چوہدری اشرف نے کہا اور قلم منگوا کر رسید لکھنے لگا۔ میں نے اسے اپنا نام عبدالرؤف ہی بتایا تھا اور رسید بھی اسی نام سے لکھی گئی تھی۔

”کاروباری ہنگاموں سے فرصت ملے تو ایک دو روز کے لئے میرے گاؤں آجائیں۔“ اس نے رسید میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ بہت آسانی سے پہنچ جائیں گے۔ اسلامیہ کالج کے ساتھ گیلانی روڈ پر مڑ جائیے اور راوی کا پل پار کر کے شرق پور روڈ پر مڑ جائیں۔ ساتویں میل پر بائیں طرف گڈ فارمز کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ بس وہیں سے میری اراضی شروع ہو جاتی ہے۔ آج کل کچھی کائیزن ہے۔ کسی دن پروگرام بنا کر آجائیں۔ اور یہ میرا کارڈ رکھ لیجئے۔ ایسے تو آپ کو میری طرف سے دعوت ہے۔ لیکن آنے سے پہلے فون کر دیں تو بہتر ہوگا۔“ اس نے اپنا ڈرائنگ کارڈ بھی مجھے دے دیا۔

میں جب رخصت ہونے لگا تو چوہدری اشرف نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ وہ کارٹک میرے ساتھ آیا تھا۔

جب میں چوہدری اشرف سے رخصت ہوا تو آٹھ بجنے والے تھے۔ میری جیب میں اس

”اصل میں سال بھر سے یہ گاڑی ہمارے استعمال میں ہے اور بچے اب اس سے انکار نہیں۔ وہ کوئی اور گاڑی خریدنا چاہتے ہیں لیکن یہ بھی تو اونے پونے نہیں بیچ سکتے۔“ آواز سے اب تک گاہک آئے ہیں مگر ڈھنگ کی کوئی آفر نہیں ملی۔“

”میں گاڑی خریدنے کے لئے آیا ہوں چوہدری صاحب!“ میں نے کہا۔ ”یہ کار بظاہر مجھے پسند آرہی ہے۔ ذرا دیکھ لوں تو مجھے امید ہے کہ میری اور آپ کی بات بن جائے گی۔“

”ہاں ہاں ضرور.....“ چوہدری اشرف نے کہا۔

”میں نے پہلے کار کے گرد ایک چکر لگایا۔ ٹائروں کو دیکھا پھر ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ یہ کار بقول شخصے فل لوڈ تھی یعنی اسے سی بھی لگا ہوا تھا اور وہ تمام آسٹریٹ موجود تھیں جو اس قسم کی کار میں ہونی چاہئے تھیں۔

”چوہدری صاحب! اگر تھوڑی سی ڈرائیونگ ہو جائے تو؟“ میں نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“ چوہدری اشرف نے لڑکے کو آواز دے کر چابی منگوائی..... میری طرز دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں چلاؤں یا آپ ڈرائیو کریں گے؟“

”میں ڈرائیو کروں گا۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے چابی لے لی۔ وہ میرے ساتھ پہنچ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور کار کورس گیر میں گیٹ سے باہر لے آیا اور اسے گلیوں سے نکال کر سمن آباد موڑ کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔

سمن آباد موڑ سے میں نے کار واپس موڑ لی اور اسے چوہدری اشرف کی کوٹھی کے گیٹ سے باہر ہی روک کر انجن بند کر دیا۔ کار بہترین حالت میں تھی اور مجھے پسند آگئی تھی۔

”جی چوہدری صاحب؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کے ایک لاکھ اسی ہزار لگ چکے ہیں۔ جب کہ میری ڈیمانڈ دو لاکھ دس ہزار کی ہے۔ کار کے بارے میں ہر قسم کی ذمہ داری لینے کو تیار ہوں۔ ایک ہفتے استعمال کے بعد بھی آپ اس میں کوئی گز بڑ محسوس کریں تو میں رقم واپس کر دوں گا۔“

”بات یہ ہے چوہدری صاحب کہ مجھے یہ کار ابھی لے کر جانی ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ اپنی ڈیمانڈ سے تھوڑا سا نیچے آجائیں صرف دس ہزار تو یہ سودا بہن ہے۔“

چوہدری اشرف چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر ڈن کہہ کر اس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔

”آئیے اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

میں چند لمحے کار کے پاس کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کا تشقید جاریہ ٹیٹ کے کھلے ہوئے گریبان سے میرا وہ لاکٹ صاف نظر آ رہا تھا اور میں نے اسے چھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ عورتیں تو زیور کی نمائش کرتی ہیں۔ اونچی سوسائٹی میں مردوں کے لئے بھی سونا پہننا ضروری ہو گیا تھا۔ گلے میں سونے کی موٹی چین پہن کر بھی دوسروں پر اپنی ادا کا رعب جمایا جاتا تھا۔

میں پارکنگ سے نکل کر اپنے تلے قدم اٹھاتا ہوا وسیع و عریض برآمدے میں آ گیا۔ ماربل کا فرش آئینے کی طرح چمکتا اور چمکتا رہتا تھا۔ میں جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچا، دربان نے ایک ہاتھ سے سلام کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میرے لئے دروازہ کھول دیا۔ یہ دربان پرانا آدمی تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔ میں سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وسیع و عریض شاندار ہال تھا۔ ایک طرف استقبالیہ کاؤنٹر تھا اور سامنے تھوڑے تھوڑے قافلے پر صوفے بچھے ہوئے تھے جن کے سامنے شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبلو رکھی ہوئی تھیں۔ ہلز کے چاروں طرف آرام دہ کشتہ والی سیٹیں بنی ہوئی تھیں۔

صوفوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور کوئی کولڈ ڈرنک سے دل بہلا رہا تھا۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ایک مرد اور ایک عورت ایک پلر کے قریب کھڑے کولڈ ڈرنکس پی رہے تھے۔ مرد اچھڑ عمر اور بھاری بھر کم تھا جبکہ اس عورت کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس برس رہی ہوگی۔ دراز قامت، صحت مند جسم، سر پر مصنوعی بالوں کا بہت بڑا جوڑا بٹھا ہوا تھا۔ میں ایک گیلے کے قریب کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس عورت نے میری طرف دیکھا تو ایک لمحہ کو اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ شاید وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور پھر اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے چلے گئے۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی ابھرنے لگی تھی۔ ممکن ہے وہ اپنی کسی حرکت سے شناسائی کا اظہار کرتی لیکن میں دوسری طرف مڑ گیا۔

ایک طرف گنار ریسٹورنٹ کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں اس راہداری میں داخل ہو گیا۔ نہایت کشادہ راہداری تین چار گز سے زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس کے اختتام پر گنار ریسٹورنٹ تھا۔ بہت کشادہ اور شاندار بڑے بڑے فانوس چھت سے لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر پینٹنگز آویزاں تھیں۔ جن میں لاہور کی قدیم تہذیب کی عکاسی کی گئی تھی۔

میں محرابی دروازے کے قریب ہی رک کر جائزہ لینے لگا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ کسی کسی میز پر کوئی

وقت بھی تیس پینتیس ہزار روپے موجود تھے۔ اس طرح آزادانہ گھومنا میرے لئے اگرچہ خطرناک تھا مگر میں نے آج رات کا کھانا کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ملتان روڈ سے ہوتا ہوا میں مال روڈ پر آ گیا اور کار کا رخ اپر مال کی طرف موڑ دیا۔ اس طرف دو تین فائیو اسٹار ہوٹل تھے جن میں، میں پہلے بھی جا تا رہتا تھا۔

کار واقعی بہت شاندار تھی۔ اگر میں یہ کار اسی کنڈیشن میں کسی شوروم سے خریدتا تو مجھے زیادہ مہنگی پڑتی۔ مگر چوہدری اشرف ریکس آدمی تھا۔ اس سے نہ صرف کار کا سودا بڑی آسانی سے ہو گیا تھا بلکہ یہ سودا اس سے دوستی کی بنیاد بھی بن گیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے فارم پر آنے کی دعوت بھی دی تھی اور مجھے ایسی جگہوں کی ضرورت تھی جہاں میں دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکوں۔ اس کا فارم ہاؤس کسی وقت میرے کام آ سکتا تھا۔

ہوٹل آداری ٹاور سے آگے نکل کر میں نے یوٹرن لیتے ہوئے کار دوسری سڑک پر واپس موڑ لی۔ اس طرف بھی ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ میں نے کار کو ہوٹل کی طرف جانے والے راستے پر موڑ دیا۔

سامنے، بڑا خوبصورت وسیع و عریض لان تھا۔ میں نے کار کو پارکنگ ایریا میں لے جا کر روک دیا اور انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔

میں بہت عرصہ بعد اس طرف آیا تھا اور مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ یہاں کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان دنوں جب میں ہر روز یہاں آیا کرتا تھا تو بہت سے لوگوں سے میری دوستی بھی تھی۔ میرے حلقے میں زیادہ تعداد حسین لڑکیوں کی ہوا کرتی تھی جو مجھے بڑا ہوا ریکس زادہ سمجھتی تھیں۔ میرے مرد دوستوں کی تعداد بھی نہایت معقول تھی۔ وہ سب شہر کے معززین سمجھے جاتے تھے۔ کوئی صنعت کار تھا، کوئی بزنس مین اور کوئی اسمگلر۔ یہاں بیٹے کو نہیں، دولت کو اہمیت حاصل تھی۔ دولت ہی نے ان لوگوں کو معزز بنایا تھا۔ اور دولت ہی کے بل بوتے پر مجھے بھی معزز سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو یہ پریشانی نہیں تھی کہ میں کون ہوں۔ میرا کاروبار کیا ہے۔ انہیں صرف اس بات سے غرض تھی کہ میرے پاس کتنی دولت ہے۔

اس وقت نو بجنے والے تھے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ایسی جگہوں پر رونق عروج پر ہوتی ہے۔

میں نے اس وقت اسٹون واش کی پینٹ اور ڈینیم کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس کے اوپر کے دو بٹن جان بوجھ کر کھول رکھے تھے۔ اس قسم کا لباس بھی ایسی جگہوں پر انسان کو معزز بنا دیتا ہے۔

قدم اٹھاتی ہوئی میری طرف آنے لگی۔

”بیاد رونی!“ وہ میرے سامنے رک کر مسکرائی اور بے تکلفی سے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
”بہت دنوں بعد نظر آئے ہو یہاں..... لابی میں مجھے دیکھ کر تو تم ایسے گزر گئے جیسے کوئی شناسائی
ہی نہ ہو۔“

”سوری میڈم! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ میں نے کہا۔ ہو سکتا ہے وہ پہلے بھی مجھ سے ملی
ہو لیکن میں نے اسے واقعی نہیں پہچانا تھا۔

اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات ابھر آئے اور شاید مایوسی۔

”حیرت ہے۔“ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”اتنی جلدی بھول
میں..... ارے بھئی میں راشدہ ہوں۔ لیکن شاید تمہیں سوئیٹی کے نام سے کچھ یاد آ جائے۔ یہ نام
تم نے مجھے بھی دیا تھا۔“

”اوہ.....“ میرے دماغ میں جھماکہ سا ہوا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ بھی ان لڑکیوں
میں سے ایک تھی جو ایسے ہی ہوٹلوں میں میرے ارد گرد منڈلایا کرتی تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد آ گیا
کہ میں نے اسے سوئیٹی کا نام کیوں دیا تھا۔ وہ گلبرگ کی ایک کونھی میں پرائیویٹ محفل تھی۔ میرا
ایک دوست مجھے وہاں لے گیا تھا۔ راگ رنگ کی اس محفل میں شراب بھی چل رہی تھی۔ راشدہ
نامی اس لڑکی سے میری یہاں ملاقات اسی محفل میں ہوئی تھی۔ میں اس وقت شراب پی رہا تھا
اور راشدہ سوئفٹ ڈرنک۔ ایک موقع پر میں نے اُس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا تو مجھے مٹھاس کا
احساس ہوا۔ یہ شاید اس سوئفٹ ڈرنک کی وجہ سے تھا جو وہ پی رہی تھی۔ اور اسی مٹھاس پر میں نے
کہا تھا کہ تمہارا نام راشدہ نہیں، سوئیٹی ہونا چاہئے تھا۔ مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس محفل میں نیلیم
نامی ایک لڑکی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

”یاد آ گیا مجھے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس عرصہ میں تم کتنا بدل
گئی ہو۔ شاید اس لئے میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔ نیلیم بھی تو تمہارے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ آج
کل کہاں ہے وہ؟“

”نیلیم تو ڈیڑھ مہینہ پہلے کراچی چلی گئی ہے۔“ سوئیٹی نے بتایا۔ ”تم کہاں عائب رہے اتنا
عرصہ؟“

”کچھ مہرودیات تھیں جن کی وجہ سے میں دوستوں سے ملنے کا وقت بھی نہیں نکال سکا۔“
میں نے جواب دیا۔

”یہ ملک شہاب کا کیا چکر ہے؟“ اس نے آگے جھک کر سرگوشیا نہ لہجے میں پوچھا۔

سیٹ خالی نظر آ رہی تھی۔ ایسی جگہ پر کسی کی میز پر بیٹھ جانا خلاف تہذیب سمجھا جاتا تھا۔ میری
نظریں کسی شناسا چہرے کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں کہ ایک میز خالی ہوئی نظر آئی۔
ادھیڑ عمر میاں بیوی تھے۔ ان کے ساتھ تقریباً دس سال کی عمر کی ایک بچی بھی تھی۔ وہ لوگ مل
کر کے اٹھ رہے تھے۔ میں میزوں کے درمیان اپنے تئیں قدم اٹھاتا ہوا اسی طرف چلنے لگا۔
پھر ان لوگوں کے ہنپتے ہی میں نے میز پر قبضہ کر لیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دیرپائی نازل
گیا۔

”آج کی خاص ڈش کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تندوری چکن اور روغنی نان۔“ ویٹر نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ وہی لے آؤ۔ لیکن پہلے پانی۔ پیاس لگ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ مجھے
وقت واقعی پیاس لگ رہی تھی۔ حلق خشک ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میرے ذہن
میں اچانک ہی ملک شہاب کا خیال ابھر آیا تھا جس نے پولیس میں درج کرائی جانے والا
رپورٹ میں مجھ پر اپنے آدمیوں کے قتل کا شبہ ظاہر کیا تھا۔ اس رپورٹ پر پولیس مجھے باضابطہ
طور پر گرفتار تو نہیں کر سکتی تھی مگر مجھے پکڑ کر شامل تفتیش تو کر سکتی تھی۔ مجھے غیر قانونی طور
حراست میں رکھنے کے لئے پولیس سو تھکنڈے استعمال کر سکتی تھی۔ اور جب پولیس والوں کا
ملک شہاب جیسے شخص کی آشیر باد حاصل ہو تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ جعلی پولیس مقابلے تو پولیس کی
ایک عام روایت بن گئی تھی۔ کسی کو مار کر لاش سڑک پر پھینک دی اور اس کے خلاف پولیس کی
حراست سے فرار ہونے کی کوشش اور بالآخر مقابلہ میں مارے جانے کی رپورٹ درج کر
جاتی۔

یہ خیال بھی میرے ذہن میں اچانک ہی آیا تھا۔ اس وقت اگرچہ میری جیب میں پونل
موجود تھا اور میں کسی نازک صورتحال کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مگر میں کسی الجھن میں نہیں پھنسا جاتا
تھا۔

ویٹر نے پلیٹ میں رکھا ہوا پانی کا گلاس میرے سامنے رکھا تو میرے خیالات منتشر ہو گئے۔
میں نے گلاس اٹھا لیا اور ایک دو گھونٹ پینے کے بعد گلاس میز پر رکھ دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
اور پھر اس عورت کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا جو ہال کے محرابی دروازے میں داخل ہو کر
متحسنگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی عورت تھی جسے میں نے لابی میں ایک اونٹ
عمر آدمی کے ساتھ کھڑے کوئلہ ڈرنک پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے گلاس دوبارہ اٹھا لیا۔
ٹھیک اسی وقت اس عورت نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ نے

”کیا.....؟“ میں اچھل پڑا۔

”آج بھی تو اخبار میں خبر چھپی ہے۔ اس نے تم پر کسی قسم کا الزام لگایا ہے۔ اور شاید پولیس تمہیں تاثر کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں تمہیں تو گھر سے باہر نہیں نکلتا چاہئے تھا۔“ اس کا بچہ راز دارانہ تھا۔

”گھر سے باہر نہ نکلتا تو تم سے ملاقات کیسے ہوتی؟“ میں نے جواب دیا۔ ”ملک شہاب سے میری کچھ نسل چل رہی ہے۔ اخبار میں شائع ہونے والی وہ خبر میں نے بھی پڑھی ہے۔ اس نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے اس کا کوئی حقیقت نہیں ہے۔ محض شبہ ظاہر کیا ہے۔ اور شبہ الزام کے زمرے میں نہیں آتا۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو میں واقعی گھر سے نہ نکلتا۔ بہر حال، بھول جاؤ اس بات کو۔ ایسے معاملات چلتے ہی رہتے ہیں۔ تم کہو۔ لابی میں تمہارے ساتھ کون تھا؟ تمہارا شوہر؟“ میں نے شوہر کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ سوینی جیسی عورتیں شوہر کا روگ نہیں پاتیں۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”بزنس مین ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں بہت بڑا سپر اسٹور ہے۔ ایک کولڈ اسٹوریج بھی ہے۔ اور کئی دوسرے دھندوں میں بھی سرمایہ لگا رکھا ہے۔“

”موٹی آسامی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے؟“

ماڈل ٹاؤن جیسے علاقوں میں تو اس وقت کا روبرو عروج پر ہوتا ہے۔ اس وقت تو اسے اپنے اسٹور پر ہونا چاہئے تھا۔

”اسٹور اس کے داماد نے سنبھال رکھا ہے۔ دوسرے دھندوں کی مگرانی کے لئے بھی بندے موجود ہیں۔ اسے کیا فکر ہے۔ اس کا کام تو صرف نوٹ سمیٹنا ہے۔“

میں نے ویٹر کو ٹرے اٹھائے اپنی طرف آتے دیکھا تو سوینی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”میں نے تو اپنے لئے کھانا منگوایا ہے۔ ویٹر آ رہا ہے۔ تم کچھ کھانا چاہو تو منگوا لو۔“

ویٹر نے کھانا میز پر لگا دیا۔ سوینی نے بھی تندوری چکن کا آرڈر دے دیا اور میرے ساتھ کھانے میں شامل ہو گئی۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کی نظر اچانک ہی میرے لاکٹ کی طرف اٹھ گئی۔

”بڑا شاندار لاکٹ ہے۔“ اس نے قدرے آگے جھک کر لاکٹ کو انگلیوں سے چھونے ہوئے کہا۔ ”کہاں سے مارا؟“

”تم جیسی ایک مہربان دوست نے تحفہ دیا تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کون ہے وہ؟“ سوینی بولی۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ دوسری لڑکی کا نام سن کر اس کے دل میں حسد کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنے ساتھ کسی دوسری عورت کا نام سننا گوارہ نہیں کرتی۔

”جی۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اب تو وہ بچاری اس دنیا میں نہیں رہی۔“

”اوہ۔“ سوینی بولی۔ ”بہت افسوس ہوا۔“

اس دوران ویٹر نے سوینی کا آرڈر بھی سرور کر دیا۔

کھانے کے بعد ہم ایک ریشٹن ہال میں آ گئے۔ یہاں کی رونق بھی عروج پر تھی۔ بلکی موسیقی کی آواز بہت خوشگوار تاثر دے رہی تھی۔ میں سوینی کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ گیا۔

سوینی نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک ویٹر کی ٹرے سے دو سوٹ ڈرنکس اٹھائے۔

کوک کی چسکیاں لیتے ہوئے میری نظر تیسری میز پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی کی طرف اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ جس کا رخ دوسری طرف تھا۔ وہ سرگوشیانہ لہجے میں عورت سے کچھ کہہ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے بھی رخ بدل لیا۔ میں نے بھی توجہ نہیں دی۔

چند منٹ بعد ہی وہ دونوں اٹھ گئے۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے وہ آدمی رک گیا۔ اس کی انگلیوں میں بغیر جلا سگریٹ دبا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنی جیبیں منول رہا تھا۔

عورت دو قدم آگے نکل چکی تھی۔

”معاف کیجئے۔“ وہ آدمی میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے پاس ماچس یا لائٹر ہے؟“

”سوری۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔“ میں نے معذرت کر لی لیکن سوینی نے اپنے پرس میں سے ایک خوبصورت لائٹرنکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

سگریٹ سلاگتے ہوئے وہ شخص میرے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے لائٹر سوینی کو واپس کر دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس عورت سے جاملو جس دوران کافی آگے جا چکی تھی۔ اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی وہ دونوں ہال سے نکل گئے۔

”یہاں تو بڑی بوریت ہو رہی ہے بھئی۔“ سوینی نے کوک کی آخری چسکی لے کر خالی بوتل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”چلو نوید کے ہاں چلتے ہیں۔ وہاں اس وقت محفل شباب پر ہوگی۔“

”نوید کون؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں تھوڑی دیر کو مایوس ہوں گا۔ کوئی بات نہیں۔ مگر تم خاموشی سے پارکنگ کی طرف چلتے رہو۔“ اس نے کہا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ابھی تو ساڑھے دس ہی بجے تھے۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اور ایسی بارونق جگہ پر یہ شخص مجھے اغوا کر کے لے جا رہا تھا اور کسی کو خبر نہیں تھی۔ وہ شخص میرے ساتھ اس طرح جڑا ہوا چل رہا تھا کہ کوئی دیکھنے والا شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس شخص کو نہیں جانتا تھا۔ پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے ذہن میں ملک شہاب کا خیال ابھرا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ اس کا آدمی ہو اور اس طرح اسلحہ کے زور پر اغوا کر کے مجھے ملک شہاب کے پاس لے جانا چاہتا ہو۔

میری جیب میں بھی پستول موجود تھا اور ایک آدمی سے نمٹنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا پارکنگ ایریا میں پہنچ کر کرنا تھا۔ اس لئے میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ چند کاروں کے قریب سے گزر کر وہ سرخ رنگ کی ایک شیرازہ کے قریب پہنچ گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں اس کے کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے۔ مگر کار میں اسٹیرنگ کے سامنے کسی مرد کی بجائے ایک عورت کو بیٹھے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ اس عورت کا چہرہ دیکھ کر میرے دماغ میں جھماکہ سا ہوا۔

یہ وہی عورت تھی جسے اس رات میں نے مادام دیشکے کی کوشی سے ایک آدمی کے ساتھ کار میں فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ یہ ملک شہاب کے آدمی نہیں، مادام دیشکے کے قاتل تھے۔ لیکن مجھے انہوں نے کیوں پکڑ لیا؟ کیا اس رات کوشی کے باہر کہیں چپ کر مگرانی کرتے رہے تھے اور انہوں نے مجھے کوشی سے نکلنے ہوئے دیکھ لیا تھا؟

اس شخص کے حکم پر میں دونوں ہاتھ کار کی چھت پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میرا لباس تجتہا کر میری جیب سے پستول نکال لیا اور کار کا دروازہ کھل کر مجھے اندر بیٹھنے کا حکم دیا۔

کار میں بیٹھے ہوئے مجھے ایک موقع مل گیا تھا۔ اس وقت میں بڑی آسانی سے اس شخص پر قابو پا سکتا تھا۔ لیکن اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھی ہوئی اس عورت کو دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ اب اگر وہ مجھے پستول کی زد میں نہ بھی لئے ہوتا تو میں ان کے ساتھ جانے کو تیار تھا۔ مادام دیشکے کا قاتل میرے لئے بھی ایک معرہ بنا ہوا تھا۔ اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ مادام دیشکے کو انیس دونوں نے قتل کیا تھا اور اب اتفاق سے یہ مجھ سے ٹکرا گئے تھے اور میں ان کے ذریعے بہت کچھ معلوم کر سکتا تھا۔ لیکن مجھے حیرت تھی کہ انہوں نے مجھے پہچانا کیسے؟ اور اگر کوئی شبہ ہوا

”تم مل چکے ہو۔ دیکھو گے تو پہچان لو گے۔“ سوینی نے کہا۔ ”کل بھی اس نے مجھے کہا کہ اس نے کسی فلمی اداکارہ کو بھی بلایا ہوا ہے۔“

”چلو۔“ میں کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

یہ میں اس دور کی بات کر رہا ہوں جب پاکستان میں نائٹ کلبوں اور شراب خانوں پابندی لگ چکی تھی۔ نائٹ کلبوں اور شراب خانوں پر تالے پڑ گئے تھے۔ فائینو اسٹار ہوٹلوں میں بھی رقص کے پروگرام بند ہو چکے تھے۔ ان ہوٹلوں میں بھی شراب صرف غیر ملکی مہمانوں کو پڑھنے کی جاتی تھی اور وہ بھی ان کے کمروں میں۔ عام لوگوں کے لئے ان ہوٹلوں میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برائی کسی ایک جگہ محدود رہنے کی بجائے شہروں میں پھیل گئی۔ یار لوگ نجی طور پر محفلیں سجانے لگے۔ یہاں رقص بھی ہوتا اور شراب بھی اڑائی جاتی۔ آج بھی گلبرگ کی کسی کوشی میں کوئی ایسی ہی محفل تھی جس میں سوینی مجھے لے جانا چاہتی تھی۔ ہم ہال سے نکل کر لابی میں آ گئے۔ میں نے چند لمحوں میں وہاں رک کر ادھر ادھر دیکھا۔ سوینی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم لابی سے نکل کر وسیع برآمدے میں آ گئے۔ اس وقت کوئی کار پورچ میں آ کر رکی۔ دو غیر ملکی عورتیں اور دو مرد نیچے اترے۔ میں اور سوینی برآمدے سے نکل کر کار پارکنگ کی طرف چلنے لگے۔ لیکن یکایک سوینی راک گئی۔

”کیا ہوا.....؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اپنا پرس وہیں بھول آئی ہوں۔ میز پر۔“ سوینی نے کہا۔ ”تم پارکنگ میں چلو۔ میں رہی ہوں۔“

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔ میں چند لمحوں میں وہاں کھڑا رہا اور پھر پارکنگ کی طرف چلنے لگا۔ ابھی دو تین قدم آگے بڑھا تھا کہ بائیں طرف سے ایک آدمی تیز تیز قدم اٹھا ہوا میرے قریب آ گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے ہال میں سوینی سے لائسنس لے کر سگریٹ کھینچا تھا۔ میں نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میرا اطمینان رخصت ہو گیا۔

”خاموشی سے میرے ساتھ چلتے رہو مسٹر!“ اس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ ”اگر تم شور مچانے یا گاڑ بوا کرنے کی کوشش کی تو میرے ہاتھ میں پستول ہے اور انگلی ٹرائیگر پر۔“

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ پستول کی نال میرے پہلو میں چھ رہی تھی۔ ”کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”میری جیب میں اتنی زیادہ رقم نہیں ہے۔“

تھا تو کیوں؟ وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے؟

ہمارے بیٹھے ہی کار حرکت میں آگئی۔ اس شخص نے پستول میرے پیٹھ سے لگا کر اس نے ایک بار پھر مجھے وارننگ دی تھی کہ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کروں۔

کار پارکنگ سے مڑی تو میں نے گردن گھما کر پورچ کی طرف دیکھا۔ سوینٹی برآمدے باہر آ رہی تھی۔

”سیدھے بیٹھے رہو۔“ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے اس شخص نے پستول کی نال سے میرے پہلو میں ٹپو کا دیا۔ ”اپنی جگہ سے حرکت کرنے یا کسی کو اشارہ کرنے کی صورت میں نقصان پہنچاؤ گا۔“

”اطمینان رکھو۔“ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نہ کوئی گڑبڑ کروں اور نہ ہی کسی کو اشارہ کروں گا۔ مگر یہ تو بتا دو کہ تم لوگ ہو کون..... مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ اور اس طرح اغوا کر کے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے گا۔ مگر اس وقت خاموشی سے بیٹھے رہو۔“ اس شخص نے غراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ عورت ابھی تک کچھ نہیں بولی تھی۔ البتہ اس نے ایک دو مرتبہ سامنے لگے ہوئے غصے کی پیش کرنے والے آئینے میں مجھے دیکھا تھا۔

کار مین روڈ سے اتر کر گلبرگ نہر کے کنارے والی سڑک پر اتر گئی۔ نہر کے دونوں کناروں پر سڑکیں تھیں۔ سامنے کا ٹریفک دوسری سڑک سے آرہا تھا۔ سڑک کی ڈھلان کے ساتھ گریبلٹ تھا جس کے پرلی طرف سروس روڈ پر کوٹھیاں تھیں۔

کار تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔ راستے میں کئی پل کراس کرتی ہوئی سڑکیں آئی تھیں۔ گلبرگ کی طرف جانے والی سڑک بھی پیچھے رہ گئی تھی۔ اب نہر کے دونوں طرف یونیورسٹی کیمپس کی عمارتیں تھیں۔ کار کہیں رُکے بغیر تیزی سے دوڑتی رہی۔ کیمپس سے بہت آگے آنے کے بعد کار کی رفتار کم ہو گئی۔ سڑک کے بائیں طرف آبادی بہت گنی چنی تھی۔ کہیں کہیں کوئی کونٹری ہاؤس نظر آ رہی تھی۔

کار بالآخر ایک ذیلی سڑک پر مڑ کر رک گئی۔ عورت نے اپنے گلے میں پڑا ہوا دوپٹہ اپنے ساتھی کی طرف بڑھا دیا اور پستول اس کے ہاتھ سے لے کر پیچھے کی طرف مڑ کر بیٹھ گئی۔ مجھے پستول کی زد پر لے لیا۔

”اس کی آنکھیں باندھ دو ٹھیکیل!“ اس نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس

تیر بھی ہلکتی ہوئی تھی۔

میں نے بڑے اطمینان سے آنکھوں پر پٹی بندھوائی۔ دوپٹے میں سے بڑی بستی اور مسکور کن کی ہلک آ رہی تھی۔

”کون سا سینٹ استعمال کرتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ظاہر ہے میری مخاطب وہ عورت تھی جس کا دوپٹہ میری آنکھوں پر باندھا گیا تھا۔ ہوٹل سے لے کر اب تک میں اطمینان اور سکون سے بیٹھا رہا تھا۔ میں انہیں یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ میں اس طرح اغوا کئے جانے پر خوفزدہ ہوں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ میرے دل میں خوف ضرور تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ایک غیر ملکی سفارت کار کو قتل کیا تھا۔ اور ان کے خطرناک ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس وقت تو یہ دونوں اکیلے تھے اور میں نے بڑے اطمینان سے کسی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔ اور ممکن ہے جہاں یہ مجھے لے جا رہے تھے وہاں ان کے اور ساتھی بھی موجود ہوں۔ میں کی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ لیکن بہر حال، میں نے ایک رسک لیا تھا۔

کار ایک بار پھر حرکت میں آگئی اور بالآخر دو موڑ گھومنے کے بعد رک گئی۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت کار نے کم از کم ایک میل کا فاصلہ ضرور طے کیا تھا۔ کار کا انجن بند ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر نیچے اتار لیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ کار کسی کونٹری کے کپاڈنڈ میں رکی ہے۔ کار سے اترنے کے بعد تین چار گز کا فاصلہ طے ہوا اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر ہم غالباً کسی برآمدے میں آ گئے۔ اور پھر کچھ دیر بعد میری آنکھوں کی پٹی کھول دی گئی۔

تیز روشنی میں، میں کچھ دیر پلکیں جھپکاتا رہا۔ اور جب آنکھیں روشنی سے مانوس ہوئیں تو میں اس کمرے کا جائزہ لینے لگا جس میں اس وقت موجود تھا۔ وسیع دیریز کمرہ تھا۔ جہاں فرنیچر کے نام پر ایک پرانا سا صوفہ اور دو تین کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ پچھلی طرف کشادہ کھڑکی تھی جس میں باہر کی طرف آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ چھت پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو پتلی تھے اور ان کے بیچ میں دو طاقتور بلب جل رہے تھے جن کی روشنی خاصی تیز تھی۔ چھت پر دو اضافی آہنی ہلک بھی لگے ہوئے تھے۔

میں نے پہلی مرتبہ اس عورت کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ کار میں میری آنکھوں پر پٹی باندھنے کے لئے اس عورت کا دوپٹہ استعمال کیا گیا تھا جو اب ایک کرسی پر پڑا نظر آ رہا تھا۔ اس نے دوپٹہ اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دراز قامت، بھرا بھرا جسم اور چہرے کے نقوش تیسہ لکڑی تھے۔ وہ دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے کمان کی طرح تن کر میرے سامنے کھڑی تھی۔

”یہ میرا لاکٹ ہے۔ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے جو میں نے اپنے سینے سے لگا رکھی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو وہ تہاری ماں تھی؟“ تاجی نے قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی میرے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ اس قدر زوردار تھا کہ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔

”نجمہ..... فیقہ کو بلاؤ۔ یہ خود ہی بتائے گا کہ اس نے یہ لاکٹ کہاں سے لیا تھا؟“ دوسری لڑکی میری طرف دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ صورتحال سنگین ہو رہی تھی۔ اب مجھے واقعی کچھ نہ کچھ سوچنا تھا۔ نجمہ نام کی وہ لڑکی جو باہر گئی تھی اس کے بارے میں میرے ذہن میں نہانے چھپی ہوئی کیوں ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہو۔ لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کب اور کہاں دیکھا تھا۔

دو دن بعد نجمہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک مسنڈا بھی تھا۔ قد ساڑھے چھ فٹ سے کم تو کی طرح بھی نہیں رہا ہوگا۔ کالی پتلون اور دھاری دار سینڈوٹ بنیان پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں نیلے رنگ کا اسکارف بندھا ہوا تھا۔ پیروں میں جوگرز تھے۔ سر گنجا اور بائیں کان میں سونے کی بالی تھی۔ اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

”تاجی بی بی! کیا بات ہے؟ کیوں تکلیف دی ہے مجھے۔ کتنے آرام سے بیٹھا ریڈیو پر فزائنگ پروگرام سن رہا تھا۔“ اس نے تاجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”فزائنگ پروگرام سننے اور روٹیاں توڑنے کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے تمہیں؟ کبھی کوئی کام بھی کر لیا کرو۔“ تاجی نے کہا۔

”حکم کرو تاجی بی بی! میں کسی کی ہڈیاں بھی توڑ سکتا ہوں۔“ قہقہہ بولا۔

”اس سے معلوم کرو اس نے یہ لاکٹ کہاں سے لیا ہے۔ اس کی ہڈیاں بھی توڑنی پڑیں تو میری طرف سے اجازت ہے۔“ تاجی نے میری طرف اشارہ کیا۔

شکل و صورت سے تو تاجی بہت معصوم اور بھولی بھالی لگتی تھی۔ اسے تو دلوں پر حکمرانی کرنی ہوتی تھی۔ مگر وہ فیقہ جیسے مسنڈے پر رعب جھاڑ رہی تھی۔

”نجمہ بتائے گا تاجی بی بی..... کیوں نہیں بتائے گا۔“ فیقہ نے کہا اور میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”کیوں روٹی باؤ! کہاں سے لیا ہے یہ لاکٹ تم نے؟“

فیقہ کی زبان سے اپنا نام سن کر میں اچھل پڑا۔ نجمہ بھی گھورتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اس کے ساتھ ہی وہ آدمی کھڑا تھا جس نے مجھے پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہاں ایک نر شخصیت بھی تھی۔ اور وہ پچیس پچیس سال کی عمر کی ایک لڑکی تھی۔ وہ بھی دوپٹے سے بے پردہ اور اب بھی ہوئی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے ساتھیوں کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ کون ہے تاجی؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے دوسری عورت کی طرف دیکھا جو مجھے کر آئی تھی۔

”یہی پوچھنے کے لئے تو اسے یہاں لائے ہیں۔“ تاجی نے جواب دیا اور میرے قریب گئی۔ چند لمحے گہری نظروں سے میرے چہرے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کی نظریں میرے پیٹ کی طرف ریگ گئیں اور پھر میرے گلے میں لٹکا ہوا لاکٹ اس نے چنگی میں پکڑ لیا۔

”بڑا خوبصورت لاکٹ ہے۔ کہاں سے لیا؟“

یہ سوال کیا تھا، ہم تھا جو میرے سر پر پھٹا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ تاجی اور اس کے ساتھی گلیل کو اس رات میں نے باغ و شکار کی کوشش سے نکلنے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے لئے اس میں شے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ دونوں مادام دھکے کے قاتل تھے۔ مادام دھکے کا گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا اور ظاہر ہے انہوں نے اس کے گلے میں یہ لاکٹ بھی دیکھا ہوگا۔ مادام دھکے کو قتل کرنے کے بعد انہوں نے اس میں لوٹ مار نہیں کی تھی۔ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ یہ لاکٹ بھی اس کے گلے ہی میں رہنے لگا تھا جسے مالی غنیمت سمجھ کر میں نے اپنے گلے میں ڈال لیا تھا اور انہوں نے میرے گلے میں یہ لاکٹ دیکھ کر ہی مجھے پکڑا تھا۔ ہوٹل میں، میں نے صرف اس آدمی کو دیکھا تھا جو سڑک ساگانے کے لئے ماچس لینے کے بہانے میرے قریب آیا تھا۔ پہلے اس نے دور سے لاکٹ دیکھا ہوگا اور پھر قریب آ کر تصدیق کر لی تھی یہ لاکٹ وہی ہے۔ ہوٹل میں، میں نے اس عورت کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لیا ہوتا تو شاید صورتحال مختلف ہوتی۔ اور اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔

”دیکھو۔“ میں نے تاجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگوں نے مجھے یہاں لاکر غلطی کی ہے۔ کسی کو اغوا کرنا جرم ہے۔ میرے پاس کچھ رقم ہے اور سونے کا یہ لاکٹ بھی ہے۔ کچھ تم لوگ لے لو۔ اور میرا پستول بھی رکھ لو۔ مجھے یہاں سے جانے دو..... میں سب کچھ چھوڑ جاؤں گا۔“

”سب کچھ بھول تو تم ویسے بھی جاؤ گے۔“ اس نے کہتے ہوئے لاکٹ کو ہلکا سا جھکا۔

”نجمہ ٹوٹ گئی اور لاکٹ اس کے ہاتھ میں چلا گیا۔“ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ یہ لاکٹ تم

”فیقہ سے تم بچ نہیں سکو گے۔ تاجی بی بی جو پوچھنا چاہتی ہے بتا دو۔ ورنہ.....“
اور پھر اس نے اچانک ہی میرے اوپر چھلا لگا دی۔ میں جھکائی دے کر ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ سنبھل کر دوبارہ میری طرف بڑھا۔ میں ایک بار پھر پیچھے ہٹنے لگا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس دیو زاد کے ہاتھ آگیا تو وہ میری ہڈیاں تک توڑ دے گا۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو مجھے پریشانی نہ ہوتی۔ آسانی سے نمٹ سکتا تھا۔ مگر اس کا دوسرا ساتھی پستول لئے کھڑا تھا۔ اگر میں فیقہ پر قابو پانے کی کوشش بھی کرتا تو تکلیل میری اس کوشش کو ناکام بنا سکتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے اس لاکٹ کے بارے میں پوچھے بغیر نہیں رہیں گے۔ میں لوہے کا بنا ہوا نہیں تھا کہ تشدد برداشت کر لیتا۔ لاکٹ کے بارے میں حقیقت اگل دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ میں اپنی گردن پھنسا دیتا۔ جب انہیں یہ پتہ چلے گا کہ ان کے فوراً ہی بعد میں مادام دھکنہ کی گولی میں داخل ہوا تھا تو وہ مجھے کسی حالت میں زندہ نہ چھوڑے۔

میں فیقہ سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن بالآخر اس کی گرفت میں آ ہی گیا۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر معمولی کھلونے کی طرح زمین سے تقریباً ایک فٹ اوپر اٹھالیا اور پھر دیوار کے ساتھ دے مارا۔

میرا سر دیوار سے ٹکرایا۔ میں کسی بے جان شے کی طرح نیچے گرا۔ سر پر لگنے والی چوٹ سے بری آنکھوں میں نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ اس سے پہلے کہ میرے حواس بحال ہوتے، میری پسلیوں پر زوردار ٹھوکریں اور میں کراہ اٹھا۔ دوسری ٹھوکرنے مجھے چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور پھر ٹھوکروں کی بارش ہونے لگی۔ جسم کا کوئی حصہ محفوظ نہیں تھا۔ ٹھوکروں کے ساتھ ہی فیقہ کی بھیڑیے جیسی غراہٹیں بھی میری سماعت سے ٹکرائی تھیں۔

میں کئی منٹ فیقہ کے ہاتھوں پٹتا رہا اور بالآخر اس کا ایک پیر میری گرفت میں آ گیا۔ میں اسے ان کے پیر کو زوردار جھکا دیا۔ وہ ایک پیر پر تاج کر رہ گیا اور پھر بھد کی آواز سے پشت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور تقریباً اسی وقت تکلیل میری طرف لپکا۔ اس نے ہتھول کو بال کی طرف سے پکڑ لیا تھا۔ وہ غالباً پستول کے دتے سے میرے سر پر ضرب لگانا چاہتا تھا۔ مگر میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ میں پھرتی سے نہ صرف اپنی جگہ سے ہٹ گیا بلکہ اس کے ہتھول والے ہاتھ پر زوردار ٹھوکریں بھی رسید کر دی تھی۔ پستول تکلیل کے ہاتھ سے نکل کر کسے کے دوسرے کونے میں جا گرا۔ وہ خود لڑکھڑا کر رہ گیا تھا۔ مگر میں نے اسے سنبھلنے کا

”تم جانتے ہو اسے..... کیا نام لیا اس کا؟“ وہ بولی۔

”رونی باؤ۔“ فیقہ نے جواب دیا۔ ”کئی سال پہلے یہ ہیرامنڈی میں پرویز کے ساتھ تھا۔ پہلے تو رکشہ چلاتا تھا، پھر اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جرائم میں بھی شامل ہو گیا۔ پھر مارے جانے کے بعد یہ غائب ہو گیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس کی واپسی بڑے عجیب انداز میں ہوئی۔ یہ زیر زمین دنیا کا ابھرتا ہوا ستارہ بن گیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ بہت بڑا آدمی بن گیا۔ شہر کے تمام جرائم پیشہ لوگ اس کے نام کی مالا چپنے لگے۔ اس کے نام سے بھی ڈرتے۔ سب لوگ۔ ہیر وٹن بیچنے والے تو اس کو دیکھ کر ہی تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔ پھر اس نے ملک شہر سے پنگا لے لیا اور اس کا بیڑا غرق کر دیا۔ اس کی تو ریڑھ کی ہڈی مضبوط تھی۔ کروڑوں کا ٹھکانہ اٹھا کر بھی سیدھا کھڑا رہا۔ اس کے کہنے پر پولیس نے اسے بھی پکڑ لیا لیکن پولیس اسے جبراً بھی اپنا مہمان نہیں رکھ سکی۔ اب ملک شہاب اسے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔“ وہ خاموش ہو کر ایک طرف دیکھنے لگا۔ اس نے چند لفظوں میں میری ہسٹری بیان کر دی تھی۔ وہ تاجی کی طرف دیکھ ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”تاجی بی بی! ویسے یہ بڑا جی دار ہے..... انگلیوں پر نچا رکھا ہے اس نے ملک شہاب کو..... پر تم اسے کیسے جانتی ہو؟“

”تو یہ ہے وہ رونی جس کی شہرت کا ڈنکا ہر طرف بج رہا ہے۔“ تاجی نے میری طرف دیکھ ہوئے کہا۔ ”اس سے یہ معلوم کرو کہ یہ لاکٹ اس نے کہاں سے لیا ہے؟“

”کیوں رونی باؤ! کہاں سے لیا ہے یہ لاکٹ؟“ فیقا میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔
میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ فیقا میرے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا لیکن میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے پرویز کا حوالہ دیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس زمانے میں ملاقات ہوئی ہو۔ لیکن اب میں اسے بالکل بھول چکا تھا۔ اب تو وہ انسان نہیں، موت کا ڈنکا بن کر میری طرف لپک رہا تھا۔

”پیچھے ہٹ کر کہاں جاؤ گے رونی باؤ!“ فیقا بولا۔ ”یہ کمرہ تو بہت چھوٹا ہے۔ زیادہ جگہ دوڑ تو ہونے لگتی۔ اس لئے اپنے آپ کو تھکانے کی کوشش مت کرو۔“

”میں بتا چکا ہوں یہ لاکٹ میرا ہے۔ میں نے بازار سے خریدا تھا۔“ میں نے کہا۔
تمہاری تاجی بی بی کا اس سے ملنا جتنا لاکٹ کہیں چوری ہو گیا تھا تو یہ وہ لاکٹ نہیں ہے۔ غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”تاجی بی بی کو غلط فہمی نہیں ہو سکتی اوئے رونی باؤ!“ فیقہ نے بدستور آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”اب تک تو تم ملک شہاب کے ساتھ آنکھ پھولی کھیلے رہے ہو۔ مگر اب مجھ سے

مجھے تاجی کی گرفت سے نجات مل گئی تھی۔ مگر سنبھلنے سے پہلے ہی مجھے کھلیل نے چھاپ لیا۔ اس مرتبہ میں اپنے آپ کو نہیں بچا سکا تھا۔ کھلیل نے مجھے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اس دوران تاجی اور فقیہ بھی سنبھل چکے تھے۔ تاجی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ فقیہ گاندی گالیاں بکتا ہوا مجھ پر پل پڑا۔ اور پھر مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ دونوں لاقوت اور گھونٹوں سے میری دھناتی کر رہے تھے اور تاجی چیخ رہی تھی۔

”اور..... اور مارو اس حرامزادے کو۔ اتنا مارو کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔“

اس سارے ہنگامے کے دوران نجمہ خاموش تماشا کی طرح الگ تھلگ کھڑی رہی تھی۔ اس نے نہ تو کوئی مداخلت کی تھی اور نہ ہی اس کے منہ سے کوئی آواز نکلی تھی۔

میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کے ہاتھوں اس طرح پٹ رہا تھا۔ میرے تو نام کی دہشت تھی۔ زیر زمین دنیا میں مجھے خونی بھیڑیا کہہ کر پکارا جاتا تھا اور اس وقت یہ خونی بھیڑیا گدھے کی طرح پٹ رہا تھا۔

میں نے تاجی کو لپک کر پستول اٹھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور پھر اس وقت مجھے ایک موقع مل گیا۔ فقیہ نے جھک کر مجھے گریبان سے پکڑ لیا۔ وہ مجھے اوپر اٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اس کے چہرے پر سر کی زوردار نگر مار دی۔ نگر اس کی ناک پر لگی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ اس نے میرا گریبان ہموار کیا اور ایک ہاتھ ناک پر رکھ لیا جہاں سے خون کی دھار بہنے لگی تھی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کھلیل پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس وقت یوں لگا جیسے میرے سر پر بم پھٹا ہو۔ تاجی نے پستول کے دستے سے میری کھوپڑی پر بھر پور ضرب لگائی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چمگاریاں رقص کرنے لگیں۔ میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سر کے پچھلے حصے پر ایک اور ضرب لگی اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادر پھیلتی چلی گئی اور نیرازن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔



ہوش آنے پر میں نے اپنے آپ کو اس کمرے میں پڑے ہوئے پایا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ کمرے میں کوئی تنفس نہیں تھا۔ دروازہ بھی بند تھا۔

میں چند لمحوں پر پڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ میرے سر کے پچھلے حصے میں ٹہنی سی اٹھ رہی تھی۔ کھلیل تو میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور مجھے اس طرح باندھ کر کیوں ڈالا گیا ہے۔ لیکن پھر میرے حواس بتدریج بحال ہونے لگے اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔

میں سوچنے لگا جو ہوٹل میں ملی تھی اور وہیں رہ گئی تھی۔ وہ اپنا بھولا ہوا

موقع نہیں دیا۔ میری دوسری ٹھوکرا اس کے گولے پر لگی اور وہ کراہتا ہوا فقیہ کے اوپر گرا جواڑے کوشش کر رہا تھا۔ فقیہ کے منہ سے غیظ گالی نکل گئی۔

میں ان دونوں پر ٹھوکریں برسانے لگا۔ فقیہ کو جب بھی ٹھوکرا لگتی وہ چیخ اٹھتا۔ دوسروں پر کرتے ہوئے تو اسے خوب مزہ آتا تھا لیکن اس کی اپنی ٹھوکرا کی ہو رہی تھی تو چیخنے لگا۔ اس کے غیظ گالیاں بھی نکل رہی تھیں۔

نجمہ اور تاجی ایک طرف کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ پھر نجمہ تو اپنی جگہ پر کھڑی لیکن تاجی پستول اٹھانے کے لئے لپکتی تھی۔ میں ان دونوں کو چھوڑ کر تاجی کی طرف لپکا۔ دو وقت پستول اٹھانے کے لئے جھک رہی تھی۔ میں نے دور ہی سے اسے ٹھوکرا مارنے کی کوشش کی۔ میرا پیر اس کی پسلیوں کو صرف چھو سکا تھا۔ لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اس کا ہاتھ پستول نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس نے سنبھلتے ہوئے دوبارہ پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس مرتبہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی نکل گئی۔ میں اسے گھٹیتا ہوا پیچھے لے آیا۔ اس وقت کھلیل اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاجی گلیاں سے ٹکرائی۔ وہ دونوں ایک بار پھر فقیہ پر گر گئے۔ فقیہ کے منہ سے ایک بار پھر گالیوں کا کمر لگا پڑا۔

میں ان تینوں کو چھوڑ کر پستول کی طرف لپکا۔ میں پستول اٹھانے کے لئے جھکا ہی تھا کہ تاجی نے لپک کر میری ٹانگ پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں منہ کے بل گرا۔ میں نے اپنی ٹانگ چھڑانے کے لئے زوردار جھٹکا دیا۔ تاجی کی گرفت سے میری ٹانگ چھوٹ تو گئی مگر وہ مجھ سے زیادہ پھر تیلی ثابت ہوئی اور اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

تاجی نے مجھے پشت کی طرف سے اپنی ہاتھوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں نے یکے وقت دونوں کہنیاں چلا دیں۔ اسے پہلو میں چوٹ تو لگی تھی لیکن اس کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ جو تک کی طرح مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ اسے محض عورت سمجھ لینا میری بہت بڑی حماقت تھی۔ اس میں بے پناہ طاقت تھی اور اس نے مجھے اس طرح گرفت میں لے رکھا تھا کہ میں ایک طرح سے تقریباً بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اپنے آپ کو چھڑانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے کو جھٹکتا چلا گیا۔ وہ میری پشت پر لدی ہوئی تھی۔ میں نے دوہرا ہو کر اپنے آپ کو زوردار جھٹکا دیا۔ تاجی میرے اوپر سے الٹی قناب بازی کھاتے ہوئے آگے کو گری۔ اس وقت فقیہ بھی اٹھ کر میری طرف لپکا تھا۔ تاجی کے دونوں پیر اس کے منہ پر لگے۔ وہ گالیاں بکتا ہوا ایک بار پھر گر گیا۔

پس لینے کے لئے دوبارہ ہال میں گئی تھی اور اس دوران مجھے انوا کر لیا گیا تھا۔ مجھے وہاں نہ پاؤں وہ یقیناً یہی سوچ رہی ہوگی کہ میں اسے دھوکا دے کر بھاگ گیا ہوں۔ یہ بات تو اس کے ذہن میں بھی نہیں آئی ہوگی کہ مجھے انوا کر لیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ تاجی اور ٹھیکل ہی مادام دھکے کے قاتل تھے اور میرے مگر لاکٹ دیکھ کر انہوں نے مجھے گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ لاکٹ میرے پاس کیسے آیا۔ انہیں یقیناً مجھ پر شبہ تھا۔ اگر انہیں یہ پتہ چل گیا کہ ان کے جانے کے فوراً ہی بعد میں مادام دھکے کی کوشی میں داخل ہوا تھا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے ان کا تشدد برداشت کر لیا تھا مگر زبان نہیں کھولی تھی۔ اور اگر میں سر پر چوٹ لگنے سے بے ہوش نہ ہو جاتا تو وہ یقیناً تشدد جاری رکھتے۔ وہ مجھے یہاں باندھ کر ڈال گئے تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا تھا اور یہ رات کا کون سا پہر تھا۔

جب انہوں نے مجھے ہوٹل سے انوا کیا تھا تو ساڑھے دس بجے تھے۔ اور یہاں آنے کے بعد تقریباً بارہ بجے تک تو میں اپنے حواس ہی میں رہا تھا۔ اور اس کے بعد ہی سر پر چوٹ لگنے کے بعد میں انٹانٹیل ہو گیا تھا۔

میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے مگر میرے پیر آزاد تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ میں اٹھ سکتا تھا۔ میں نے پہلو کے بل لوٹ لگا کر اٹھنے کی کوشش کی تو دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ سر میں ایک بار پھر شدید ٹیسس اٹھنے لگیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا اور چند منٹ تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر کمرے میں ادھر ادھر ٹپٹے لگا۔ کھڑکی کے سامنے اس وقت نیلے رنگ کا موٹا سا پردہ کھنچا ہوا تھا۔ میں دانت سے پردے کو ایک طرف پکڑ کر دوسری طرف کھینچتا چلا گیا۔ باہر گہری تاریکی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ ابھی رات ہی تھی۔ شاید آخری پہر تھا۔ سنائے میں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مکان کے اندر بھی خاموشی تھی۔ شاید وہ لوگ مجھے باندھ کر خود بھی سو گئے تھے۔

نمبر والی سڑک سے اس طرف مڑتے ہوئے میں نے یہ تو دیکھ لیا تھا کہ ہم یونیورسٹی کیمپس سے بہت آگے نکل آئے ہیں اور ویرانہ ہی تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں کھیتی باڑی عملاً ختم ہو چکی تھی اور اس طرف کی بہت سی جگہ کنسرکشن کمپنیوں نے خرید رکھی تھی۔ بعض کمپنیوں نے اس طرف رہائشی اسکیموں کے اعلان بھی کر رکھے تھے۔ بعض جگہوں پر پلاننگ ہو چکی تھی اور بعض جگہوں پر اس قسم کا پیمائشی کام جاری تھا۔ بعض لوگوں نے انفرادی طور پر زمینیں خریدی تھیں اور اپنی رہائش کے لئے کوشیاں بھی بنائی تھیں جو ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر تھیں۔ اس علاقے میں کوئی

میں چند لمبے کھڑکی کے سامنے کھڑا ہر تاریکی میں گھورتا رہا۔ پھر کمرے کے وسط میں آ گیا اور کلائیوں کو جھٹکے دے کر ہاتھ کی بندش کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر گرہیں خاصی مضبوط تھیں۔ میں نے کوشش ترک کر دی اور تجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس کمرے میں ایک صوفے کے علاوہ تین چار پرانی سی کرسیوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔

میری نظریں ایک کرسی پر ٹپک گئیں۔ اور پھر میری آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ ایک کرسی کی چوبیس شاید ڈھیلی تھیں اور انہیں مضبوط کرنے کے لئے پتھر لگائی گئی تھی۔ پتھریاں ایک طرف کی پٹی سے شروع ہو کر پائے والے حصے کو گرفت میں لیتی ہوئی دوسری طرف والی پٹی تک تھیں۔ جنہیں کیلوں سے ٹھونکا گیا تھا۔ ایک پتھر لکڑی کی پٹی سے ذرا سی اوپر کوٹکی ہوئی تھی اور پٹی کا اوپر کوٹکا ہوا حصہ تیز دھار چھری کا کام دے سکتا تھا۔

میں کرسی کی طرف پشت کر کے فرش پر بیٹھ گیا اور بندھے ہوئے ہاتھوں کی رستی پتھر پر رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی مگر اس مقصد کے لئے مجھے گھنٹوں پر کھڑا ہونا پڑا تھا۔

یہ کام خاصا تکلیف دہ تھا۔ مگر ظاہر ہے مجھے ہر صورت میں پایہ تکمیل تک پہنچنا تھا۔ میں اس پٹی کی دھار پر رستی کو گرٹتا رہا۔ رستی نالکوں کی تھی جو پتھر پر بار بار پھسل رہی تھی۔

میری کلائی پر رستی کے تین چار بل پڑے ہوئے تھے۔ کبھی ایک بل پتھر پر آتا اور کبھی دوسرا اس طرح رستی کٹنے میں مزید دشواری پیش آرہی تھی۔ لیکن میں نے اپنی کوشش ترک نہیں کی اور بازوؤں میں تکلیف ہونے کے باوجود میں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔

اس کوشش میں جوڑ کے قریب سے میری کلائی بھی کٹی تھی جس سے خون رسنے لگا تھا۔ خون کی چھپ چھاپٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔ میں ہاتھوں کو آگے پیچھے حرکت دیتا رہا۔ اور پھر کڑک کڑکاتی آواز سن کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ رستی کا ایک بل کٹ گیا

نہیں چلے گا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔“

میں فرش سے اٹھ کر اسی کرسی پر بیٹھ گیا جس پر لگی ہوئی پتری سے میں نے رتی کاٹی تھی۔ اور رتی اب بھی میرے ایک ہاتھ میں تھی۔

”میں نہیں جانتا کہ تم لوگ کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔“ میں نے تاجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو مجھے پستول کی زد میں لئے ہوئے تھی۔ اب تک یہ تو میں سمجھ چکا تھا کہ تاجی بی اس کہنے یا گروہ کی سربراہ تھی۔ کیونکہ اب تک وہی احکامات دیتی رہی تھی۔ اور ایک اور بات بھی میری سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کوٹھی میں ان چاروں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ تین تو اس وقت میرے سامنے تھے اور چوتھی نجمہ نامی وہ لڑکی اس وقت نظر نہیں آرہی تھی۔ ممکن ہے وہ سو گئی

”ہمارے بارے میں جاننا ضروری نہیں۔ لیکن یہ ضرور سمجھ گئے ہو کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔“ تاجی نے کہا۔ ”ہم اس لاکٹ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں کہ یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟“

”میں بتا چکا ہوں کہ.....“

”میں کوئی تیسری کہانی نہیں سننا چاہتی۔“ تاجی نے میری بات کاٹ دی۔ ”پہلی مرتبہ تم نے کہا تھا کہ یہ لاکٹ تمہاری مرحوم ماں کا ہے اور دوسری مرتبہ تم نے بتایا کہ کسی سنار کی دکان سے خریدا تھا۔ اور اب شاید تم کوئی نئی کہانی سناتے جا رہے ہو۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”دیکھو مسٹر روٹی! میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جان چکی ہوں۔ کچھ باتیں مجھے اخبارات کے ذریعے معلوم ہوتی رہی ہیں۔ لیکن میں نے ان پر کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن جب فیچے نے تمہارے بارے میں بتایا تو اخباروں میں پڑھی ہوئی ساری باتیں مجھے یاد آ گئیں۔ اور کل ہی تو تمہارے بارے میں ایک اہم خبر چھپی ہے۔ ملک شہاب نے تمہارے دو بندوں کے قتل کا الزام لگایا ہے۔ اور غالباً پولیس کو بھی تمہاری تلاش ہے۔ ایسے موقعوں پر دوستوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تم چاہو تو ہم دوستوں کی طرح تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ اور ہمیں ملک شہاب سے بھی نجات دلا سکتے ہیں۔“

”ملک شہاب کو جانتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ذاتی طور پر نہیں۔ اس کے بارے میں اخبارات میں ہی پڑھتی رہتی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”ملک شہاب وہ دیمک ہے جو اس ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ اس ملک میں اس جیسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ تمہاری اور ملک شہاب کی دشمنی کی وجہ بھی میری سمجھ میں آگئی ہے۔ تم

تھا۔ اور پھر ٹھیک اسی وقت دروازے کے باہر قدموں کی آہٹ سن کر میں بری طرح الجھ پڑا۔ میں جلدی سے کرسی کے قریب سے اٹھ کر فرش پر اسی جگہ لیٹ گیا جہاں پہلے میں بیٹھا تھا۔ قدموں کی آواز دروازے کے باہر رک گئی اور پھر تالے میں چابی کھمکائی جانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگا۔

رتی کا ایک ہل کٹ جانے سے بندش ڈھیلی ہو گئی تھی اور اب میں ہاتھوں کی معمولی حرکت سے رتی سے نجات حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن دروازہ کھلنے کی آواز سن کر میں بے حرکت ہو گیا۔

”اوہ..... یہ تو ابھی تک بے ہوش پڑا ہے۔“ یہ ٹھیکیلی کی آواز تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کہیں یہ تو نہیں ہو گیا؟“

”یہ بہت ڈھیٹ آدمی ہے تاجی بی بی!“ یہ فیچے کی آواز تھی۔ ”اس جیسے لوگ آسانی سے بے حرکت ہوتے۔“

”اگر یہ زندہ ہے تو اسے ہوش میں لاؤ۔ اور اگر مر چکا ہے تو یہاں سے دور لے جا کر نہ بڑھینک دو۔ اوہ..... یہ دیکھو..... یہ کیا ہے؟“ یہ تاجی کی آواز تھی جو آخر میں بالکل بدل گئی تھی۔

”خون.....“ ٹھیک بولا۔ ”اوہ، سمجھ گیا۔ یہ نہ تو بے ہوش ہے اور نہ ہی مرا ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہمارے بعد یہ ہوش میں آگیا تھا اور اس نے کرسی پر لگی ہوئی اس پتری سے رتی کاٹنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں شاید اس کا ہاتھ بھی کٹ گیا ہے۔ اور ہو سکتا ہے اس نے ڈنڈا کھول بھی لی ہو۔ اور اب یہ ہمارے ساتھ مکر کر رہا ہے۔ لیکن اس مرتبہ اگر اس نے چالاک دکانے کی کوشش کی تو میں اسے گولی ہی مار دوں گا فیچے!“ اس نے فیچے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے ذرا ہرش میں لاؤ تا۔ طریقہ تمہیں معلوم ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں فیچے کا طریقہ جان سکتا، ایک زوردار ٹھوک میرے سینے پر پڑی۔ بے اختیار کراہ اٹھا۔ اسی کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں کھول دیں اور پشت پر ہاتھوں کو تھامنے سے حرکت دیتے ہوئے اس سے بھی نجات حاصل کر لی۔ لیکن مجھے کچھ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے فیچے کی ایک اور ٹھوک نے مجھے کراہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”رک جاؤ فیچے!“ تاجی نے حکمانہ لہجے میں کہا۔ اور پستول ٹھیکیلی کے ہاتھ سے لے کر مجھے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اس کرسی پر بیٹھ جاؤ روٹی! میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرنا چاہتی لیکن اس مرتبہ اگر تم نے کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو میں بلا دروغ گولی دوں گی۔ یہ کوٹھی آبادی سے اتنی دور ہے کہ گولی کی آواز کہیں بھی نہیں سنی جائے گی اور کسی کو

جرائم پیشہ ضرور ہو مگر تمہارے دل میں اس ملک کے نوجوانوں سے ہمدردی موجود ہے۔ تم انہی غشیات کے زہر سے بچانا چاہتے ہو اور ملک شہاب سے تمہاری دشمنی کی وجہ بھی یہی ہے۔ اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔

”کیا چاہتی ہو تم؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”میرا صرف ایک ہی سوال ہے اور وہ تم جانتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ

اس کے بعد میرے ساتھ دھوکہ نہیں کیا جائے گا؟“

”تمہیں میری زبان پر بھروسہ کرنا ہو گا۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھ لو کہ میں اس مرتبہ جھوٹ نہیں سننا چاہتی۔“ تاجی نے کہا۔

”میری بات سے تمہیں پتہ چل ہی جائے گا کہ میں جو کہوں گا اس میں سچ کتنا ہے اور جھوٹ کتنا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کئی روز پہلے کی بات ہے۔ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ ملک شہاب کے آدمی موت کے فرشتوں کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے تھے اور میں اپنی جان بچانے کے لئے گلبرگ کی سنان سڑکوں اور گلیوں میں بھاگا پھر رہا تھا۔ اس روز ملک شہاب کا پشاور سے آنے والا ٹرک پکڑا گیا تھا جس میں پچاس من ہیردن تھی اور ملک کو شہر تھا کہ اس ٹرک کے بارے میں، میں نے خبری کی تھی۔“

میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”میں اس رات ملک شہاب کی کوٹھی سے ہی فرار ہوا تھا اور اس کے آدمی مجھے گھبرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ایک کوٹھی کے سامنے والے لان کی باڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ اس دوران مجھے سڑک کے دوسری طرف ایک بہت بڑی کوٹھی سے کسی عورت کے چنچنے کی آوازیں سنائی دیں۔“ میں ایک بار پھر چند لمحوں کو خاموش ہو گیا اور پھر انہیں بتانے لگا کہ کس طرح میں نے اسے ایک اور آدمی کے ساتھ کار میں اس کوٹھی کے گیٹ سے نکلنے ہوئے دیکھا تھا اور کس طرح میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔

”اس چور نہیں ہوں اور نہ ہی میری چوری کی کوئی نیت تھی۔ وہ الماری بھی میں نے محض تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کھولی تھی۔“ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے تاجی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنسنی کی سی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں دھشت سی ابھر آئی تھی۔

تاجی نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور فیچے کو باہر بھیج دیا اور یہ حکم بھی دیا کہ جب تک اسے بلایا نہ جائے وہ کمرے میں آنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے اشارے پر کھیل

جرائم پیشہ ضرور ہو مگر تمہارے دل میں اس ملک کے نوجوانوں سے ہمدردی موجود ہے۔ تم انہی غشیات کے زہر سے بچانا چاہتے ہو اور ملک شہاب سے تمہاری دشمنی کی وجہ بھی یہی ہے۔ اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔

”کیا چاہتی ہو تم؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”میرا صرف ایک ہی سوال ہے اور وہ تم جانتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ

اس کے بعد میرے ساتھ دھوکہ نہیں کیا جائے گا؟“

”تمہیں میری زبان پر بھروسہ کرنا ہو گا۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھ لو کہ میں اس مرتبہ جھوٹ نہیں سننا چاہتی۔“ تاجی نے کہا۔

”میری بات سے تمہیں پتہ چل ہی جائے گا کہ میں جو کہوں گا اس میں سچ کتنا ہے اور جھوٹ کتنا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ کئی روز پہلے کی بات ہے۔ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ ملک شہاب کے آدمی موت کے فرشتوں کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے تھے اور میں اپنی جان بچانے کے لئے گلبرگ کی سنان سڑکوں اور گلیوں میں بھاگا پھر رہا تھا۔ اس روز ملک شہاب کا پشاور سے آنے والا ٹرک پکڑا گیا تھا جس میں پچاس من ہیردن تھی اور ملک کو شہر تھا کہ اس ٹرک کے بارے میں، میں نے خبری کی تھی۔“

میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”میں اس رات ملک شہاب کی کوٹھی سے ہی فرار ہوا تھا اور اس کے آدمی مجھے گھبرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ایک کوٹھی کے سامنے والے لان کی باڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ اس دوران مجھے سڑک کے دوسری طرف ایک بہت بڑی کوٹھی سے کسی عورت کے چنچنے کی آوازیں سنائی دیں۔“ میں ایک بار پھر چند لمحوں کو خاموش ہو گیا اور پھر انہیں بتانے لگا کہ کس طرح میں نے اسے ایک اور آدمی کے ساتھ کار میں اس کوٹھی کے گیٹ سے نکلنے ہوئے دیکھا تھا اور کس طرح میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔

”اس چور نہیں ہوں اور نہ ہی میری چوری کی کوئی نیت تھی۔ وہ الماری بھی میں نے محض تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کھولی تھی۔“ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے تاجی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر سنسنی کی سی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں دھشت سی ابھر آئی تھی۔

تاجی نے ہاتھ اٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور فیچے کو باہر بھیج دیا اور یہ حکم بھی دیا کہ جب تک اسے بلایا نہ جائے وہ کمرے میں آنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے اشارے پر کھیل

دی تھی۔“
 ”جو گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اس قتل میں تمہارا بائبل کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”اگر ایسی بات ہے تو تم لوگوں کو وہاں سے بھاگنے کی بجائے قانون سے تعاون کرنا چاہئے تھا
 کہ پولیس کو اصل مجرموں کا سراغ لگانے میں آسانی ہوتی۔“
 ”ہم سفارتی معاملات میں نہیں الجھنا چاہتے تھے اس لئے.....“

”وہاں سے بھاگ گئے۔“ میں نے اس کی بات پوری کر دی۔ ”ایسی صورت میں تو تمہیں
 کسی ایسے شخص کے قریب بھی نہیں آنا چاہئے تھا جو تم پر کسی قسم کا شبہ کر سکتا۔ لیکن میرے گلے میں
 اس دیکھ کر تم لوگ اس قدر بدحواس ہو گئے کہ مجھے انخوا کر کے یہاں لے آئے۔“

”میں اس لاکٹ کو بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں۔“ تاجی نے جواب دیا۔ ”الماری کھولنے
 پر جب دھکے کی لاش میرے اوپر گری تھی تو یہ لاکٹ اس وقت بھی اس کے گلے میں تھا۔ اسے
 نہارے پاس دیکھ کر میرے لئے فکر مند ہونا فطری بات تھی۔ اس لئے ہم تمہیں یہاں لے آئے
 تھے۔“

”شاید تمہیں یہ پریشانی تھی کہ میں تمہارا راز فاش نہ کر دوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے
 کہا۔ ”لیکن اگر تم لوگ مجھے نہ چھیڑتے تو میں تم لوگوں کے بارے میں بے خبر ہی رہتا۔ لیکن
 اب.....“

”لیکن اب پریشانی کی بات یہی ہے کہ تم ہمیں پہچان گئے ہو اور یہ بھی جان گئے ہو کہ
 لاش دریافت ہونے سے پہلے مادام دھکے کی کوٹھی سے کون لوگ باہر نکلے تھے۔ ایسی صورت
 میں.....“

”ایسی صورت میں میرا زندہ رہنا تم لوگوں کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔“ میں نے
 مسکراتے ہوئے اس کی بات پوری کر دی۔

”ہاں۔ یہی بات ہے۔“ تاجی نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”اس
 کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔“ اس نے میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”اگلے روز اخبار
 میں لکھا تھا کہ مادام دھکے کی کوٹھی پر ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی۔ یا کم از کم پولیس نے یہی نتیجہ اخذ
 کیا تھا۔ کیونکہ پولیس کے کہنے کے مطابق کوٹھی میں سامان بکھرا ہوا تھا۔ الماری اور ڈریسنگ ٹیبل
 کی درازیں کھلی ہوئی تھیں۔ بقول تمہارے، ہمارے فوراً ہی بعد کوٹھی میں داخل ہونے والے تم
 نے کوٹھی میں کوئی افراتفری نہیں دیکھی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ.....“ وہ خاموش ہو کر
 ٹیبل کی طرف دیکھنے لگی۔

”اور کون ہو سکتا ہے۔“ میں نے بلا جھجک جواب دیا۔ ”تم دونوں کے جانے کے دو یا تین
 منٹ بعد میں کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ اس بیچ میں کوئی تیسرا آدمی کوٹھی میں داخل ہوتے یا باہر نکلنے
 نہیں دیکھا گیا۔ اور جب میں اندر داخل ہوا تو میرا استقبال لاشوں ہی نے کیا تھا۔ لہذا یہ
 شدہ بات ہے کہ مادام دھکے اور چوکیدار کو قتل انہی لوگوں نے کیا تھا جو مجھ سے پہلے وہاں
 نکلے تھے۔ اور یہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تمہارے ساتھ وہ آدمی کون تھا؟ اس کا چہرہ
 دیکھا تھا اور نہ ہی میں نے کسی کا نام لیا ہے۔ جبکہ تم نے ٹکلیل کا نام لے کر اس کی تصدیق کر دی
 ہے۔ اس کے علاوہ.....“ چند لمحوں کو خاموش ہو گیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔
 ”اس کے علاوہ۔“ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم دونوں مادام دھکے کے قتل میں
 ملوث نہ ہوتے تو تمہیں یہ لاکٹ میرے پاس دیکھ کر اتنی پریشانی کیوں ہوتی۔ تم یہ جاننے کے
 لئے اتنا بے چین کیوں ہو کہ یہ لاکٹ میرے ہاتھ کیسے لگا۔“

”میں تمہیں بتاؤں کہ حقیقت کیا ہے۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔
 ”مادام دھکے سے میری پرانی دوستی تھی۔ ہماری ملاقاتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ اس رات بھی میں
 اس سے ملنے گئی تھی۔ ٹکلیل بھی میرے ساتھ تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور چوکیدار گیٹ پر بند کیونکہ
 ہمیں حیرت ہوئی تھی۔ اور جب اندر داخل ہو کر ہال میں چوکیدار کی لاش دیکھی تو میں بے اختیار
 چیخ اٹھی تھی۔ ہم دونوں پوری کوٹھی میں دھکے کو تلاش کرتے رہے اور پھر میں نے بھی تمہاری طرح
 وہ الماری ادھ کھلی دیکھ کر اس کا پٹ کھولا تو مادام دھکے کی لاش میرے اوپر گری اور میں خوفزدہ
 کر چیختی رہی۔ وہ چیخیں میری تھیں جو تم نے سنی تھیں۔“

میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ کس خوبصورتی سے جھوٹ بولنے کی کوشش کر
 رہی تھی۔

”دھکے تمہاری دوست تھی اور تم کوٹھی میں اس کی لاش دیکھ کر بھاگ گئیں۔ تم نے پولیس کو
 اپنی دوست کے قتل کی اطلاع کیوں نہیں دی؟“ میں نے کہا۔

”در اصل ہم بہت خوفزدہ ہو گئے تھے۔“ تاجی بولی۔ ”ہم دونوں نے کسی نہ کسی طرح لاش
 دوبارہ الماری میں خنوسا اور وہاں سے نکل گئے۔ اس وقت یہ سوچ کر پولیس کو اطلاع نہیں دی
 کہ دھکے ایک غیر ملکی سفارت کار تھی۔ پولیس ہمیں اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کرے گی
 ہمارے ملک میں یہی تو ہوتا ہے۔ کسی جرم کی نشاندہی کرنے والے اور قانون سے تعاون کرنے
 والے کو بھی دھریا جاتا ہے جبکہ اصل مجرم آزادی سے دندناتے پھرتے ہیں۔ کوٹھی سے بہت
 جانے کے بعد ہم نے پولیس کو گناہم کال کے ذریعے کوٹھی میں لاشوں کے بارے میں اطلاع

وسن بنا رکھا تھا۔

اب شے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ مادام دھکے کے قاتل تاجی اور ٹھیکل ہی تھے۔ انہیں نے ادا دھکے کو دولت کے لئے نہیں کسی اور مقصد سے قتل کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ الماری کی دراز میں کئی نوٹوں اور سونے کے زیورات سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن اسے انہوں نے بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا اور بعد میں اس نے اخبارات میں پڑھا تھا کہ پولیس نے اسے ڈکیتی کی واردات قرار دیا تھا اور تاجی کو انفس ہو رہا ہو گا کہ ان کے جانے کے بعد کوئی اور کٹھی میں داخل ہوا تھا اور سب کچھ لوٹ کر لے گیا تھا۔ اور آج انہوں نے میرے گلے میں وہ لاکٹ دیکھ لیا تھا اور وہ دونوں یہی سمجھتے تھے کہ وہ میں ہی تھا جو مادام دھکے کی کٹھی سے ساری دولت اڑا لے گیا تھا۔ اور اب یقیناً مجھ سے وہ دولت حاصل کرنا چاہیں گے۔ اگر میں ساری دولت ان کے حوالے کر بھی دیتا تو یہ لوگ مجھے زندہ چھوڑنے والے نہیں تھے کیونکہ میں اس راز سے واقف ہو چکا تھا کہ مادام دھکے کو کس نے قتل کیا تھا۔

”اب صورتحال یہ ہے مسٹر روٹی!“ تاجی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بات صرف اس لاکٹ کی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اور بھی کہانیاں وابستہ ہیں۔ پہلی کہانی تو یہ کہ جس الماری میں مادام دھکے کی لاش تھی، اس الماری کے دوسرے خانوں میں لاکھوں روپے کی نقدی اور زیورات بھرے ہوئے تھے۔ دوسری کہانی پولیس کی ہے جس کے مطابق یہ ڈکیتی کی واردات تھی اور الماری کا سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ یہ لاکٹ تمہارے قبضہ سے ملا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ.....“

”تم غلط سوچ رہی ہو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے وہاں کسی اور چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم تمہاری بات کا یقین کر لیں گے؟“ تاجی نے کہا۔ ”اب تمہارے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ وہ سب کچھ ہمارے حوالے کر دو اور.....“

”اور اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن تمہارے لئے بھی اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمہیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ مادام دھکے کو تم ہی لوگوں نے قتل کیا ہے۔ اب ہم دونوں کی بات ہے اور ہم میں سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ تاجی نے مجھے گھورا۔

”وہ لاکٹ مجھے واپس کر دو۔ میں آج کی یہ ساری کارروائی اور اس رات کی ساری بات بھول جاؤں گا۔ اور تم مجھے بھول جاؤ۔ اس کے علاوہ ہم دونوں کے پاس کوئی اور راستہ نہیں

”بولتی رہو..... میں سن رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے وہاں سے صرف یہ لاکٹ نہیں اڑایا تھا بلکہ وہ ساری بھی اڑا لی تھی جو الماری کی درازوں میں بھری ہوئی تھی۔“ تاجی نے کہا۔

میں اچھل پڑا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی اور دماغ میں سنسناہٹ ہو گئی۔

”الماری کی درازوں میں بھری ہوئی دولت!“ میں نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا تم ہمیں بیوقوف سمجھتے ہو؟“ اس نے مجھے گھورا۔ ”اس دولت میں ہمارے لئے بڑی کٹش تھی لیکن ہم نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ہم وہاں کسی اور مقصد سے گئے تھے۔“

”اور وہ مقصد تھا مادام دھکے کا قتل۔“ میں نے کہا۔ ”اٹنی دولت کو نظر انداز کر دینے والا کاسب سے بڑا بیوقوف ہی ہو گا۔ اصل بات یہ ہے کہ چوکیدار اور مادام دھکے کو قتل کرنے بعد تم لوگ بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے تم نے اس پر فائرنگ کی آواز سن لی، میرا حاقب کرنے والوں نے کی تھی۔ تم لوگ خوفزدہ ہو کر سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے اور.....“

”وہ دولت تمہارے ہاتھ آگئی۔“ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے تلاشی لینے کا موقع نہیں مل سکا۔ میری الٹی نیت بھی نہیں تھی۔ لیکن اگر وہ دولت میرے سامنے ہوتی تو میں چھوڑتا بھی نہیں۔ البتہ.....“

خاموش ہو کر اس کے چہرے کو دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ”البتہ وہاں سے بھاگتے ہوئے میری مادام دھکے کے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ پر پڑ گئی تھی۔ اور میں نے وہ لاکٹ نکال لیا۔“

”آج تم نے چھین لیا۔“

میں جانتا تھا کہ اگر میں الماری میں بھری ہوئی اس دولت کو چرانے کا اعتراف کر لیتا، مجھ سے وہ دولت حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے اور اس کے لئے مجھے مزید تشدد کا نشانہ جاتا۔ تاجی کی باتوں سے یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی تھی کہ مادام دھکے سے اس کے تعلقات ضرور رہے ہوں گے۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس الماری میں دولت بھری ہوئی اور غالباً اسی دولت کے لئے ہی اسے قتل بھی کر دیا گیا تھا۔ لیکن عین آخری لمحوں میں باہر والی فائرنگ یا کسی اور وجہ سے وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ لیکن اس وقت تک

باتیں مجھے یاد آنے لگیں۔

رخشی نے بتایا تھا کہ مادام دھکے کسی اہم مشن پر کام کر رہی تھی اور اس کے لئے اس نے

برے ہاتھ میں آجانے کے باوجود اس نے میرے اوپر جھلانگ لگا دی تھی۔ وہ بڑی مردار قسم کی عورت ثابت ہوئی تھی۔ پستول چھیننے کی کوشش کے ساتھ اس نے میری ٹانگوں کے بیچ میں تھپے سے ٹھوکر لگانے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔

ایسی شکست میں میری انگلی سے پستول کا ٹرائیگر دب گیا۔ گولی ہم دونوں میں سے کسی کو نشانہ بنانے بغیر سامنے والی دیوار میں پیوست ہو گئی۔

فیفا شاید کمرے کے باہر ہی کھڑا تھا۔ فائر کی آواز سن کر اس نے دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔ ابک لہجہ میں نے زوردار جھٹکا دے کر تاجی کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور بڑی پھرتی سے اسے احوال کی طرح اپنے سامنے کر لیا۔ میرا بایاں بازو اس کے سینے پر لپٹا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ نے پستول کی نالی اس کی کینٹھی سے لگا دی۔

”اب کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔“ میں نے چیخ کر کہا اور پھر تاجی کے کان کے قریب زب فرمایا۔ ”اگر تم اپنی جان بچانا چاہتی ہو تو ان دونوں حرا مزدوروں سے کہو کہ کھڑکی کے قریب ہار کھڑے ہو جائیں اور اپنا منہ کھڑکی کی طرف رکھیں۔“

”کک..... کیا چاہتے ہو تم.....؟“ تاجی بھلائی۔

”یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ اور تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”سنو روئی!“ وہ بولی۔ ”ہم میں سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ تمہاری شرائط پر۔“

”اب سمجھوتے کا وقت گزر چکا ہے۔“ میں نے غراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ان سے کہو کہ کھڑکی کے پاس چلے جائیں۔ اور تم دروازے کی طرف بڑھو۔“

”ہٹ جاؤ..... راستے سے ہٹ جاؤ۔ کھڑکی کے پاس چلے جاؤ۔“ تاجی نے ٹکلیل اور فیفے کو اشارہ کیا۔

فیفا غوغا نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی ناک سوسے کی طرح پھولی ہوئی تھی۔ دروازے کے سامنے سے ہٹ کر کھڑکی کے قریب چلا گیا۔ ٹکلیل بھی کھڑکی کے قریب ٹپک چکا تھا۔

میں تاجی کو دھکیلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک دوسرے پیچھے مڑ کر بھی دیکھا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی چوک گیا۔

جب یہ لوگ مجھے اغوا کر کے لائے تھے تو ٹکلیل نے میرا پستول میری جیب سے نکال کر اپنی ٹانگ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ میں اس وقت سے اب تک اپنے پستول کو بھولا ہوا تھا۔ ٹکلیل نے پستول اس وقت میرے قبضے میں تھا۔ اور ٹکلیل نے اچانک ہی اپنی جیب سے میرے والا

ہے۔“ میں نے کہا۔

”بات صرف اس لاکٹ کی نہیں ہے۔“ تاجی نے کہا۔ ”وہ رقم اور زیورات کہاں ہیں؟“ وہ سب کچھ ہمارے حوالے کر دو تو سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔“

”مجھے بیوقوف سمجھتی ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چلو مان لیا کہ میں وہ سب یہاں سے لے گیا تھا۔ لیکن یہ سن لو کہ اب اس میں سے کچھ بھی واپس نہیں ہوگا۔ اور یہ کہ تیرے لاکٹ کے ساتھ تیس پینتیس ہزار کی رقم بھی واپس کرنی پڑے گی جو اس طرف آتے ہوئے پستول کے ساتھ میری جیب سے نکالی گئی تھی۔“

تاجی جواب دینے کی بجائے چند لمحوں تک گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر ٹکلیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی۔ یہ ہمارے راز سے واقف ہو گیا ہے۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے لئے خطرناک ہوگا۔ لیکن اسے ٹھکانے لگانے سے پہلے نقدی اور زیورات حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ فیفے کو بلاؤ..... وہی اس کی زبان کھلوائے گا۔“

”تم مجھے کسی کے بھی حوالے کر دو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دیا جائے تو وہ دولت مجھ سے واپس نہیں لے سکو گے۔ لیکن میں مرنے سے پہلے یہ ضرور جانا چاہوں گا کہ مادام دھکے سے تمہارا کیا تعلق تھا اور وہ یہاں کس مشن پر آئی ہوئی تھی اور اسے قتل کرنے کی اصل وجہ کیا ہے؟“

”کیا.....؟“ تاجی اچھل پڑی۔ اس کے چہرے پر سنسنی سی پھیل گئی اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ٹکلیل کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے حواس پر قابو پا سکتے، میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی رشتی ہنٹر کی طرح گھما کر تاجی کے پستول والے ہاتھ پر ماری۔ رشتی تاجی کے ہاتھ پر لپٹ گئی۔ میں نے زوردار جھٹکا دیا۔ نہ صرف پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا بلکہ وہ خود بھی لڑکھڑاتی ہوئی آگے آ گئی۔ میں نے ایک اور جھٹکا دیا۔ رشتی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پستول کی طرف جھلانگ لگا دی۔ تقریباً اسی وقت ٹکلیل نے بھی پستول کی طرف جھلانگ لگائی دی۔

میں ایک دم ہوا میں اُچھلا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے لات چلا دی۔ میرے ہیکر کی ٹھوکر ٹکلیل کے کندھے پر لگی۔ وہ چیختا ہوا الٹ کر دیوار سے نکل آیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے جھٹکے پستول اٹھالیا۔ اس وقت مجھے تاجی کے حوصلے اور جرأت مندی کی داد بھی دینی پڑی تھی۔ پستول

پستول نکال لیا تھا۔

میں نے تاجی کو زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گری۔ اس کے منہ سے زخمی
نکس گئی تھی۔ میں بھی اس کے اوپر گرا تھا۔ اور اسی لمحہ فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی فضا
چارفٹ اوپر سامنے والی دیوار میں پیوست ہو گئی۔

تاجی میرے نیچے دبی ہوئی چیخ رہی تھی۔ چیخنے کے ساتھ اس کے منہ سے گالیوں کا کڑوا
اہل رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر ایک طرف چھلانگ لگا دی۔

یہ کشادہ راہداری تھی۔ مجھے اس کوشی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ جب
لے کر آئے تھے تو اس کمرے میں پہنچ کر ہی میری آنکھوں سے پٹی کھولی تھی اور مجھے کچھ پتہ نہ
تھا کہ اس کوشی میں کتنے کمرے ہیں اور باہر جانے کا راستہ کس طرف ہے۔

میں راہداری کے اختتام پر بائیں طرف مڑ گیا۔ یہ ہال نما کمرہ تھا جس میں سامنے ایک
دروازہ تھا اور ایک دروازہ بائیں طرف بھی نظر آ رہا تھا۔ میں سامنے والے دروازے کی طرف
بڑھا۔ لیکن اسی وقت بائیں طرف والا دروازہ کھلا اور نجمہ کی صورت دکھائی دی۔ اس نے بائیں
فائر کی آواز سن کر دروازہ کھولا تھا۔

”ادھر نہیں، اس طرف آؤ۔ جلدی سے۔“

نجمہ کی سرگوشیاں آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ میری آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ وہ دروازے
میں کھڑی اندر کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے ایک لمحہ کو کچھ سوچا پھر اس طرف چھلانگ
دی۔

”اس طرف۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جاؤ۔“ نجمہ کی سرگوشی میری سماعت سے نکل گئی۔
کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور دوسری طرف بھی ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس وقت
راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے نجمہ کو بازو سے پکڑ کر ایک
طرف پیچھے ہوئے بیڈ پر دھکیل دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور چہرے پر خوف
آیا۔ میں اسے دھکا دے کر پچھلے دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے
دروازے کا بولٹ گراتے ہوئے پستول والے ہاتھ سے نجمہ کو اشارہ کیا کہ وہ چپٹی رہے۔ نجمہ
میرا اشارہ سمجھ گئی اور اس نے چیختے ہوئے اٹھ کر اندر والا دروازہ بند کر دیا اور اس کے ساتھ ہلکے
لگا کر کھڑی ہو گئی۔

دوسرا دروازہ کھول کر میں نے متشکرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔
یہ کوشی کا پہلو والا حصہ تھا اور باہر تاریکی تھی۔ میں نے صرف ایک لمحہ رک کر صورتحال کا جائزہ

یا اور پھر کوشی کی باؤنڈری وال کی طرف دوڑنے لگا جو وہاں سے تقریباً پندرہ گز دور تھی۔ اسی
نجمہ والے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سنائی دی۔

میں چھلانگ لگا کر دیوار پر چڑھ گیا۔ اور پھر عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی

دی۔ ”وہ رہا۔۔۔۔۔ اس طرف دیوار پر۔“ یہ چیختی ہوئی آواز نجمہ کی تھی۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے خاموشی اور تاریک فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ میں نے دیوار
کے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اور مجھے یوں لگا جیسے میں بہت بلندی سے پستی کی طرف جا
ہا ہوں۔ اور پھر میں بھد کی آواز سے نیچے گرا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے
لڑنے کی کوشش کی تو کراہ اٹھا اور دایاں پیر پکڑ کر دوبارہ بیٹھتا چلا گیا۔

باہر سے یہ دیوار زیادہ اونچی تھی جس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ گرتے ہوئے میرا پیر بے ترتیبی
زمین پر پڑتے ہوئے مڑ گیا تھا جس سے غالباً موج آگئی تھی۔

صورتحال خاصی خطرناک تھی۔ دیوار کے دوسری طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں
سنائی دے رہی تھیں اور کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ان میں سے کوئی دیوار پر چڑھ جائے اور گولی مار
کر میری زندگی کا چراغ گل کر دے۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تکلیف کی پرواہ کئے بغیر ایک طرف دوڑ لگا دی۔ کچی زمین پر دوڑنا
بہت خاصا مشکل ہو رہا تھا۔ کئی جگہ تو میرے پیر مٹی میں دھنس رہے تھے۔ دائیں پیر میں تکلیف
ہی ہو رہی تھی۔ لیکن میں اس تکلیف کی پرواہ کئے بغیر دوڑتا رہا۔

”وہ کیمتوں کی طرف بھاگا ہے۔ زیادہ دور نہیں کیا ہو گا فیچے!“ یہ چیختی ہوئی آواز ٹیکیل کی تھی۔
”تم اس طرف دیکھو، میں اس طرف جا رہا ہوں۔ اگر وہ بچ کر نکل گیا تو ہمیں موت سے کوئی
نکل بچا سکے گا۔“

اور پھر دوسرے ہی لمحہ بھد بھد کی آوازیں سنائی دیں۔ ان دونوں نے دیوار سے باہر کی
طرف چھلانگ لگا دی تھی۔

میں وہاں سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ سامنے دو تین درخت تھے۔ میں
رک گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ اتفاق تھا کہ ان دونوں
ٹکے سے کوئی بھی اس طرف نہیں آیا تھا۔ ایک دائیں طرف نکل گیا تھا اور دوسرا بائیں طرف۔ مجھے
فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ فضا میں یوں بھی تاریکی تھی۔ اور درختوں کی وجہ سے یہاں اندھیرا
گہرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ میں درخت کے تنے سے ٹیک لگائے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جنگل کے

ساتھ موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ آگے کھیت تھے اور میں ان کھیتوں میں ایک پگڈنڈی پر دوڑ رہا۔

میرے پیچھے ایک دو فائر بھی ہوئے تھے مگر تاریکی میں دور سے چاکی جانے والی گولیاں میرا ہجومی نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ میں رُکے بغیر دوڑتا رہا۔

آگے شاید کھیتوں میں پانی دیا ہوا تھا۔ میرے پیر کچھڑ میں دھنس رہے تھے اور میرے لئے روزانہ مشکل ہو رہا تھا۔ سانس بھی بری طرح پھول گیا تھا۔ میں نے رک کر ادھر ادھر دیکھا۔ دور ہی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ایک پگڈنڈی کے کنارے ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

میرے پیر میں تکلیف بڑھ گئی تھی۔ میں نیچے بیٹھ گیا اور پیر سہلانے لگا۔ پیر سوچ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر تکلیف بڑھ گئی تو آگے کیسے جاسکوں گا۔

تقریباً دس منٹ بعد میں ایک بار پھر اٹھ کر چل پڑا۔ میں اتنی دور نکل آیا تھا کہ اس کوٹھی کی روشنائی اب بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دائیں طرف بہت دور بہت مہم ٹٹماتی ہوئی سی بتیاں دکھائی دیں۔ میں اس طرف چل پڑا۔

کھیتوں ہی کھیتوں میں چلتا ہوا تقریباً بیس منٹ بعد میں ایک بار پھر کھلی جگہ پر نکل آیا اور بالآخر ایک بار پھر نہر کر کنارے پر پہنچ گیا۔

نہر کے دائیں طرف بہت دور یونیورسٹی کیمپس کا علاقہ تھا اور بائیں طرف تاریکی تھی۔ بائیں طرف یہ نہر ٹھوکر نیاز بیگ کی طرف چلی گئی تھی۔ میں چند لمحے وہاں رکا اور پھر نہر کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

تقریباً پانچ سو گز کا فاصلہ طے کر کے ایک چھوٹی سی پلایا پار کر کے میں نہر کے دوسری طرف آ گیا۔ اس طرف بھی کھیت ہی تھے۔ لیکن بہت آگے کہیں کہیں خوابیدہ سی روشنائیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

آج اگر آپ سمن آباد موڑ سے ٹھوکر نیاز بیگ کی طرف جائیں تو آپ کو سڑک کے دونوں طرف منجانب آبادی نظر آئے گی۔ لیکن جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس زمانے میں یہاں آباد ہوا کرتا تھا۔ یتیم خانے والے چوک سے ٹھوکر نیاز بیگ تک سڑک کے دونوں طرف کھیت ہوا کرتے تھے۔ کہیں کوئی آبادی نہیں تھی۔ ٹھوکر نیاز بیگ کا علاقہ البتہ اس وقت بھی آباد ہوا کرتا تھا۔ یہاں سے ایک سڑک ملتان کی طرف اور دوسری رانیوٹ کی طرف جاتی تھی۔ ٹھوکر نیاز بیگ کو اس وقت ایک گاؤں کی حیثیت حاصل تھی۔ آج یہ لاہور کے نواح میں سب سے زیادہ منجانب

کمرے میں میری دھنائی کرتے ہوئے تاجی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہاں دور دور تک آبادی نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہر طرف تاریکی تھی۔ یونیورسٹی کیمپس بھی یہاں سے بڑبڑاہے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں اونچے نیچے درختوں کی بہتات تھی۔ اس طرف سے بھی کوئی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

مجھے کچھ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کوٹھی آبادی سے دور کھیتوں کے بیچ میں کس جگہ واقع تھی۔ ہو سکتا ہے کسی زمیندار نے بنوائی ہو۔ لیکن تاجی وغیرہ کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا تھا؟

اور پھر میرے ذہن میں نجمہ کا خیال ابھرا آیا۔ میں نے آنکھوں پر سے پٹی کھولنے کے بعد پہلی مرتبہ نجمہ کو دیکھا تھا تو اس کا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا لگا تھا۔ لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ تاہم وہ اپنے ساتھیوں سے مختلف ثابت ہوئی تھی۔ تاجی، ٹکیل اور فیغ نے حسب توفیق میری پٹائی میں حصہ لیا تھا۔ وہ اس وقت بھی الگ تھلگ کھڑی رہی تھی۔ اور اب جبکہ میں اس کوٹھی سے فرار ہو رہا تھا، اس نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا تھا اور فرار کا راستہ دکھانے میں میری مدد کی تھی۔ میں شاید غلط دروازے کی طرف جا رہا تھا مگر نجمہ نے مجھے اپنے کمرے کے پچھلے دروازے سے نکلنے میں رہنمائی کی تھی۔ اور پھر اس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اس طرح چپخنا شروع کر دیا تھا جیسے میں اس پر کوئی زیادتی کر رہا ہوں۔ اس طرح اس نے اپنے ساتھیوں کو یہ تاثر دیا تھا کہ میں اس کی مرضی سے نہیں، اس کے ساتھ کچھ زیادتی کر کے بھاگا ہوں۔

مگر اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ فرار ہونے میں میری مدد کیوں کی تھی؟ اس میں شبہ نہیں کہ تاجی اور ٹکیل، مادام دھکے کے قتل میں ملوث تھے۔ میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ مادام دھکے کا قتل کیا بہت بڑی بین الاقوامی سازش کا حصہ تھا اور تاجی وغیرہ بھی اس سازش میں شریک تھے یا آلہ کار بنے ہوئے تھے۔ مگر نجمہ..... یہ بھی انہی کی ساتھی تھی۔ مگر ان سے مختلف ثابت کیوں ہوئی تھی؟ اس نے بھاگنے میں میری مدد کیوں کی تھی؟

میں یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں کر چوک گیا۔ کچی زمین پر دھب دھب کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے غور سے اس طرف دیکھا۔ تاریکی میں ایک ہیولہ اس طرف دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے بھی ایک طرف دوڑنا لگا دی۔

اور پھر اس وقت ایک فائر ہوا۔ اس بہولے نے مجھے دیکھ کر گولی چلا دی تھی۔ میں نے بھی مڑ کر جوابی فائر کیا اور ایک طرف دوڑنا چلا گیا۔ میرے پیر میں اگرچہ تکلیف تھی لیکن اس وقت

بڑے بڑے بھینچ لئے تھے۔ چند منٹ تک تو پیر میں شدید ٹیسس اٹھتی رہیں اور پھر حیرت انگیز طور پر تکلیف کم ہوتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

مجھے یاد نہیں کہ میں کتنی دیر سویا رہا یا بے ہوش پڑا رہا تھا۔ لیکن اپنے قریب آہٹ سن کر میری آنکھ کھلی۔ دھوپ کی چمک سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں چند لمحے پلکیں جھپکاتا رہا اور جب نظر تیز روشنی سے مانوس ہوئی تو میں اس عورت کو دیکھنے لگا جو مجھ سے دو تین گز کے فاصلے پر کڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ایک لمحہ کو تو میں بھی سمجھا تھا کہ وہ تاجی ہے۔ لیکن وہ تاجی نہیں تھی۔ میں پلکیں جھپک جھپک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ کوئی دیہاتی عورت تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اونچی لمبی اور صحت مند۔ اس نے پھولدار کپڑے کی قمیض اور ہلکے نیلے رنگ کی دھوتی پہن لی تھی۔ دھوتی دیکھ کر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ بہت سی دیہاتی عورتیں دھوتی پہنتی کرتی تھیں۔ میں نیچے سے اوپر تک اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اتنی زیادہ حسین نہیں تھی۔ مگر چہرے کے نقوش اور جسمانی ساخت نے اسے خاصا پُرکشش بنا دیا تھا۔ اس نے کھانے کے برتن اٹھا رکھے تھے جو غالباً خالی تھے۔

”اوائے، کون ہو تم.....؟“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا گھر نہیں ہے؟ یہاں زمین ہائے سور ہے ہو۔“

”گھر.....“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”گھر تو ہے بی بی! مگر میرے پیر میں چوٹ لگ گئی ہے۔ چلائیں جا رہا۔ شاید بے ہوش ہو کر یہاں گر گیا تھا۔ تم کون ہو۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟“

”یہ ہماری زمین ہے اور ہمارا گھر وہ ہے، اس طرف۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

”تم کیمتوں میں اپنے بندے کو روٹی دینے گئی تھی۔ تمہیں یہاں پڑے دیکھا تو رک گئی۔ کون ہو؟“

”میرا گھر یہاں سے بہت دور ہے۔“ میں نے کہا۔ ”رات کو ڈاکو مجھے اٹھالائے تھے۔ میں مارا نکلا۔ اور پھر یہاں گر پڑا۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”تم اپنے بندے کو بلا کر لاتی ہو۔ تم یہیں بیٹھے رہو۔ کہیں جانا مت۔“ اس نے کہا۔

”میرے بعد میں موج آگئی ہے۔ دیکھو کتنا سو جا ہوا ہے۔ میں کہاں جا سکتا ہوں؟“ میں نہکتے ہوئے اپنے پیر کی طرف اشارہ کیا۔

آبادی والا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال میرا رخ اب اسی طرف تھا۔

میرے لئے چلنا اب بہت ہی مشکل ہو گیا تھا۔ پیر کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جو تا بھی اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

رات کی تاریکی رخصت ہو رہی تھی اور دن کا تلکبسا اُجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ دن کی روڑ پھیلنے سے پہلے پہلے میں کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ٹھوکر نیاز بیگم ہی میرے ایک پرانے دوست رفیق کی کوشی بھی تھی جہاں میں چند روزہ بھی چکا تھا۔ مگر یہ بہر پرانی بات تھی۔ کئی سال پہلے اس وقت کی بات جب میں ہیرا مندلی والے پرویز کے ساتھ کرتا تھا۔ پرویز مخالف پارٹی سے ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا اور مجھے جان بچانے کے لئے رفیق کے پاس پناہ لینی پڑی تھی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد تک تو رفیق سے ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں مگر پھر یہ سلسلہ متوقف ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کئی سال گزر گئے تھے۔ اب مجھے معلوم نہیں تھا کہ رفیق اب بھی اس کوشی میں رہائش پذیر تھا یا اسے بیچ کر کہیں اور چلا گیا تھا۔

کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور آگے چمدری سی آبادی شروع ہو گئی تھی۔ دن کی روشنی بھلا رہی تھی۔ کھیتوں کی طرف کسانوں کی آمد و رفت بھی شروع ہو گئی تھی۔ میرے لئے اب چاہت بہت مشکل ہو گیا تھا۔ پیر سوچ کر کہا ہو رہا تھا۔ میں ایک بار پھر شیشم کے ایک درخت سے لگا لگا کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ پیر سہلانے لگا۔ صرف پیر ہی نہیں، جسم کے دوسرے حصے بھی ڈکا رہے تھے۔ رات کو انہوں نے جو دھنائی کی تھی اس سے میرا نجر پھر ڈھیلا ہو گیا تھا۔

رات بھر جانے کی وجہ سے میری آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ میں جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر دماغ میں سنناٹا بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں اٹھ کر چلا رہا ہوں تو نیند کا زور کم ہو سکتا تھا۔

میں بڑی مشکل سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک پیر پر زور دے کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اگرچہ یہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ میرا پیر کسی پتھر پر پڑ کر پھسل گیا۔ نیچے گرتے ہوئے میرا دایاں ایک بار پھر مڑ گیا۔ اس مرتبہ میں نے کڑک کی ہلکی سی آواز بھی واضح طور پر سنی تھی۔ میں بڑا مشکل سے اپنی چیخ کو دبا سکا تھا۔

ٹخنے سے اٹھنے والی درد کی لہر پورے جسم میں سنسنی سی پھیلاتی ہوئی میرے دل تک پہنچ گئی تھی۔

میں نے اپنے پیر کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا اور تکلیف ضبط کرنے کے لئے

لے دوڑتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ اور پھر ایک جگہ مجھے ایسی ٹھوکر لگی کہ میرا پیچہ مڑ گیا۔ مگر میں بڑی مشکل سے چلتا رہا اور پھر شاید میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ دوبارہ جب ہوش آیا تو دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور یہ فرشتہ صفت عورت میرے قریب کھڑی تھی۔ ”مجھے نہ دیکھ لیتی تو پتہ نہیں میں کب تک وہاں پڑا رہتا۔“

”تمہیں جو لوگ اٹھا کر لائے تھے کیا ان میں کوئی عورت بھی تھی؟“ اکبر نے میرے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”عورت؟“ میں چونک گیا۔ ”وہ لوگ چہروں پر ڈھانے باندھے ہوئے تھے۔ میں کسی کی نظر نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن ان میں ایک کی آواز باریک سی تھی۔ ممکن ہے وہ کوئی عورت ہی ہو۔ کرم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”آج میری پانی کی باری ہے۔“ اکبر نے کہا۔ ”صبح سورج نکلنے سے پہلے جب میں کھیتوں میں گیا تو کھیتوں کے پرلی طرف کچھ لوگ تمہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ دوسرا اور ایک عورت۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ ”وہ لال رنگ کی کار میں تھے۔ کھیتوں کے پرلی طرف دو راستہ نہر کے قریب سے ہوتا ہوا یونیورسٹی کی طرف جاتا ہے۔ وہ لوگ اس طرف سے آئے تھے۔ اس عورت نے بتایا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی پاگل ہے جو گھر سے بھاگ نکلا ہے۔ ان کے جوہلیہ بتایا تھا وہ.....“

”وہ بالکل میرے جیسا تھا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”لیکن کیا میں تمہیں پاگل لگتا ہوں؟ یہ وہی لوگ ہوں گے۔ تم نے انہیں کیا بتایا؟“

”کیا بتاتا۔“ اکبر نے کہا۔ ”اس وقت تو مجھے تمہارے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ لیکن اہلک ہیں بہت خطرناک۔ ان کا پوچھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں نے تمہیں چھپا رکھا ہو۔ مجھ سے سوال جواب اس عورت ہی نے کئے تھے۔ وہ سب سے زیادہ خطرناک لگتی ہے۔ میں نے ان کی بات کا یقین تو نہیں کیا تھا۔ لیکن تم بتاؤ..... اصل بات کیا ہے؟“

”تو تمہیں میری بات کا بھی یقین نہیں آیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں ان پڑھ اور جاہل ضرور ہوں مگر خدا نے مجھے عقل دی ہے اور اس قسم کی باتوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے نہ اس عورت کی بات کا یقین آیا تھا اور نہ ہی تمہاری بات کا یقین آ رہا ہے۔ میں نے انسانی تمدنوں کی بنیاد پر تمہاری مدد کی ہے۔ لیکن مجھے کچھ گڑباز نظر آ رہی ہے۔ میں کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اگر تم مظلوم اور بے قصور ہو تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ بصورت دیگر میں یہی کہوں گا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

اس نے جھک کر میرے پیر کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر تشویش ابھر آئی تھی۔ اس نے ہاتھ برتن وہاں رکھ دیئے اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کھیتوں کی طرف چلی گئی۔

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے جس طرف اشارہ کیا تھا، اس طرف تقریباً گز کے فاصلے پر ایک کچا مکان نظر آ رہا تھا جس کے آس پاس چند درخت بھی تھے۔ اس ایک مکان کے علاوہ آس پاس کوئی اور مکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر پیر میں ایک بار پھر ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ میں پھر بے حرکت ہو رہ گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ عورت ایک آدمی کے ساتھ واپس آ گئی۔ اس آدمی کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دھوتی کرتہ، سر کے بال قریب سے تراشے ہوئے اور بھدے نقوش۔ وہ اکبر تھا۔ نذیراں نامی اس عورت کا شوہر۔ اس کے پیر کچھڑ میں تھڑے ہوئے تھے اور ہاتھوں پر بھی کچھڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ دیر تک سوالات کرتا رہا، پھر جھک کر مجھے کندھے پر لاد لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مکان کی طرف چلنے لگا۔ نذیراں برتن اٹھائے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

مکان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ صرف تین کمرے تھے۔ ایک کمرے میں کچھ زرعی آلات پڑے ہوئے تھے۔ دوسرے کمرے میں ایک چار پائی تھی جس پر میلا سا بستر پڑا ہوا تھا اور کچھ کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اکبر نے مجھے اس چار پائی پر ڈال دیا۔ نذیراں اندر آ کر بکھری ہوئی چیزیں سنبھالنے لگی۔ پھر وہ باہر پڑی ہوئی چار پائی بھی اٹھا کر اندر لے آئی۔

اکبر نے پہلے میرے پیر کو ٹٹول کر دیکھا پھر نذیراں کی طرف رخ کر کے بولا۔ ”تیل اور ہلدی ملا کر گرم کر لاؤ۔ میرا خیال ہے جوڑ مل گیا تھا جو اپنی جگہ پر بیٹھ گیا ہے۔ مالش کرنے سے ٹھیک ہو جائے گا۔“

نذیراں باہر چلی گئی۔ اسے واپس آنے میں دس منٹ لگے تھے۔ ایلو مینیم کے ایک ٹوکڑ میں ہلدی ملا کر ڈاؤ تیل گرم کر لیا تھا۔ اکبر میرے پیر پر مالش کرنے لگا۔ اس کا ہاتھ خاصا بھاری تھا۔ میرے منہ سے بار بار کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ مالش کر کے اس نے پیر پر کپڑا لپیٹ دیا۔

”گھبراؤ نہیں۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بس تمہیں دو تین دن آرام کی ضرورت ہے۔ اور اب تم کون ہو؟ اور وہ کون لوگ تھے جو.....“

”ڈاکو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ مجھے یتیم خانہ چوک کے قریب سے اٹھا کر لائے تھے۔ مگر میں کسی نہ کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں اپنی جان بچانے کے

”بات یہ ہے اکبر بھائی!“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی کوئی اہم آدمی نہیں ہوں۔ لیکن جن لوگوں نے مجھے اغوا کیا تھا وہ ڈاکو نہیں، قاتل ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں ایک بہت مشہور عورت کا قتل ہو گیا تھا۔ اتفاق سے کل رات مجھے پتہ چل گیا کہ قاتل ان لوگوں نے کیا تھا۔ انہیں بھی پتہ چل گیا کہ میں ان کے راز سے واقف ہو چکا ہوں۔ یہ لوگ رات کو شہر کے ایک بڑے ہوٹل سے اغوا کر کے لے آئے۔ انہوں نے مجھے ایک ویران کوئی میں رکھا اور رات بھر مار پیٹ کرتے رہے۔ تم میرے جسم پر ان کی مار کے نشان دیکھ سکتے ہو۔ رات کے آخری پہر میں موقع پا کر ان کی قید سے بھاگ نکلا۔ دوڑتے ہوئے میرے پیر میں موچ آ گئی تھی۔ مگر میں جان کے خوف سے بھاگتا رہا۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ ”اگر تمہیں اب بھی میری بات کا یقین نہ آیا ہو تو مجھے یہاں چار پائی کے ساتھ باندھ کر چلے جاؤ اور قرعہ جی تھانے میں جا کر اطلاع کر دو۔ لیکن.....“

”لیکن..... میں تو پکڑا جاؤں گا۔ اور وہ لوگ بچ نکلیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں انہیں دھوکے میں رکھ کر پکڑنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین آ گیا ہو تو مجھ پر اعتماد کر۔ میں تم لوگوں پر آئینے نہیں آنے دوں گا۔ اس دوران اگر تم میرا ایک کام کر دو تو میں فوراً یہاں سے چلا جاؤں گا اور تم لوگوں کو کوئی خطرہ بھی نہیں ہوگا۔“

”کیسا کام؟“ اس نے پوچھا۔

”ٹھوکر نیاز بیگ میں چوک کے بائیں طرف رفیق ملک نامی ایک شخص کی کوٹھی ہے۔ رفیق ملک میرا دوست ہے۔ اگر تم اسے جا کر اطلاع دے دو تو وہ مجھے آکر لے جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”رفیق ملک تو اس علاقے کا بہت بڑا زمیندار ہے۔“ اکبر نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”وہ تمہارا دوست ہے؟“

”ہاں۔ اسے جا کر بتا دو۔ وہ مجھے یہاں سے لے جائے گا اور پھر تم لوگوں کے لئے کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔“

”اب تمہیں پریشانی کی ضرورت نہیں۔“ اکبر نے کہا۔ ”میں ملک رفیق کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اس کے دوست ہو۔ اب میں تم پر کوئی آئینے نہیں آنے دوں گا۔“ وہ مڑ کر اپنی ہڈی کی طرف دیکھنے لگا۔ ”اُوئے بھلی مائیں۔ یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ اس کے لئے کوئی ناشتہ واشتہ کا بندوبست کرو۔ اور خیال رکھنا، اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔“ وہ پھر میری طرف

”اب میں چلتا ہوں۔ کھیتوں کو پانی لگایا ہوا ہے۔ دوپہر کو آکر تمہارا پتہ کروں گا۔“ اکبر کھیتوں پر چلا گیا اور نذیراں باہر جا کر ناشتہ بنانے لگی۔ یہ مکان دراصل اکبر کا ڈیرہ تھا۔ اس کا مکان تو یہاں سے تقریباً نصف میل دور گاؤں میں تھا۔ دن کے وقت یہ میاں بیوی یہاں آ جاتے تھے اور شام کو واپس چلے جاتے تھے۔ جب کھیتوں کو پانی لگانا ہوتا یا زیادہ کام ہوتا تو وہ نین چار روز یہاں رہ بھی جاتے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد نذیراں ناشتہ بنا کر لے آئی۔ پرائے اور انڈوں کا آلیٹ۔ میں چار پائی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔

نذیراں میرے سامنے دوسری چار پائی پر بیٹھی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے جب بھی اس کی طرف دیکھا، اس نے نظریں جھکالیں۔

اور پھر باہر قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔

”شاید گاؤں سے کوئی لڑکا آیا ہوگا۔ میں دیکھتی ہوں۔“ نذیراں کہتے ہوئے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

میں اطمینان سے ناشتہ کرتا رہا۔ اور پھر نذیراں کی چیخ سن کر میں چونک گیا۔ اس کے ساتھ مالکی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے دھینگا مشتکی ہو رہی ہو۔ میں نے جلدی سے چنگیر ایک رف رکھ دی اور بیٹھے بیٹھے پہلو بدلتے ہوئے پستول نکالنے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ دھکیلا تھا کہ ایک آدمی دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

”خبردار.....“ وہ چیخا۔ ”کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔“

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

وہ ٹھیک تھا جس نے مجھے پستول کی زد پر لے رکھا تھا.....!

مجھے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔

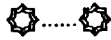
ٹھیک کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ میری طرف تھا۔ اس کی انگلی ٹرائیگر پر تھی۔ مالکی مزاحمت کرتا تو وہ بے دریغ گولی چلا دیتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ مجھے جان سے نہیں مارنا بتاتا تھا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک مجھ سے دھمکے کی کوٹھی سے لوٹی ہوئی دولت حاصل نہ کر لیں۔ لیکن ٹانگ یا بازو پر گولی مار کر زخمی تو کر سکتا تھا۔ لہذا فی الحال میرا اپنے آپ کو تکلیف میں رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”بہت چالاک سمجھتے تھے اپنے آپ کو۔“ ٹھیک کہتے ہوئے دروازے سے اندر آ گیا۔

میں معلوم تھا کہ تم زیادہ دور نہیں نکلے۔ قرب و جوار ہی میں کہیں چھپے ہوئے ہو گے۔ اور

نذیراں کے چیخنے کی آواز مسلسل میری سماعت سے نکل رہی تھی۔ وہ بیچاری شریف عورت اپنی عزت بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور پھر شاید اس کا وار چل گیا۔ اس نے تاجی کو زوردار دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر مجھ سے نکل گئی اور میں چارپائی کے دوسری طرف الٹ گیا۔ اس طرح ٹکلیل بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

میں زمین پر گر اٹھا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا، ٹکلیل نے مجھے چھاپ لیا۔ وہ مجھے بری طرح زمین پر رگید رہا تھا۔ تاجی کو بھی سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین پر پڑا ہوا پستول اٹھالیا اور اس کا دستہ پوری قوت سے میری کھوپڑی میں رید کر دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پتلی چنگاریاں قفس کرنے لگیں۔ اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا.....!



چھپنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔“

اسی دوران تاجی بھی نذیراں کو دھکیلتی ہوئی اندر آگئی۔ نذیراں لڑکھڑا کر نیچے گر گئی تھی۔ دیر پہلے باہر سے دھینگا مٹھی کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ اور اب نذیراں کی حالت دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ باہر کیا ہوا ہوگا۔ اس کے بال الجھے ہوئے اور قمیض ایک کندھے سے پھرتی ہوئی تھی۔ دھوتی بھی ٹانگوں میں الجھی ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ دھوتی کی گرہ کھل گئی تھی اور نذیراں نے ایک ہاتھ سے دونوں پلو پکڑ کر سمیٹ رکھے تھے۔

تاجی کے بال بھی الجھے ہوئے تھے اور اس کی قمیض گریبان سے پھٹی ہوئی تھی جس سے اس کے سینے کا اوپر کا حصہ برہنہ ہو رہا تھا۔ لیکن شاید اسے اپنی برہنگی کی پروا نہ تھی۔ اس کا اسٹاک اس وقت بالکل بازاری عورتوں جیسا تھا۔ چہرے پر کڑھکی اور آنکھوں میں نفرت و حقارت تھی۔ اس کے برعکس نذیراں کے چہرے پر معصومیت اور خوف کے ملے جلے تاثرات تھے۔

”حرامزادی!“ تاجی غرائی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ ”مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا تم نے۔ میرے کپڑے پھاڑ دیے۔ میں تو تمہاری ٹانگیں چیر کر رکھ دوں گی۔“

اس نے آگے بڑھ کر نذیراں کو زوردار ٹھوک ماری۔ نذیراں چیخ اٹھی۔ وہ سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ تاجی اس کی دھوتی پکڑ کر کھینچنے لگی۔ وہ بڑی حرافہ عورت تھی۔ نذیراں کو برہنہ کرنا چاہتا تھا۔ نذیراں نے بھی دھوتی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں ایک شریف عورت کی بے عزتی ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن ٹکلیل نے مجھے پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ لیکن بالآخر مجھے موقع مل گیا۔ ٹکلیل نے ایک لمحہ کو مڑ کر نذیراں کی طرف دیکھا تھا اور اسی لمحہ میں نے ٹکلیل پر چھلانگ لگا دی۔

میرے مجروح پیر کی ٹھوک اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول تو اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا مگر پیر کو جھٹکا لگنے سے میرے منہ سے بھی ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

ٹکلیل میری اس جرأت پر ایک لمحہ کو بھونچکا سا رہ گیا۔ اسے شاید میری طرف سے ایسے کسی اقدام کی توقع نہیں تھی۔ میں نے اس کی بدحواسی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ایک بار پھر اسے چھلانگ لگا دی اور اسے ساتھ لیتا ہوا دوسری چارپائی پر گر گیا۔

ہم دونوں چارپائی پر ایک دوسرے سے منقسم کھتا ہو رہے تھے۔ وہ اس وقت میرے پیچھے ہوا تھا۔ میں نے اس کے بال پکڑ لئے اور اس کا سر زور زور سے چارپائی کے پائے سے نکلایا۔

نہ تھی۔ میں ان کے راز سے واقف ہو چکا تھا۔ اس راز سے جسے چھپانے کے لئے یہ لوگ بے ہوشی کے گھاٹ بھی اتار سکتے تھے۔ لیکن دوسری طرف زندگی کی بھی امید تھی۔ انہیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ جو دولت یہ لوگ مادام دیکھ کے گھر میں چھوڑ آئے تھے وہ اب میرے قبضے میں تھی۔ اور اس دولت کو حاصل کرنے کے لئے یہ لوگ میرے جسم کا جوڑ جوڑ الگ کر دیں گے۔ اور اس وقت تک مجھے زندہ رکھیں گے جب تک میں انہیں اس دولت کا پتہ نہیں بتا دیتا یا ان کے حوالے نہیں کر دیتا۔

دفنہ میرے ذہن میں نجمہ نام کی اس لڑکی کا خیال ابھر آیا جس نے یہاں سے بھاگنے میں میری مدد کی تھی۔ وہ انہی کی ساتھی تھی۔ ٹکلیل اور فیقا جب میری دھنائی کر رہے تھے تو تاجی بھی حسب توفیق ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ لیکن نجمہ بالکل الگ تھلگ کھڑی رہی تھی۔ اور جب میں نے موقع پا کر بھاگنے کی کوشش کی تھی تو اس نے ہی مجھے باہر کا راستہ بتایا تھا جس پر مجھے اب بھی حیرت ہو رہی تھی۔ تاجی اور ٹکلیل کی ساتھی ہونے کے باوجود اس نے فرار میں میری مدد کیوں کی تھی؟ اور کیا تاجی وغیرہ کو بعد میں پتہ چل گیا تھا؟ اگر پتہ چل گیا تھا تو انہوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟

اس بند کمرے میں گرمی تھی اور میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ قمیض بھگ کر جسم سے چپک گئی تھی۔ سر اور پیر کی تکلیف نے الگ مجھے اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ پھر دروازے کے باہر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ وہ فیقا تھا جس کی ناک اب بھی پکڑے کی طرح پھولی ہوئی تھی۔

”بڑی لمبی نیند سوئے ہو رو فیقا! وہ آگے بڑھ کر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”ہم تو سمجھے تھے کہ تم بے ہوشی میں دنیا ہی چھوڑ کر چلے گئے ہو۔ پر میں نے تاجی کو بتا دیا تھا کہ تم جیسے ذہین لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔“

”میں مروں گا تو تم لوگوں کو ساتھ لے کر ہی مروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے اس طرح بانہہ کر ڈال دیا ہے تو یہ مت سمجھ لینا کہ میں بالکل بے بس ہو گیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک ایسا موقع ضرور ملے گا کہ تم سب کو جنم رسید کر سکو۔“

”یہ خیال دل سے نکال دو۔“ فیقے نے انگلی سے پھولی ہوئی ناک سہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب ہم ایسی غلطی نہیں کریں گے۔ اس مرتبہ تمہیں کوئی موقع نہیں ملے گا۔“

میں چند لمحوں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم لوگ انسانیت کے زمرے سے بھی خارج ہو چکے ہو۔“

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں پختہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اور وہی رستی میرے ٹخنوں پر بھی لپٹی ہوئی تھی۔ اکبر نے میرے پیر پر مالش کر کے لپیٹ دیا تھا لیکن اب وہ پٹی میرے پیر پر نہیں تھی۔ پیر کی سوجن کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ رستی کی اس سختی سے لگائی گئی تھی کہ رستی میری کھال میں اتری جا رہی تھی۔

میں نے پڑے پڑے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں پہلے بھی مجھے رکھا گیا تھا۔ لیکن اب یہاں نہ تو وہ پرانا صوفہ تھا اور نہ ہی وہ کرسیاں تھیں۔

کمرے میں دونوں بلب جل رہے تھے جن کی تیز روشنی کمرے میں بھری ہوئی تھی۔ پیرا پشت کھڑکی کی طرف تھی۔ اس لئے مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ دن کا وقت تھا یا رات کا۔

میں بڑی مشکل سے پہلو بدولنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ اب کھڑکی میرے سامنے تھی کھڑکی کے سامنے اگرچہ پردہ پڑا ہوا تھا لیکن باہر تیز روشنی تھی جس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ صبح وقت کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ اور صبح تو بڑا اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا تھا۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ پستول کے دستے کی ضرب سے کھال پھٹ گئی تھی اور غالباً خون بھی نکلا تھا۔ بال جڑے ہوئے سے لگ رہے تھے اور گردن پر بھی چھپا ہوا محسوس ہو رہی تھی۔

رستی کی بندش کی وجہ سے ٹخنوں میں بھی شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ پوری ٹانگ ٹخنوں کی طرح اکڑی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔

میں اپنا دھیان بنانے کے لئے نذیراں کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے بے ہوش ہونے کے بعد پتہ نہیں ان لوگوں نے اس بیچارے کی ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ یہ دونوں مجھے تلاش کرتے ہوئے وہاں تک کیسے پہنچ گئے تھے؟

میں جیسے جیسے سوچتا رہا، میرے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی گئی۔ میں دوبارہ ان کے ہاتھ لگا دیا تھا اور اب مجھے ان سے رحم کی توقع نہیں تھی۔ نہ ہی اب مجھے یہاں سے فرار کا موقع ملے گا۔

”کیا تم نہیں چاہتے کہ تم بھی خود مختار ہو۔ تمہاری زندگی پر تمہارا اپنا اختیار ہو؟“
”کیا کیا چاہتے ہو روٹی باؤ؟“ اس نے میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”میں تمہیں اتنا بیوقوف نہیں سمجھتا کہ سیدھی سی بات نہ سمجھ سکو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں معلوم ہے انہوں نے مجھے کیوں پکڑا ہوا ہے؟“
”مجھے تاجی بی بی کے اندرونی حالات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو بس اس کے حکم کا بندہ ہوں۔ وہ جو کہتی ہے میں کرتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”بات یہ ہے فیچے!“ میں کہتے کہتے رک گیا پھر بولا۔ ”لیکن پہلے یہ بتاؤ، تاجی اور ٹھکیل کہاں ہیں۔ میرا خیال ہے وہ گھر پر نہیں ہیں۔“

”وہ گھر پر نہیں ہیں تو یہ مت سمجھنا کہ تم مجھے دھوکا دے کر نکل سکو گے۔ ویسے نجمہ بی بی گھر میں ہے۔ مگر اسے ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اس نے بہت ساری کتابیں جمع کر رکھی ہیں۔ بس ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتی رہتی ہے۔ لیکن تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”بات یہ ہے فیچے!“ میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”میری ان لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ کل سے پہلے تک تو ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تھے۔“
”تو پھر ان کا دماغ خراب ہے جو تمہیں اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں؟“ فیچے نے کہا۔

”وہی بتانے جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ یہ دونوں میرا مطلب ہے کہ تاجی اور ٹھکیل ایک عورت کے قتل میں ملوث ہیں۔ تم نے بھی سنا ہوگا، پندرہ روز پہلے ایک غیر ملکی عورت کو قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ قتل ان دونوں نے کیا تھا۔“

”میرا خیال ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔
”یہ درست ہے۔ میں اس قتل کا چشم دید گواہ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ اتفاق سے کل ان کی نظروں میں آ گیا اور یہ لوگ مجھے پکڑ لائے۔ اس کے علاوہ.....“
”اس کے علاوہ کیا.....؟“ وہ بولا۔

”وہ عورت بہت دولت مند تھی۔“ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھکیل اور تاجی کو موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ قتل کے فوراً بعد فرار ہو گئے تھے اور اتفاق سے اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ مجھے موقع مل گیا اور میں وہ دولت سمیٹ کر لے گیا۔ تمہیں یاد ہے کہ جب یہ دونوں اس لاکٹ کے بارے میں پوچھ رہے تھے تو انہوں نے تمہیں کمرے سے نکال دیا تھا۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ فیچے نے مجھے گھورا۔ ”ویسے ایک بات شاید تم بھول گئے ہو کہ جیسے لوگ جس دھندے سے وابستہ ہیں اس میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ انسانیت اسی وقت ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے جب جرائم کی دنیا کی طرف پہلا قدم اٹھتا ہے۔ ویسے کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ پانی پلا دو۔“ میں نے کہا۔ فیچے کو اس کمرے میں آئے ہوئے تین چار منٹ ہو چکے تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس دوران کسی طرف سے کوئی آواز نہ نہیں دی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ اگر فیچا اکیلا ہی ہے تو اسے پنانے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت تو واقعی مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔

فیچا چند لمحوں میں مجھے دیکھتا رہا، پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ پانی سے بھرا ہوا گلاس لے آیا اور گلاس میرے سامنے فرش پر رکھ دیا اور مجھے سہارا دے کر اٹھانے لگا۔ میرے پیچھے بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ فیچے نے بڑی بے دردی سے مجھے اٹھایا تھا۔ پیر ذرا سا مارا تو میرے منہ سے کراہ خارج ہو گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے مجھے سہارا دے رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے گلاس اٹھا کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں ایک ہی سانس میں پانی پی گیا۔

”شکریہ۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”گلتا ہے ابھی تم میں تھوڑی سی انسانیت باقی ہے۔“

”پیاس کو پانی پلانا تو بڑے ثواب کا کام ہے روٹی باؤ!“ وہ بولا۔
”اور اسی طرح کسی کے ہاتھ پیر توڑنا بھی ثواب کا کام ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تاجی کے ساتھ کب سے ہو؟“

”کئی سال ہو گئے۔ پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس نے مجھے گھورا۔
”اس سے پہلے تم ہیرا منڈی میں تھے اور میرا خیال ہے تاجی کا تعلق بھی ہیرا منڈی سے ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے ساتھ رہتے ہوئے تم عیش تو ضرور کر رہے ہو گے۔ لیکن کہلاؤ گے دلال ہی۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ فیچے نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ ”جب آدمی کا ضمیر مر جائے، غیرت ختم ہو جاتی ہے تو اسے چاہے دلال کہہ کر بلایا جائے یا کچھ اور۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”بہت فرق پڑتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم ساری زندگی ایک عورت کی غلامی کرنے

”شکریہ۔“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے میری طرف دیکھے بغیر باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے تالے میں چابی مٹھنے کی آواز بھی سنی تھی۔

میں اپنے آپ کو کھینٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے لیکن چیر محل جانے سے اب میں ٹانگیں پھیلا سکتا تھا۔ میرا پیر بہت زیادہ سوج گیا تھا اور پوری ٹانگ میں درد کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

وقت گزرتا رہا اور میں ان لمحات کو کوستا رہا جب گزشتہ روز اپنی نئی خریدی ہوئی کار پر فائو اسٹار ہوٹل گیا تھا۔ اس وقت مجھے اچانک ہی کار کا خیال آ گیا۔ اگر کار کہیں سڑک پر کھڑی ہوتی تو اسے لاوارث سمجھ کر یا تو پولیس اٹھا کر لے جاتی یا چور اس پر ہاتھ صاف کر چکے ہوتے۔ لیکن کار ایک فائو اسٹار ہوٹل کے پارکنگ لائٹ پر کھڑی تھی۔ اس کے چوری ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا اور نہ ہی اس بات کا ڈر تھا کہ ہوٹل والے اسے لاوارث قرار دے کر پولیس کے والے کر دیں گے۔ اس ہوٹل میں شہر کے معززین کی آمد و رفت تھی۔ بعض لوگ تو کئی کئی روز تک اپنی گاڑیاں یہاں چھوڑ جاتے تھے۔

اس وقت شام ہونے والی تھی۔ کھڑکی کے باہر اب دھندلا سا چھانے لگا تھا۔ بہت دیر سے گھر میں چلنے پھرنے اور باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن میرے کمرے میں کسی نے ہمارا ٹک ٹک نہیں تھا۔ میں نے صبح کا شنکار اکبر کے گھر میں ناشتہ کیا تھا اور اس کے بعد ایک قبل تک اڈ کر منہ میں نہیں گئی تھی۔ ان لوگوں نے جان بوجھ کر مجھے کھانا نہیں دیا تھا۔ مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ مجھے بھوکا رکھ کر اذیت پہنچائی جائے۔ مجھے کمرے میں بند کرنے کے بعد تاجی اور ٹکیل کہیں چلے گئے تھے۔ فیفا میری عمرانی کے لئے یہاں تھا۔ اسے بنیادیت کی لگی ہوگی کہ مجھے کھانے پینے کو نہ دیا جائے۔ لیکن فیفا کی یہ مہربانی تھی کہ اس نے دوپہر کو مجھے ایک گلاس پانی پلا دیا تھا۔ اب مجھے پھر پیاس لگنے لگی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ اب کھڑکی کے باہر بالکل اندھیرا تھا۔ میں اب پیر کی تکلیف اور بھوک کی وجہ سے بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ چیخا شروع کر دوں تاکہ میری آوازیں سن کر کوئی تو اندر آئے۔ لیکن پھر میں نے یہ فیصلہ ذہن سے نکال دیا۔ چیخنے کو میری کڑوی سمجھا جائے گا جس سے یہ لوگ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اور میں تاجی جیسی اذیت کے سامنے اپنے آپ کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ہاں..... اور شاید یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے کسی معاملے میں مجھ سے رازداری نہ کی۔“ فیتہ نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے دل میں شک پیدا ہو چکا تھا۔

”تاجی اور ٹکیل مجھ سے وہ دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ ”اور یہ دولت حاصل کرنے کے بعد وہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے۔ لیکن اگر تم چاہو اس دولت میں سے تمہیں حصہ مل سکتا ہے۔ لاکھوں کے حساب سے۔ اپنا حصہ لے کر کہیں چلے جانا۔ اتنا دور کہ یہ لوگ تمہاری گرد کو بھی نہ پاسکیں۔“

”رونی باؤ!“ فیفا میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم مجھے اتنا بیوقوف سمجھتے ہو کہ تمہاری باتوں میں آکر تاجی بی بی سے غداری کروں؟ نہیں رونی باؤ..... میں تو تاجی سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب میں سڑکوں پر ٹھوکریں کھا تھا۔ میرے اپنے بھی مجھے چھوڑ چکے تھے۔ میں تین دن کے فاقے سے تھا اور بھوک کی شدت سے غمگین تھا کہ رونی میں گر پڑا تھا۔ تاجی ہی وہ عورت تھی جس نے مجھے گندی نالی سے اٹھا سہارا دیا تھا اور مجھے اپنے گھر لے آئی تھی۔ وہ ناچنے والی تھی تو کیا ہوا، اس میں انسانیت تھی۔ اس نے بھوک سے مرتے ہوئے ایک شخص کو زندگی دی تھی۔ میں اس کی مہربانی کو کبھی بھول سکتا ہوں۔ یہ زندگی اس کی دی ہوئی ہے۔ میں اس سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اسے پٹانے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن میں نے اس کے دل میں شک کا بیج بو دیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر میری کہانی ضرور رنگ لائے گی۔ وہ جب واپس جانے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔“

”حالات نے تمہیں ایک طوائف کے قدموں میں ڈال دیا ہے لیکن تم فطرتاً ایک شریف انسان ہو۔ میرے ساتھ ایک نیکی کرتے جاؤ۔“

”بولو۔“ اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”میرے پیر کھول دو۔“ میں نے کہا۔ ”میرے منحنے میں موج آگئی تھی۔ اور تم دیکھ رہے ہو کہ میرا پیر سوجا ہوا ہے۔ رسی سے مزید تکلیف ہو رہی ہے۔ یقین کرو بھائی تو کیا میں اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر تم میرے پیر کھول دو تو تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“ وہ چند لمحوں میری طرف دیکھتا رہا، پھر جھک کر میرے قریب بیٹھ گیا اور پیروں کی بندھن کھولنے لگا۔

میرے پیر آزاد کر کے اس نے رسی میرے ہاتھوں پر پلیٹ دی۔

”پلاؤ۔“ تاجی نے روکھے لہجے میں کہا۔

فیاضی سے باہر نکل گیا اور چند منٹ بعد پانی کا گلاس لے کر آ گیا۔ میں اس وقت واقعی بڑی شدت سے پانی کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ میں نے فیضی کے ہاتھ سے گلاس جھٹ لیا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی حلق میں اندر لیا اور پھر بڑے اطمینان سے مگ اٹھا کر چائے کی چمکیاں لینے لگا۔

مورتی حال بڑی تشویشناک تھی۔ ٹکیلی اور تاجی کے ہاتھوں میں پستول تھے اور فیضی بھی زانٹ سننے کے بعد سینڈو کی طرح تن کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ ویسے میرا ان سے الجھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پیر سو جا ہوا تھا۔ ٹانگ تنخنے کی طرح اکڑی ہوئی تھی اور کھوپڑی میں بھی ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ اگر میں بھڑنے کی کوشش بھی کرتا تو ان کا کچھ نہیں لگاڑ سکتا تھا۔

چائے پی کر میں نے مگ ایک طرف رکھ دیا اور مسکراتی ہوئی نظروں سے تاجی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ارادے بڑے خطرناک نظر آ رہے تھے۔ پہلی مرتبہ جب میں نے اسے ٹکیلی کے ساتھ مادام دکھنے کی کوشش سے نکلنے ہوئے دیکھا تھا تو وہ مجھے حسین لگی تھی۔ دوسری مرتبہ ہوٹل کے پارکنگ لاٹ پر کھڑی ہوئی کار کے اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی بہت حسین لگی تھی۔ اور پھر جب اس نے میری دھناتی شروع کی تھی تو پہلی مرتبہ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ بعض حسین عورتیں جلاد سے بھی زیادہ ظالم اور سفاک ہوتی ہیں۔ اور اس وقت بھی وہ پستول تانے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا مگر اس کی نظریں قہر بر سار ہی تھیں۔

”کیا ارادہ ہے؟“ میں نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ”غصے میں تو تم بہت زیادہ حسین لگتی ہو۔“

”میں ابھی تمہیں حسن کا جلوہ دکھاتی ہوں۔“ تاجی کے حلق سے جلی جیسی غراہٹ نکلی۔ ”نہیۓ؟“ وہ اس کی طرف گھوم گئی۔ ”اس سے پوچھو کہ اس نے وہ دولت کہاں چھپا رکھی ہے۔ جب تک زبان نہ کھولے اس کی دھناتی کرتے رہو۔ ہڈیاں توڑ دو اس کی۔“

میں نے فیضی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ اور تن گیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی تناؤ بڑھ گیا تھا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ دولت کا نام سن کر اس کی آنکھوں میں ایک لمحہ کوچک سی ابھرا آئی تھی۔ اسی دولت ہی کے حوالے سے میں نے اسے درغلانے کی کوشش کی تھی کہ تاجی اسے اچھکے میں رکھے ہوئے ہے۔ اسے زرخیز غلام سمجھتی ہے اور ساری اہم باتیں اس سے چھپائی جاتی ہیں۔ اور وہ کسی حد تک میری باتوں میں آ بھی گیا تھا۔ میرے ہاتھ کھولتے ہوئے جب

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور وہ تینوں اندر داخل ہوئے۔ سر سے آگے تاجی تھی۔ اس کے پیچھے ٹکیلی اور فیضی۔ فیضی نے ہاتھ میں پائرسک کا گگ پکڑ رکھا تھا۔ مجھے یوں ٹانگیں پیارے دیکھ کر تاجی کی بھنویں سکڑ گئیں۔ اس نے گھور کر فیضی کی طرف دیکھا۔ فیضی اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا۔

”یہ بہت تکلیف میں تھا تاجی بی بی! اس لئے میں نے اس کے پیر کھول دیئے۔“ فیضی نے کہا۔ ”لیکن میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کوئی چالاکی نہ دکھانے پائے۔“

”تم نہایت احمق ہو۔“ تاجی نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ اس کے ہاتھ پیر نہ کھولے جائیں تو تم نے حکم عدولی کیوں کی؟ میں دیکھ رہی ہوں کہ چند روز سے تم سر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہو۔ شاید بھول گئے ہو کہ تم کون تھے اور میں کون ہوں؟“

”میں بالکل نہیں بھولا ہوں تاجی بی بی!“ فیضی نے جواب دیا۔ تاجی کی ڈانٹ سے اس کا منہ لٹک گیا تھا۔

”تم جاننے ہو یہ کتنا خطرناک ہے۔ اسے دوبارہ پکڑنے کے لئے ہمیں کتنی محنت کرنی پڑی، تمہیں شاید اس کا اندازہ نہیں۔ اگر یہ کوئی چالاکی دکھا کر بھاگ جاتا تو کون ذمہ دار ہوتا؟“

”معافی چاہتا ہوں تاجی بی بی! آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“ فیضی کا لہجہ بھیک ماننے والا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ تاجی نے کہا۔ ”اب اس کے ہاتھ کھول دو اور اسے چائے پلاؤ۔“

فیضی نے میرے قریب آ کر مگ فرش پر رکھ دیا اور مجھے دیوار سے ہٹا کر میرے ہاتھ کھولے لگا۔ اس نے رتی بھی سمیٹ کر ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ کیونکہ پچھلی مرتبہ میں رتی کو بھی ہتھیار کے طور پر استعمال کر چکا تھا۔ بندشیں کھلنے کے بعد میں کلاسیاں سہلانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی فیضی کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے بہت مدہم لہجے میں کہا۔

”دیکھ لیا۔ تمہیں شاید پہلے بھی دوسروں کے سامنے ایسے ہی ذلیل کیا جاتا رہا ہوگا۔ کیا تمہاری غیرت بالکل مر چکی ہے؟“

”کیا کہہ رہا ہے یہ؟“ تاجی کی کڑکٹی ہوئی آواز کمرے میں گونج گئی۔

”پپ..... پانی مانگ رہا ہے تاجی بی بی!“ فیضی نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ میری بات نے اس پر تھوڑا بہت اثر کیا تھا۔

میں نے دوبارہ فیقے کو لات مارنے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس مرتبہ وہ بچ گیا اور اس نے بڑی بھرتی سے میرے جڑے پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ ایک زوردار گھونسہ میرے جڑے پر چڑھا۔ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ یوں تو پورا جڑا ابل کر رہ گیا تھا مگر ایک دانت نے شاید اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔

اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کر کے مجھ پر بھی گویا جنون سا طاری ہو گیا۔ میرے دواؤں اٹھ آزاد تھے۔ میں فیقے کے پیٹ پر گھونسے برسائے لگا۔ ایک گھونسہ اس کی ناف کے نیچے لگا۔ وہ بری طرح بلبلاتا اٹھا۔ اس نے میرے بال بھی چھوڑ دیئے اور دوہرا ہوتا چلا گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر سر کی زوردار ٹکڑی کر دی۔ مگر اس کی زخمی ناک پر لگی اور وہ چیخ کر برہا ہو گیا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ میرا جنون ہی تھا کہ مجھے اپنے پیر کی تکلیف کا حس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جبکہ کر فیقے کو اٹھالیا۔ وہ مجھ سے زیادہ قد آور اور بھاری برم تھا مگر میں اسے دونوں ہاتھوں پر سر سے اوپر اٹھاتا چلا گیا۔

اس دوران میری نظریں تاجی کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی تھی۔ میں نے اسے کچھ سوچنے کا موقع دیئے بغیر فیقے کو پوری قوت سے اس پر اچھال دیا۔ فیقا تاجی سے ٹکرایا اور وہ دونوں نیچے گر گئے۔ تاجی اس کے نیچے دب گئی تھی اور بری طرح بٹاری تھی۔ اور پھر اس کے منہ سے ایسی گندی گالیاں نکلنے لگیں جو میں نے کبھی کسی مرد کے منہ سے نہیں سنی تھیں۔

فیقے کو اچھالنے کے بعد میں بھی اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ میرے مضروب پیر بلکہ پوری ٹانگ میں بہت شدید ٹیسس اٹھنے لگی تھیں۔ میں اپنی تکلیف ضبط کرتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت تکلیف مجھ پر حملہ آور ہوا۔

اس نے ہتھول جیب میں ڈال لیا تھا اور لاتوں اور گھونسوں سے میری تواضع کر رہا تھا۔ فیقا اٹھ کر میرے جسم پر ٹھوکریں اور گھونسے برسائے لگا۔ اس پر جنون طاری تھا۔ میرے جسم پر اسے والی ہر ٹھوک اور ہر گھونسے کے ساتھ اسکے منہ سے بڑی غلیظ گالیاں بھی نکل رہی تھیں۔

میری ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ جسم کے ہر حصے پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ سر ہٹ سے بھی خون بہہ کر گردن پر رنگ رہا تھا اور دونوں مجھے بری طرح پیٹ رہے تھے۔

مارو..... مارو..... اس حرامزادے کی ہڈیاں توڑ دو۔ اور مارو اسے..... اتنا مارو کہ یہ زندگی

میں نے اسے تاجی کے رویے سے اس کی ذلت کا احساس دلایا تھا تو بات اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ اس لئے اس نے تاجی کے پوچھنے پر کہا تھا کہ میں پانی مانگ رہا ہوں۔ لیکن اس کے چہرے کے تاثرات یکدم بدل گئے تھے۔

”کیوں بھی روئی باؤ!“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”اس دولت کی کہانی مجھے تم نے سنائی تھی۔ اب بتاؤ کیا ارادہ ہے؟“

میں نے تاجی کی طرف دیکھا۔ فیقے کی بات سن کر تاجی چونک گئی تھی۔

”اوہ.....“ وہ بولی۔ ”تو اس نے تمہیں کوئی کہانی بھی سنائی تھی۔ وہ کہانی بالکل سچی ہے۔“

فیقے! اب تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس نے وہ دولت کہاں چھپا رکھی ہے۔“

”اس کے تو فرشتے بھی بتائیں گے تاجی بی بی!“ فیقے نے جواب دیا اور جھک کر میرا گریبان پکڑ لیا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ مجھے اس طرح اٹھاتا چلا گیا جیسے میرا کوئی وزن نہ ہو۔ میرے پیر زمین سے تقریباً ایک فٹ اوپر اٹھ گئے۔

فیقے نے مجھے ایک جھٹکے سے نیچے گرا دیا مگر میرا گریبان چھوڑا نہیں۔ میرے دونوں پیر جھٹکے سے زمین پر گئے۔ زیادہ زور اسی پیر پر پڑا تھا جو کپے کی طرح پھولا ہوا تھا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے مجھے دوبارہ اوپر اٹھالیا۔ اور اس مرتبہ جھٹکے سے نیچے گراتے ہوئے میرا گریبان بھی چھوڑ دیا۔ پیر زمین پر لگتے ہی میرے منہ سے ایک بار پھر ہلکی سی چیخ نکل گئی اور میں لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ فیقے نے ایک بار پھر مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھالیا اور دیوار کے ساتھ ٹخ دیا۔ میری کھوپڑی دیوار سے ٹکرائی اور میری آنکھوں کے سامنے تیز روشنی کے جھماکے سے ہونے لگے۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔

فیقے نے اس مرتبہ مجھے گریبان سے پکڑنے کی بجائے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ میں ادھر ادھر لڑھک کر بچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ہر مرتبہ لگنے والی ٹھوک میرے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ گرما دیتی۔

ایک مرتبہ موقع پا کر میں نے فیقے کا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ میں بھی سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اب میں نے طے کر لیا تھا کہ اس طرح آسانی سے نہیں ہٹا رہوں گا۔

فیقے نے مجھے ایک موٹی سی گالی دی اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے زمین پر پڑے پڑے لات چلا دی۔ میرے پیر کی ٹھوک اس کے تھوڑے پر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا کٹر ابل پڑا تھا۔

ذہن میں در آیا تھا۔

یہ تو ملے ہو چکا تھا کہ مادام دھکے کوتاجی اور کلکیل نے ہی قتل کیا تھا۔ لیکن کیوں؟ ایک غیر ملکی سفارت کار سے ان کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ تاجی نے بتایا تھا کہ مادام دھکے سے اس کی دوستی تھی۔ ہو سکتا ہے انہوں نے یہ قتل دھکے کی دولت حاصل کرنے کے لئے کیا ہو۔ لیکن اس کو قتل کرنے کے بعد وہ وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ تاجی کے کہنے کے مطابق باہر سے فائرنگ کی آوازیں سن کر وہ بدحواس ہو گئے تھے اور بڑی عجلت میں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ مگر تاجی کی یہ بات میرے حلق سے نہیں اترتی تھی۔

بقے کے کہنے کے مطابق تاجی ایک ناچنے والی طوائف تھی۔ اگر دھکے کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو ایک حسین عورت کی اس تک رسائی سمجھ میں آتی تھی۔ مگر ایک طوائف کا مادام دھکے جیسی معزز اور باعزت عورت سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔ مادام دھکے سے تاجی کی دوستی والی بات بھی میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔

بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مادام دھکے کو محض اس کی دولت کے لئے قتل نہیں کیا گیا تھا۔ قتل کی اصل وجہ کچھ اور تھی۔

دفعۃ میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ رخصی نے کہا تھا کہ مادام دھکے یہاں کسی اہم اور فخریہ مشن پر آئی ہوئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ مشن کیا تھا۔ لیکن اب اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ اس کے قتل کی وجہ بھی دولت نہیں، کچھ اور تھی۔

اس رات گلے میں اس لاکٹ کی وجہ سے میں ہوٹل میں پکڑا گیا تھا۔ اور جب تاجی اور کلکیل پر یہ انکشاف ہوا کہ دھکے کی کوٹھی سے ان کے فرار کے بعد میں وہاں پہنچ گیا تھا تو انہوں نے مجھے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن تاجی وہ دولت بھی حاصل کرنا چاہتی تھی جو میں دھکے کی کوٹھی سے اڑا لیا تھا۔ اس دولت کے لئے وہ مجھے اذیتیں دے رہے تھے۔

میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ہلکی سی آہٹ سن کر چونک گیا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ تالے میں چابیاں گھمانے کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور پھر ہینڈل آہستہ آہستہ کھولنے لگا۔ لگتا تھا جیسے کوئی بہت محتاط انداز میں دروازہ کھول رہا ہو۔

اور پھر ہلکے سے جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ میں نجمہ کو دیکھ کر اچھل پڑا۔ اس نے محتاط انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ آئی۔ وہ ننگے پیر تھی۔ اس لئے میں دروازے کے اندر اس کے قدموں کی آواز نہیں سن سکا تھا۔

”اٹھو۔ جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

میں کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے۔“

پہنچے ہوئے ایک مرتبہ میری نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے وہاں پر کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ دروازے کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

بقیے نے ایک بار پھر مجھے گریبان سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ اس وقت میرے دونوں پیر زمین ہی تھے۔ اس نے میرے مضروب پیر پر زوردار ٹھوکر ماری۔ میں چیخ اٹھا۔ وہ مجھے دھکیلا۔ پیچھے لے گیا اور پھر مجھے اوپر اٹھا کر دیوار کی طرف اچھال دیا۔

میرا سر دیوار سے ٹکرایا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی سی چنگاریاں رقص کرنے لگیں۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ لہراتا ہوا نیچے گرا اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا.....!



میرے چاروں طرف سناٹا تھا۔ کوئی معمولی سی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہوا میں آنے کے بعد بھی کافی دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا تھا۔ میرا پورا جسم پھوڑے کی طرح ڈھک رہا تھا اور دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ ان کم بختوں نے مجھے رُوئی کی طرح دھکے رکھ دیا تھا۔ کھڑکی کے باہر گہری تاریکی تھی اور اندر لمبوں کی روشنی۔ مجھے وقت کا کوئی انداز نہیں تھا۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو پیر سے اٹھنے والی ٹیسس پورے جسم پر پھیلتی چلی گئیں۔ اور پھر اسی وقت مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ میرے ہاتھ پیر کھلے ہوئے تھے انہوں نے شاید مجھے اس لئے نہیں باندھا تھا کہ اب میں اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سوں گا۔ میں اپنے آپ کو گھسینا ہوا دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے ٹانگے دبائے لگا جو تختے کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ میرے کان کوئی آواز سننے کے منتظر تھے مگر پورے گھر پر سناٹا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ رات کا آخری پیر ہو گا اور سب لوگ سو رہے ہوں گے۔ میں شدید زخمی تھا۔ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور دروازہ بند تھا۔ انہیں یہ اطمینان ہو کہ میں یہاں سے بھاگ نہیں سکوں گا۔ اس لئے اطمینان سے سو گئے تھے۔

میرے جسم کے ہر حصے سے ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ میں واقعی بہت ڈھیٹ تھا۔ اتنی دھماکا کسی اور کی ہوئی ہوتی تو ختم ہو چکا ہوتا۔

نجانے کیوں..... میرے ذہن میں اچانک ہی مادام دھکے کا خیال ابھر آیا۔ اپنی صورتحال دیکھتے ہوئے تو مجھے اپنے علاوہ کوئی اور بات سوچنی ہی نہیں چاہئے تھی۔ لیکن مادام دھکے

”میں نے کہا۔“ اگر بے قابو ہو کر الٹ گئی تو.....“
”مگر انہوں نے راستے میں ہمیں دیکھ لیا تو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ نجمہ نے کچکا پاتی ہوئی

تواڑ میں کہا۔

میں خاموش ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کار چند منٹ میں ہی نہر والی سڑک پہنچ گئی۔ نجمہ نے اسٹیرنگ بائیں طرف گھما دیا اور چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار ایک پہاڑ پر کر کے نہر کے دوسرے کنارے والی سڑک پر آگئی اور یونیورسٹی کیمپس کی طرف دوڑنے لگی۔ نہر کے دوسری طرف سامنے سے آنے والی سڑک تھی۔ جس پر اکا دکا گاڑیوں کی آمد و رفت تھی۔

تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد نجمہ نے کار بائیں طرف سڑک پر موڑ دی۔ یہ مین روڈ تھا۔ اگرچہ رات کے ساڑھے گیارہ بجتے والے تھے مگر یہاں ٹریفک بھی زیادہ نہ تھی۔ نجمہ کو ایک ٹریفک سگنل پر کار روکنا پڑی۔ اس وقت ایک اور کار ہمارے برابر رک گئی۔ اس میں تین عورتیں تھیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت نے میری طرف دیکھا۔ میرا حلیہ بہت اتر تھا۔ ناک اور ہونٹوں سے خون بہہ کر جم چکا تھا۔ گردن پر بھی سر سے بہنے والا خون جما ہوا تھا اور سر کے بال بھی خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس عورت نے اپنی ساتھیوں سے کچھ کہا اور وہ بھی مڑ کر میری طرف دیکھنے لگیں۔

سگنل جیسے ہی تبدیل ہوا، نجمہ نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار دائیں طرف ایک ذیلی سڑک پر موڑ کر روک لی۔ اس سڑک کے ایک طرف وسیع و عریض میدان تھا اور دوسری طرف بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ نجمہ کے ہاتھ اسٹیرنگ پر تھے اور وہ گہرے گہرے ہانس لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔

”کیا ہوا؟“ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس طرح گردن گھمانے سے میں بے اختیار کراہ اٹھا تھا۔ جسم کا کوئی حصہ سلامت نہیں رہا تھا۔

”میں تمہیں کوٹھی سے لے آئی ہوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہاں لے کر جاؤں۔“ اس نے ناگہانیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں میں تمہیں لے جا سکوں۔“ نجمہ نے کہا۔ ہمارا بھی کوئی ٹھکانہ تو ہوگا۔ مجھے پتہ بتاؤ۔“

”میں اٹھ نہیں سکتا۔“ میں نے اپنے پیر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اگر تم میری مدد کرنا چاہتی ہو تو ہاتھ کچھ آگے بڑھانا پڑے گا۔“

اس نے شاید پہلی مرتبہ غور سے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر دہشت ابھرائی۔ اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھا دیا۔ میرا مضروب پیر زمین پر نہیں ٹک رہا تھا۔ نجمہ نے میرا بازو اپنے کندھوں پر رکھ لیا اور اپنا ایک بازو میری کمر میں سما لے کر دیا اور مجھے اس طرح سہارا دے کر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

”تم اپنی جان خطرے میں کیوں ڈال رہی ہو؟ اگر ان میں سے کسی کی آنکھ کھل گئی تو وہ میرے ساتھ تمہیں بھی جان سے مار دیں گے۔“ میں نے مدھم لہجے میں کہا۔

”شکیل اور تاجی گھر پر نہیں ہیں۔ فیچے کو میں نے نیند کی گولیاں دے کر بے ہوش کر دیا ہے۔ اور یہ وقت باتوں کا نہیں ہے۔ ذرا تیز چلنے کی کوشش کرو۔“ نجمہ نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

میری حالت بہت ہی اتر تھی۔ پیر زمین پر نہیں دھرا جا رہا تھا۔ میں اس کے کندھے پر بوجھ ڈالے مینڈک کی طرح پھدک پھدک کر چل رہا تھا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ میرے جسم کے جوڑ بھی مل رہے تھے۔

نجمہ مجھے کسی نہ کسی طرح کمرے سے نکال کر برآمدے میں لے آئی۔ پورچ میں سرخ شیراڈ کھڑی تھی۔ برآمدے کی سیزھیاں اترنا اور بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا تھا۔

نجمہ نے کار کا پینچر سیٹ والا دروازہ کھول کر مجھے اندر بٹھا دیا اور دوڑتی ہوئی دوبارہ اندر چلی گئی۔ اس کی واپسی میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس مرتبہ دوپٹہ بھی اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا اور پیروں میں سینڈل بھی تھے۔ ایک ہاتھ میں پرس بھی تھا۔ اس نے پرس کھڑکی سے میری گود میں ڈال دیا اور دوڑ کر باہر کا گیٹ کھول کر واپس آگئی۔

اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ کر اس نے انجن اشارت کیا اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ کار کے ڈیش بورڈ پر لگی ہوئی گھڑی گیارہ کا وقت بتا رہی تھی۔

میں نے نجمہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف نمایاں تھا اور اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کتنی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ ایک موقع پر تو کار بے قابو ہو کر سڑک سے اتر گئی تھی لیکن نجمہ نے فوراً ہی قابو پالیا تھا۔

رکشہ ڈرائیور نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”کیا بہن؟“ وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ان کی یہ حالت.....“

”سیڑھیوں سے گر پڑے تھے۔“ نجمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”پیر میں موج آئی ہوئی تھی۔ کھڑا تو ہوا نہیں جاتا۔ کسی سہارے کے بغیر اوپر کی منزل سے نیچے آنے کی کوشش کی تو برہوں پر قلابازیاں کھاتے ہوئے نیچے آئے..... انہیں اپنے بھائی کے کلیک لے کر جا رہی ہوں۔ کم بخت گاڑی کو بھی اسی وقت خراب ہونا تھا۔“

چیر کی تکلیف کی وجہ سے میرے لئے رکشے میں بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے مجھے سہارے کے سیٹ پر بٹھا دیا۔ میرا سو جا ہوا پیر دیکھ کر اسے نجمہ کی بات کا یقین آ گیا تھا۔ ویسے بھی نجمہ پر وقار شخصیت کی مالک تھی۔ اور پھر اتنی شاندار کار کے ہوتے ہوئے اس پر کون شبہ کر سکتا تھا۔

رکشہ مختلف سڑکوں پر دوڑتا رہا۔ ڈرائیور کوئی شریف آدمی تھا۔ میری تکلیف کو دیکھ کر وہ بہت محتاط انداز میں رکشہ چلا رہا تھا تاکہ جھٹکے لگنے سے مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

رکشہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ٹوٹکھا تھانے کے سامنے دلی دروازے کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گیا۔ اس سڑک کے ایک طرف بلندی پر ریلوے لائن تھی اور دوسری طرف باڑوں، غریبوں کی دکانیں تھیں جو اس وقت بند تھیں۔ لیکن اس سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا۔

دو موہرے پل سے ذرا پہلے رکشہ رُک گیا۔ ڈرائیور اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن تیل ختم ہو چکا تھا۔ انجن کیسے اسٹارٹ ہوتا؟

نجمہ نیچے اتر گئی۔ اس نے پرس میں سے پیسے نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیے اور نے بھی سہارا دے کر نیچے اتار لیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک اور رکشہ قریب سے گزر کر چند گز آگے ل گیا۔ میں نجمہ کے سہارے مینڈک کی طرح چھدکتا ہوا اس رکشے کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے والے نے بھی اتر کر مجھے سہارا دیا اور سیٹ پر بٹھا دیا۔

”کہاں جانا ہے بی بی؟“ اس نے مڑ کر نجمہ کی طرف دیکھا۔

”تیرا احاطے۔“ نجمہ سے پہلے میں بول پڑا۔

رکشہ دو موہرے پل کے نیچے سے گزر کر جی ٹی روڈ پر دائیں طرف مڑ گیا۔ اب ہم ایک لائن سے واپس جا رہے تھے اور ریلوے لائن ہمارے دائیں طرف تھی۔

اسٹیشن کی عقبی سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر میں نے رکشہ بائیں طرف سلطان پورہ کی طرف ہٹنے والی سڑک پر مڑوا لیا اور کچھ آگے جانے کے بعد میں نے ڈرائیور کو رکشہ روک لینے کو

”اوہ.....“ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اچھا ہوا اس نے مجھے بتا دیا تھا۔ ورنہ پورے شہر میں گھماتی رہتی۔ ایک طرف پولیس کو میری تلاش تھی اور دوسری طرف ملک شاہ کے آدمی باؤں کے کتوں کی طرح شہر بھر میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اور پھر میرا طریقہ ایسا تھا کہ کوئی بھی شخص مجھے دیکھ کر پولیس کو اطلاع دے سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے.....“ میں نے کہا۔ ”کار کو وحدت روڈ کی طرف لے چلو۔“

وہ چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتی رہی اور پھر انجن اسٹارٹ کر کے کار کو آگے بڑھا دیا۔ میدان کے اوپر سے ایک طویل چکر کاٹ کر وہ کار کو ایک اور سڑک پر لے آئی۔

میں نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ سر میں دھماکے سے ہونے لگے تھے اور ٹانگ سے اٹھنے والی ٹیسیں پورے بدن میں پھیل رہی تھیں۔ ویسے بھی جسم کا کون حصہ سلامت تھا۔ جوڑ جوڑ مل کر رہ گیا تھا اور درد کی لہریں پھیل رہی تھیں۔ کار کو ذرا سا جھکا کر تو میں بے اختیار کراہ اٹھا اور سنبھل کر بیٹھنے کی کوشش کرتا۔

نجمہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”تکلیف ہو رہی ہے؟“ ایک مرتبہ اس نے پوچھ ہی لیا۔

”نہیں۔ شوقی طور پر کراہ رہا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”زندہ دل ہو۔“ وہ بھی مسکرا دی۔ ”تکلیف میں بھی مسکراتا جانتے ہو۔“

”زندگی تو آدمی رو کر بھی گزار لیتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ یہ چند روز ہنس کر گزار لے جائیں۔“

باتوں سے وہ بھی اپنی کیفیت پر قابو پا چکی تھی۔ لیکن چہرے پر خوف کے ہلکے سے نشان اب بھی موجود تھے۔

کار دو تین سڑکوں پر گھومنے کے بعد وحدت روڈ پر آ گئی۔ میں نے نجمہ کو اشارہ کیا۔ اس نے کار ایک ذیلی سڑک کے موڑ پر روک لی اور انجن بند کر دیا۔

”نیچے اتر کر کوئی رکشہ روکو۔“ میں نے کہا۔ ”بہانہ کرنا کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے۔“

”کہاں جانا ہے؟“ نجمہ نے دروازہ کھولتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

”دلی دروازے۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

نجمہ نیچے اتر گئی۔ اتفاق سے دو منٹ بعد ہی ایک خالی رکشہ مل گیا۔ نجمہ نے میری جانب والا کار کا دروازہ کھولا اور مجھے سہارا دے کر نیچے اتار لیا۔ اپنا پرس لے کر اس نے کندھے پر لیا تھا۔

میں طرف والا دروازہ ہے۔ سو بجر نام ہے اس بندے کا۔

اجد رکشے سے اتر کر کھلی میں چلا گیا۔ کھلی میں اندھیرا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز سنائی دی۔ اور اس کے تین چار منٹ بعد دو سائے اندھیرے میں آتے ہوئے آگئی۔

سو بجر میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے مجھے سہارا دے کر رکشے سے باہر نکالا اور مجھے اٹھانا چاہتا تھا مگر اجد نے اس سے پہلے ہی جھک کر مجھے گود میں اٹھالیا۔

”تم آگے چلو سو بجر! دروازہ کھولو۔ میں لے کر آ رہا ہوں رونی باؤ کو۔“ اجد نے کہا۔ سو بجر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ اجد نے مجھے گود میں اٹھا رکھا تھا اور نجمہ ہمارے ہاتھ ساتھ چل رہی تھی۔

محن میں داخل ہوتے ہی سو بجر نے دروازہ بند کر دیا اور ہم سے آگے نکل کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اجد جب مجھے لے کر کمرے میں داخل ہوا تو سو بجر ایک چار پائی پر بکھری ہوئی چیزیں اٹھا رہا تھا۔ اس نے چادر اور نکیہ درست کیا اور اجد نے بڑی احتیاط سے مجھے چار پائی پر بٹا دیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے کی حالت بہت بدلی ہوئی تھی۔ دوسری چار پائی پر بھی صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ باقی چیزیں بھی سلیپے سے رکھی ہوئی تھیں۔

میں نے نجمہ کی طرف دیکھا۔ وہ سبھی ہوئی سی دروازے ہی میں کھڑی تھی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ اس نے مجھے تاجی کی کوٹھی سے نکال کر اور میرے ساتھ یہاں آ کر کوئی غلطی تو نہیں کی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ہمیں اجد مل گیا تھا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا اور سر پر غنڈوں کی طرح مظفر لپٹا ہوا تھا۔ اکثر ٹیکسی ڈرائیور تو ویسے ہی بدنام ہوتے ہیں، اجد بھی حلیے سے چھٹا ہوا ہی لگ رہا تھا۔ اور سو بجر..... وہ اپنے پرانے حلیے میں تھا۔ لمبا کرتہ جس کے گریبان کے سارے بٹن کٹے ہوئے تھے۔ جینز کی پتلون اور گگلے میں تعویذ۔ اس کے بال الجھے ہوئے اور آنکھوں میں رنی تھی۔ ہمارے آنے سے پہلے وہ سو رہا تھا۔

میرے خیال میں ان دونوں کے حلیوں نے نجمہ پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ ”نجمہ! بیٹھ جاؤ۔ تم کھڑی کیوں ہو؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نجمہ جا میری بہن! یہاں تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ سو بجر نے کہا اور دوسری چار پائی پر بیٹھی ہوئی چادر درست کرنے لگا۔

نجمہ بھی کھڑی ہوئی سامنے والی چار پائی پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا پرس بھی کندھے سے اتار کر بچے کے قریب رکھ دیا تھا۔

کہا۔

”تم نے تیزاب اچاٹے جانا تھا رونی باؤ! رکشے کیوں رکوا لیا ہے؟“ ڈرائیور نے زور رکھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں رکشہ ڈرائیور کے منہ سے اپنا نام سن کر اچھل پڑا۔ ”کک..... کون ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

نجمہ کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا تھا۔

”اپنا بار ہی سمجھو رونی باؤ!“ ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”جب میں نے تم سہارا دے کر اپنے رکشے میں بٹھایا تھا تو میں نے تمہیں اسی وقت پہچان لیا تھا۔“ ”لیکن میں نے تمہیں نہیں پہچانا۔“ میں نے کہا۔ میرے دل کی دھڑکن ابھی تک بے ہو رہی تھی۔

”میں بچھے (پرویز) کے ساتھ رکشہ چلاتا تھا۔ ان دنوں تم بھی اس کے پاس آئے۔“ اجد ہے میرا نام۔“ اس نے کہتے ہوئے سر پر بندھا ہوا مظفر اتار دیا۔ ”کئی سال گزرے ہیں۔ کئی بار تم سے سامنا ہوا مگر تم بڑے آدمی بن گئے ہو، کہاں پہچانتے ہو۔ مگر ہم تو اب تمہاری دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ کئی مرتبہ ہم نے ماسی فاطمہ کے تندور پر بیٹھ کر رونی کھائی یار۔“

”ہاں۔ اب میں نے پہچان لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر.....“ ”گھبراؤ مت یار!“ اجد نے میری بات کاٹ دی۔ ”یار ہوں تمہارا۔ بھروسہ کر لو۔“ یہ تمہیں ہوا کیا ہے؟

”ہم لوگوں کی زندگی میں ایسے حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں۔“ میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

”کہاں جانا ہے..... مجھے بتاؤ۔“ اجد بولا۔ ”آگے والی گلی کے سامنے روک لو۔“ میں نے اشارہ کیا۔ اجد نے پھر رکشہ اشارت

دیا۔

اس وقت سوا بارہ بج رہے تھے۔ بازار کی ساری دکانیں بند تھیں۔ البتہ چائے کی اکانیں دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔

رکشہ اس گلی کے سامنے رک گیا۔

”اندھرتی دور جانا ہے رونی باؤ؟ میں تمہیں گود میں اٹھا کر لے چلوں۔“ اجد نے کہا۔ ”پہلے جا کر معلوم کرو، وہ بندہ گھر پر بھی ہے یا نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”گلی کے آخر

سولجر وہیں سے واپس مڑ گیا۔ میں نے کمرے میں برتن وغیرہ نہیں دیکھے تھے۔ میرا خیال ہے اس نے باہر ہی کوئی بندوبست کر رکھا تھا۔

نجمہ نے میرے چہرے اور گردن وغیرہ سے خون صاف کر دیا۔ پانی کا پیالہ اور کپڑا ایک طرف رکھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہارے یہ کپڑے بھی خون آلود ہو رہے ہیں۔ تمہارے دوست کے پاس کوئی فالتو جوڑا نہ ہوگا۔“

”کیا میرے کپڑے بھی تم بدلاؤ گی؟“ میں نے کہا۔

”وہ کچھ کہنے کی بجائے مجھے گھور کر رہ گئی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”تمہارا دوست ڈاکٹر کو لے آئے تو ان کے بعد یہی دونوں مل کر تمہارے کپڑے بھی بدل دیں گے۔“

”مجھے بڑی مایوسی ہوئی تمہارے اس جواب سے۔“ میں نے کہا۔

”تم اپنے بارے میں شاید کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ”بذلہ فی زندہ دلی اچھی بات ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسی باتیں بد تیزی میں شمار ہوتی ہیں اور اگلے دم ٹھیک جاتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں سمجھ گیا۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تمہارے یہ دونوں دوست کیسے ہیں؟“ نجمہ بولی۔ ”قابل اعتماد ہیں یا۔۔۔۔۔ میرا مطلب یہ کہ۔۔۔۔۔“

”سولجر پر تو تم آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتی ہو۔“ میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے ہلکا سا مسکراہٹ سے جواب دیا۔

”نجمہ کے بارے میں ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہت عرصہ بعد ملاقات ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے وہ ہمیں دھوکا نہیں دے گا۔ اس کی باتوں سے خلوص جھلکتا ہے۔ ویسے میں ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟“

”ہاں سمجھ رہی ہوں۔“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ان میں سے کسی نے مجھے ہراسہ کرنے کی کوشش کی تو اسے پچھتانا پڑے گا۔“

”اطمینان رکھو۔ ایسی حماقت کوئی نہیں کرے گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اس وقت سولجر چائے لے کر آ گیا۔ پلاسٹک کی ٹرے میں تین پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ”چھوٹی باجی! آپ چار پائی پر ٹھیک سے بیٹھ جائیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ کے ہاتھ کا گھر ہے۔ یہاں اور کچھ ملے نہ ملے مگر بھائی کا لاڈ بہت ملے گا۔“ سولجر نے فوراً ہی

”سولجر بھائی!“ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رونی باؤ کی حالت دیکھ رہا ہوں۔ یہاں کسی ڈاکٹر کا بندوبست ہو سکتا ہے یا مجھے جانا پڑے گا؟“

”تمہیں ہی جانا پڑے گا۔“ سولجر نے کہا۔ ”یہاں تو اس وقت کوئی ڈاکٹر ملے گا نہیں۔ ویسے بھی۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ واپسی میں ذرا سی دیر ہو جائے گی۔“ اس نے کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پھر رک کر بولا۔ ”کوئی چیز منگوانی ہو تو بتا دو۔“

”کھانے کو کچھ لے آنا۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں اس وقت کھانے کو بھی کچھ نہیں ملے گا۔“

اس کے ساتھ ہی سولجر بھی کمرے سے نکل گیا تھا۔ چند منٹ بعد جب وہ باہر والا دروازہ بند کر کے واپس آیا تو نجمہ نے اس سے پانی اور ایک صاف کپڑا منگوا لیا اور کپڑے دھو کر میرے چہرے اور گردن پر جما ہوا خون صاف کرنے لگی۔ میں بڑے غور سے اس کی طرز دیکھ رہا تھا۔ کسی وقت میرے منہ سے کراہ نکل جاتی تو اس کی آنکھوں میں تشویش کی لہری دو جاتی۔

سولجر کچھ دیر تک تو دروازے میں کھڑا کبھی مجھے اور کبھی نجمہ کو دیکھتا رہا، پھر باہر جا کر کمرہ جگہ بیٹھ گیا۔

”تم کون ہو؟“ میں نے نجمہ کے چہرے کو تکتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتی ہو، میں تابی اور ٹھیکل کے لئے کتنا اہم ہوں۔ میری زندگی ان کی موت بن سکتی ہے۔ وہ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے مجھ سے ایک بہت بڑی دولت کا راز معلوم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن تم مجھے ان کے شکبے سے نکال کر لائیں۔ حالانکہ تم انہی کی ساتھی ہو۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اب تم دوبارہ ان کا سامنا کر سکو گی؟ تاجی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”تم نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوال پوچھ ڈالے ہیں۔ لیکن میں فی الحال تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔ اور تمہیں بھی بولنے میں تکلیف ہو رہی ہے اس لئے خاموشی سے لیٹے رہو۔“ نجمہ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں اپنائیت تھی۔ کچھ دیر پہلے تک اس کے ذہن میں جو خوف تھا وہ دور ہو چکا تھا۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس وقت سولجر دروازے میں نمودار ہوا۔

”چائے بناؤں رونی باؤ؟“ اس نے وہیں رک کر پوچھا۔

”ہاں بنا لو۔“ مجھ سے پہلے نجمہ بول پڑی۔ ”اعصاب میں شدید کشیدگی ہے۔ اس وقت واقعی چائے کی طلب ہو رہی ہے۔“

”پھر مجھے اس بی بی نیک پروین کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جو میرے دوست کو دشمنوں سے بچائی۔“ سو لجر بولا۔ ”ویسے تو ہوا سنا تعارف چھوٹی باجی کا بھی ہو جائے تو کیا حرج ہے۔“

”اس کے بارے میں تو ابھی تک میں بھی کچھ نہیں جان سکا۔“ میں نے کہا۔

میں نے جس طرح سو لجر کو اپنی کہانی سنائی تھی، اس سے نجمہ سمجھ گئی تھی کہ میں اسے کیا بتانا چاہتا ہوں اور کیا چھپانا چاہتا ہوں۔

”سو لجر بھائی! وہ اس طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ملک شہاب کے غنڈے دو دن پہلے مجھے ادا کردہ سے اغوا کر کے لائے تھے۔ اس دوران وہ لوگ انہیں بھی پکڑ لائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کا آپس میں کیا جھگڑا تھا۔ لیکن وہ کل سے انہیں بری طرح پیٹ رہے تھے۔ میرا دل بچ گیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ میرا بھی یہی حشر کریں گے۔ آج دو ڈھائی گھنٹے پہلے مجھے وہاں سے بھاگنے کا موقع ملا تو میں انہیں بھی وہاں سے نکال لائی۔ اب ہم کب تک ان ہاتھوں سے بچے رہ سکتے ہیں یہ تو وقت ہی بتائے گا۔“

”بڑی بہادری دکھائی ہے تم نے چھوٹی باجی! بیٹھ بیٹھ کے بھٹ سے شکار کو نکال لائیں۔“ سو لجر تو صلی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ویسے تم دونوں ہو بڑے کئی۔ ملک شہاب آج کل اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ اگر وہ لاہور میں ہوتا تو اب تک تم دونوں کا کام تمام ہو چکا ہوتا۔“

سو لجر کی اس اطلاع پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں پچھلے دو تین دن سے تو تاجی اور ٹیکل وغیرہ کی قید میں تھا اور اس دوران مجھے شہر کی صورتحال کا کچھ علم نہیں تھا۔

”اور شہر کے کیا حالات ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”پولیس بڑے زور و شور سے تمہیں تلاش کر رہی ہے۔“ سو لجر نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے ملک شہاب نے اسلام آباد سے دباؤ ڈالوایا ہو گا۔ اسی لئے پولیس پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئی ہے۔“

”ملک شہاب کا سارا زور اسلام آباد پر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سلطان جیسے حکومت کے اعلیٰ افسر یا ری ان جیسے دیکھوں کی پرورش کرتے ہیں جو اندر ہی اندر ملک کی بنیادیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ نزلہ تو ہم جیسے لوگوں پر گرتا ہے۔ جو چور، ڈاکو اور لٹیرے کہلاتے ہیں۔ ملک شہاب بڑے سنگین ترین جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد بھی معززین ہی کہلاتے ہیں۔ بہر حال۔“

”تو پتہ لگوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”ملک شہاب سے بہت آنکھ پھولی ہو چکی۔ میں ذرا ٹھیک ہواں تو یہ کھیل ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔“

اس سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔

نجمہ نے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ”دو دن پہلے چار پائی پر ٹائیس لٹکائے ٹیٹھی تھی۔ سو لجر کے اصرار پر وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور ٹیسے میں سے ایک پیالی اٹھالی۔ سو لجر نے ٹیسے میرے سر ہانے کی طرف رکھی ہوئی میز پر رکھ دی اور مجھے سہارا دے کر بیٹھا دیا۔

”خود سے بیٹھ جاؤ گے یا ایسے ہی سہارا دے کر بیٹھا رہوں؟“ سو لجر نے کہا۔

”میں بیٹھ جاؤں گا۔ اتنا نازک بھی نہیں ہوں کہ یہ چوٹیں برداشت نہ کر سکوں۔“ میں نے کہا۔

سو لجر وہاں سے ہٹ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ ایک پیالی اس نے خود لے لی اور ایک مجھے دے دی۔

”ہاں اب بتاؤ رونی باؤ!“ وہ چائے کا گھونٹ بھر کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اتنے دن کہاں غائب رہے۔ تم پر کیا ہتی اور تمہارا یہ حلیہ کس نے بگاڑا ہے؟“

میں نے نجمہ کی طرف دیکھا۔ سو لجر کی بات سن کر وہ مسکرا دی تھی۔ میں چائے کی چٹکیاں لیتا رہا اور پھر سو لجر کو ایک فرضی کہانی سنانے لگا۔ اس کہانی میں ملک شہاب کا ذکر بکثرت تھا۔ میں نے شروع میں بھی اسے یہی بتایا تھا کہ میری دشمنی ملک شہاب سے ہے۔ داماد دھکے کے بارے میں، میں نے اسے پہلے بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ تاجی اور ٹیکل کا قصہ بھی گول کر گیا تھا۔ اپنے ایک انجیکشن ٹاؤن والے مکان اور رشتی کے بارے میں، میں نے اسے پہلے بھی لاطم رکھا تھا اور اب بھی کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی کہانی میں سارا زور ملک شہاب پر ہی رکھا تھا۔

”کل رات۔“ میں کہہ رہا تھا۔ ”میں کسی طرح ملک شہاب کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ کل ساری رات اور آج سارا دن وہ حسب توفیق میری خاطر تواضع کرتے رہے۔ آج شام بھی انہوں نے میری ٹھیک ٹھاک دھنائی کر دی تھی۔ اور پھر یہ بی بی نیک پروین مجھے ان درندوں کے ہتھکنچے سے نکال لائی۔“

”اچھا۔ تو چھوٹی باجی کا نام نیک پروین ہے۔“ سو لجر بولا۔

”نیک پروین اس کا نام نہیں۔ میں نے تو محاورہ استعمال کیا تھا۔ جس کا مطلب ہے بیک دل خاتون جو کسی دوسرے کا دکھ نہیں دیکھ سکتی۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”اگر یہ وہاں نہ ہوتی تو وہ لوگ قسطوں میں مجھے مار ڈالتے۔“

چرا بھول جاؤ گے۔ آؤ..... اب میں تمہیں واپس چھوڑ آؤں..... اور رونی باؤ.....“ وہ میری طرف مڑ گیا۔ ”میں یہ دوائیں لے کر صبح سویرے ہی آ جاؤں گا۔ گھبرانا نہیں۔“

ان کے ساتھ ہی سولجر بھی باہر دروازہ بند کرنے کے لئے کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس کے ایک منٹ بعد نجمہ دروازے میں نمودار ہوئی۔ لیکن میری حالت دیکھ کر وہ بری طرح بدحواس ہو گئی اور بڑی تیزی سے واپس مڑ گئی۔ میں اس کی بدحواسی پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔

سولجر شاید ڈاکٹر اور امجد کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ اس کی واپسی چار پانچ منٹ بعد ہوئی۔ غم۔ اس نے اپنا کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر دے دیا۔ میں کپڑے پہن چکا تو میں نے نجمہ کو آواز دی۔ وہ فوراً ہی کمرے میں آ گئی۔

اس وقت دو بج چکے تھے۔ سولجر میری چار پائی پر ہی بیٹھا میرے پیر کی مالش کر رہا تھا۔ دوسری چار پائی پر بیٹھی خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”بس کرو یار! اب سو جاؤ تم۔ کافی رات گزر گئی ہے۔ لیکن.....“ میں کہتے کہتے خاموش ہو کر سولجر کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم فکر ہی نہ کرو رونی باؤ!“ وہ میری ادھوری بات کا مطلب سمجھ گیا۔ ”تم لوگ آرام سے

ہاں سو جاؤ۔ دوسرے کمرے میں ایک چار پائی پڑی ہے۔ میں وہاں سو جاتا ہوں۔“

سولجر کمرے سے چلا گیا۔ اس نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ نجمہ نے میری طرف دیکھا اور ہلکا سا ہنستا ہنستا اپنی چار پائی پر دراز ہوتی چلی گئی۔

”میرا خیال ہے تمہیں نیند تو نہیں آرہی ہوگی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم بکھم میں کہا۔

”ہاں..... نیند تو واقعی نہیں آرہی۔“ نجمہ نے میری طرف کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ اس

نے کئی کھڑکی کر کے سر ہتھیلی پر ٹکا لیا تھا۔ ”ایک عجیب سی وحشت طاری ہے۔ ذہن پر ایک بھانسا خوف۔ تاجی بہت چالاک اور گھاگ عورت ہے۔ وہ ہمارا پیہ ضرور لگا لے گی۔“

”تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے فرشتے بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن تم نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ میں نے تو وہاں سنا تھا کہ تم تاجی کی بھولتی بہن ہو۔ ایک اجنبی کے لئے تم نے اپنی بہن کو دھوکا کیوں دیا؟“

”ہمارا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ نجمہ نے جواب دیا۔ ”تاجی ایک طوائف ہے اور برا تعلقات ایک شریف گھرانے سے ہے۔ لیکن.....“ اس نے خاموش ہو کر گہرا سانس لیا۔

”کیا تمہارے خیال میں یہ کھیل ختم ہو سکتا ہے رونی باؤ؟“ سولجر نے کہا۔

میں جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر باہر کے دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز سن کر چپکے گیا۔ سولجر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

”ایک منٹ۔“ میں نے کہا۔ ”کیا یہاں ایسی کوئی جگہ ہے جہاں کچھ دیر کے لئے چھپا سکتے؟“

”ہاں..... کیوں نہیں.....؟“ سولجر نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”امجد کسی ڈاکٹر کو کچھ لایا ہوگا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ نجمہ کسی اور کی نظروں میں آئے۔ اس لئے تھوڑی دیر کے لئے اسے.....“

”میں سمجھ گیا۔“ سولجر نے میری بات کاٹ دی۔ باہر اینٹوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ چھوٹی باجی تھوڑی دیر اس کے پیچھے بیٹھی رہے۔“

وہ نجمہ کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا اور پھر چند منٹ بعد سولجر اور امجد اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک تیسرا آدمی بھی تھا۔ درمیانے قد کا، بھاری بھر کم تو نہ منکے کی طرح آگے کوٹکی ہوئی تھی۔ وہ بات کرتے ہوئے ہکلا رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے بار بار اس کا گیزر انگ رہا ہو۔

ڈاکٹر نے میرے کپڑے اتروا دیئے۔ میرے جسم پر صرف انڈرویز رہ گیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے میرے پیر کا معائنہ کیا پھر جسم کی دوسری چوٹوں کا معائنہ کرنے لگا۔ سر کا زخم دیکھنے کے لئے اسے میرے سر کے بڑے حصے کے بال کاٹنے پڑے تھے۔

”ج..... ج..... حیرت ہے۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”تم زن..... زن..... زندہ..... لک..... لک..... کیسے ہو؟“

میں نے جواب میں صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے بیک میں سے دوائیں نکال کر میری چوٹوں پر لگا دیں۔ سر پر پٹی بھی باندھ دی۔ کچھ گولیاں اپنے پاس سے دے دیں اور کچھ دوائیں کھلا دیں جن میں کھانے کے لئے گولیاں اور مالش کے لئے کریم بھی شامل تھی۔ پیر کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ اس کی دی ہوئی کریم سے دن میں کم از کم تین مرتبہ مالش کی جائے۔ اگر تین دن تک سو جن نہ اترے تو یا تو اس کا علاج آپریشن ہو گا یا کئی پہلوان کو دکھانا پڑے گا۔

جب ڈاکٹر واپس جانے لگا تو امجد نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اب تم اس جگہ کو اور ان چہروں کو بھول جانا ڈاکٹر! اگر تم اپنی زبان بند نہ رکھ سکتے تو تم اپنا

ایک کسی دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر اس طرف سے گزرا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس نے تودہ رکے بغیر چلا گیا۔ میں جب گھر پہنچی تو میرا بھائی میرا منتظر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بھائی کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ پہلے تو وہ مجھے سرزنش کرتا رہا اور بڑی نرمی اور احترام کے ساتھ مجھے سمجھاتا رہا کہ مجھے اس طرح سر عام بازاروں میں قہقہے نہیں لگانے چاہئیں اور لڑکوں کے ساتھ نہیں گھومنا چاہئے۔ لیکن مجھے اس کی باتیں بری لگیں۔ چنانچہ جب میں نے کہا کہ وہ مجھ سے چھوٹا ہے۔ اپنی حد میں رہے تو وہ مجھ سے اکھڑ گیا۔ اس نے مجھے انتہائی سخت الفاظ میں برا بھلا کہا اور میرے باہر نکلنے پر سخت اعتراض کیا اور مجھے راشدہ سے ملنے سے روک دیا۔ گھر میں کہاں ماننے والی تھی۔

ایک روز موقع پا کر میں چوہدری اکرام کی کونھی پر پہنچ گئی۔ پتہ چلا کہ ممتاز بیگم لاہور چلی گئی ہے اور دو ہفتوں بعد واپس آئے گی۔

میں بے چینی سے ممتاز بیگم کا انتظار کرتی رہی۔ نجانے یہ بات میرے ذہن میں کیوں سا لگی تھی کہ ممتاز بیگم ہی مجھے اس عذاب سے نجات دلا سکتی ہے۔ میں اب اس گھر کے گھٹے لئے ماحول میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔

ممتاز بیگم سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے اپنے گھر کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ ات حیران ہوئی کہ میں اس ماحول میں کیسے زندہ ہوں۔ میں اس کی ہمدردانہ باتوں سے بہت اثر ہوئی۔ اس نے مجھے پیشکش کی کہ اگر میں اس کے ساتھ لاہور چلی چلوں تو سب ٹھیک ہوئے گا۔ میں نے اپنے بھائی اور باپ کی طرف سے خدشات ظاہر کئے تو اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں بالغ ہوں اور اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق رکھتی ہوں۔

مجھے اپنے گھر والوں سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔ میں اس عذاب سے نکلنا چاہتی تھی۔ مادہ بھائی کو جب پتہ چلا کہ میں کسی سوشل ورکر عورت سے ملنے جاتی ہوں تو انہوں نے رے گھر سے نکلنے پر بھی پابندی لگا دی۔

اور پھر ایک روز میں ساری پابندیاں توڑ کر گھر سے نکل آئی۔ ممتاز بیگم اسی روز مجھے اپنی کار لاہور لے آئی اور میں نے سکھ کا سانس لیا کہ اس جہنم سے نکل آئی ہوں۔ لیکن میری یہ خوشی لمبی بہت جلد دور ہو گئی کہ آزاد ہو گئی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں گھر کی جنت سے نکل کر اس آگ کی تھی۔

نہر خاموش ہو کر گھرے گھرے سانس لینے لگی۔ وہ کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔

”لیکن اب میں بھی کہاں شریف عورت رہی ہوں۔ اپنے خاندان کی عزت کو مٹی میں ملا دیا ہوں۔ تاجی نے تو مجھے بھی طوائف بنا دیا ہے۔“

”لگتا ہے تاجی نے تمہیں اچھی خاصی چوٹ دی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہاری کہنا سننا چاہتا ہوں۔ تمہارے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ ایک دوسرے کو جاننے کے بعد ہم بہتر طور پر ایک دوسرے کی مدد کر سکیں گے۔“

”اب کوئی میری مدد کیا کرے گا؟ میرا سب کچھ تو لٹ چکا ہے۔“ اس نے ٹھنڈا سا ہنس بھرتے ہوئے جواب دیا۔

میں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کئی لمحات خاموشی میں گزر گئے۔ پھر وہ فریادیں لہجے میں کہنے لگی۔

”میرا تعلق جڑانوالہ کے ایک متوسط مذہبی گھرانے سے ہے۔ میرے والد ایک کاروباری آدمی ہیں۔ اناج منڈی میں ان کی آڑھت کی بہت بڑی دکان ہے۔ وہ پانچ وقت کے نمازی تھے۔ گھر میں بھی سب لوگ پابندی سے نماز پڑھا کرتے تھے۔

ایک روز میں اپنی چھوٹی بہن کیساتھ کسی کام سے گھر سے نکلی۔ ہم دونوں نے برقعے پہن رکھے تھے۔ آنکھوں کے سوا جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جس پر کسی کی نظر پڑ سکتی۔ ہم دونوں اپنی ایک دوست راشدہ کے گھر آ گئیں۔ راشدہ کے گھر والے پڑھے لکھے تھے۔ آزاد خیال تھے۔ ان کے ماحول میں گھٹن نہیں تھی۔ جبکہ مجھے اپنے گھر کے مذہبی اور شریفانہ ماحول میں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ اور شریعت نے جو پابندیاں عائد کی ہیں وہ مجھے اچھی نہیں لگتی تھیں۔ مجھے آزاد خیالی اچھی لگتی تھی۔ وہیں میری ملاقات ممتاز سے ہوئی۔

ممتاز بیگم لاہور کی ایک سوشل ورکر تھی۔ ایک این جی او چلا رہی تھی اور اسی کام کے سلسلے میں جڑانوالہ آئی ہوئی تھی۔ مجھے بھی سوشل اور سماجی کاموں کا شوق تھا۔ میں تو کالج کی ویلنٹیئر سوسائٹی کی عہدیدار بھی تھی۔ ممتاز بیگم میرے بارے میں جان کر بہت خوش ہوئی۔

میں نے چھوٹی بہن کو تو گھر واپس بھیج دیا اور خود راشدہ کے گھر میں بیٹھی ممتاز بیگم سے باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتوں سے آتش شوق بھڑک اٹھی۔

میں روزانہ ممتاز بیگم سے ملنے لگی۔ ممتاز بیگم چوہدری اکرام نامی ایک بڑے آدمی کی کونھی میں رہائش پذیر تھی۔ اس روز میں ممتاز بیگم سے مل کر اس کونھی سے نکل رہی تھی۔ میرے ساتھ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ میں نے برقعہ پہن رکھا تھا لیکن نقاب چہرے سے ہٹا ہوا تھا اور اس وقت ہم تینوں لڑکیاں کسی بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ اتفاق سے میرا چھوٹا بھائی

”ممتاز مجھے سخن آباد کی ایک کوٹھی میں لے آئی تھی۔ وہاں بہت سے لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ان میں بڑے بڑے دولت مند لوگ بھی تھے اور جوان اور حسین لڑکیاں بھی۔ پینڈا میں یہی سستی رہی کہ چونکہ ممتاز بیگم این جی او چلا رہی ہے اور اس کے پاس آنے والے سب لوگ سماجی کارکن ہیں۔ مگر چند روز بعد یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ممتاز بیگم این جی او کی آڑ میں چکلا خانہ چلا رہی تھی۔

اس رات دس بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ ممتاز بیگم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بلا لیا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ عمر شاید چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ کلین شیو، سر کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اپنی عمر کے اعتبار سے وہ خاصا صحت مند آدمی تھا۔ قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔

”نجمہ بیٹی!“ ممتاز بیگم نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ رشید ترابی صاحب ہیں۔ شہر کے ایک نامور رئیس اور مشہور سماجی کارکن۔ یہ مرد ہو کر حقوق نسواں کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ عورتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف انہوں نے مرووں کے خلاف ایک محاذ کھول رکھا ہے۔ آج ان کے ہاں اسی سلسلے میں ایک میٹنگ ہے۔ کل انہوں نے صبح بتایا تھا لیکن آج یہ خود مجھے لینے کے لئے آگئے ہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میری جگہ تم ان کے ساتھ چلی جاؤ۔“

”میں؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں تم۔“ ممتاز بیگم نے کہا۔ ”تمہارے خیالات اور تمہاری باتوں سے میں اندازہ لگا چکی ہوں کہ تم اس موضوع پر بھی بہت اچھا بول سکتی ہو۔ اور پھر تم خود ظلم کی بھٹی سے نکل کر آئی ہو۔ تم سے اچھا اور کون بول سکتا ہے۔ جاؤ، تم ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ گھنٹے بھر کی تو بات ہے۔ یہ میٹنگ ختم ہونے کے بعد تمہیں یہاں واپس چھوڑ جائیں گے۔“

میں کچھ دیر ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتی رہی اور پھر رشید ترابی کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ نئے ماڈل کی ایئر کنڈیشنڈ مرئیز کار میں سفر کرتے ہوئے مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی ایسی کار میں بیٹھنے کا موقع ملے گا۔

رشید ترابی مجھے ماڈل ٹاؤن کی ایک کوٹھی میں لے آیا اور اندر داخل ہونے کے بعد یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ نہ تو رشید ترابی حقوق نسواں کا علمبردار تھا اور نہ ہی یہاں ایسی کوئی میٹنگ تھی۔ بلکہ اس وسیع و عریض کوٹھی میں تو کسی عورت کا نام و نشان تک نہیں

نہ اس کے برعکس دو بٹے کئے ملازم موجود تھے۔

رشید ترابی نے مجھے کہا تھا کہ میٹنگ میں شریک ہونے والی خواتین کو گراہہ بچے کا وقت دیا جاتا ہے۔ بس کچھ دیر میں وہ آنا شروع ہو جائیں گی۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ ذہن میں طرح طرح کے دوسے آرہے تھے۔ اور دل خزاں رسیدہ ہوتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

رشید ترابی مجھے گھوم پھر کر اپنی کوٹھی دکھانے لگا۔ میں خوف سے سہمی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ جیسے ہی موقع ملے گا میں باہر نکل جاؤں گی۔ اور پھر میں اس کے ساتھ جیسے ہی ایک کمرے میں داخل ہوئی، اس نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔

میں خوف سے کانپ اٹھی اور متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ یہ بہت وسیع و راسخ بیڈ روم تھا۔ یہاں ہر وہ چیز موجود تھی جس کی کسی کروڑ پتی کے بیڈ روم میں توقع کی جا سکتی تھی۔ شیشے کے ٹاپ والی ایک چھوٹی سی میز پر شراب کی بوتلیں اور گلاس بھی رکھے ہوئے تھے۔

میں نے دروازے کی طرف بڑھنا چاہا تو رشید ترابی نے مجھے پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ دیا۔ میں اس کی منت سماجت کرنے لگی کہ مجھے جانے دیا جائے۔

”کیسے جانے دوں جان من!“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”سماجی کو پچاس ہزار روپے دیئے ہیں ایک رات کے۔ یہ رقم تو وصول کر لوں تم سے۔ پھر بے شک چلی جانا۔“ یہ سن کر ایک لمحہ کو تو مجھ پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ممتاز بیگم سماجی کارکن نہیں، دلف تھی!

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ سنسنی کی لہریں پورے بدن میں دوڑ رہی تھیں۔ میری ٹانگیں کاپٹنے لگیں۔ میں نے ایک بار پھر اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑنا چاہا مگر کھرا کر گر گئی۔ رشید ترابی نے مجھے اٹھا کر دوبارہ پٹنگ پر پھینک دیا۔ میں نے اس کے سامنے ٹھوڑا دیئے۔ اس کے پیروں پر گر گئی۔ خدا اور رسول کا واسطہ دیا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ رلی آؤ نفاس راہیگاں گئی۔ وہ عیاش آدمی تھا۔ وہ پچاس ہزار روپے خرچ کر کے مجھے عیاشی کرنے لے کر آیا تھا۔ میری فریاد اور رونا دھونا اس پر کس طرح اثر انداز ہو سکتا تھا۔

رشید ترابی نے شراب کی بوتل کھول کر دو گلاسوں میں شراب انڈیلی اور ایک گلاس اٹھا کر لی طرف آ گیا۔

”لو..... یہ شربت پی لو۔ تمہارے دل کو تقویت ملے گی۔ اور تم یہ بھول جاؤ گی کہ تمہارے ٹھکایا ہوا ہے۔“

اس نے گلاس میرے ہونٹوں سے لگانا چاہا۔ بوکا بھبکا میرے نعتوں سے ٹکرایا۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں بیڈ سے اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑی مگر لڑکھڑا کر سونے پر گر گئی۔ وہ بھی صوفے پر آ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے مجھے دبوچ لیا اور دوسرے ہاتھ سے شراب گلاس میرے منہ سے لگا دیا۔ کچھ شراب میرے اوپر گری اور کچھ حلق میں اتر گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے حلق اور سینے میں انگارے سے بھر گئے ہوں۔ مجھے تنگی سی ہونے لگی۔ اس نے مجھے دبوچ کر گلاس میں پچی ہوئی شراب میرے حلق میں انڈیل دی اور مجھے چھوڑ کر دوسری جگہ بیٹھا اور دوسرا گلاس اٹھا کر شراب لی چسکیاں لینے لگا۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے اور سنسنی کی لہریں پورے بدن میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنا چاہا مگر ٹانگوں میں اتنی سکتی نہیں رہی تھی۔ میں لڑکھڑا کر قالین پر گر گئی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔ ارد گرد کی ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے میں کسی مجبور میں پھنس گئی ہوں۔ میرے اطراف میں ہر چیز بڑی تیزی سے گھوم رہی تھی۔ پورا کمرہ گردش کر رہا تھا۔ رشید ترابی نے مجھے اٹھا کر بیڈ پر ڈال دیا۔ میں نے برائے نام سی مزاحمت کی کوشش کی تھی۔ ہاتھوں پیروں سے جیسے جان نکلی جا رہی تھی۔ مزاحمت کیسے کرتی۔ اس نے شراب کا گلاس دوبارہ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میرا ہاتھ گلاس پر لگا۔ ایک گھونٹ میرے حلق میں گیا اور باقی شراب میرے سینے پر گری تھی۔

میرے اندر اب مزاحمت کی سکت بالکل نہیں رہی تھی۔ دماغ میں سنناٹا ہو رہی تھی۔ مجھے اتنا یاد رہا کہ رشید ترابی نے میرے کپڑے اتار دیئے تھے۔ اور اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ میرا شعور بھی مر گیا تھا۔

مجھے ہوش آیا تو رات گزر چکی تھی۔ یہ رات کیا تھی۔ ایک طوفان تھا جو میرا سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ دراصل میری زندگی میں طوفان تو اسی دن آ گیا تھا جب میں نے گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔

میں بیڈ پر بے لباس پڑی تھی۔ دماغ میں اب بھی سنناٹا ہو رہی تھی۔ پہلے چند لمحوں تک نو میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ میں کہاں ہوں۔ پھر رفتہ رفتہ حواس بحال ہونے لگے تو یہ جان لیا انکشاف ہوا کہ میرا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ تنہی دامن ہو چکی ہوں۔ سنسنی کی لہریں میرے پورے وجود میں پھیلتی چلی گئیں۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس نے بیڈ کے قریب صوفے پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے بیڈ سے چھلانگ لگا دی اور جلدی جلدی کپڑے پہنے لگی۔ میرے ہاتھ پیر بری طرح کانپ رہے تھے۔ دروازے کے اندر والی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں گی۔

کپڑے پہن کر میں نے پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا اور رشید ترابی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی مکروہی مسکراہٹ تھی۔ گزشتہ رات تاجی کی کوشی پر میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تھا تو اس کے چہرے پر شرافت کا رنگ نظر آیا تھا۔ مگر اپنی کوشی پر آنے کے بعد اس کے چہرے سے شرافت کا رنگ اتر چکا تھا اور اب اس کے چہرے پر شیطانت دکھائی دے رہی تھی۔

”اوہ.....“ وہ دو قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ تم ابھی سو رہی ہو گی۔ اچھا ہوا جاگ گئیں۔ ناشتہ کرلو۔ پھر میرا ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا۔“ اس نے جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے ہزار روپے کا نوٹ نکال کر میری طرف رکھ دیا۔ ”لو، یہ رکھ لو۔ تمہارے لئے ہے۔ تاجی کو اس کی ہوامت لگنے دینا۔ ورنہ وہ جھین لے گی۔ بڑی حرافہ عورت ہے وہ۔“

میں نفرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میری قیمت تو تاجی وصول کر چکی تھی۔ اور رشید ترابی مجھے بخشش دے رہا تھا۔

”ناراض ہو؟“ وہ کہتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ اس نے نوٹ کی دو تین جھین لگا دیں اور پھر اس نے میرے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ تہ کیا ہوا نوٹ میرے گریبان میں ڈالنا چاہتا تھا۔ اسی لمحہ میرا ہاتھ حرکت میں آیا۔ میرا تھپڑ اس کے منہ پر لگا چٹاخ کی آواز کے ساتھ۔ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ ایک لمحہ کو اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پایا اور ڈھٹائی سے مسکرا دیا۔

”ٹھیک ہے.....“ وہ نوٹ کی تہ کھول کر اسے دوبارہ اپنے پرس میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہاری پہلی رات تھی۔ تمہیں یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ لیکن ایک وقت آئے گا جب تم نوٹ کا کھل کی جیسوں سے نوٹ نکالا کرو گی۔ چلو..... ناشتہ تیار ہے۔“

”مجھے نہیں کرنا ناشتہ۔ میں جا رہی ہوں۔“ میں نے کہا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیا۔

وہ بھی میرے پیچھے ہی کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں راہداری اور وسیع لاؤنج سے ہوتی ہوئی بلائندے والے دروازے سے باہر آ گئی۔ پورچ میں کار کھڑی تھی۔ قریب ہی ایک گن

ہی تھی۔ اور بھر وہ مجھ پر پل پڑی۔ ٹھیک اور تاجی مجھے بری طرح پیٹ رہے تھے جبکہ دونوں زبانیں خاموشی سے ایک طرف کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔

میں بچتی رہی اور چپٹی رہی۔ اور پھر انہوں نے مجھے لے جا کر ایک کمرے میں پھینک دیا۔ پھر بالکل خالی تھا۔ فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں فرش پر پڑی کراہتی رہی۔ میرے جسم پر جوز جوز ڈکھ رہا تھا۔ درد کی ٹیسیں پورے بدن میں پھیل رہی تھیں۔

پورا دن گزر گیا۔ کسی نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تک نہیں۔ اور پھر رات بھی گزر گئی۔ میں رات بھر کراہتی رہی تھی مگر مجھے پوچھنے یا دیکھنے کے لئے کوئی نہیں آیا تھا۔

اگلی دوپہر کا وقت تھا۔ جسم پر چونوں کی تکلیف تو تھی ہی، بھوک اور پیاس سے بھی میری بری حالت ہو رہی تھی۔ پیٹ میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں اور حلق خشک ہو رہا تھا۔ کانے کی طرح لڑی ہوئی زبان بار بار تالو میں چبھ رہی تھی۔ میری قوت برداشت جواب دے گئی اور میں اٹھ کر دروازہ دھڑ دھڑانے لگی۔ میں جانتی تھی گھر میں سب لوگ موجود تھے۔ مجھے ان کی آواز بھی بالی دے رہی تھی۔ مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔

شام ہونے لگی۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا چھا گیا۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ لڑی ہوئی کھڑکی عقبی سمت میں تھی۔ اس طرف جھاڑ جھکاڑ اور چند درختوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ لڑی ہوئی کی آمدورفت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مگر وہ سامنے کی طرف تھیں۔

گوئی میں لوگوں کی آمدورفت سے پہلے تو میں یہی دیکھتی رہی تھی کہ وہ سب لوگ سماجی ارکان ہیں۔ کسی نہ کسی حوالے سے خدمت خلق کر رہے ہیں۔ لیکن کل رات سب کچھ مجھ پر ہوا گیا تھا۔ یہاں آنے والی عورتیں طوائف تھیں اور مردان کے گاہک۔ ممتاز بیگم کی یہ لٹی عیاشی کا بہت بڑا اڈا تھی۔ وہ لوگوں کو لڑکیاں سپلائی کرتی تھی۔

یہ وقت گاہکوں کی آمدورفت کا تھا۔ میں دیر تک دروازہ دھڑ دھڑاتی رہی مگر کسی نے اس کو توجہ نہیں دی تھی۔ اگر کسی گاہک نے آواز سی بھی ہوگی تو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ وہ سب سننے تھے کہ یہاں لڑکیوں کو اغوا کر کے یا خرید کر لایا جاتا ہے۔ وہ مزاحمت کرتی ہوں گی، رپٹائی ہوں گی اور انہیں سزا بھی دی جاتی ہوگی۔ وہ لوگ سب کچھ جانتے تھے مگر جان بوجھ انہیں اور کان بند کر رکھے تھے۔ انہیں صرف اپنی عیاشی سے غرض تھی۔

میں زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔ لڑکھڑا کر دروازے کے قریب ہی گر گئی۔ پیاس کی تڑپ سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور بھوک سے پیٹ میں آٹیشن ہو رہی تھی۔ میری ہڈیوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی۔

میں بھی کھڑا تھا۔ کل رات میں نے اس گن مین کو نہیں دیکھا تھا۔

رشید ترابی بھی میرے پیچھے ہی برآمدے میں آچکا تھا۔ اس نے گن مین کو اشارہ کیا۔ میں برآمدے سے اتر کر گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ مگر گن مین مجھے بازو سے پکڑ کر کار کی طرف لے گیا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا اور خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ رشید ترابی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار گیٹ سے نکل کر مختلف سڑکوں پر ہوتی ہوئی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ممتاز کی گوئی کے سامنے رک گئی۔ رشید ترابی نے ہارن بجا دیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی گوئی کا گیٹ کھل گیا اور ممتاز کا مکروہ چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی کریمہ سی مسکراہٹ تھی۔ کل تک یہی ممتاز بیگم مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ لیکن اب اس کی صورت دیکھ کر ہی مجھے گھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے گن مین نے میری طرف جھک کر دروازہ کھول دیا۔ جھکتے ہوئے اس نے جان بوجھ کر اپنا سارا بوجھ میرے اوپر ڈال دیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی میں نیچے گر گئی۔

میرا خیال ہے اس وقت صبح کے دس بجے ہوں گے۔ گلی میں بعض کوٹھیوں کے سامنے کاریں تو کھڑی تھیں مگر کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں جیسے ہی کار سے اتر کر ممتاز کی مسکراتی ہوئی دونوں ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے گلے لگ جاؤں گی۔ لیکن میرا زور دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

وہ ایک لمحہ کو بدحواس سی ہوئی۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کھینچتی ہوئی اندر لے جانے لگی۔ رشید ترابی کار آگے بڑھا لے گیا تھا۔

مجھے اندر گھسیٹ کر ممتاز نے گیٹ دھڑ سے بند کر دیا اور مجھے کھینچتی ہوئی برآمدے میں لے آئی۔ اس وقت میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور ممتاز پر پل پڑی۔ وہ نیچے گر گئی۔ میں نے اس کے بال پکڑ لئے اور اس کے جسم پر ٹھوکریں برسانے لگی۔

ممتاز بری طرح چیخ رہی تھی۔ اس کی چیخوں کی آوازیں سن کر ٹھیک اور دو لڑکیاں دروازے کی طرف آ گئیں۔ وہ تینوں ممتاز کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن مجھ پر جنون طاری تھا۔ میں ممتاز کو مار ڈالنا چاہتی تھی جس نے میری زندگی برباد کی تھی۔

ٹھیکل نے مجھ پر گھونے برسانا شروع کر دیے۔ سینے پر لگنے والے ایک زوردار گھونے سے میں چیخ اٹھی۔ ممتاز میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ ٹھیکل مجھے مارتا اور گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ کچھ دیر بعد دو لڑکیاں ممتاز کو بھی اندر لے آئیں۔ وہ خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھ

”باہر خونخوار بھیڑیے ہیں، موت ہے۔ اور اس چار دیواری کے اندر تحفظ ہے۔ عزت میں آرام ہے۔ تم بھی دوسری لڑکیوں کی طرح عیش کرو گی۔“

میں نے پانی کے دو تین گھونٹ پیئے ہی تھے کہ اس نے گلاس میرے ہونٹوں سے ہٹا لیا۔ بری پیاس کچھ اور بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس جھپٹ لیا۔ آدھا پانی برے کپڑوں پر گرا۔ گلاس میں جو ایک دو گھونٹ بچے تھے وہ میں نے حلق میں اٹھیل لئے۔ ہناز کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

”تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔ کھانا کھاؤ گی؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے جواب دینے کی بجائے نظریں جھکا لیں۔

”کلیل اشیریں سے کہو، نجمہ کے لئے کھانا لگائے۔ اور تم جا کر سیٹھ لطیف کا پتہ کرو۔ اس نکل رقم پہنچانے کا وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک کوئی خبر نہیں۔“

”اس وقت؟“ کلیل کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”رات کے دو بج رہے ہیں۔“

”تو کیا ہوا.....“ ممتاز بولی۔ ”ہماری اور سیٹھ لطیف جیسے لوگوں کی زندگی میں رات ہی تو نہ ہوتی ہے۔ وہ اسی وقت تمہارے قابو آ سکتا ہے۔ دن میں تو اس کا پتہ نہیں چلتا کہاں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ابھی جاتا ہوں۔“ کلیل کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ ممتاز نے نے ہمارا دے کر اٹھایا اور اس کمرے سے نکال کر اپنے کمرے میں لے آئی اور ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”تم منہ ہاتھ دھو لو۔ میں دیکھتی ہوں شیریں نے کھانا لگایا ہے یا نہیں۔“ وہ کمرے سے باہر آئی۔ میں نے ہاتھ روم میں گھس کر سامنے لگے ہوئے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میرے کنار رخسار پر نیلا دھبہ پڑا ہوا تھا۔ ہونٹوں کے کنارے پر ہلکا سا خون جما ہوا تھا۔ جڑا بھی ہوا ہوا تھا۔

میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ کلی کی تو منہ سے ہلکا سا خون بھی نکل آیا۔ کوئی دانت اپنی جگہ سے ہٹا تھا۔ میں نے وہیں اسٹینڈ پر بیٹھے ہوئے تولیے سے منہ پونچھا۔ میرے بال اگرچہ بری سا لکھے ہوئے تھے مگر میں نے انہیں سنوارنا ضروری نہیں سمجھا اور باہر آ گئی۔

بال کی طرف سے ممتاز کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ شاید شیریں نامی ملازمہ پر ناراض رہ گئی۔ میں ممتاز کے کمرے سے باہر آ گئی۔ ایک بند دروازے کے سامنے سے گزرتے سے اندر سے ہلکے سے نسوانی قہقہے کی آواز سنائی دی۔ اس کے فوراً ہی بعد ایک مردانہ قہقہہ

شاید رات کے ایک یا دو بجے کا وقت ہو گا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر میں نے ہم آنکھیں کھول دیں۔ وہ ممتاز اور کلیل تھے۔ میرے اندر اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اپنا جگہ حرکت کر سکوں۔ ممتاز میرے سامنے آ کر رک گئی۔ چند لمحے بے رحمانہ نظروں سے میرا طرف دیکھتی رہی، پھر میری ٹانگ پر ٹھوکر مارتے ہوئے بولی۔

”امید ہے تمہارے ہوش ٹھکانے آچکے ہوں گے۔“

”پانی..... مجھے پانی..... دو۔“ میرے منہ سے آواز بمشکل نکل سکی تھی۔ ممتاز نے مڑ کر کلیل کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ ممتاز میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے بھی ہمارے دے کر بٹھایا۔

”کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری۔“ اس کے لہجے میں ہلکا سا تاسف تھا۔ ”یہ سب کچھ تمہاری غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔ تمہیں گھر سے قدم نکالنے سے پہلے ہی سوچ لینا چاہئے تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔“

”تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میری زندگی برباد کر دی۔ میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔“ میں نے رک رک کر جواب دیا۔

”اوہو.....“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔ ”کس بل ابھی باقی ہیں۔ مجھے دھمکی دے رہی ہو۔ مگر تم کیا کر سکو گی؟“ وہ خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ”کیا کر سکتی ہو تم؟ تم زندگی کے ایسے موڑ پر آ چکی ہو جہاں تمہارے لئے کوئی چوائس نہیں رہی۔ گھر واپس جانا چاہتی ہو؟ میں کل صبح ہی تمہیں ساتھ لے کر تمہارے گھر کے دروازے پر چھوڑ دوں گی۔ لیکن کیا تم اس گھر میں قدم رکھ سکو گی؟ کیا تم اس قابل رہی ہو کہ اپنے گھریا خاندان والوں کو صورت دکھا سکو؟“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی، پھر بولی۔ ”میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے، مانتی ہوں۔ تم مجھے چھوڑ کر جانا چاہتی ہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دروازے کھلے ہیں۔ تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ یہ دنیا خونخوار درندوں سے بھری پڑی ہے۔ قدم قدم پر تمہیں انسان کے روپ میں خونخوار بھیڑیے ملیں گے جو تمہیں اجڑ کر رکھ دیں گے۔ ایک کے پنجوں سے لٹکوا دیں تو دوسرا تمہیں نوچنے کے لئے تیار بیٹھا ہو گا۔ اور تمہارا جو انجام ہو گا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکو گی۔“

کلیل پانی کا گلاس لے کر آ گیا۔ ممتاز نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور دوبارہ میرے قریب بیٹھ گئی۔

”میں نے جو کہا ہے اس پر غور کرو۔“ اس نے کہتے ہوئے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا

بازوں پر فائز تھے۔ ان کی تصویریں اکثر اخباروں میں بھی چھپتی رہتی تھیں۔

ممتاز سوچتی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اب بھی میرے سینے پر تھا۔ میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹا کر ڈال دیا۔ میں نے سر کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کپٹیاں سلگے لگیں۔ میں بڑی آہستگی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا اور بڑی متوحش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اس وقت اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ یہ میرے لئے ایک بہترین موقع تھا۔ ممتاز کو گولی مار دوں اور یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر ایک دوسرے خیال نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔ یہاں سے بھاگ کر کہاں جاؤں گی؟ کون سی ایسی جگہ تھی جہاں میں پناہ لے سکوں گی۔ ممتاز نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ اس دنیا میں انسان نہیں، درندے بستے ہیں۔ ڈنڈا بھڑیئے ہیں جو قدم قدم پر گھات لگائے بیٹھے مجھے جیسے شکار کا انتظار کرتے ہیں۔ میں ہاں سے نکل کر زیادہ دور نہیں جا پاؤں گی۔ یہ خونخوار بھڑیئے مجھے چیر ڈالیں گے۔ اور اگر ان سے بچاؤ تو پولیس..... میرے پاس پناہ کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اور پولیس مجھے صبح ہونے سے پہلے ہی پکڑ لے گی۔ پولیس ملازموں کے ساتھ جو سلوک کرتی ہے اس کے بارے میں اُن دن اخباروں میں خبریں چھپتی رہتی ہیں۔

اس عذاب ناک درندگی سے بچنے کا ایک اور راستہ تھا۔ اپنے آپ کو ختم کر لوں۔ میں نے بول کی نالی اپنی کپٹنی پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میری انگلی کی معمولی سی حرکت مجھے زندگی سے نجات دلا سکتی تھی۔ لیکن میں بزدل تھی۔ اپنے آپ کو بھی نہیں مار سکی اور بستر پر اوندھ کر ہٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میرے رونے کی آواز سن کر ممتاز جاگ گئی۔ وہ پہلے تو رونے کی وجہ پوچھتی رہی۔ پھر میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر شاید ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے بڑی آہستگی سے بول میرے ہاتھ سے لے کر دوسری طرف ڈرائنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا اور مجھے اپنے ہاتھ لپٹا لیا۔ میں اس کے سینے پر سر رکھ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ عجیب بات تھی کہ جس نابھیری زندگی برباد کی تھی، میں اس سے ہمدردی کی توقع کر رہی تھی۔

رات کا باقی حصہ روتے ہوئے ہی گزرا تھا۔ اور پھر صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے میں سو گئی۔ شہر کی گلیوں نے نہیں جگایا۔ ویسے بھی اس جیسی جگہوں پر راتیں جاگتیں اور دن سوتے ہیں۔ اس طرح میں بھی سب لوگ سو رہے تھے۔ ممتاز بھی سو رہی تھی۔

بھی سنائی دیا تھا۔

میں آگے بڑھ گئی۔ ممتاز مجھے لاؤنج ہی میں مل گئی اور مجھے بازو سے پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ میز پر کھانا لگ چکا تھا۔ ایک پلیٹ میں چکن کا سالن تھا۔ دسترخوان پر دو گرم گرم چائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شیریں نے روٹیاں پکانے میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اس وقت بھی کچن میں کھڑی روٹیاں پکا رہی تھی۔ مجھے دو دن بھوکا رکھا گیا تھا اور وہ سمجھ رہی تھی کہ میں نجانے کتنی روٹیاں کھاؤں گی۔

ممتاز میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے سالن کی پلیٹ میرے آگے بڑھا دی اور بڑے پار سے ایک لقمہ بنا کر میرے منہ کی طرف بڑھا دیا۔ میرا دل تو چاہا کہ اس مکاری پر سالن کی پلیٹ اٹھا کر اس کے منہ پر دے ماروں اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

جبرے میں تکلیف کی وجہ سے میں بڑی مشکل سے اپنا منہ کھول سکی تھی۔ اور پھر نوالہ چبانے میں بھی مجھے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ بہر حال، دوسرا نوالہ میں نے خود اٹھایا تھا۔

میں بڑی مشکل سے صرف ایک روٹی کھا سکی تھی۔ میرے روٹی ختم کرنے تک شیریں نے چائے بھی بنا دی تھی۔ ممتاز بھی میرے ساتھ چائے پیتی رہی اور پھر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئی۔

”تمہارے کمرے میں شکیل کے ساتھ ایک مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ آج رات تم یہیں سو جاؤ۔ میرے پاس۔“ ممتاز نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

میں بیڈ کے ایک کنارے پر لیٹ گئی۔ ممتاز نے بھی لیٹ کر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور جیسے لمبے میں مجھے دنیا کی اونچ نیچ سمجھانے لگی۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس کے ہمدردی جھلنے پر نہیں، اپنی بربادی پر۔

لیکن میرے خیال میں ممتاز کی اس میں کوئی غلطی نہیں تھی۔ میں اپنی بربادی کی ذمہ داری اس پر نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ تو ایک شکاری عورت تھی۔ اس کا تو دھندہ ہی یہ تھا۔ وہ سانی سرگرمیوں کی آڑ لے کر مجھ جیسی بھولی بھالی لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتی تھی اور ان کی کمائی پر عیش کر رہی تھی۔

میں کئی روز سے ممتاز کے پاس تھی۔ یہاں میں نے بڑے بڑے لوگوں کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں صنعت کار بھی تھے۔ بزنس مین بھی، اعلیٰ سرکاری آفیسر بھی اور سیاست دان بھی۔ میں نے کونھی کے لاؤنج اور ڈرائنگ روم میں بعض سیاستدانوں کے ساتھ ممتاز کی تصویریں بھی فریوٹوں میں لگی ہوئی دیکھی تھیں۔ ان میں کم از کم دو سیاستدان ایسے تھے جو

میرا دماغ سلگ رہا تھا۔ میں آہستگی سے بستر سے اٹھ کر ہاتھ روم میں کھس گئی اور دیکھنے لگی۔ پانی کے شاور کے نیچے کھڑی رہی۔

میں نہا کر باہر نکلی تو اس وقت بھی گھر پر سناٹا تھا۔ ہال کمرے میں رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اچانک ہی اس وقت میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہاں سے بھاگ چلوں۔ دن وقت ہے، کسی نہ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ ہی جاؤں گی۔ کسی کوٹھی میں کھس جاؤں گی۔ کوئی نہ کوئی عورت تو ملے گی۔ اپنی کہانی سنا کر مدد طلب کروں گی۔

میرے قدم خود بخود باہر والے دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔ میں دروازہ کھول کر برآمدے میں نکلی تو برآمدے کے دائیں طرف پودوں کی کیاری کے قریب فیچے کو دیکھ کر کمرے اور ادوں پر اوس پڑ گئی اور میں برآمدے ہی میں رک گئی۔

فیچا ممتاز کا پرانا وفادار تھا۔ وہ ہٹا کٹا، لمبا ترنگا آدمی ممتاز کے اشاروں پر چلتا تھا۔ وہ پچھلے تین چار روز سے غائب تھا۔ غالباً شہر سے باہر کہیں گیا ہوا تھا اور شاید آج صبح ہی واپس آیا تھا۔ وہ اس وقت پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

میں چند لمحے برآمدے میں رکی رہی اور پھر واپس آ کر ہال کمرے میں ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ چند منٹ بعد ہی اپنے قریب آہٹ سن کر میں نے آنکھیں کھولیں۔ شیریں پائے کا کپ لئے میرے قریب کھڑی تھی۔ اس نے کپ میرے سامنے تپائی پر رکھ دیا اور قالین پر بیٹھ گئی۔

میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں کپ اٹھا کر پائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔ میرے سامنے قالین پر بیٹھی ہوئی شیریں دھیمے لہجے میں مجھے سمجھا رہی تھی۔ وہی باتیں جو رات بھر ممتاز سمجھاتی رہی تھی۔

شیریں کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کا بدن اگرچہ اب ڈھک چکا تھا مگر اس کی کٹھ بتا رہی تھی کہ جوانی میں بڑی حسین رہی ہوگی۔

”ہم جیسی عورتیں جب گھر کی دلہیز سے باہر قدم نکالتی ہیں تو ان کا ٹھکانہ ایسی کوٹھیاں ہی ہوتی ہیں۔“ شیریں کہہ رہی تھی۔ ”تم جو غلطی کر چکی ہو، اس کا اب کوئی اوپاٹے نہیں ہے۔ تمہیں ساری زندگی اب اسی دلدل میں گزارنی ہے۔ یہاں سے نکل جانا اب تمہارے لیے میں نہیں۔ ویسے بھی یہ بہت ظالم لوگ ہیں۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ تم ان سے بچ کر کہیں نہیں جاسکوگی۔ یہ تمہیں باتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔“

شیریں بولتی رہی اور میں سنتی رہی۔ اس نے اپنے بارے میں بھی کچھ انکشاف کئے تھے۔

پچیس سال سے اس گندگی میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ بیس بائیس سال کی تھی جب اسے گجرات کے ایک گاؤں سے انوا کر کے لایا گیا تھا۔ مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی چند سال پہلے ممتاز نے اسے خریدا تھا۔ وہ ساری زندگی عیاش مردوں کے ہاتھوں کا کھلونا اور طوائفوں کی آمدنی کا ذریعہ بنی رہی تھی۔ اور اب بھی انہی کی خدمت کر رہی تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ میرا وہ کمرہ دوبارہ مجھے دے دیا گیا تھا۔ میں سارا دن اپنے کمرے میں بی رہتی۔ میری حالت اب کافی بہتر ہو گئی تھی۔ ممتاز بھی مجھ پر بڑی توجہ دے رہی تھی۔

تین ہفتے گزر گئے۔ اس دوران مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ ممتاز ایک بڑی سیاسی پارٹی کے شعبہ خواتین کے اپنے حلقے کی صدر بھی تھی۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی کہ کوئی ان کا کچھ کیوں نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ ممتاز نے این جی او اور سیاسی پارٹی کی آڑ میں اپنا کاروبار پھیلا رکھا تھا۔ وہ سیاست دانوں، اعلیٰ سرکاری عہدیداروں اور پولیس کے بڑے افسروں کو عورتیں بلاتی کرتی تھی۔ اس طرح اس نے ان بڑے اور بڑے دارلوگوں کے نہ صرف ہاتھ پیر باندھ رکھے تھے بلکہ ان سے اپنے دوسرے کام بھی نکلواتی رہتی تھی۔ اس نے شہر کے کئی پوش علاقوں میں بڑے بڑے پلاٹ لے رکھے تھے۔ ان پلاٹوں کے لئے اسے پہلے سے ایک پیسہ بھی ادا نہیں کرنا پڑا تھا۔ یہ تو ان لڑکیوں کے حسن و شباب کا کرشمہ تھا جنہیں وہ سیاست دانوں اور بڑے لوگوں کی خدمت میں پیش کرتی رہتی تھی۔

ایک مہینے بعد ممتاز نے پھر ایک دولت مند عیاش کے ساتھ میرا ایک رات کا سودا کر لیا۔ نول ممتاز کے میں نے بہت آرام کر لیا تھا۔

اور پھر دو سال گزر گئے۔ ان دو برسوں میں، میں نے جو کچھ دیکھا وہ اگر منظر عام پر لے آؤں تو اس ملک میں قیامت آجائے۔ ممتاز نے مجھے بڑے بڑے سیاست دانوں اور چند خاص نامدار لوگوں کے لئے مخصوص رکھا تھا۔ جلسوں میں عوام کی ناگفتہ بہ حالت پر تقریریں کرتے ہوئے آنسو بہانے والے سیاست دان، ملک کی سلامتی کا رونا رونے والے حکمران اور نیکی اور انسانی کا درس دینے والے۔ ان سب کو میں نے نگاہ دیکھا ہے۔

یہ پلاٹ بھی ممتاز کو ایک بڑے آدمی نے تحفے میں دیا تھا۔ جبکہ ایک سیاست دان نے کوٹھی بنا لی۔ ممتاز چند مہینے پہلے ہی اس کوٹھی میں منتقل ہوئی ہے۔ اگرچہ سمن آباد والی کوٹھی میں بھی اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن ممتاز کے خیال میں یہ کوٹھی اس کے دھندے کے لئے زیادہ نفع دیتی تھی۔ وہ صرف مجھے یہاں لے کر آئی تھی۔ جبکہ دوسری لڑکیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر انہیں بلایا جاتا تھا۔

میں نے ایجوکیشن ٹاؤن میں ایک کوٹھی بھی کرائے پر لے رکھی ہے۔ لیکن وہاں..... قریب
خجور اہلی رہتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ اور پھر اچانک ہی مجھے اور بہت کچھ یاد آ
”کیا تم دھکے نامی کسی عورت کو جانتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”دھکے! یہ وہی عورت تو نہیں جس کے بارے میں پچھلے دنوں اخبارات میں بہت کثرت
چھپا رہا ہے؟“

”ہاں وہی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ پاکستان میں لبنان کی سفیر تھی اور مہینے میں ایک
بلا ہوور میں رہتی تھی۔ پچھلے دنوں اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کا قتل پولیس کے لئے ابھی تک
بک معہ بنا ہوا ہے۔“
”میں نے اخباروں میں پڑھا تھا۔ لیکن یہاں دھکے کا کیا ذکر۔ اس کا اس معاملے سے کیا
تعلق؟“ اس نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔
”بہت گہرا تعلق ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ اس کی باتوں سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اس
مسلے میں صرف اخباروں کی حد تک جانتی ہے۔ اسے اصل حقائق کا علم نہیں ہے۔ ”مادام دھکے
نے قتل میں تمہاری ممتاز بیگم عرف تاجی اور شکیل کا ہاتھ ہے۔“
”کیا.....؟“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس طرح میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے
سیریلی بات کا یقین نہ آیا ہو یا میری دماغی صحت پر شبہ ہو۔“

”یہ سچ ہے۔“ میں نے منسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں اس واردات کا چشم دید گواہ تو
ہوں لیکن پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مادام دھکے کو انہی دونوں نے قتل کیا ہے۔“ میں
نہوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے اسے اس رات کے بارے میں بتانے لگا
ب میں ملک شہاب کی کوٹھی سے فرار ہوا تھا اور عجیب حالات کے تحت مادام دھکے کی کوٹھی میں
فل ہوا تھا۔

”اور پوسوں رات.....“ میں کہہ رہا تھا۔ ”فائیو اسٹار ہوٹل میں میرے گلے میں مادام دھکے
الاکٹ دیکھ کر انہیں مجھ پر شبہ ہوا تھا۔ اور یہ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کر کے اپنی کوٹھی لے
ئے تھے۔“

”لیکن وہ تو تم سے کسی دولت کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“ نجمہ نے اُلجھی ہوئی
”اُس سے میری طرف دیکھا۔“

”یہ درست ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ دولت میں مادام دھکے ہی کی کوٹھی سے اُڑا کر

میں اپنا ڈکھ نہیں بھولی تھی۔ مجھے وہ رات یاد تھی جب پہلی مرتبہ میری عزت کا سودا ہوا تو
میرے دل میں ممتاز کے لئے اب بھی اتنی ہی نفرت تھی۔ میں اس سے اپنی بریادی کا انتقام با
چاہتی تھی۔ مگر اکیلی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں ان کی طاقت سے واقف ہو چکی تھی۔ اور یہ بار
اچھی طرح جانتی تھی کہ جہاں بھی جاؤں گی، پکڑی جاؤں گی۔ ان کے چنگل سے نکلنے کے
مجھے کسی مضبوط سہارے کی تلاش تھی۔ لیکن کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس سے میں وفا کی توقع
سکتی۔

اس روز تمہیں ان کی قید میں دیکھا اور تمہاری پٹائی ہوتے دیکھی تو میں سمجھ گئی کہ تم جیسے شخص
کو جھکانا یا توڑنا ممکن نہیں۔ اور تم جیسا شخص ہی میرا ساتھ دے سکتا ہے۔ اس لئے اس رات
میں نے فرار ہونے میں تمہاری مدد کی تھی۔ مگر بد قسمتی سے تم اگلے ہی روز پھر پکڑ لئے گئے۔
ممتاز وغیرہ کو یہ شبہ بھی نہیں ہو سکا تھا کہ میں نے تمہیں فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ ممتاز
سمجھ گئی تھی کہ اب میں کہیں نہیں جاسکتی۔ وہ مجھ پر اگرچہ کچھ اعتماد کرنے لگی تھی لیکن اس نے
مجھے اکیلا کبھی نہیں چھوڑا تھا۔ میں بازار جاتی تو شکیل یا فیقا میرے ساتھ ہوتا۔ گھر پر بھی ان
دونوں میں سے کوئی نہ کوئی میری نگرانی کے لئے موجود رہتا۔ اور پھر تمہاری وجہ سے بھی گھر پر
ایک آدمی کی موجودگی ضروری تھی۔

میں نے تمہارے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ ملک شہاب جیسے آدمی
سے نکل لینا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ نہ صرف تمہیں ان کی
قید سے نکالوں گی بلکہ خود بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اور اب.....“ وہ خاموش ہو کر گہرے
سانس لینے لگی۔ پھر بولی۔ ”تم بھی آزاد ہو اور میں بھی۔ لیکن سوچ رہی ہوں کہ ہماری یا کم از
کم میری یہ آزادی کتنے روز برقرار رہ سکتی ہے۔“

”اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ اور تم نے مجھ پر
جو اعتماد کیا ہے اسے بھی ٹھیک نہیں پہنچنے دوں گا۔“

”میں بھروسہ کر کے ہی تمہارے ساتھ آئی ہوں۔ لیکن.....“
”لیکن کیا.....؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا ہمیں یہیں رہنا پڑے گا؟ اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہے؟ یہ تو مجھے کوئی کھنڈر لگتا
ہے۔“ نجمہ نے کہا۔

”ہے تو یہ کھنڈر ہی۔ لیکن یہ محفوظ ترین جگہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ایک جگہ اور بھی

اس خونخوار بلی کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“ نجمہ بھی مسکرا دی۔ میں چند لمحوں میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنی جان داؤ پر لگا کر مجھے تاجی کی قید سے نکال کر لائی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس پر اعتماد کیا جاسکتا تھا اس لئے میں نے اسے رشتی کے بارے میں سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

”وہ چند روز مادام دھکے کے پاس کام کر چکی ہے اور اس سے پہلے پولیس میں بھی رہ چکی ہے۔ میں نے کہا اور پھر اسے رشتی کے بارے میں بتانے لگا۔

”رشتی کی نظریں مادام دھکے کی اس دولت پر ہیں جو اس کے کہنے کے مطابق کوٹھی کے تہہ بنائے میں محفوظ ہے۔ لیکن میں مادام دھکے کے بارے میں کچھ اور جانتا چاہتا ہوں۔ وہ مبینہ ہر ایک ہفتہ لاہور میں کیوں رہتی تھی، اس کا خفیہ مشن کیا تھا اور اس کے قتل کے محرکات کیا تھے؟ سب کچھ اگر معلوم ہو جائے تو یہ معصومہ حل ہو سکتا ہے اور ہماری حکومت کی نیک نامی پر جو براہِ راجہ لگا ہے، وہ بھی صاف ہو سکتا ہے۔“

”حکومت کی نیک نامی سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”کسی ملک میں جب اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں، کسی غیر ملکی سفارتکار کو قتل کر دیا جائے تو بدنامی اس ملک کی ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں جرائم پیشہ ضرور ہوں لیکن اپنے ملک کا دفاع نہیں۔ چھوٹے موٹے جرائم کا ارتکاب کرنا الگ بات ہے اور ملک کی جڑیں کھوکھلی نہ دوسری بات۔ ملک شہاب سے میری کیا دشمنی ہے۔ ذاتی طور پر تو میں اسے جانتا بھی نہیں۔“ وہ اٹھ کھڑا۔ ”ہیروئن کا بیوپاری ہے۔ موت کا سوداگر ہے۔ اس کے پھیلائے ہوئے زہر ہماری نوجوان نسل مفلوج ہو رہی ہے۔ یہی نوجوان آگے چل کر ہمارے ملک کے ستون بنائے۔ لیکن انہیں اندر سے کھوکھلا کیا جا رہا ہے۔ وہ اپنے پیروں پر ہی کھڑے نہیں ہو سکیں۔“ ملک کا بوجھ کیسے اٹھائیں گے۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”میں جرائم پیشہ نہیں۔ قاتل بھی ہوں۔ زیر زمین دنیا میں میرے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ بڑے بڑے مجرم میرا نام لے کر فرار ہوتے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ جب بھی پکڑا جاؤں گا، مجھے پھانسی کے پھندے پر لٹا جائے گا۔ میرے کندھوں پر جرائم کا بہت بوجھ ہے۔ لیکن میں اس وقت تک قانون کی نافرمانی نہیں آنا چاہتا تھا جب تک ملک شہاب جیسے لوگوں کو کیفرِ کردار تک نہ پہنچا دوں۔“

”جانتا ہوں ایک ملک شہاب کے کم ہونے سے ہمارا معاشرہ پاک نہیں ہو جائے گا۔ لیکن ہمارا کردار تو ادا کر سکتا ہوں۔“

”تمہارا خیال ہے کہ اگر تم ملک شہاب کا خاتمہ کر دو اور مادام دھکے کے قتل کا معصومہ حل کر

لایا تھا۔ مجھ سے دولت حاصل کر کے مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ نجمہ چار پائی پر بیٹھی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ”تاجی بہت لمبی ہی خطرناک عورت۔ ایک سال پہلے بھی ایسی ہی ایک بات سننے میں آئی تھی۔ بلکہ مانگا منڈی کا ایک پولیس آفیسر کسی قتل کی تفتیش کے سلسلے میں اس کی کوٹھی پر آیا تھا۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی، پھر بولی۔ ”تاجی نے زنگس نام کی ایک لڑکی کو کہیں سے خریدا تھا۔ وہ چند ہفتے ہی اس کے پاس رہی تھی، اس کے بعد یکایک غائب ہو گئی اور پھر اس کی لاش مانگا منڈی کے ایک کھنڈر نما ویران مکان میں ملی تھی۔ پولیس کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ زنگس، تاجی کے پاس تھی۔ مانگا منڈی کی پولیس تاجی کو اس قتل میں ملوث کرنا چاہتی تھی۔ مگر تاجی کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ تین دن بعد نہ صرف اس پولیس آفیسر کا مانگا منڈی سے تبادلہ ہو گیا بلکہ زنگس کے قتل کیس کی فائل بھی بند کر دی گئی۔“

”ہاں۔ تم تاجی کے بارے میں بہت تفصیل سے بتا چکی ہو۔ اس قسم کی عورتوں کے ہاتھ واقعی بہت لمبے اور رسائی بہت اوپر تک ہوتی ہے۔ ان جیسے لوگوں پر ہاتھ ڈالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ملک شہاب بھی ایسا ہی آدمی ہے۔ میں نے ایک شریف اور ذمے دار پولیس آفیسر کے ذریعے اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا تھا لیکن اسلام آباد تک کھلبلی مچ گئی اور وہ چند گھنٹوں بعد ہی رہا ہو گیا۔ جبکہ اس فرض شناس آفیسر کو بھی تبدیل کر کے لاہور سے باہر بھیج دیا گیا۔ بہر حال۔“ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم بتا سکتی ہو کہ تاجی کے تعلقات اور کس قسم کے لوگوں سے ہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی ایسا شخص جو تمہاری نظروں میں مشکوک ہو۔ یا تم نے کبھی تاجی اور ٹیکل کو کوئی ایسی بات کرتے سنا ہو۔ میرا مطلب ہے کوئی غیر معمولی بات یا کبھی ان کی باتوں میں تم نے دھکے کا نام سنا ہو۔“

”ایسی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں آ رہی۔ لیکن۔۔۔۔۔“

”لیکن صورتحال یہ ہے کہ۔۔۔۔۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مادام دھکے ایک سفارتکار تھی اور سننے میں آیا ہے کہ وہ کبھی خفیہ مشن پر تھی۔ اور مجھے شبہ ہے کہ اس کا قتل بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ کسی خفیہ مشن پر تھی؟“ نجمہ نے مجھے گھورا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک خونخوار بلی کا ذکر کیا تھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس سلسلے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ اور مجھے بھی اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔“

دو حکومت تمہیں کچھ مراعات دے گی۔ تمہارے جرائم معاف کر دے گی؟“ نجمہ نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”بالکل نہیں۔ میں نے ایسا بالکل نہیں سوچا۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تو پہلے یہ کہہ چکا ہوں کہ جب بھی پکڑا گیا، پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جاؤں گا۔ لیکن اگر مادہ دہشکے کے قتل کا معرہ حل ہو جائے تو ہماری حکومت کی نیک نامی پر لگا ہوا دھبہ صاف ہو کر رہے۔“

نجمہ چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔

”تمہارے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا۔“

”کیسا اندازہ؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”جب تاجی اور ٹکیل تمہیں پکڑ کر لائے تھے تو تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم مضبوط قوت ارادی اور مضبوط کردار کے مالک ہو۔ اور تمہیں جرائم کی اس دلدل میں دھکیلا گیا ہے۔“

”اپنی خوشی سے تو کوئی بھی برائی کے راستے پر قدم نہیں رکھتا۔ اس کی مثال تم خود بھی ہو۔ اور.....“ میں کہتے کہتے رک گیا۔ نجمہ کے چہرے پر عجب سے تاثرات ابھر آئے تھے اور نظریں جھک گئی تھیں۔ ”سوری! آئندہ ایسی کوئی بات میرے منہ سے نہیں نکلے گی جس سے تمہیں دکھ پہنچے۔“ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میری قوت ارادی کے مضبوط ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کا مظاہرہ تم خود بھی دیکھ چکی ہو۔ تاجی، ٹکیل اور فیض نے گدھوں کی طرح میری دھنائی کی تھی لیکن میری زبان نہیں کھلوا سکے۔ میں آہنی اعصاب کا مالک ہوں۔ لیکن میرا کردار.....“ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ”کہیں اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں بہت متقی اور پرہیزگار ہوں۔ عورتوں کو دیکھ کر میری نظریں جھک جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کے معاملے میں، میں بہت بدکردار ہوں۔ میری زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں اور شاید ہی کوئی بچ کر گئی ہو۔“

نجمہ کا چہرہ ایک بار پھر متغیر ہو گیا۔

”لیکن.....“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں محسن کش نہیں ہوں۔ تم نے

مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ تمہارے اعتماد کو نہیں نہیں پہنچے گی۔“

”مجھے تم پر یقین ہے۔“ نجمہ نے کہا۔ ”لیکن تمہارے خیال میں مادام دہشکے کو قتل کیوں کیا گیا تھا؟ اس میں تاجی اور ٹکیل کا کیا مفاد ہو سکتا ہے؟“

”تاجی کے کہنے کے مطابق دہشکے اس کی دوست تھی۔ لیکن میں اس بات کو نہیں مان سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”کسی سفارت کار سے تاجی جیسی طوائف کی دوستی کوئی عجیب بات نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ سفارت کار اگر مرد ہو تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ نہیں، میں اس بات کو نہیں مانتا اور نہ ہی بات تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ انہوں نے دولت کی خاطر قتل کیا تھا۔ اگر یہ قتل دولت کی خاطر کیا ہوتا تو وہ دولت چھوڑ کر نہ بھاگتے۔ تاجی کے کہنے کے مطابق وہ باہر سے فائرنگ کی آواز سن کر بدحواس ہو گئے تھے اس لئے دولت نہیں سمیٹ سکے۔ میں یہ بات اس لئے نہیں مانتا کہ ان کے پاس دہشکے کی لاش کو الماری میں ٹھونسنے کا وقت تھا تو وہ الماری کے دوسرے خانوں میں زیورات اور ٹوٹوں کی گڈیاں کیوں نہیں سمیٹ پائے۔ نہیں نجمہ..... یہ قتل محض دولت کے لئے نہیں ہوا۔ اس کے پیچھے کوئی اور مقصد تھا جو دولت سے بھی زیادہ بڑا تھا اور مجھے یہ معلوم کرنا ہے۔“

”میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی ہوں تو.....“

”ضرور کر سکتی ہو۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم یہ سوچتی رہو کہ لڑکیوں کے گاہکوں کے علاوہ کون ایسے آدمی ہیں جن کے تاجی سے قریبی تعلقات ہیں۔ کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جس پر تمہیں شبہ ہو۔ یا کوئی اور غیر معمولی بات۔“

”اس وقت مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں آرہی۔“ نجمہ نے جواب دیا۔ ”لیکن تم اپنی اس نگار بلی رشتی سے کیوں نہیں مل لیتے جس نے تمہیں دہشکے کے بارے میں بتایا تھا۔ ویسے نا الفاظ میں تم نے اس کی تصویر کھینچی ہے، میرا بھی اس سے ملنے کو دل چاہنے لگا ہے۔“

”میں تمہیں اس سے ضرور ملاؤں گا۔ لیکن چند روز ٹھہر جاؤ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جب تم میں چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو جاتا اس وقت تک تو ہمیں یہیں رہنا ہے۔ اس کھنڈر میں۔“

”ٹھیک ہے۔“ نجمہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ گلی چھوٹی سی ہے۔ چند ہی گھر ہیں۔ اور میرے اندازے کے مطابق یہاں نچلے طبقے کے لوگوں کی آبادی ہے۔ ایسی لڑکیوں پر کسی گھر میں مہمانوں کی آمد چھپی نہیں رہتی۔ سو لجر یہاں اکیلا رہتا ہے۔ اب یہاں بدعورت کی موجودگی محلے والوں کو شبہ میں مبتلا کر دے گی۔“

”سو لجر شریف آدمی ہے۔ کم از کم اس محلے میں شریف آدمی ہے۔ کسی کو اس سے شکایت نہیں ہے۔ اس پر کوئی اس قسم کا شبہ بھی نہیں کرے گا۔ کسی کے پوچھنے پر وہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا سنا اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا ہے۔“

بازرگ کو پکڑ کر لایا تھا۔ میرے جسم کی دوسری چوٹوں کا علاج تو کامیاب تھا مگر پیر کی تکلیف ایک سال تک رہی تھی۔ سو جن کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے آپریشن کا مشورہ دیا تھا۔ اور پھر اجد ایک روز بھائی گیٹ سے ہڈیوں اور جوڑوں کے ماہر پہلوان کو پکڑ لایا۔ اس نے حیرت دیکھتے ہی بتا دیا کہ موج آئی ہے۔ اور پھر اس نے جس طرح میری موج نکالی تھی، وہ میں ہی جانتا تھا۔ اگر میں دانتوں کے نیچے کپڑا نہ دبالتا تو میری چھین سن کر مٹنے والے جمع ہو جاتے۔

باش سے میرے پیر کی تکلیف بدستور کم ہونے لگی۔ اجد دن میں ایک دو چکر ضرور لگا لیتا تھا۔ وہ اب تک تو قابل اعتماد ثابت ہوا تھا اور ہر طرح سے میری مدد پر آمادہ نظر آتا تھا۔ سولجر نے گلی میں اپنے پڑوسیوں کو یہی بتایا تھا کہ میں اس کا دوست ہوں اور نجمہ میری بیوی۔ ہم دونوں فیصل آباد سے آرہے تھے کہ راستے میں بس کے ایکسٹنٹ میں، میں زخمی ہو گیا۔ اس کی بات پر کسی نے بھی شبہ نہیں کیا تھا۔ نجمہ کی وجہ سے نہ صرف شبنم (شبو) بلکہ گلی کی دہری خواتین بھی آزادی سے اس گھر میں آنے لگی تھیں۔ کبھی نجمہ بھی کسی گھر میں چلی جاتی۔ اس طرح اس کا وقت اچھا کٹ رہا تھا اور بوریٹ نہیں ہو رہی تھی۔

دیے نجمہ نے تو کمال ہی کر دیا تھا۔ وہ میرا اس طرح خیال رکھے ہوئے تھی جیسے وفا شعار اپنی اپنے شوہر کی خدمت کرتی ہے۔ اور ڈاکٹر کے علاج سے زیادہ اس کی خدمت گزاری تھی۔ میں تیزی سے تندرستی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ وہ روزانہ شام کو ایک چارپائی کمرے سے باہر کمرن میں بچھا دیتی۔ مجھے سہارا دے کر کمرے سے باہر لاتی۔ میرا ایک ہاتھ اپنی گردن لٹا ڈال لیتی۔ اپنا ایک ہاتھ میری کمر کے گرد حائل کر دیتی اور اس طرح سہارا دے کر مجھے کم کم اٹھا کھنٹھ کھن میں چلاتی اور ساتھ ہی ہدایات بھی دیتی رہتی کہ میں اپنا پیر کس طرح زمین رکھوں اور کس طرح آہستہ آہستہ اس پر بوجھ ڈالوں۔

شہودن میں کئی مرتبہ آتی تھی۔ وہ بھی مجھ سے بے تکلف ہو گئی تھی۔ کبھی وہ بھی نجمہ کے ہاتھ مل جاتی۔ وہ دونوں مجھے بانہوں سے سہارا دے کر کمرن میں کئی کئی چکر لگواتیں۔ مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔ اب میں بغیر سہارے کے چلنے لگا تھا۔ مگر پیر پر پوری طرح دباؤ تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ دو چار روز بعد یہ تکلیف بھی ختم ہوگئی اور میں آزادی سے چلنے پھرنے لگا۔

اس مختصر میں رہتے ہوئے مجھ نے ابھی تک کوئی شکایت تو نہیں کی تھی لیکن ظاہر ہے ہم دونوں یہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں ہم آزادی سے نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔

”کیا.....؟“ نجمہ نے گھورتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”مجبوری ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس کا دست کسی لڑکی کو بھگا کر لایا ہے۔ ویسے ایک بات بتاؤں، سولجر بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ اس نے بھی اس گلی میں ایک عدد دوستی پال رکھی ہے۔“

”اوہ.....“ نجمہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”کون ہے وہ؟“

”اسی گلی میں رہتی ہے۔ شبنم نام ہے اس کا۔ یہ دونوں بچپن سے اکٹھے ہی رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں صبح سولجر سے کہوں گا کہ وہ شبنم کو بلا لے۔ ہمیں شاید کئی روز یہاں رہنا پڑے۔ شبنم کی وجہ سے تمہارا وقت اچھا گزر جائے گا۔“

نجمہ کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اور پھر میری طرف منہ کر کے لیٹ گئی تھی۔ میں کھلے ہوئے دروازے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ رات کا اندھیرا رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہمیں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

”مجھے ایک اور خیال آ رہا ہے۔“ نجمہ نے کہا۔ ”تم تاجی کے بارے میں دھکے کے قتل کے حوالے سے پولیس کو مکمل اطلاع کیوں نہیں دے دیتے؟ پولیس انہیں پکڑ کر خود ہی سب کچھ اُگلوا لے گی۔“

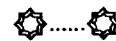
”تاجی کے بارے میں تم خود ہی بتا چکی ہو کہ اس کی رسائی بہت اوپر تک ہے اور وہ پہلے بھی قتل کے ایک کیس میں اپنے آپ کو بچا چکی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پولیس کو اطلاع دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کے چاہنے والے فوراً ہی آگے آجائیں گے۔ اس طرح نہ صرف تاجی بچ جائے گی بلکہ کیس بھی بگڑ جائے گا۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟“ نجمہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”فی الحال کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”رات بیت چکی ہے۔ دن کی روشنی نمودار ہونے والی ہے۔ اب تم سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔“

نجمہ نے نہایت سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوپٹہ پھیلا کر منہ پر ڈال لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

میری آنکھوں میں اس وقت جلن سی ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور فوراً ہی نیند کی وادی میں اتر گیا۔



ایک ہفتہ بڑی مشکل میں گزرا۔ اس ایک ہفتے کے دوران رکشہ ڈرائیور اجد دومرتبہ اور اس

میں نے اپنا حلیہ کسی حد تک تبدیل کر لیا۔ شیو تو ویسے ہی تین چار روز کا بڑھا ہوا تھا۔ امجد کا غرر پر پیٹ لیا اور بارہ بجے کے قریب اس کا رکشہ لے کر روانہ ہو گیا۔ امجد کو اپنی واپس نہ دہیں رکنے کو کہا تھا۔

رکشہ اور ٹیکسی ڈرائیوروں پر پولیس زیادہ شبہ نہیں کرتی۔ یہ رات بھر بھی سڑکوں پر پھرتے ہیں تو انہیں نہیں روکا جاتا اور اگر روکا بھی جائے تو انسپس یا کاغذات کے بہانے دس بیس روپے نوٹر کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

میں شہر کی مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا ملتان روڈ پر چوگی موڑ سے اس سڑک پر گھوم گیا جس کی ایک طرف اقبال ٹاؤن اور دوسری طرف ایجوکیشن ٹاؤن تھا۔ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے ڈکانوں سے پہلے ہی رکشہ ایجوکیشن ٹاؤن کی ایک گلی میں موڑ لیا۔ کچھ آگے جا کر ایک چھوٹے سے میدان کے قریب روک کر انجن بند کر دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

تقریباً پونے ایک بجے کا وقت تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں رکشے سے اتر کر گلی میں آگے بڑھا۔ اچانک ہی تاریکی میں ایک آوارہ کتا بھونکتا ہوا میری طرف لپکا۔ میں ایک دم اچھل کر اس کتے نے مجھے واقعی خوفزدہ کر دیا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے جھک کر اندھوں کی رانوں ہاتھ پھیلا کر ادھر ادھر ٹھولا۔ اتفاق سے ایک پتھر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ کتا ابھی اچھل کر بھونک رہا تھا۔ میں نے پتھر پوری قوت سے اس کی طرف اچھال دیا۔

جرے میں بھی پتھر نشانے پر بیٹھا۔ کتا چیاؤں پیاؤں کرتا ہوا ایک طرف بھاگ گیا۔ میں اپنی کونھی کی پچھلی گلی سے گھوم کر دوسری طرف سے کونھی والی گلی میں داخل ہوا۔ اس رات مجھے لمبا چکر کاٹنا پڑا تھا۔ اگر میں دوسری طرف سے آتا تو رخی کے مکان کے سامنے ٹارنر پڑتا۔ رات کے ایک بجے اس سے سامنا ہونے کی توقع ہرگز نہیں تھی لیکن میں احتیاط مان ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں مادام دھکے والے معاملے میں رخی سے ملنا تو ہاتھ مگر اس وقت نہیں۔

اپنی کونھی کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور دیوار پر لڑکھڑکی آہستگی سے دوسری طرف کود گیا۔ چند لمحے اپنی جگہ پر دبکا رہا اور پھر دبے قدموں آواز آمد سے میں آگیا اور پلے سے جھک کر اس کے پیچھے غلامی میں ہاتھ ڈال کر چابیاں تلاش کرنے لگا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

چابیوں کا گچھا وہاں نہیں تھا!

میرے دشمنوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ ملک شہاب کے بندے اور پولیس تو میری تلاش میں تھی ہی اور اب ان میں تاجی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ تاجی صرف ایک طوائف کا نام نہیں تھا، اس کے پیچھے سیاستدانوں اور اعلیٰ سرکاری حکام کی طاقت تھی جو دن میں تو ملک اور عوام کی بدحالی پر آنسو بہاتے تھے اور راتوں میں تاجی اور اس کی سپلائی کردہ طوائفوں کے پیر چاٹنے تھے۔ یہ بے ضمیر اور بے غیرت لوگ تاجی کے ایک اشارے پر میرے نیچے ادھیڑ سکتے تھے اور مجھے یقین تھا کہ تاجی نے بہت سے لوگ میری تلاش پر لگا دیے ہوں گے۔

میں اب بہت آرام کر چکا تھا۔ اب میں خاموش بیٹھا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ میں سب سے پہلے تاجی کے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہتا تھا لیکن نجمہ کوئی الحال سامنے نہیں لانا چاہتا تھا اور نہ ہی اسے ایجوکیشن ٹاؤن والی کونھی پر لے جانا چاہتا تھا۔

نجمہ کے بارے میں سوچتے ہوئے دفعۃً میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میری کونھی کی مالکہ رضیہ..... وہ بیوہ عورت تھی۔ اپنی بیٹی کے ساتھ اکیلی رہ رہی تھی۔ اگر نجمہ کو وہاں چھوڑ دیا جائے تو چند روز کے لئے یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔

رضیہ کو اگرچہ میں چھ مہینے کا کرایہ ایڈوانس دے دیا کرتا تھا۔ ابھی تین مہینے پہلے میں نے اسے پیسے دیئے تھے اور اگلے پیر یڈ تین مہینے بعد شروع ہونے والا تھا۔ لیکن میں نے اس روز رضیہ کے ہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ جس روز میں نے گاڑی خریدی تھی، میری جیب میں پچیس پچیس ہزار روپے تھے جو تاجی نے نکال لئے تھے اور میرا پستول بھی اس کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ میری گاڑی فائیو اشار ہوئی کے پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی۔ اس کی چابیوں کا گچھا میری جیب میں تھا جو اتفاق سے تاجی وغیرہ کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ وہ گچھا آخر وقت تک میری جیب میں رہا تھا اور یہاں اس رات کپڑے تبدیل کئے تو وہ گچھا جیب سے نکال لیا تھا جو اس وقت بھی میری چارپائی کے قریب رکھی ہوئی چھوٹی سی میز پر پڑا ہوا تھا۔ پچھلی مرتبہ جب میں یہاں سے رخصت ہوا تھا تو سو لجر کو چند ہزار روپے دے گیا تھا۔ اس نے کچھ رقم گھر کی بعض چیزیں خریدنے کے لئے بڑے سلیقے سے خرچ کی تھی اور باقی رقم بچا رکھی تھی جو میرے علاج پر خرچ ہوئی تھی۔ اس لئے سب سے پہلے میں نے اپنی کونھی جانے کا فیصلہ کیا۔

اس رات دس بجے کے قریب امجد مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اسے وہیں روک لیا۔ اس وقت شبو بھی نجمہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے نجمہ کو اشارہ کیا۔ وہ شبو کے ساتھ اس کے گمہ چلی گئی۔

میں نے ایک بار پھر اچھی طرح ٹٹولا پھر دوسرے ستون کے پیچھے بھی دیکھ ڈالا۔ مگر چابیوں کا کچھا نہیں ملا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، میں نے چابیوں کا کچھا دین رکھا تھا۔ میں تیزی سے اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ دروازے میں تالا لگا ہوا تھا۔ میری کنپٹیاں سلگے لگیں۔ میری عدم موجودگی میں شاید کوئی چور گھس آیا ہوگا۔ مگر چور اتنی شرافت کا مظاہرہ نہیں کرتے کہ پہلی چھپی ہوئی چابیاں تلاش کریں پھر واپس جاتے ہوئے دروازے پر تالا بھی لگا دیں۔

میں برآمدے سے نکل کر دبے قدموں چلتا ہوا پچھلی طرف آ گیا۔ اس طرف بھی دس بارہ فٹ چوڑی کھلی جگہ تھی۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی کو ٹٹول کر دیکھا، تمام شے سلامت تھیں۔ میں دوسرے کمرے کی کھڑکی کے قریب آیا۔ اتفاق سے اس کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے اندر ہاتھ ڈال کر چنچنی گرا دی اور کھڑکی کھول کر آہستگی سے چوکتھ پر چڑھ کر اندر کود گیا۔

میں کچھ دیر اپنی جگہ پر کھڑا ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کون کی چیز کمرے میں کہاں رکھی ہوئی تھی۔ میں اگر چاہتا تو دیوار پر سوکچ ٹٹول کر ہی بتی جلا سکتا تھا۔ لیکن بتی جلانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

اس کمرے سے نکل کر راہداری پار کر کے لاؤنج میں آیا تو راستے میں رکھی ہوئی ایک کرسی سے ٹکرا گیا۔ کرسی الٹ گئی۔ میرے گھٹنے پر چوٹ لگی تھی۔ میں کراہ اٹھا اور جھک کر گھٹا سہلانے لگا۔

یہ عجیب بات تھی کہ میں اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح گھسا تھا اور پکڑے جانے کے خوف سے اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا چل رہا تھا۔

کچن میں ماچس تلاش کرنے میں مجھے دشواری پیش نہیں آئی۔ لیکن دیا سلائی جلانے کی بجائے میں اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا ہی اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرہ اس لحاظ سے محفوظ تھا کہ یہ پچھلی طرف تھا اور سامنے کے رخ سے اس کی روشنی بھی نظر نہیں آ سکتی تھی۔ اس لئے میں نے بتی جلا لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ لیکن میں نے فوری طور پر بتی نہیں جلائی بلکہ دیا سلائی جلا کر اس کی زرد کپکپاتی ہوئی روشنی میں جائزہ لینے لگا۔

میری الماری کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں سے چابی نکال لی۔ پہلی دیا سلائی ختم ہو چکی تھی۔ میں نے دوسری دیا سلائی جلائی اور دوسرے ہاتھ سے الماری کا تالا کھولنے لگا۔

الماری میں وہ رقم محفوظ تھی جو چند روز پہلے میں نے تھیلے میں سے نکال کر یہاں رکھی تھی۔ اب میں نے کمرے کی بتی جلا لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ رقم بھی محفوظ تھی۔ الماری کا تالا میں نے خود کھولا تھا اور کسی دوسری چیز کو بھی جھوٹا نہیں تھا۔

میرا چور والا نظریہ غلط ثابت ہوا تھا۔ اگر میری عدم موجودگی میں کوئی چور آیا ہوتا تو کم از کم یہ رقم مجھے یہاں نہ ملتی۔ لیکن چابیوں کا کچھا کہاں غائب ہو گیا؟ مجھے یاد تھا کہ چابیوں کا کچھا میں نے برآمدے والے ستون کے پیچھے خلا میں اسی جگہ رکھا تھا جہاں ہمیشہ رکھا کرتا تھا۔ میں نے نوٹوں کے چند بٹل نکال کر پتلون کی جیبوں میں ٹھونس لئے۔ الماری کو تالا لگا کر چابی دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں ڈالی اور بتی بجھا دی۔

میں اسی طرح خاموشی سے کوٹھی سے نکل آیا جس طرح داخل ہوا تھا۔ پچھلی گلی میں کتے نے ایک بار پھر بھوک کر میرا استقبال کیا۔ لیکن شاید اس نے پہچان لیا تھا اور اس مرتبہ میرے قریب نہیں آیا تھا۔

ڈیڑھ سے اوپر کا وقت تھا۔ ملتان روڈ پر آ کر میں نے رکشے کی رفتار بڑھا دی۔ شہر سے باہر آنے جانے والی اکا دکا بسوں کے علاوہ کوئی ٹریفک نہیں تھا۔ یا پھر کبھی کبھار کوئی کار نظر آ جاتی۔ البتہ سمن آباد موڑ پر کھانے پینے کی دکانوں کی وجہ سے خاصی رونق تھی اور اس سے آگے چوبتری چوک پر بھی ایسی ہی دکانوں کی وجہ سے خاصی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ میں نے خان بابا ریسٹورنٹ کے سامنے رکشہ روک لیا۔ یہاں کئی کاریں کھڑی تھیں۔ ریسٹورنٹ کے سامنے کھلی جگہ پر دور تک میزیں کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن پر گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ دو میزوں پر تو والدین کے ساتھ بچے بھی نظر آ رہے تھے۔

تکے اور کباب کی اشتہا آمیز خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ خان بابا کے ساتھ اور سامنے بڑک کے دوسری طرف بھی تکے کباب والے ایسے ہی ریسٹورنٹ تھے اور وہاں بھی گاہکوں کی بھرمار تھی۔

میں نے نیچے اتر کر چکن ٹیکوں کا آرڈر دیا اور کیمین سے گولڈ لیف کا ایک سگریٹ لے کر کٹ لگاتا ہوا رکشے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اس دوران موٹر سائیکل پر دو پولیس والے اس طرف آنکے۔ انہوں نے موٹر سائیکل میرے قریب ہی روک لی۔ ایک کانسٹیبل تو شاید پانی پینے کے لئے ایک میز کی طرف چلا گیا اور دوسرا میرے قریب آ کر اوٹ پٹانگ سوالات کرنے لگا۔ میں لاپرواہی سے اس کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔

میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی تھی۔

میرا ہاتھ ابھی تک پولیس والے کے پیر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ دوسرا پولیس والا ریٹورنٹ کے اندر دروازے کے قریب ہی کاؤنٹر کے سامنے کھڑا سفید بالوں والے داری بھر کم غصے سے باتیں کر رہا تھا۔ ریٹورنٹ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے گاؤں کے بچے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس پولیس والے نے بھی کن انکھیوں سے اطراف میں دیکھا اور پھر جھک کر اپنے پیر اور رے ہاتھ کے نیچے دبا ہوا بنڈل اٹھالیا۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پولیس والا پہلو بدل کر اس رج کھڑا ہو گیا تھا کہ اس کی پشت ریٹورنٹ کی طرف تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اس کا دوسرا ساتھی لیبل یا باہر بیٹھے ہوئے گاؤں میں سے کوئی اس کے ہاتھ میں نوٹوں کا بنڈل نہ دیکھ لے۔ اس کا مطلب سمجھ کر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ یہ صورتحال کوئی انوکھی نہیں تھی۔ نوٹوں کا بنڈل بکراں کا نشیبل کی نیت میں بھی فوراً آگیا تھا اور اب میرے لئے اس صورت حال سے نمٹنا مان ہو گیا تھا۔

”مجھے تو پہلے ہی تم پر شک تھا اوئے۔“ کانیشیبل نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کی ازباده بلند نہیں تھی۔ اس نے نوٹوں کا بنڈل بھی اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ دوسروں کی نظروں سے اٹکے۔ ”تم تو شکل ہی سے وارداتے لگتے ہو۔ کہاں ڈاکا مار کر آئے ہو؟ اور تمہارے فوار کون تھا؟“

”میں وارداتیا نہیں ہوں سنتری بادشاہ!“ میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے ”نہ ہی میں کوئی ڈاکو ہوں۔ میں تو ایک سواری کو سمن آباد چھوڑ کر آ رہا ہوں۔“

”کوہتا شریف نہ بن اوئے۔“ وہ غرایا لیکن آواز اب بھی ہلکی تھی۔ ”میں تیری چڑی ادھیڑ لگایے۔“

”سنتری بادشاہ!“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا ساتھی اس طرف آ رہا ہے۔ اگر وہ آگیا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ رکشے میں بیٹھ جاؤ۔ آگے موڑ پر جا کر ساری بات سمجھا دیتا

آدھے گھنٹے بعد میرے آرڈر کے چکن نکلے تیار ہو گئے۔ ایک ویٹر نے شاپنگ بیک میرے حوالے کر دیا۔ میں نے قمیض کی جیب سے پیسے نکال کر دیئے۔ ”تھیا! آگے رکھا اور سین پر بیٹھ کر رکشہ اشارت کرنے لگا۔ مگر انجن اشارت نہیں ہو رہا تھا۔

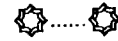
رکشوں میں یہی ایک بیماری تھی۔ ہر چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پلگ میں کچرا جاتا ہے۔ میں نیچے اتر آیا۔ سیٹ پیچھے کواٹھادی اور جھک کر پلگ کھولنے لگا۔

میری پتلون کی دونوں جیبوں میں نوٹوں کے بنڈل تھے۔ جینز کی جیبیں زیادہ گہری نہیں تھیں۔ اس طرح جھکنے سے ایک جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکل کر نیچے گر گیا۔

بنڈل گرنے کی ہلکی سی آواز سن کر ہی میں نے نیچے دیکھا تھا۔ ہزار والے نئے نوٹوں کا وہ بنڈل میرے پیر کے قریب گرا تھا۔ میں جھکے جھکے ایک قدم پیچھے ہٹا اور وہ بنڈل اٹھانے لگا۔

میرا ہاتھ جیسے ہی نوٹوں کے بنڈل پر پہنچا، کسی نے میرے ہاتھ پر پیر رکھ دیا۔ کالی پٹاوری چپل اور خاکی پتلون کا پانچہ.....!

میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ اوپر دیکھا، یہ وہی پولیس والا تھا جو کچھ دیر پہلے مجھ سے اٹنے سیدھے سوالات کرتا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں آٹوٹیک رائفل تھی اور ہونٹوں پر بڑی ظالمانہ مسکراہٹ.....!



اس سڑک کے ایک طرف گندانا تھا جس کے پچھلی طرف بنگلے تھے اور دائیں طرف وسیع و
ریاض پارک تھا۔ تقریباً دو فرلانگ آگے جا کر میں نے تاہر روڈ کے موڑ پر رکشہ روک لیا اور انجن
بند کر کے سیٹ پر پچھلی طرف مڑ گیا۔

”سنتری بادشاہ!“ میں نے پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کانٹیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”ہاں یہ ہے کہ میں جس بندے کو منن آباد چھوڑنے گیا تھا اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ
بندہ شراب کے نشے میں تھا اور بار بار لڑکی سے لپٹا جا رہا تھا۔ میں نے انہیں ایک کوشی کے
ہاتھ اتار دیا۔ اس بندے نے مجھے سوکانوٹ دیا تھا۔ واپس آتے ہوئے ایک موڑ پر میں نے
پچھلے مڑ کر دیکھا تو سیٹ پر شراب کی بوتل پڑی ہوئی تھی۔ میں وہ بوتل اٹھانے کے لئے پچھلی
بن پر جھکا تو ٹوٹ میٹ پر نوٹوں کا بنڈل پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے شراب کی بوتل اٹھا کر پھینک
دی اور نوٹوں کا بنڈل رب کی دین سمجھ کر جیب میں رکھ لیا۔ لیکن بد قسمتی سے یہ بنڈل میری جیب
سے گر گیا اور تم نے دیکھ لیا۔“

”سچ کہہ رہے ہو؟“ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کانٹیل نے کہا۔

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے سنتری بادشاہ!“ میں نے کہا۔ ”میں غریب آدمی
ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ قدرت نے غیب سے رقم کا بندوبست کیا ہے تو بہت سارے کام ہو
سکتے ہیں۔ بہن کی شادی بھی کر دوں گا۔ وہ بیچاری آس لگائے بیٹھی ہے۔ پر اب لگتا ہے کہ وہ
کر بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جائے گی۔ میں اسے ڈولی میں بٹھا کر رخصت نہیں کر سکوں گا۔“
”نہ اوئے نہ۔“ سنتری بادشاہ بولا۔ ”جی چھوٹا نہ کر۔ تیری بہن ڈولی میں بیٹھ کر ضرور
رفت ہوگی۔“

”کیسے رخصت ہوگی سنتری بادشاہ!“ میں نے کہا۔ ”جو امید لگی تھی وہ تم نے ختم کر دی۔ تم
لٹے تھانے لے جاؤ گے۔ یہ رقم تھانے میں جمع ہو جائے گی۔ مجھے کیا ملے گا؟ اور تمہارے ہاتھ کیا
اے گا۔“

”نہیں یار!“ کانٹیل بولا۔ ”یہ رقم تھانے پہنچ گئی تا تو ایس ایچ اوصاحب ہضم کر جائیں گے
اور کار بھی نہیں لیں گے۔“

”تو پھر یہ رقم مجھے دے دو۔“ میں نے کہا۔ ”میری بہن تمہیں بہت دعائیں دے گی۔“

”میری بہن بھی تمہیں بہت دعائیں دے گی۔“ کانٹیل نے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ میں اچھل پڑا۔

”یار! بات یہ ہے کہ میں نے بھی اپنی بہن کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں۔ پر اتنے پیسے ہی جمع

ہوں۔“

کانٹیل کے دل میں لالچ آپکا تھا۔ اس کا تعلق اس طبقے سے تھا جو رکشہ ٹیکسی ڈرائیور
اور تانگے والوں سے دودو، چار چار روپے جمع کرتے رہتے ہیں اور اس وقت تو اس کے ہاتھ
میں نوٹوں کا پورا بنڈل تھا۔ اس نے شاید ابھی تک نہیں دیکھا تھا کہ نوٹ ہزار ہزار کے تھے۔
کے لئے تو یہی کافی تھا کہ وہ کڑکڑاتے ہوئے نوٹ تھے اور بڑی تعداد میں تھے۔

”دیکھ اوئے..... میرے ساتھ ادھر ادھر کی نہ مار..... سچ بتا، کون ہے تو؟ اور یہ نوٹ کہاں
سے لئے؟“ کانٹیل نے کہا۔

”میں سچ کہتا ہوں سنتری بادشاہ!“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھ آگے والے موڑ پر
چلے چلو۔ ورنہ زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ یاد رکھو سنتری بادشاہ! قسمت کی دیوی زندگی میں سرز
ایک بار مہربان ہوتی ہے۔ تمہیں زندگی میں یہ موقع ملا ہے، فائدہ اٹھاؤ اس سے۔ سارے دل
دور ہو جائیں گے۔ اور دیکھو..... تمہارا ساتھی اس طرف آ رہا ہے۔ نوٹ چھپا لو اور رکشے میں بیٹ
جاؤ۔ اس سے کوئی بہانہ کر دیتا۔ دومنٹ میں واپس آ جاؤ گے۔“

سنتری بادشاہ نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کا ساتھی ریستورنٹ سے نکل کر اس طرف آر
تھا۔ سنتری بادشاہ ذرا سا گھوم گیا اور گھومتے ہوئے اس نے نہایت ہوشیاری سے نوٹوں کا
بنڈل اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی قریب آ گیا۔

”سراج! تم نکلے تیار کرو، میں اس کے ساتھ ذرا اگلے موڑ تک جا رہا ہوں۔“ سنتری بادشاہ
نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”معاملہ کیا ہے؟“ دوسرے کانٹیل نے کہتے ہوئے گھورا۔

”کوئی خاص معاملہ نہیں ہے یار۔ تو بیٹھ ادھر..... میں دومنٹ میں آتا ہوں۔“ سنتری
بادشاہ نے کہا اور رکشے کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ”چل بھی..... واپس آنے میں دومنٹ
سے زیادہ نہیں لگتا۔“

”بس یوں گیا اور یوں آیا سنتری بادشاہ۔“ میں نے چنگی بجائی اور محتاط انداز میں اپنی سیٹ
پر بیٹھ گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ نوٹوں کی کوئی دوسری گڈی نہ جیب سے نپک پڑے۔

میں نے بڑی احتیاط سے جھک کر کلک ہینڈل کو پکڑ کر زور سے اوپر کی طرف جھکے
کھینچا۔ پہلی ہی کوشش میں رکشہ اشارت ہو گیا۔

دوسرا کانٹیل ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے رکشہ
آگے بڑھا دیا کہ کہیں وہ کوئی چراغ نہ کر دے۔

”جہاں رہے ساتھی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگتی چاہئے۔ مجھے اپنی بہن کی شادی پر ضرور بلانا۔“
 ”جیسا کیا یار!“ وہ میرے ہاتھ سے نوٹوں کا بڈل لے کر پتلون کی جیب میں ٹھونسنے
 لگا۔ ”وہیے معاف کرنا یار! میں نے تمہیں پتہ نہیں کیا کیا کہہ دیا تھا۔“
 ”کی بات نہیں سنتری بادشاہ!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اپنا نام تو بتا دو۔ اور کون سے تھانے
 پر تم سے ملتا رہوں گا۔“

”میرا نام سلیمان ہے۔“ اس نے تھانے کا نام بھی بتا دیا، پھر بولا۔ ”اسی تھانے کے
 دروازوں میں رہتا ہوں۔ کوآرڈینر اٹھارہ ہے۔“
 ”ٹیک ہے۔ اب میں تمہیں واپس اسی جگہ چھوڑ دیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور سیدھا ہو کر
 ٹرانسٹ کرنے لگا۔ ”اپنے ساتھی سے کوئی بہانہ کر دیتا۔ اسے کوئی شک نہ ہونے پائے۔“
 ”اس کی تم فکر مت کرو۔“ کانٹیل سلیمان نے جواب دیا۔

میں نے رکشہ موڑا اور اسے سڑک کے کنارے کنارے چلاتا ہوا خان بابا ریسٹورنٹ تک
 آیا۔ دوسرا کانٹیل اب پھر کاؤنٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ سلیمان کے اترتے ہی میں نے رکشہ
 اور اسے تیزی سے دوڑا دیا۔
 اس وقت دو بجنے والے تھے۔ تیز رفتاری سے رکشہ دوڑاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کوئی
 زبردست ہو جائے۔ لیکن خیریت گزری۔

میں جب سو لجر کے کھنڈر نما گھر پہنچا تو ڈھائی بج چکے تھے۔ امجد اور سو لجر چارپائی پر بیٹھے
 لیٹ رہے تھے۔ نجمہ موجود نہیں تھی۔ وہ شبنم کے گھر میں تھی اور میرا خیال ہے وہیں سو گئی تھی۔
 ”بہت دیر کر دی روٹی باؤ..... ہم تو پریشان ہو رہے تھے۔“ امجد نے چارپائی سے اٹھتے
 ہو کر کہا۔

”کیا یار..... راستے میں ایک سنتری بادشاہ نے گھیر لیا تھا۔ اس کے چکر میں دیر ہو گئی۔“
 نے جواب دیا۔

”کوئی گڑبڑ؟“ امجد نے پوچھا۔
 ”نہیں۔ بس ڈرائیونگ لائسنس پر ہی بحث ہو رہی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”بڑی مشکل سے
 چھڑایا تھا۔“

”اچھا روٹی باؤ! اب میں چلتا ہوں۔“ امجد بولا۔
 ”بہت دیر ہو چکی ہے۔ رات یہیں رہ جاؤ نا۔“ میں نے کہا۔
 ”نہیں روٹی باؤ..... ماں پریشان ہو رہی ہوگی۔“ اس نے کہا۔

نہیں ہوتے کہ اسے رخصت کر سکوں۔ اب قدرت نے ایک وسیلہ بنا دیا ہے تو.....“ وہ چلنے
 کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو کہ قسمت کی دیوی زندگی میں صرف ایک بار مہر پار
 ہوتی ہے۔ آج ہم دونوں کی قسمت جاگ اٹھی ہے۔ ایسا کرتے ہیں ہم یہ رقم آدھی آدھی کر لیں
 ہیں۔ ہم دونوں اپنی بہنوں کو عزت و آبرو کے ساتھ رخصت کر دیں گے۔ ویسے کتنی ہے یہ رقم؟“
 میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے تو اپنی بہن کے بارے میں ایک فرضی کہانی گھڑی تھی اور
 اپنی بہن کا ڈکھڑالے بیٹھا تھا۔ اس نے رقم آدھی آدھی تقسیم کر لینے کی پیشکش کی تھی۔ اس
 مطلب تھا کہ اس کے دل میں ہمدردی تھی۔ اس کی بہن واقعی بڑے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس
 لئے اس نے میری بہن کا ڈکھڑا بھی محسوس کیا تھا۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے ڈرا دھماکا
 پوری رقم ہی ہضم کر جاتا۔ اس کی اس بات پر مجھے بھی ہمدردی ہو گئی۔

”ہزار والے نوٹوں کا بڈل ہے۔ ایک لاکھ روپیہ ہونا چاہئے۔“ میں نے کہا۔
 ”ایک لاکھ؟“ وہ اُچھل پڑا۔ ”اتنی رقم تو میں ساری زندگی جمع نہیں کر سکتا۔ پر تم مجھے تو آدھی
 رقم دو گئے نا۔ پچاس ہزار..... یہ بھی بہت ہے۔ تھوڑا بہت جہیز جمع کر رکھا ہے میں نے۔ تھوڑا
 سامان اور بنا لوں گا اور بہن کی شادی پر مہمانوں کو راج کے بوتلیں بھی پلاسکوں گا۔ لے بار..... تو
 ایمانداری سے اس رقم کو اُدھا اُدھا کر دے۔“ اس نے جیب سے نوٹوں کا بڈل نکال کر میرے
 حوالے کر دیا۔

مجھے اس سنتری بادشاہ سے واقعی ہمدردی ہو گئی تھی۔ مجھے یقین آ گیا تھا کہ اس کی بہن واقعی
 شادی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ میں نے فوراً ہی ایک اور فیصلہ کر لیا۔ یہ رقم میری حلال کی کمائی کی
 تو نہیں تھی جو مجھے کسی قسم کا ڈکھڑا ہوتا۔ اگر میں اس کانٹیل پر کوئی احسان کروں گا تو یہ آئندہ
 میرے کام آسکے گا۔

”سنتری بادشاہ!“ میں نے کہا۔ ”مہنگائی کا دور ہے۔ ہر چیز کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی
 ہیں۔ پچاس ہزار میں نہ تو میری بہن کی شادی ہو سکتی ہے اور نہ ہی تمہاری بہن کی۔ اس لئے.....“
 ”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ کانٹیل نے میری بات کاٹ دی۔ ”تمہاری نیت تو نہیں بدل گئی
 رقم ہاتھ میں آتے ہی؟“

”ہاں..... میری نیت بدل گئی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے یہ فیصلہ کیا
 ہے کہ یہ ساری رقم تم رکھ لو۔“

”کیا واقعی؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔
 ”یار سنتری بادشاہ!“ میں نے نوٹوں کا بڈل اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اسے سنبھال کر رکھو“

”ایمان ہو رہی ہوگی۔“

عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر کچھ کہے بغیر رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے جیبوں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر نیچے کے نیچے رکھ دیں۔ میں ہزاروں نوٹوں کی پانچ گڈیاں لے کر آیا تھا جن میں سے ایک راستے ہی میں نکل گئی تھی اور پانچ گڈیاں رہ گئی تھیں۔ یعنی چار لاکھ روپے۔

سو لجر نے بھی نوٹوں کی وہ گڈیاں دیکھی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی نظروں میں لالچ یا ہوس نہیں تھی۔

”نجمہ باجی کو بلا لاؤں رونی باؤ؟“ سو لجر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ نجمہ کو باجی کہتا تھا۔

”نہیں۔ وہ سو رہی ہوگی۔ اسے وہیں رہنے دو۔ اور تم مجھے چائے بنا کر دو۔ بڑی طلب ہو ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس وقت چائے رونی باؤ؟“ سو لجر نے کہا۔ ”تین بج چکے ہیں۔“

”نیز نہیں آ رہی یار..... عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کوئی بات نہیں ہوئی رونی باؤ؟“

”نہیں۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ تم چائے بناؤ..... ذرا اسٹراٹنگ۔“ میں نے کہا۔

سو لجر کمرے سے چلا گیا۔ میں چار پانی پر نیم دراز ہو گیا۔ پرانی یادیں فلم کی طرح میرے بالکل سر پر نمودار ہونے لگیں۔ ماں..... صرف اس ایک لفظ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں باغی کی یادوں میں اس طرح کھو گیا کہ اپنے آپ کو بھی بھول گیا اور چونکا تو اس وقت ایک شیریں سی آواز میری ساعت سے ٹکرائی۔

”کیا ہو رونی..... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ نجمہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں اپنے خیالات میں اس قدر غافل تھا کہ مجھے اس کی آمد کا پتہ ہی نہیں چل سکا تھا۔

”اے اتم کب آئیں؟“ میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں انداز اور چہرہ سنا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرفخی تھی۔

”نجمہ نے جواب دیا۔“ پہلے تو میں سمجھی تھی کہ تم سو رہے ہو۔ پھر سو لجر نے بتاتے دیکھا تو.....“

میں چونک گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ ماں کا ذکر کیا تھا۔ مجھے کبھی موقع ہی نہیں ملا تھا کہ اپنے سے اس کے گھر والوں کے بارے میں دریافت کرتا۔ اس وقت اس نے ماں کا ذکر کیا تو مجھے اپنے سینے پر گھونسا سا لگتا ہوا محسوس ہوا۔

میری آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کا چہرہ گھوم گیا۔ آخری مرتبہ جب میں نے اسے دیکھا تو وہ حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ زندگی بھر دھوکے اور فریب کا شکار رہی تھی۔ اس نے خدمت اور مسیحا کی جذبے کے تحت زسنگ سیکھی تھی اور ہسپتال میں ملازمت کی تھی۔ جہاں احمد علی کے فریب کا شکار ہوئی۔

احمد علی میرا باپ تھا۔ وہی میرے اس دنیا میں آنے کا باعث بنا تھا لیکن اس نے میری ماں پر بدکاری کا الزام لگا کر گھر سے نکال دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میری ماں کس طرح اس کے قدموں میں گر کر روئی تھی۔ اور پھر میں کس طرح بھاگ بھاگ کر اس کے پاس جاتا تھا مگر اس نے ہم دونوں کو ٹھکرا دیا تھا۔

پھر ایک اور شخص ہماری زندگی میں داخل ہوا۔ وہ ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر تھا اور میری ماں کے حسن پر مر مٹا تھا۔ اس نے مجھے بھی کتنا پیار دیا تھا لیکن وہ سب فریب ثابت ہوا۔ اس کا پیار دھوکا تھا۔ میری ماں سے شادی کرتے ہی اس نے مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ مجھے بے سہارا چھوڑ دیا اور میری ماں کو لے کر غائب ہو گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے بھوک سے بے تاب ہو کر ایک روٹی چرائی تھی اور پھر میں قدم قدم پر ٹھوکرین کھاتا رہا تھا۔ میں نے اپنی ماں کو تلاش کر لیا لیکن میرا سوتیلا باپ ہمارے راستے کی دیوار بن گیا۔ میں اپنی ماں کی حالت دیکھ کر دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ کتنی حسین ہوا کرتی تھی وہ۔ لیکن اب سوکھ کر کاٹنا ہو چکی تھی۔ پیچھے ہوئے گال اور اندر کو دھنسی ہوئی دیران آنکھیں۔ میرے سوتیلے باپ کو اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ اسے ایک فالتو چیز سمجھ کر گھر کے ایک کونے میں ڈال دیا گیا تھا۔ کس قدر ظالم اور کمینہ تھا وہ شخص۔ اسے میرا ماں سے ملنا بھی گوارہ نہیں تھا۔ میں سب کچھ برداشت کرتا رہا تھا لیکن ماں کے ساتھ ظلم کی یہ انتہا دیکھ کر میری قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ فرعون صفت شخص میرے ہاتھوں مارا گیا اور میں اپنی ماں کے جنازے کو کندھا بھی نہ دے سکا۔

ابجد نے آج اپنی ماں کا ذکر کیا تھا تو مجھے یہ سب کچھ یاد آ گیا۔

”کیا بات ہے رونی باؤ..... کہاں کھو گئے ہو؟“

ابجد کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ ”اوہ، کچھ نہیں۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”تم گھر جاؤ۔ ماں

مرحہ انڈر ورلڈ میں میرے نام کی دھوم مچ گئی۔

پہلے میں ایک وقت کی روٹی کے لئے ترستا تھا۔ پھر میرے پاس اتنی دولت آگئی کہ سنبھال گیا۔ اس دوران ممکن ہے امجد سے آمانا سامنا بھی ہوتا رہا ہو لیکن میں نے کبھی خیال نہیں کیا اور امجد نے بھی کبھی مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور پھر اس رات محض اتفاق سے اس سے ملاقات ہو گئی۔ اس کے اب تک کے کردار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ قابل اعتماد آدمی ہے اور اس پر مکمل بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ بے لوث آدمی ہے۔ اب تک ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ کسی لالچ کی وجہ سے میرا ساتھ دے رہا ہے۔

”ہاں..... دنیا میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو دوستی کو سمجھتے ہیں۔“ نجمہ نے کہا۔ ”اس کی ایک مثال تو یہ سولجر بھائی ہیں۔ انہیں تم سے کیا لالچ ہے۔“

”نجمہ باجی!“ سولجر بولا۔ ”روپیہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے۔ آج ہے تو کل نہیں ہے۔ پر سچے دست نصیبوں سے ملتے ہیں۔ روٹی باؤ کے لئے تو اپنی جان بھی حاضر ہے۔“

”منہ پر تعریف تو نہیں کرنی چاہئے مگر میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سولجر واقعی سولجر ہے۔ میرا آدمی ہے۔“ میں نے کہا۔

”رہنے دور روٹی باؤ!“ سولجر بولا۔ ”سب لوگ مجھے کھوٹا سمجھ ہی کہتے ہیں۔ جب میں پولیس مانگتا تو مجھے اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔“

”نہیں..... تم ہیرو ہو ہیرا۔“ میں نے کہا۔

”اچھا روٹی باؤ!“ سولجر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت ہیرے کو نیند آرہی ہے۔ تم لوگ بھی جاؤ۔ رات ختم ہونے والی ہے۔“

دو کپ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ نجمہ نے اٹھ کر دروازہ بھیڑ دیا اور گلے میں پڑا ہوا دوپٹہ اتار کر ہانے رکھ لیا اور چارپائی پر لیٹ گئی۔ میں نے تکیے کے نیچے سے نوٹوں کے بٹل سنبھال کر ان کی طرف بڑھا دیئے۔

”یہ سنبھال کر رکھ لو۔“

”یہ..... یہ کہاں سے آئے؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”یہ بٹل مادام دیکھ کی اسی دولت کا حصہ ہیں جس کے لئے تاجی میری دشمن بنی ہوئی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں یہ رقم ہی لینے گیا تھا۔“ میں چند لمحوں کو خاموش بھر بولا۔ ”میں ایک دو روز سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہاں تم اپ سیٹ سی ہو۔ تم اس ماحول کی غرضت نہیں ہو پارہی ہو۔“

”تین سے اوپر کا وقت ہو رہا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہیں اس لئے نہیں بلوایا تھا کہ تم سوچ سکی ہوگی۔“

”تم گئے ہوئے تھے تو مجھے نیند کیسے آئی؟“ نجمہ نے جواب دیا۔ ”رکشے کی آواز سن کر میں سمجھ گئی تھی کہ تم آگئے ہو۔ اور جب دوسری مرتبہ رکشے کی آواز سنائی دی تو اندازہ ہو گیا کہ امجد چلا گیا ہے۔ اس لئے میں یہاں آگئی۔ نجانے تم کن خیالات میں گم تھے کہ نہ تو تم نے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنی اور نہ ہی میری اور سولجر کی باتوں کی۔“

”ہاں..... آج مجھے کچھ پرانی باتیں یاد آرہی ہیں۔ ان یادوں میں کھوکھو تو میں اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھا تھا۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

اسی دوران سولجر چائے لے کر آگیا۔ ٹرے میں تین کپ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک کپ مجھے دے دیا، دوسرا نجمہ کی طرف بڑھایا۔

”نہیں بھئی۔ میں چائے نہیں پیوں گی۔ نیند اڑ جائے گی۔“ نجمہ نے کہا۔

”نیندیں تو پہلے ہی اڑی ہوئی ہیں۔ چائے سے کیا فرق پڑے گا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ مجھے اس وقت بالکل طلب نہیں ہے۔“ نجمہ نے انکار کر دیا۔

”ٹھیک ہے..... تمہاری مرضی۔“ میں نے کہا۔

سولجر اپنا کپ لے کر میری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ نجمہ دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چائے کے دوران امجد کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔

”میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔“ میں نے نجمہ کے پوچھنے پر بتایا۔ ”کئی سال پہلے جب میں پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا تو پرویز نام کے ایک رکشہ ڈرائیور سے ملاقات ہوئی تھی۔

اس نے مجھے سہارا دیا۔ رکشہ چلانا سکھایا۔ اور پھر اپنا ایک رکشہ بھی میرے حوالے کر دیا۔ انہی دنوں امجد سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ان دنوں بھی رکشہ چلایا کرتا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں کبھی کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پرویز ایک پارٹی کے ساتھ مل کر ہیروئن کا دھندا کرتا تھا۔ ہیرا منڈی میں بھی اس کا کچھ عمل دخل تھا۔ وہ عورتیں بھی سٹوٹی کرتا تھا۔ اس نے مجھے

بھی اپنے دھندے میں پھنسانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے ان دھندوں سے تو اپنے آپ کو بچائے رکھنا ہم پارٹی بازی سے اپنے آپ کو نہ بچا سکا۔

پرویز مخالف پارٹی سے ایک جھڑپ میں مارا گیا۔ میں بھی ان کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ میں اپنی جان بچانے کے لئے چھپتا رہا۔ لیکن بالآخر مجھے سامنے آنا پڑا کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ مظلوم بن کر زندہ نہیں رہا جاسکتا۔ میں نے بھی اپنی پارٹی بنائی اور مخالفوں کے سامنے ڈٹ گیا۔ اور اس

شادمان کالونی میں کوٹھی کا بندوبست سولجر ہی نے کیا تھا۔ اور پھر اس نے اسجہ کے ساتھ مل کر سولجر کی سامان بھی کوٹھی میں پہنچا دیا تھا۔ ہر چیز نئی خریدی گئی تھی اور ضرورت کے مطابق ہی خریدی گئی تھی۔ کوئی فالتو چیز نہیں لی گئی تھی۔

اس کے چار دن بعد میں اور نجمہ بھی کوٹھی جانے کے لئے سولجر کے کھنڈر نما مکان سے نکلتی ہو گئے۔ ہمارے ساتھ سولجر بھی تھا اور شبو بھی۔ نجمہ کی وجہ سے شبو کو ہمارے ساتھ ہانے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس کے والدین اور گلی میں رہنے والے دوسرے لوگ ہمیں یعنی نجمہ اور نجمہ کو واقعی میاں بیوی سمجھتے تھے۔ سولجر نے محلے والوں کو میرے بارے میں بڑی ناپاؤنی داستان سنائی تھی۔ یعنی میں گجرات کا زمیندار تھا اور میں نے اپنی زرعی زمین فروخت کر کے لاہور میں کاروبار شروع کرنے کا پروگرام بنایا تھا مگر میں حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ لاہور میں اگرچہ میرے اور بھی دولت مند رشتے دار تھے مگر میں نے اپنے ایک غریب دوست (سولجر) کے ہاں رہنے کو ترجیح دی تھی۔

اس دوران میں نے داڑھی رکھ لی تھی اور بالوں کا اسٹائل بھی تبدیل کر لیا تھا اور میں دعوے کرتا تھا کہ میرا کوئی دشمن مجھے آسانی سے نہیں پہچان سکتا تھا۔ نجمہ کو بھی برقعہ پہنا دیا گیا تھا اس نے نقاب اس طرح ڈال رکھا تھا کہ آنکھوں کے سوا پورا چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ ہم گلی سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے جی ٹی روڈ پر آگئے اور پھر طویل ریلوے پل پار کر کے ٹیٹن کے سامنے والے رخ پر آگئے۔ میں اور نجمہ آگے آگے چل رہے تھے اور ہم سے چند گز پیچھے سولجر شبو کا ہاتھ پکڑے چلا آ رہا تھا۔

ریلوے اسٹیشن کے سامنے بڑی رونق تھی۔ میں ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب رک گیا۔ کئی ٹیکسیاں ان میں لگی ہوئی تھیں، ہم سب سے آگے والی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ سولجر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا تاکہ ڈرائیور کو راستہ بتا سکے۔ جبکہ ہم تینوں پیچلی سیٹ پر تھے۔ ایک کونے میں ٹیٹن، اس کے ساتھ نجمہ اور نجمہ کے ساتھ میں بیٹھا تھا۔ سیٹ زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ نجمہ ہم دونوں کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گئی تھی۔ میں پہلی مرتبہ اس کے ساتھ اس طرح جڑ کر بیٹھا تھا کہ اس کے گداز بدن کے لمس سے مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی لیکن میں نے فوراً ٹیٹن سے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

ٹیکسی میکوڈ روڈ اور شاہراہ قائد اعظم سے ہوتی ہوئی ٹیٹن روڈ پر آگئی۔ اس وقت صبح کے آٹھ بجے تھے۔ ٹیٹن روڈ تنگ سا بازار تھا جو ریگل چوک سے شروع ہو کر فاطمہ جناح روڈ، لکھن روڈ، ٹیٹن روڈ اور شاہراہ جلال الدین کے چوراہے تک چلا گیا تھا۔ ٹیکسی اس چوراہے

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“ نجمہ مسکرائی۔ ”میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن آہیں اس ماحول میں ایڈجسٹ ہونے میں خاصی دشواری پیش آ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرے پاس ایجوکیشن ٹاؤن میں کوٹھی تو ہے مگر پڑوس میں رہنے والی خونخوار بلی کی وجہ سے میں فی الحال تمہیں وہاں نہیں لے جانا چاہتا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ وقتی طور پر کوئی اور مکان کرائے پر لے لیا جائے۔ تمہیں اس ٹھکان سے تو نجات مل جائے گی۔“

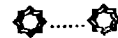
”اچھی بات ہے۔“ نجمہ مسکرائی۔ ”لیکن میں شبو کو بھی اپنے پاس رکھوں گی۔ یہ معصوم اور بھولی بھالی سی لڑکی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔“

”اگر اس کے ماں باپ اجازت دیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ میری بات نہیں ٹالیں گے۔“ نجمہ بولی۔ ”لیکن..... یہ رقم تم اپنے پاس ہی رکھو۔ میں کہاں سنبھالوں گی۔“

”صبح سولجر کو دے دیتا۔ وہ سنبھال لے گا۔“ میں نے کہا۔

نجمہ نے نوٹوں کے وہ چاروں بنڈل اپنے نیچے کے نیچے رکھ لئے۔ نجمہ کے بارے میں پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ اسے کچھ عرصہ کے لئے رضیہ کے گھر پر چھوڑ دوں گا۔ لیکن پھر میں نے ارادہ بدل دیا تھا۔ رضیہ ایک شریف عورت تھی۔ میں اسے کسی ایسے معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے اس کی رسوائی ہو۔ اس لئے میں نے ایک الگ مکان لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ نجمہ کروٹ کے بل لیٹی مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ پھر اونگھنے لگی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پہلے میں چشم تصور ہے اپنے ماضی میں جھانک رہا تھا، پھر اچانک ہی میرے ذہن میں کائٹیل سلیمان کا خیال ابھر آیا۔ بیچارہ اپنی بہن کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے رقم کا انتظار کر رہا تھا اور قدرت نے میرے توسط سے اس کا یہ مسئلہ حل کر دیا تھا۔ کتنا خوش ہو رہا تھا وہ ایک لاکھ کی رقم مل جانے پر۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ نجمہ کی طرف دیکھا تو مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ نجمہ بالکل سیدھی سوئی ہوئی تھی۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا سکا۔ میں نے دوسری کروٹ بدل لی اور لا حول پڑھتے ہوئے اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔



ضرورت کی دوسری چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ سولجر اور امجد نے ہر چیز کا خیال رکھا تھا۔ میں نے مڑ کر نجمہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ کمرے میں اس وقت ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نجمہ نے میری طرف دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ اُس کی اس حرکت پر میں بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

دوسرے بیڈروم میں دو چار پائیاں اور دو تین کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان چار پائیوں پر بھی ہنر بچے ہوئے تھے۔ تیسرا بیڈروم البتہ خالی تھا۔ ہم کچن میں آ گئے۔

یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ میرا خیال ہے کچن کے حوالے سے ہمیں کئی روز تک کوئی چیز باہر سے لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ شیشے والے شیلف میں نیا ڈزنیٹ سجا ہوا تھا اور کچن کے دروازے کے ساتھ ہی درمیانے سائز کا فریج بھی رکھا ہوا تھا۔ کچن پر سولجر نے دل کھول کر رقم خرچ کی تھی۔

بڑے ہال کمرے میں ہی اوپر جانے کے لئے زینہ تھا۔ میں اوپر آیا تو میرے پیچھے ہی نجمہ بھی تھی۔ پورچ کے اوپر والے کمرے کا دروازہ کھول کر میں اندر داخل ہو گیا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ میں دوسری طرف کا دروازہ کھول کر چھت پر آ گیا اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

کچھلی طرف بھی کشادہ گلی تھی۔ ایک طرف پارک تھا۔ میرے نکتہ نظر سے یہ بنگلہ بہت ٹھیک تھا۔ کسی ہنگامی صورت حال میں یہاں سے آسانی سے فرار ہوا جاسکتا تھا۔ سولجر نے بھی شاید یکساں کچھ سوچ کر اس بنگلے کا انتخاب کیا تھا۔

”بہت اچھا بنگلہ ہے۔“ میرے قریب کھڑی ہوئی نجمہ نے کہا۔ ”اگر کسی وقت بھاگنا پڑے تو زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔“

”تم نے بھی اس وقت وہی بات کہی ہے جو میں سوچ رہا تھا۔“ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہم دونوں چھت کے پچھلے حصے کی طرف آ گئے۔ اس طرف تقریباً بیس فٹ بڑی گلی تھی اور سامنے والے بنگلے کے لان میں دو بچے کھیل رہے تھے۔ ایک جوان عورت بائیس فٹ کے کرسی پر بیٹھی ان بچوں کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اس عورت نے ہماری طرف دیکھا تو نجمہ نے بے اختیار ہاتھ ہلا دیا۔ جواب میں اس عورت نے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا تھا۔

ہم کچھ دیر چھت پر کھڑے رہے اور پھر نیچے آ گئے۔ سولجر اور امجد لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ شہلاؤ شو کچن میں تھی۔ میں بھی صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ نجمہ بھی کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ چند منٹ بعد وہ دونوں چائے لے کر آ گئیں۔

چائے پیتے ہوئے سولجر نے جیب سے ایک کانڈ نکال کر میری طرف بڑھادیا۔

سے جلال الدین روڈ پر ذرا آگے جا کر گلی برگ روڈ پر مڑ گئی اور پھر طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد شادمان مین روڈ پر گھوم گئی۔

اس سے آگے شاہ جمال کا علاقہ تھا۔ لیکن ٹیکسی شادمان کالونی ہی میں دائیں طرف کی ایک سڑک پر مڑ گئی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا سولجر ڈرائیور کو راستہ بتا رہا تھا۔ ایک اور سڑک پر گھومنے کے بعد ٹیکسی ایک پارک کے سامنے سے گزر کر پہلی گلی کے کنارے والے بنگلے کے سامنے رکنے لگی۔

یہ بنگلہ باہر سے ہی بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ غالباً نیا ہی بنا تھا۔ رنگ و روغن چمک رہا تھا۔ اس سے آگے کے دو پلاٹ خالی تھے جو خود رو جھاڑیوں سے اٹے ہوئے تھے۔ بنگلے کے سامنے امجد کا رکشہ کھڑا تھا۔

سولجر نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا۔ ہم اس سے پہلے ہی نیچے اتر آئے تھے۔ ٹیکسی رکنے کی آواز سن کر امجد گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول کر باہر آ گیا تھا۔ نجمہ اور شبو، سولجر کے ساتھ اندر داخل ہو گئیں اور میں وہیں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ یہ گلی زیادہ طویل نہیں تھی۔ سامنے والی لین میں بھی دو پلاٹ خالی تھے۔ دو بنگلوں کے سامنے کرائیں بھی کھڑی تھیں۔ دوسری طرف یہ گلی ایک بڑی سڑک سے جاملتی تھی۔ جبکہ اس طرف ہماری کوشی کے ساتھ پارک تھا۔ کوشی اور پارک کے درمیان تقریباً بیس فٹ جگہ خالی تھی۔

میں گیٹ میں داخل ہو کر باہر ہی سے کوشی کا جائزہ لینے لگا۔ دو کنال پر بنی ہوئی یہ کوشی واقعی خوبصورت تھی۔ ایک چھوٹا سالان بھی تھا اور پورچ کے اوپر بھی ڈرا پیچھے ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ جب میں سولجر کے ساتھ اندر داخل ہوا تو امجد، نجمہ اور شبو کو گھوم پھر کر کوشی دکھا رہا تھا۔ ایک بڑا ہال کمرہ تھا جسے لاؤنج کہا جاسکتا تھا۔ اس میں چند کرسیاں اور ایک صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔ درمیان میں فرش پر نیلے رنگ کی درزی پچھی ہوئی تھی جس پر وسط میں ایک کافی ٹیبل بھی موجود تھی۔ ایک طرف ٹرائی اور رنگین ٹیلی ویژن بھی رکھا ہوا تھا۔

اس کوشی میں تین بیڈروم تھے۔ ایک میں میٹرز والا ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک سیٹ ٹی اور تین چار بچتے والی کرسیاں بھی تھیں۔ بیڈ کے ساتھ ایک طرف خوبصورت ڈرائنگ ٹیبل تھی اور دوسری طرف سفید فارمیکا کی الماری تھی۔

میں ملحق باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکنے لگا۔ باتھ روم بہت کشادہ تھا۔ سامنے ہی بہت بڑا سفید ہاتھ بٹ تھا اور دائیں طرف ذرا ہٹ کر ٹل لگا ہوا تھا جس کے نیچے نیلے رنگ کی پلاسٹک کی غنی بالٹی رکھی ہوئی تھی۔ اوپر شاور بھی لگا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگے ہوئے راز پر تولیہ بھی لٹکا ہوا تھا اور اس کے ساتھ شیشے کے شیلف پر ٹینس کے قریب صابن، ٹوتھ پیسٹ اور

ہنچ گیا۔ اور اس وقت پہلی مرتبہ انکشاف ہوا کہ ٹرائی کے نچلے حصے میں وی سی آر بھی موجود تھا اور دوسرے خانے میں چند ویڈیو کیسٹس بھی رکھے ہوئے تھے۔ میں ایک ایک کیسٹ نکال کر دیکھنے لگا۔ ان میں پاکستانی فلمیں ہی تھیں۔ اُردو بھی اور پنجابی بھی۔ میں نے سلطان راہی کی ایک فلم وی سی آر پر لگادی اور ٹی وی آن کر کے نجمہ کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔

کہانی تو وہی تھی۔ ایک ظالم و سنگدل جاگیردار، اس کا اوباش اور مادر پدر آزاد بیٹا۔ ایک حراے کی حسین بیٹی اور گاؤں کے ایک غریب گھر کا غیرت مند بیٹا..... سلطان راہی کو ظلم اور بری کے خلاف حق و صداقت کی ایک علامت بنا کر پیش کیا گیا تھا۔

فلم کی کہانی تو عام سی تھی مگر مکالمے اور اداکاری کا شعبہ سب سے بہتر تھا۔ سلطان راہی اداکاری میں بہت حادی نظر آ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، کئی سال پہلے میں نے یہ فلم سینما ہال میں بھی دیکھی تھی۔ سلطان راہی جب بڑھک مارتا تو سینما ہال تماشاخیوں کی سیٹوں سے گونج اٹھا۔ اور کھیتوں میں انجمن کا رقص شروع ہوتا تو سینما ہال کے در و دیوار شروع سے آخر تک لوگوں کے شور سے گونجتے رہتے۔

فلم رات ڈیڑھ بجے کے قریب ختم ہوئی تھی۔ میں نے اٹھ کر ٹی وی اور وی سی آر بند کر دیا۔ ”سو نے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“ میں نے نجمہ کی طرف دیکھا۔

”نیند نہیں آ رہی۔“ نجمہ نے جواب دیا۔ ”بہر حال، کوشش کرتی ہوں۔“

ہم اس بیڈروم میں آگئے جس میں میٹرز کا شاندار بیڈ بچھا ہوا تھا۔ میں نے نجمہ کے انداز میں تنجک واضح طور پر محسوس کر لی تھی۔

”ایسا کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم اس بیڈ پر سو جاؤ۔ میں دوسرے کمرے میں چار پائی پر سوجاتا ہوں۔“

”میں..... یہاں اکیلی۔“ نجمہ بولی۔

”تو کیا ہوا؟“ میں نے جواب دیا۔ ”تمام دروازے اندر سے لاک ہیں۔ اور ویسے بھی شاید تم میرا یہاں سونا پسند نہ کرو۔ کیونکہ یہاں بیڈ تو ایک ہی ہے..... اس لئے.....“ میں چند لمحوں کو ناخوش ہوا، پھر بولا۔ ”تم آرام سے یہاں سو جاؤ۔ میں دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔ اگر ات کو کی وجہ سے خوف محسوس کرو تو مجھے جگا دینا۔“

میں اس کمرے سے نکل کر ساتھ والے کمرے میں آ گیا اور نائٹ بلب جلا کر ایک چار پائی لٹ گیا اور خلاف معمول فوراً ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

صبح چار بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ ایسی آواز سنائی دی تھی جیسے پچھلی گلی میں کوئی

”یہ کیا ہے؟“ میں نے کاغذ لیتے ہوئے پوچھا۔

”تم نے جو پیسے دیئے تھے ان کا حساب ہے روٹی باؤ!“ سو لجر نے کہا۔ میں نے وہ کاغذ دیکھے بغیر پھاڑ دیا۔

”تم میرے منشی ہو کیا جو پیسوں کا حساب دے رہے ہو؟“ میں نے اُسے گھورا۔

”حساب تو حساب ہی ہوتا ہے ناروٹی باؤ!“ سو لجر نے کہا اور جیب سے نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیئے۔ ”یہ اٹھارہ ہزار روپے بچے ہیں۔ میں نے خرچ ہونے والی رقم کا حساب لکھا تھا تم نے وہ کاغذ ہی پھاڑ کر پھینک دیا۔ زبانی بتا دیتا ہوں۔ چالیس ہزار روپے تو اس کوئی کچھ مہینے کا ایڈوائس کرایہ اور پراپرٹی ڈیلر کا کمیشن اور.....“

”سو لجر!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اپنی زبان بند رکھو۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ سمجھو؟ اور یہ رقم اپنے پاس ہی رکھو۔“

”سمجھ گیا روٹی باؤ!“ سو لجر نے مسمی سی صورت بنا کر جواب دیا اور نوٹ جیب میں ڈال لئے۔

ہم دیر تک وہاں بیٹھے اس کوٹھی ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ کچن میں اگرچہ راشن کی تمام چیزیں موجود تھیں مگر دوپہر کا کھانا فوری طور پر تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ اجمد دوپہر کا کھانا ہوٹل سے لے آیا اور کھانا کھانے کے بعد وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

”اب میں چلتا ہوں روٹی باؤ! کچھ تھوڑا سا دھندہ بھی کلوں۔ ویسے تم گھبرا نا نہیں۔ میں چکر لگاتا رہوں گا۔ اگر کوئی ایمر جنسی ہو تو اس نمبر پر فون کر کے پیغام دے دینا جو میں نے تمہیں لکھوایا تھا۔ اچھا، میں چلتا ہوں۔ رب را کھا۔“

اجمہ کئی روز سے ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے کام دھندہ بھی تقریباً چھوڑا ہوا تھا۔ میں اسے کچھ رقم دینا چاہتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ نہیں لے گا اس لئے میں فی الحال خاموش ہی رہا۔ یہ بہر حال طے کر لیا کہ کسی مناسب وقت پر کسی بہانے اسے کچھ رقم دے دوں گا تاکہ اس کا نقصان ہوا ہے اُس کا ازالہ ہو جائے۔

فریج میں گوشت وغیرہ بھی موجود تھا۔ نجمہ اور شبونے مل کر کھانا تیار کر لیا۔ شبو اور سو لجر رات نو بجے کے قریب کھانا کھا کر چلے گئے۔

میں نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد نجمہ کچھ گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ اور میں اس کی وجہ بھی سمجھتا تھا۔

اس وقت ہم دونوں ہال کمرے ہی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اٹھ کر ٹی وی ٹرائی کے قریب

میری آنکھ صبح نو بجے کے قریب کھلی تھی۔ میں کئی منٹ تک چارپائی پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا اور پراٹھ کر کمرے سے نکل آیا۔ نجمہ والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستگی سے گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

نجمہ کمرے میں نہیں تھی۔ میرا خیال تھا وہ مجھ سے پہلے جاگ گئی تھی اور شاید کچن میں چائے پاری ہوگی۔ میں ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اور جیسے ہی دروازہ کھولا، میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

نجمہ سامنے ہی پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔ میں نے بدحواسی میں دھڑ سے دروازہ بند کر دیا اور تیز تیز چلتا ہوا کمرے سے نکل کر ہال میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

اسی طرح چندرہ منٹ گزر گئے۔ اور پھر قدموں کی ہلکی سی چاپ سن کر میں نے پیچھے دیکھا۔ نجمہ نے تلے قدم اٹھاتی ہوئی میری طرف آرہی تھی۔ اس نے تولیہ پکڑی کی طرح سر پر پلیٹ رکھا تھا۔

”سوری نجمہ!“ میں نے شریف آدمی کی طرح نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں دروازہ اندر سے لاک کر لیتا چاہئے تھا۔“

”میں نے دروازہ بند تو کیا تھا مگر شاید وہ لاک نہیں ہو سکا۔ بہر حال۔“ اس نے بھی نظریں ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں ناشتہ بنانے جا رہی ہوں۔ تم بھی جا کر نہالو۔۔۔۔۔ میں کئی روز بعد اس طرح کھلے پانی میں نہائی ہوں۔ مزہ آگیا۔“

میں نے اٹھتے ہوئے نجمہ کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ میرا خیال تھا کہ میری اس حرکت پر وہ مجھے سرزنش کرے گی۔ شاید مجھے مورد الزام ٹھہرائے گی کہ میں جان بوجھ کر اس طرح کمرے اور پھر ہاتھ روم میں گھس آیا تھا۔ لیکن اس نے میری اور اپنی غلطی کو لکھی تسلیم کر لیا تھا اور بات ٹل گئی تھی۔

میں کمرے میں آگیا اور دروازہ اندر سے لاک کر کے ہاتھ روم میں گھس گیا۔ کئی روز بعد اس طرح نہانے کا موقع ملا تھا۔ میں کتنی دیر تک ٹھنڈے پانی کے شاور کے نیچے کھڑا رہا اور بالآخر جب میں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو ایک جانی پہچانی خوشبو میرے نچنوں سے نکلنے لگی۔ پراٹھوں کی خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں بھی کچن میں آگیا۔ نجمہ آخری پراٹھا توڑے سے اتار رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، پھر تو اچولہے سے ہٹا کر فرانسٹک بین رکھ دیا اور انڈے فراہم کرنے لگی۔

گاڑی آکر رکی ہو۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن تجسّس نے مجھے چارپائی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

نجمہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتا تو دروازہ چوہٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر نیلگوں روٹی تھی اور نجمہ بیڈ پر آرمی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ اس کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ نیلگوں روٹی میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

میں دے قدموں آگے بڑھ گیا اور ہال میں پہنچ کر بڑی احتیاط سے پچھلی طرف والا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس طرف بھی ایک چھوٹا سالان تھا اور عقبی دیوار میں بھی ایک چھوٹا دروازہ تھا۔

وہ گاڑی اسی طرف آکر رکی تھی جس کی آواز سے میری آنکھ کھلی تھی اور اب اس طرف سے باتوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں دے قدموں چلتا ہوا عقبی دروازے کے قریب پہنچ گیا اور جھری سے آنکھ لگا کر باہر جھانکنے لگا۔

سامنے والی کوٹھی کے سامنے پولیس کی ایک جپ کھڑی تھی۔ جپ کا انجن اب بھی اشارت تھا۔ ایک پولیس آفیسر اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا نیچے کھڑا تھا۔ وہی دونوں آہلر میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر کسی بات پر ان دونوں نے قہقہہ لگایا۔ اور اس کے فوراً ہی بعد جپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

وہیں کھڑے رہ جانے والے آفیسر نے ہلر پر لگا ہوا کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ دوسری منزل بیل بجانے کے بعد برآمدے والا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی باہر نکل آیا۔

میں اس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک وہ پولیس آفیسر اور ادھیڑ عمر آدمی اندر نہیں چلے گئے۔ میں نے دے قدموں واپس آکر ہال کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور کچن کی طرف چل پڑا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ یہ کھٹی کرائے پر لیتے ہوئے سوبلجھنے اور توہر بات کا خیال رکھ تھا مگر اس سے یہ غلطی ہو گئی تھی۔ پڑوس میں کسی پولیس آفیسر کی موجودگی ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

واپس جاتے ہوئے بھی میں نے نجمہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ اسی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا اور اس صورت حال پر غور کرنے لگا۔ آج صبح جب ہم یہاں آئے تھے تو نجمہ نے چھت پر سے پچھلے بنگلے کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی عورت کو اشارہ کیا تھا اور جواب میں اس عورت نے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا دیا تھا۔ لیکن اب میرے خیال میں ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

اس سے اگلے روز میں نجمہ کو ساتھ لے کر سولجر کے مکان پر پہنچ گیا۔ نجمہ فوراً ہی شبو کے گھر چلی گئی تھی۔ دو گھنٹوں بعد جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو شبو ہمارے ساتھ تھی۔ اس کے پاس نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد شبو کو چند روز کے لئے ہمارے پاس رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

دو دن اور گزر گئے۔ اس گلی کے کسی آدمی سے ابھی میرا تعارف نہیں ہوا تھا۔ البتہ سامنے والی خاتون خالدہ کے توسط سے یہ خبر گلی کے تمام بنگلوں تک پہنچ گئی تھی کہ میں گجرات کا ایک زمیندار ہوں اور اپنی اراضی فروخت کر کے کوئی کاروبار شروع کرنے کے لئے حالات کا جائزہ لے رہا ہوں۔

سولجر بھی ہمارے پاس آ گیا تھا۔ اس نے بھی اب ڈھنگ کے کپڑے پہننا شروع کر دیئے تھے اور چہرے سے بھی شرافت مخپنے لگی تھی۔ اور پھر اسی رات میں اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ میں نے بہت آرام کر لیا تھا اور اب کام کی ضرورت تھی۔ میں ایک پُر سکون زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ میں اگر چاہتا تو اسی بھیس میں دن گزار سکتا تھا لیکن اس طرح دل کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا۔ ہماری کوئی غلطی یا کسی اور وجہ سے ہمارا راز فاش ہو سکتا تھا۔ جب تک میرے دشمن زندہ تھے، میں سکون کی زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ اور پھر مجھے مادام دھکے کے قتل کے راز سے بھی پردہ اٹھانا تھا۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کس خفیہ مشن پر تھی اور اسے قتل کیوں کیا گیا تھا؟

میں نے نجمہ کو بتا دیا تھا کہ اگر دو تین دن تک واپس نہ بھی آؤں تو وہ پریشان نہ ہو۔ میں ٹلفون پر اس سے رابطہ رکھوں گا۔ سولجر کو بھی میں نے ہدایت کر دی تھی کہ میری واپسی تک بیٹھ رہے۔

گوشتی سے نکلنے سے پہلے میں نے گاڑی کی چابیوں والا رنگ اٹھا کر پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ ایجوکیشن ٹاؤن پہنچنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ رکشہ میں نے مین روڈ پر ہی چھوڑ دیا اور دکانوں کے ساتھ اپنی گوشتی کی طرف جانے والی گلی میں داخل ہو گیا۔

میں شام کا انتظار ہی نہ تھا۔ گلی میں لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ رخصتی کا خیال ذہن میں آتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اور پھر دور ہی سے میں نے ٹوٹی کو دیکھ لیا۔ وہ اپنے گھر سے نکل کر سامنے والے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ میں سر جھکائے چلتا رہا۔ اور جب رخصتی والے مکان کے سامنے پہنچا تو غیر ارادی طور پر میری نظریں اس طرف اٹھ گئی تھیں۔

اور پھر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم ہال کمرے میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ میں پرائیوٹ کی تعریف کر رہا تھا اور نجمہ مسکرائے جا رہی تھی۔

”آج دوپہر میرے ہاتھ کا کھانا کھاؤ گے تو انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”دوپہر کو تو تمہارے ہاتھ کا کھانا نہیں کھایا جاسکتا۔“ میں نے کہا۔

”کیوں.....؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”ہم تھوڑی دیر بعد بازار جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے اور اپنے لئے کچھ کپڑے خریدنے ہیں اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی۔“

اتفاق سے اس وقت سولجر کافون آ گیا۔ وہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے ایک پبلک ہونڈ سے بات کر رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔

”پانچ بجے سے پہلے مت آنا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ یہ اس بنگلے میں ہمارے لئے پہلی کال تھی۔ گزشتہ روز سولجر اور امجد نے یہاں کافون نمبر نوٹ کر لیا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب ہم لوگ گھر سے نکلے۔ نجمہ نے برقعہ پہن لیا تھا اور آنکھوں کے سوا پورے چہرے کو نقاب میں چھپا لیا تھا۔ اس وقت گلی میں ذرا آگے سبزی کا ایک ٹھیلہ کھڑا تھا۔ دو تین عورتیں سبزی لے رہی تھیں۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا بھی تھا مگر ہم گلی میں مخالف سمت میں مڑ گئے تھے۔

پارک کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مجھے اچانک ہی صبح چار بجے والا واقعہ یاد آ گیا اور میں نجمہ کو بتانے لگا کہ وہ پچھلے بنگلے میں رہنے والی عورت سے تعلقات نہ بڑھائے۔

پارک کے دوسری طرف ذرا آگے مارکیٹ کے قریب پہنچتے ہی ہمیں رکشہ مل گیا اور اس طرح اتار کلی پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔

چکھری روڈ کے موڑ پر ہم نے رکشہ چھوڑ دیا اور پیدل چلتے ہوئے اتار کلی میں داخل ہو گئے۔ تین گھنٹوں تک گھومتے ہوئے ہم نے شاپنگ کی۔ نجمہ نے کپڑوں کے کئی جوڑے خریدے تھے۔ ان میں چار پانچ جوڑے تو ایسے تھے جو وہ شبو کو دینا چاہتی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ ایک دو روز بعد شبو کے گھر جا کر اسے چند روز کے لئے اپنے پاس لے آئے گی۔

چار دن تک ہماری سرگرمیاں اسی بنگلے تک محدود رہیں۔ تاہم نجمہ نے ایک روز گلی میں سے سبزی لیتے ہوئے سامنے والے بنگلے کی بیگم سے دوستی کر لی تھی۔ خالدہ کا شوہر بزنس میں فو اور اپنے کاروبار کے سلسلے میں کراچی کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ ان دنوں بھی وہ کراچی گیا ہوا تھا۔

دیکھا۔ اسی دوران گیٹ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا گیا۔ میں اٹھ کر گیٹ کی طرف چل پڑا۔ چائے کا پیرے ہاتھ میں ہی تھا۔ میرے ذہن میں ٹوٹی کا خیال ابھرا تھا۔ شاید رختی نے ٹوٹی کو اس طرف بھیجا تھا اور خود چھت پر چلی گئی تھی۔

میں نے گیٹ کھولا۔ وہ ٹوٹی نہیں، گلی کا چوکیدار تھا۔ گھر کی بتی جلتے دیکھ کر وہ اپنے دو مہینے کی خواہ لینے آیا تھا۔ میں نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور گیٹ بذکر کے پورے صحن میں بکھرے ہوئے اخبار سمیٹنے لگا۔ اخبار والے کو بھی دو مہینوں سے بل نہیں ملا تھا مگر وہ اخبار باقاعدگی سے ڈالتا رہا تھا۔

میں ایک بار پھر برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک پرانا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ مقصد بت گزاری کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اور پھر اندر کے ایک صفحہ پر ایک خبر دیکھ کر میں چونک گیا۔

میں نے وہ پوری خبر پڑ ڈالی۔

اس خبر کے مطابق لبنان سے آنے والی تحقیقاتی ٹیم کو کیس میں کچھ پیش رفت حاصل ہوئی تھی اور ٹیم کے سربراہ کے بیان کے مطابق مادام دھکے کے قتل میں اسرائیل کے ملوث ہونے کا بظاہر کیا گیا تھا۔ لبنانی تحقیقاتی ٹیم کے سربراہ نے یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ مادام دھکے لبنان میں سفارتی فرائض کے علاوہ کسی اہم مشن پر بھی کام کر رہی تھی اور اس مشن کے حوالے سے ہونے والی سرگرمیاں ہی اس کی موت کا باعث بنی تھیں۔

میں نے اخبار پلٹ کر دیکھا۔ اس پر بیس دن پہلے کی تاریخ تھی۔ میں تقریباً ڈیڑھ مہینے تک انصاف کے معاملے پر میں نے قطعاً توجہ نہیں دی تھی اور اب یہ انکشاف میرے لئے واقعی سنسنی خیز تھا۔ خبر اگرچہ بیس روز پرانی ہو چکی تھی مگر میرے لئے تو انکشاف ہی تھا۔

سب سے پہلے یہ انکشاف رختی نے کیا تھا کہ مادام دھکے یہاں کسی خفیہ مشن پر کام کر رہی تھی۔ اس وقت تو میں یہی سمجھا تھا کہ وہ مجھے پھنسانے کے لئے معاملے کو زیادہ سے زیادہ سنگین بنا کر پیش کر رہی ہے۔ لیکن اب اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔ لبنان پولیس یا انٹیلی جنس سے تعلق رکھنے والے ایک ذمہ دار شخص نے اس کا اعتراف کیا تھا۔

میں ایک بار پھر سوچنے لگا کہ وہ مشن کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن میری کچھ باتیں کوئی نہیں آرہی تھیں۔ مجھ جیسا شخص سفارتی سرگرمیوں اور اس قسم کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن رختی ان معلومات میں مجھ سے بہت آگے تھی۔ وہ مادام دھکے کے قریب رہ چکی تھی اور یقیناً وہ بھی بہت

دروازے میں رختی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک گئی تھی۔ میں رکے بغیر آگے چلتا رہا۔ اپنے مکان کے سامنے پہنچ کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ رختی دروازے میں کھڑی اسی طرف جھانک رہی تھی۔

میں نے اپنی کونٹھی کے گیٹ کے قریب دیوار کے سوراخ میں ہاتھ ڈال کر اندر کی طرف دیوار کے ٹاپے سے چابی نکالی اور گیٹ کا تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ چابی الگ سے یہاں رکھ رہی تھی اور اس کا کچھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر میں نے غیر ارادی طور پر ہلر کے پیچھے والی غلامی میں ہاتھ ڈال دیا اور دوسرے ہی لمحہ اچھل پڑا۔ چابیوں کا گچھا وہاں موجود تھا۔ میں چابیاں نکال کر ایک جھکے سے اٹھ گیا۔ پچھلی مرتبہ میں اسی جگہ تلاش کرتا رہا تھا مگر چابیاں نہیں ملی تھیں اور اب کچھا اس جگہ موجود تھا۔ اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ کوئی اور بھی چابیوں کے راز سے واقف ہو گیا تھا۔ پچھلی مرتبہ جب آیا تھا تو چابیاں یہاں سے غائب تھیں لیکن گھر میں کسی چیز کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا حتیٰ کہ میرے کمرے کی الماری میں رقم بھی محفوظ تھی۔

میں تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا اور بتی جلادی۔ دروازے کو میں نے اندر سے کد نہیں لگا۔ تھامض بھیڑ دیا تھا۔ دو قدم آگے بڑھ کر میں ہال کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

میں تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد یہاں آیا تھا۔ ہر چیز پر گرد جمی ہوئی تھی۔ میں نے پورے گھر کی بتیاں جلادیں۔ سب سے پہلے اپنے کمرے میں جا کر الماری کو چیک کیا۔ کوئی گزب نہیں تھی۔ ہر چیز محفوظ تھی۔

گرد پورے گھر میں جمی ہوئی تھی۔ میں ایک پرانا کپڑا لے کر فرنیچر کی صفائی کرنے لگا۔ پہلے اپنا کمرہ صاف کیا، پھر ہال کمرے میں صوفہ اور کرسیاں وغیرہ جھاڑیں اور کچن میں آگیا۔ یہاں بھی برا حال تھا۔ پوری صفائی کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے چند ضروری برتن دھو لئے اور چائے بنانے لگا۔ چائے کے لئے خشک دودھ ہی استعمال کیا گیا تھا جس کا ڈبہ کچن میں موجود تھا۔

میں چائے کا کپ لے کر برآمدے میں آگیا اور کرسی پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے ہوئے رختی والے مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ توقع کے عین مطابق رختی وہاں موجود تھی۔ اندھیرے میں تھی۔ اس کا صرف ہیولہ نظر آ رہا تھا اور وہ ہاتھوں سے کچھ اشارے بھی کر رہی تھی جو میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

اس دوران باہر والے گیٹ پر دستک کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے گیٹ کی طرف

مارا اپنی تو اسے یہ پریشانی نہ ہوتی۔ مجھے ان کی قید سے فرار ہوئے تقریباً ڈیڑھ مہینہ ہو چکا تھا۔ دو لوگ شکاری کتوں کی طرح مجھے اور نجمہ کو تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ نجمہ کے بارے میں بھی انہیں اب یقین ہو چکا ہو گا کہ وہ بھی میرے ساتھ ہے۔ میں دیر تک یہ سب کچھ سوچتا رہا۔ لیکن کوئی بات واضح نہیں ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے سوچتا رہا، اُلجھنا چلا گیا۔ بالآخر میں سر جھٹکتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور غیر ارادی طور پر رخی کی چھت کی طرف دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں اندر جانے کے لئے دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ باہر گیٹ پر دستک کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کے پاس پہنچ گیا۔ ذیلی دروازہ کھولا تو نوٹی سامنے کھڑی تھی۔

”ہیلو نوٹی..... کیسی ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ٹھیک ہوں انکل۔“ نوٹی نے جواب دیا۔ ”یہ خالہ نے دیا ہے اور کہا ہے کسی کو بتائیے گا۔“ اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔
 ”میں تو کسی کو نہیں بتاؤں گا مگر تم.....“
 ”میں بھی کسی کو نہیں بتاؤں گی انکل! آپ بالکل بے فکر ہیں۔“ نوٹی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا اور واپس چلی گئی۔

میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ گلی میں دوسری طرف سے دو آدمی اونچی آواز میں باتیں کرتے ہوئے آرہے تھے۔ میں نے گیٹ بند کر دیا اور برآمدے کی طرف آ گیا۔ اندر داخل ہو کر میں نے دروازہ بند کر کے کنڈا لگا دیا اور وہ کاغذ کھول کر دیکھا۔ صرف ایک جملہ تحریر تھا۔ ”بارہ بجے کے بعد آ جانا۔ میں انتظار کروں گی۔“

میں نے کاغذ کی گولی بنا کر ایک طرف پھینک دی اور اپنے کمرے میں آ کر چار پائی پر لیٹ گیا اور سر ہانے کے قریب پڑا ہوا ایک پرانا ڈائجسٹ اٹھا لیا۔ ڈائجسٹ کھولنے سے پہلے میں نے سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس وقت سوا دس بج رہے تھے۔

رسالہ پڑھتے پڑھتے میں اونگھ گیا۔ اور پھر کھٹکے کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ سب سے پہلے میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اس وقت ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی انگلی سے برآمدے والا دروازہ کھٹکنا رہا ہو۔ میں کمرے سے نکل کر ہال میں آ گیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی رخی تیزی سے اندر داخل ہوئی اور اپنے پیچھے دروازہ بھیڑ دیا۔ میرے

کچھ جانتی تھی۔

یہ تو میں جانتا تھا کہ سفارت کار ہر ملک میں ایک دوسرے کے خلاف جاسوسی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے بے بہا دولت خرچ کی جاتی تھی۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا تھا۔ کئی جاسوس مارے بھی جاتے تھے۔ مادام دیشکے کے حوالے سے بھی کچھ ایسے ہی حالات سامنے آئے تھے۔ وہ ماری گئی تھی اور اس کے گھر سے بھی کروڑوں کی دولت برآمد ہوئی تھی۔ یہ تو وہ دولت تھی جو میں اڑا لیا تھا۔ رخی کے کہنے کے مطابق کوٹھی کے تہ خانے میں بھی دولت کے انبار لگے ہوئے تھے جس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ اور رخی وہی دولت اڑانے کے چکر میں تھی۔

مادام دیشکے کے قتل میں تاجی اور ٹکیل کا ہاتھ تھا۔ تاجی کے بارے میں نجمہ سے بہت سی سنسنی خیز باتیں معلوم ہو چکی تھیں اور اب میں سوچ رہا تھا کہ کیا تاجی کسی کے لئے جاسوس کی حیثیت سے کام کر رہی تھی؟ لے دے کر اسرائیل ہی کا نام ذہن میں آتا تھا۔ اسرائیل اور لبنان میں پرانی دشمنی چل رہی تھی۔ غیر ممالک میں بھی ان دونوں ملکوں کے ایجنٹ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ پاکستان میں کسی اور کو لبنانی سفارت کاروں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اسرائیل ہی ایک ایسا ملک تھا جو کسی بھی ملک میں اپنے مفادات کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے مادام دیشکے کا وہ خفیہ مشن اسرائیل کے خلاف ہو اور اسرائیلی ایجنٹوں کو کسی طرح اس کی بھک مل گئی ہو اور انہوں نے تاجی کے ذریعے اسے موت کے گھاٹ اتروا دیا ہو۔

تاجی کے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے بعد میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ دولت کے لالچ میں وہ کوئی بھی کام کر سکتی تھی۔

اب یہ بات واقعی سمجھ میں آتی تھی کہ تاجی اور ٹکیل کو مادام دیشکے کے کمرے میں اس دولت کا علم نہیں ہو سکا تھا جو بعد میں، میں اڑا لیا تھا۔ ہو سکتا ہے تاجی کی یہ بات درست ہو کہ کوٹھی کے باہر فائرنگ کی آواز سن کر وہ بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور انہیں تاشا لینے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اور پھر ہوٹل میں میرے گلے میں مادام دیشکے کا لاکٹ دیکھ کر انہیں نہ صرف اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا بلکہ یہ جان کر بھی وہ لرز اٹھے ہوں گے کہ کوئی تیسرا شخص ان کے راز سے واقف ہو چکا ہے۔ انہوں نے مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کر لیا تھا۔

تاجی مجھے جان سے مار دینا چاہتی تھی تاکہ ان کا راز ناش نہ ہو سکے۔ لیکن مجھے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے وہ اس دولت کو بھی حاصل کر لینا چاہتی تھی۔ اور میرے خیال میں یہ لالچ ہی اس کے لئے اب عذاب بن گیا تھا۔ اگر وہ دولت کے چکر میں پڑنے کی بجائے مجھے

”میرے بہنوئی کا اسلام آباد تبادلہ ہو گیا ہے۔ ابھی میں بائیس دن ہوئے ہیں اسے گئے ہوئے۔ پہلی کو آئے گا تو ٹوٹی کو بھی ساتھ لے جائے گا۔ وہاں ہمارے کچھ اور رشتے دار بھی رہتے ہیں۔ ٹوٹی انہی کے پاس رہے گی۔“ رخشی نے جواب دیا۔

”اور تم.....؟“ میں نے پوچھا۔
”میں یہیں رہوں گی۔“ رخشی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، پھر بولی۔ ”میرا خیال ہے تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔“

”ہاں..... کھانا تو میں نے واقعی نہیں کھایا۔ اور بھوک بھی لگ رہی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور رخشی کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا۔

اندر آنے کے بعد میں نے پہلی مرتبہ اس کی طرف دیکھا تھا۔ چند منٹ پہلے جب وہ برے ہاں آئی تھی تو اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور اب اس کے جسم پر ہلکے نیلے رنگ کا مرانہ سلپنگ سوٹ نظر آ رہا تھا۔ کٹے پائینچے کا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ اور بش ٹرٹ کی طرح اوپن ٹرٹ جس کا اوپر والا ایک ٹبن کھلا ہوا تھا۔

”تم بیٹھو۔ میں کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔“ رخشی کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ میں بیڈ کے سامنے الماری کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد رخشی کمرے میں کھانا سجا کر لے آئی۔ میں نے دوسری کرسی اپنے سامنے کھینچ لی اور ٹرے اس کرسی پر رکھ کر کھانا کھانے لگا۔ رخشی بیڈ کی پٹی پر بیٹھی خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔

کھانے کے بعد وہ چائے بنا کر لے آئی اور اپنا کپ لے کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

”اب بتاؤ، تم اتنا عرصہ کہاں رہے؟“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے اس طرح غائب ہو جانے سے میں تو پریشان ہو گئی تھی۔ اور تم نے یہ داڑھی کس چکر میں رکھ لی ہے؟“

”داڑھی کے باوجود تم نے مجھے پہچان لیا؟“ میں نے کہا۔
”بالکل نہیں۔“ رخشی بولی۔ ”شام کو جب تم دروازے کے سامنے سے گزرے تھے تو میں نے چہرے سے تو تمہیں نہیں پہچانا تھا لیکن تم جس طرح سر جھکا کر نے تلے قدم اٹھا کر چلتے ہو،

اُس سے میں چوکی تھی۔ اور جب تم اپنے گھر میں داخل ہوئے تو میں مجھے جانتی تھی کہ وہ تم ہی تھے۔“
”میرا چلنے کا یہ شریفانہ انداز اسی گلی تک مخصوص ہے۔ باہر تو میں گردن اکڑا کر اور سینہ تان کر ہٹا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

دماغ پر اس وقت بھی نیند کا خمار سا طاری تھا مگر رخشی کو دیکھ کر نیند کا فور ہو گئی۔

”تنت..... تم.....؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”میں وہاں بیٹھی انتظار کر رہی ہوں..... تم.....؟“

”میری آنکھ لگ گئی تھی۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اب تم آگئی ہو تو آؤ بیٹھو۔“

”نہیں۔ میں واپس جا رہی ہوں۔ ٹوٹی سو رہی ہے۔ اگر وہ اٹھ گئی تو مجھے نہ پا کر ڈر جائے گی اور چیخنا شروع کر دے گی۔ تم پانچ منٹ میں آ جاؤ۔“ رخشی نے تیز لہجے میں کہا۔
”اور تمہارا بہنوئی؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ گھر میں نہیں ہے۔“ رخشی نے جواب دیا۔
میں نے رخشی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کر لیا اور اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کی آنکھوں میں دھشت سی بھری ہوئی تھی۔

”میں چلتی ہوں۔“ وہ اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑا کر بولی۔ ”گھر کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ تم جلدی آ جاؤ۔ زیادہ انتظار مت کرنا۔“

وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ آئی تو وہ باہر کی دیوار پھاند کر تھی لیکن واپسی کے لئے اس نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ استعمال کیا تھا۔ میں چند لمحے اپنی جگہ پر کھڑا رہا، پھر دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

اور پھر ٹھیک پانچ منٹ بعد میں اپنی کونٹھی سے نکل رہا تھا۔ برآمدے والے دروازے کو میں نے تالا لگا دیا تھا جبکہ گیٹ کو باہر سے صرف کھنڈا لگایا اور کچھ دیروہیں کھڑا گلی میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ گلی میں سناٹا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا رخشی کے مکان کی طرف چلتے لگا۔

رخشی اپنے دروازے کے اندر ہی کھڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں جیسے ہی قریب پہنچا، دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ میں تیزی سے اندر داخل ہو گیا اور میرے پیچھے فوراً ہی دروازہ بھی بند ہو گیا۔ صحن اور برآمدے کے بلب بجھے ہوئے تھے جس وجہ سے یہاں تاریکی تھی۔
”آؤ..... اندر آ جاؤ!“ اندھیرے میں رخشی کی سرگوشی ابھری۔

میں رخشی کے ساتھ چلتا ہوا اس کمرے میں آ گیا جہاں ایک بار پہلے بھی کچھ وقت گزارا تھا۔
”تمہارا بہنوئی کہاں ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے رخشی کی طرف دیکھا۔ ٹوٹی کے بارے میں اس لئے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کسی کمرے میں سو رہی ہوگی۔

میرے ہونوں کی منکراہٹ اب واضح ہو گئی۔ میرے ساتھ کسی اور لڑکی کے نام سے وہ انکلی تھی۔ عورت بھی عجب فطرت کی مالک ہے۔ اپنے پسندیدہ مرد کے ساتھ وہ کسی دوسری دولت کا نام بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ رخصتی اور میرے بچ کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ ایک سو نو کاروباری معاملہ تھا۔ وہ چھت سے مجھے اس لئے اشارے نہیں کرتی تھی کہ میرے عشق میں ناہو گئی تھی۔ بلکہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جان چکی تھی۔ اور ماڈام دشلک کی پوشیدہ دولت قبضہ کرنے کے لئے میرے ساتھ ایک ذیل کرنا چاہتی تھی۔ یہ سو فیصد کاروباری معاملہ تھا۔ مگر

”اس روز جب میں یہاں سے گیا تھا تو میں نے ایک کار خریدی تھی اور پھر اس رات میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچ گیا تھا جہاں ممتاز عرف تاجی اور اس کا ایک ساتھی کلہیل بھی موجود

”میں تیار ہوں۔ تم ہی دور بھاگتے رہے ہو۔“ رخصی نے کہا۔ ”لیکن اگر ہم اس چکر میں پڑ
میں تو وہ دولت.....“
”اس کی تم فکر مت کرو۔“ میں نے بات کاٹ دی۔ ”جب تک وہ دولت تہ خانے میں محفوظ
ہے، اسے ہم ضرور حاصل کریں گے۔“
”میرا خیال ہے مخدوم کو بھی اسلام آباد سے بلایا جائے۔ وہ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتا
ہے۔“ رخصی نے کہا۔

”مدد کے لئے میرے پاس بھروسے کے دو تین آدمی موجود ہیں۔ لیکن یہ مخدوم کون ہے؟ تم
پہلے بھی اس کا حوالہ دے چکی ہو۔ بلکہ تم متوقع طور پر ملنے والی دولت کا ایک حصے دار بھی بنا چکی
ہو۔ مجھے بتاؤ وہ کون ہے؟ غلط بیانی سے کام مت لینا۔ میں چاہتا ہوں کہ جو بھی آدمی ہمارے
ہاتھ کام کرے، مجھے اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل ہوں۔“

”مخدوم اسلام آباد میں لبنانی سفارت خانے میں سکیورٹی آفیسر ہے۔“ رخصی نے جواب
دیا۔ ”مادام دسکھ جب بھی اسلام آباد میں ہوتی تھی مخدوم ہی اس کے ساتھ رہتا تھا۔ دسکھ کو بھی
اس پر مکمل بھروسہ تھا۔ وہ اسے کچھ ایسی باتیں بھی بتا دیتی تھی جو سفارت کار عام طور پر کسی اور کو
نہیں بتاتے۔ مجھے بھی مخدوم ہی کی سفارش پر مادام دسکھ نے اپنے پاس رکھا تھا۔ وہ بہت جلد
مجھ سے بے تکلف ہو گئی تھی اور اس لئے وہ مجھے اپنے ساتھ تہ خانے میں بھی لے گئی تھی۔ لیکن
جب اسے یہ پتہ چلا کہ میں پولیس میں رہ چکی ہوں تو اس نے معذرت کرتے ہوئے مجھے
لازمت سے نکال دیا تھا۔ نجانے کیوں اسے پولیس کے نام ہی سے چڑھتی تھی۔ اس لئے اس نے
حکومت کی طرف سے پولیس کے محاذ بھی قبول نہیں کئے تھے۔ اس نے اپنی کوٹھی پر صرف ایک
گاز رکھا تھا اور وہ بھی پرائیویٹ۔“

”اس کا مطلب ہے کہ مخدوم ہمیں مادام دسکھ کے اس خفیہ مشن کے بارے میں کچھ بتا سکتا
ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پہلے ہم تاجی کو تلاش کریں گے۔ اگر اس سے اصل بات نہ اُگلوا سکے
تو مجبوراً مخدوم سے مدد لینی پڑے گی۔ ویسے ہمیں کل ہی سے تاجی اور اس کے ساتھیوں کی تلاش
شروع کر دینی چاہئے۔ لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔
”تمہاری یہ بھانجی ٹونی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی وجہ سے تم آزادی سے نکل و حرکت نہیں کر
سکتے، جبکہ ایسے کاموں میں.....“
”تم اس کی فکر مت کرو۔“ رخصی نے میری بات کاٹ دی۔ ”میں کل صبح ہی اسے اپنی پھوپھو

وہ میرے ساتھ دوسری عورت کا نام سن کر سگ گئی تھی۔ اسے شاید یہ بھی افسوس ہو رہا تھا کہ میں
اتنے روز نجمہ کے ساتھ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ میں کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ”تم خبر
کے نام پر افسردہ کیوں ہو گئیں؟“

”میں افسردہ کیوں ہونے لگی؟“ اس نے ہاتھ چھڑانے کی برائے نام کوشش کرتے ہوئے
کہا۔ ”جلتی ہے میری جوتی۔ تم جس کے ساتھ بھی رہو، مجھے کیا پرواہ ہے؟“

”تم تو ناراض ہو گئیں۔“ میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ”تم نے کہا تھا کہ مادام دسکھ
کسی خفیہ مشن پر کام کر رہی تھی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لبنان کی تحقیقاتی
ٹیم کے سربراہ نے بھی اس کی تصدیق کر دی ہے۔ کچھ دیر پہلے میں نے بیس بائیس دن پرانے
اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی۔ اس خبر سے بھی میرے اس خیال کی تصدیق ہوئی ہے کہ مادام دسکھ اسی
مشن کی وجہ سے ماری گئی تھی۔ یہ تو ہم جان چکے ہیں کہ اس کے قتل میں تاجی اور ٹکیل کا ہاتھ
ہے۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ مادام دسکھ کا مشن کیا تھا اور یہ کہ تاجی کا اس کیس میں کیا
کردار ہے۔ آیا وہ بھی کسی مخالف گروہ کی رکن ہے، یا محض مادام دسکھ کو قتل کرنے کے لئے اس کی
خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اور یہ کہ اصل لوگ کون ہیں۔“

”یہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔“ رخصی نے جواب دیا۔
”تمہارے ذہن میں کوئی خاص بات؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
”تاجی کی گردن ناپ لی جائے۔ تھرڈ ڈگری اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دے گی۔“ رخصی
نے جواب دیا۔

”لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تاجی کو کہاں پکڑا جائے؟“ میں نے کہا۔
”اس کی کوٹھی پر چھاپہ مار کر۔ جہاں تم پر تشدد کیا گیا تھا۔“ رخصی نے جواب دیا۔
”آخر ہونا پولیس والی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ لوگ ہمارے
انتظار میں وہاں بیٹھے ہوں گے؟ نہیں ڈیر! میرے فرار کے بعد تاجی نے وہ کوٹھی چھوڑ دی ہو
گی۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ پورے شہر میں مجھے شکاری کتوں کی طرح تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔
لیکن وہ اتنے غیر محتاط بھی نہیں ہوں گے۔ ویسے انہیں تلاش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔“

”وہ کیا؟“ رخصی نے پوچھا۔
”نجمہ سامنے نہیں آ سکتی۔ لیکن وہ اس کے بعض ٹھکانوں کے بارے میں جانتی ہے۔“ میں
نے کہا۔ ”اگر تم کوشش کرو تو کسی نہ کسی ٹھکانے پر اس کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔“

”نہیں انکل! دروازے تو کھلے ہوئے تھے۔“ ٹوٹی نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”باہر باب والا دروازہ تو چوٹ کھلا ہوا تھا اور برآمدے والا دروازہ بھی صرف بھڑا ہوا تھا۔ پہلے تو میں نے آپ کو آواز دی۔ جواب نہیں ملا تو اندر آ گئی۔ بارہ بج رہے ہیں اور آپ ابھی تک سو رہے تھے۔ میں تو صبح سویرے جاگ جاتی ہوں۔“

”رات کو نیند نہیں آئی تھی اسلئے میں دیر تک سویا رہا۔ اچھا ہوا تم نے مجھے جگا دیا۔ کہو، کیسے آئی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”خالد نے آپ کے لئے انڈے کا حلہ اور پرائٹھا بھیجا ہے۔ باورچی خانے میں رکھ دیا ہے میں نے۔ اٹھ کر کھا لیجئے۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اب میں چلتی ہوں۔“ دروازے کے قریب پہنچ کر واپس گئی۔ مڑ کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”آج میں اپنی ایک نانی کے ہاں جا رہی ہوں۔ کئی روز وہاں رہوں گی اور آپ کو مس کروں گی۔“

میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”تمہاری کتنی نانیاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اصل والی نانی تو اللہ میاں کے ہاں جا چکی ہیں۔ میں نے تو انہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن اور بہت سی نانیاں اور دادیاں ہیں۔ بوڑھی بوڑھی سی۔ چروں پر کڑی کے جالوں کی طرح ٹھریاں پڑی ہوئیں۔ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں وہ سب کی سب۔ اچھا میں چلتی ہوں۔“

ٹوٹی چلی گئی۔ میں بھی اٹھ کر باہر آ گیا۔ پہلے گیٹ بند کیا اور پھر اندر آ کر برآمدے والا دروازہ بھی بند کر کے کنڈا لگا دیا۔ یہ واقعی بڑی خطرناک بات تھی کہ رات کو میں نے تمام دروازے کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ اگر کوئی چور موقع پا کر گھس آتا، گھر کا صفایا کر کے چلا جاتا تو مجھے فریگ نہ ہو پاتی۔

میں کمرے میں آ کر باتھ روم میں گھس گیا اور کتنی دیر تک شاور کے نیچے کھڑا رہا۔ ٹھنڈے پانی سے دماغ کی تپش کچھ کم ہو گئی۔

مکن میں پلٹوں میں ڈھکے ہوئے دو پرائٹھے اور انڈے کا حلہ رکھا ہوا تھا۔ میں پلٹیں اٹھا کر مونسے پر بیٹھ گیا اور ناشتہ کرنے لگا۔ انڈے کا حلہ واقعی بہت مزے دار تھا۔

تقریباً دو بجے کے قریب میں تیار ہو کر کوٹھی سے نکل آیا۔ اس مرتبہ دروازہ بند کرنے میں، مونسے نے خاصی احتیاط سے کام لیا تھا۔

میں حسب معمول سر جھکائے چل رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے رخشی والے مکان کی طرف دیکھا۔ گیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔ تقریباً اسی وقت سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا۔ ایک

کے ہاں چھوڑ آؤں گی۔ وہ چاہ میراں میں رہتی ہے۔ چند روز کے لئے سنبھال لے گی اسے۔“

”کل شام کو میرے ساتھ چل سکتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”کہاں؟“ اس نے ایک بار پھر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”فائیو اسٹار ہوٹل میں۔ جہاں پچھلے دو مہینوں سے میری گاڑی کھڑی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس کام میں ہمیں گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔ گاڑی موجود ہے تو اسے کیوں نہ استعمال میں لایا جائے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چلوں گی۔“ رخشی نے جواب دیا۔

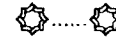
”کل رات کا کھانا ہم فائیو اسٹار ہوٹل میں کھائیں گے۔ تم تیار رہنا۔ ہم آٹھ بجے کے قریب یہاں سے نکل چلیں گے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ رخشی کہتے ہوئے اٹھنے لگی تو میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ میں نے کہا۔

”چار بج رہے ہیں۔“ اس نے دیوار گیر کلاک کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم تیار ہو جاؤ۔ میں اس دوران چائے بنا دیتی ہوں۔ پی کر چلے جانا۔“

میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔ میں نے اس کے بازو کو ہلکا سا جھکادیا تو وہ میرے اوپر گر گئی۔



میں اس قدر گہری اور بے ہوشی کی نیند سویا تھا کہ اگر کوئی گھر کا سامان تو کیا مجھے بھی اٹھا کر لے جاتا تو پتہ نہ چلتا۔

کمرے کا پچھلا اگرچہ پوری رفتار سے چل رہا تھا لیکن جب آنکھ کھلی تو میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ میری آنکھ خود بخود نہیں کھلی بلکہ مجھے جھنجھوڑ کر جگایا گیا تھا اور میں اپنے بیدار کے قریب ٹوٹی کو کھڑے دیکھ کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔

ٹوٹی اندر کس طرح آئی تھی؟

یہ سوال میرے دماغ میں ایسی دھماکوں کی طرح گونج رہا تھا۔ صبح ساڑھے چار بجے جب میں رخشی کے کمرے سے نکل کر اپنی کوٹھی میں آیا تھا تو اس وقت میرے دماغ پر ایک خمار سا طاری تھا۔ ایک عجیب سا خمار..... اور میں اندر آتے ہی بستر پر گر کر سو گیا تھا۔

”ارے ٹوٹی!“ میں نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اندر کیسے آئیں؟ تمام دروازے تو بند تھے۔“

شیدا پہلوان میرا بہت پرانا جاننے والا تھا اور بعض معاملات میں میرا احسان مند بھی تھا۔ ایک مرتبہ تو میں نے اس کے دشمنوں سے اس کی جان بھی بچائی تھی۔ یہ تقریباً تین سال پہلے کی بات تھی۔ رات ایک بجے کے قریب دو آدمیوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ گدھے کی طرح اس کی ہٹائی کر رہے تھے۔ اس وقت شیدا پہلوان کے دو دوست بھی ساتھ تھے لیکن شیدے پر حملہ ہوتے ہی وہ دونوں دم دبا کر بھاگ گئے تھے۔ اور اتفاق سے میں اس وقت وہاں پہنچ گیا تھا۔ اور میں ٹھیک وقت پر پہنچا تھا۔ اس وقت حملہ آوروں میں سے ایک چاقو سے شیدے پہلوان پر ہلکے کرنے والا تھا جبکہ دوسرے نے شیدے کو اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔

میں نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر چاقو والے حملہ آور پر چلاٹک لگا دی۔ میرا یہ حملہ اس کے لئے غیر متوقع تھا۔ وہ دونوں بہت بڑے بد معاش تھے اور انہیں کسی طرف سے مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔ لیکن میرے حملے نے انہیں بوکھلا دیا تھا۔

چاقو والا پشت کے بل زمین پر گرا تھا اور میں نے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی تھی۔ اپنے ایک حمایتی کے آجانے سے شیدے کو بھی حوصلہ ملا اور وہ اپنے آپ کو دوسرے حملہ آور کی گرفت سے چمڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلے حملہ آور کو زمین چٹا کر میں دوسرے کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس پر بھی ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

ان دنوں زیر زمین دنیا میں میرا بڑا ٹھکانہ تھا۔ میرے نام کی دہشت تھی۔ شیدے پہلوان کے ترفیوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور پھر وہ دونوں اس طرح دم دبا کر بھاگے تھے کہ ان کا پتہ ہی نہیں چلا کہ کس طرف گئے تھے۔

شیدا پہلوان کو میں اس وقت بالکل نہیں جانتا تھا۔ اسے پتہ دیکھ کر اس کی مدد کو پہنچ گیا تھا اور اگر میں بروقت اس کی مدد کو نہ پہنچتا تو وہ لوگ اسے مار ڈالتے۔

یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ شیدا پہلوان فلم انڈسٹری میں ایک سٹرا سپلائر تھا اور اس کا کسی اور بارنی سے جھگڑا چل رہا تھا۔ پچھلے دنوں دوسری پارٹی نے ایک فلم کے لئے ایکسٹرا لڑکیاں سپلائی کی تھیں اور شیدا پہلوان نے ہدایت کار سے مل کر اسے کاٹ دیا تھا اور اس سے کم ریٹ پر اپنی لڑکیاں سپلائی کر دی تھیں۔ جس پر ان دونوں میں دشمنی چل نکلی تھی اور بالآخر مخالف پارٹی نے اسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس وقت غنڈوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ تو اس کی نعمت اچھی تھی کہ میں بروقت پہنچ گیا اور اسے بچالیا۔ شیدا پہلوان میرا اس قدر احسان مند ہوا کہ میرے لئے دوسروں سے لڑنے مرنے کو بھی تیار ہو جاتا۔

شیدا پہلوان سے میری ملاقاتیں اگرچہ بہت کم ہوتی تھیں لیکن اس کے بارے میں کچھ

ادھیڑ عمر عورت نے دروازے سے سر نکال کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تشنیک کی جھلک نمایاں تھی۔ اس نے شاید ٹوٹی کو کسی وقت میرے ہاں آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور ظاہر ہے ایسی صورت میں دل میں شبہ پیدا ہونا لازمی تھا۔ میں چند قدم آگے نکل گیا تو وہ گلی میں دوسری طرف رخ کر کے کسی بچے کو آوازیں دینے لگی۔

گلیوں سے نکل کر میں روڈ پر منڈی اسٹاپ کے قریب مجھے فوراً ہی رکشٹل گیا اور میں رکشے پر بیٹھ کر ملتان روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔

ملتان روڈ پر شاہ نور اسٹوڈیوز تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ میں نے رکشہ چھوڑ دیا اور ٹھہلا ہوا اسٹوڈیوز کے گیٹ کے قریب پان سگریٹ کی ایک دکان پر پہنچ گیا۔

دکان پر اس وقت دو آدمی کھڑے پان چباتے اور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے تانبہ کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو بہت ڈبلا پتلا اور لمبے قد کا مالک تھا۔ بے تحاشہ بڑھے ہوئے بال گردن پر پھیلے ہوئے تھے اور قلمیں رخساروں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جبکہ دوسرا درمیانے قد کا اور قدرے بھاری بھر کم تھا۔ اس کی عمر بھی پچیس چھیس سال ہوگی۔ اس نے بھی حلیے سے ہیرا بننے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

میں نے گولڈ لیف کا ایک سگریٹ لیا اور وہیں کھڑے کھڑے کش لگانے لگا۔ ”چل یار! اندر چلیں۔ انجمن کی شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔“ ڈبلا پتلے شخص نے کہا اور وہ دونوں وہاں سے ہٹ کر سٹوڈیوز کے گیٹ کی طرف چل دیئے۔

میں نے سگریٹ کا کش لگا کر دھواں اڑا دیا اور دکان کے شوکیس کے پیچھے کھڑے ہوئے ہیر وکٹ نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”شیدا پہلوان کہاں ملے گا استاد؟“

اس نوجوان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”شیدا پہلوان تو شوٹنگ میں بڑی ہے سرجی! کوئی سودا لینا ہے تو مجھے بتا دو۔“

”تم میرا کام نہیں کر سکتے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اسے پیغام بھیجو کہ روٹی ملنے کے لئے آیا ہے۔“

”روٹی!“ وہ نوجوان اچھل پڑا۔ اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر آواز دے کر ایک لڑکے کو اپنی جگہ پر کھڑا کیا اور خود دکان سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسٹوڈیوز کے گیٹ کی طرف چلا گیا۔

میں وہاں کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا۔

”جنت کیسی روٹی باؤ! ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ اور تمہارے لئے تو اپنی جان بھی حاضر ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”پستول کب چاہئے؟“

”اگر ابھی بندوبست ہو جائے تو.....“

”اس وقت تو میرے پاس اپنا پستول موجود ہے۔ وہی لے جاؤ۔“ شید اپہلوان نے جواب دیا اور قنطار نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اور پھر اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی دھوتی کی ڈب (کر پر دھوتی کا بند) سے پستول نکال کر میز کے نیچے میری طرف بڑھا دیا۔ ”بھرا ہوا ہے۔“

”نہال رکھنا۔“

میں نے پستول لے کر چٹون کی سائیز پاٹ میں ٹھوس لیا۔

دیے ذرا محتاط رہا کہ روٹی باؤ! ملک شہاب کے بندے تمہیں تلاش کر رہے ہیں اور پولیس بھی تمہاری تاک میں ہے۔ اس کے علاوہ.....“

”اس کے علاوہ کیا.....؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایک عورت بھی تمہاری تلاش میں ہے۔“ اس نے کہا۔

”عورت؟“ میں چونک گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تاجی کی بات کر رہا تھا۔ لیکن میں اس سے

بڑا کچھ جانتا چاہتا تھا اس لئے انجان بننے ہوئے بولا۔ ”کون ہے وہ عورت؟“

”بڑی کتھی شے ہے۔ تاجی نام ہے اس کا۔“ شید سے اپہلوان نے جواب دیا۔ ”تم اس کی کسی بھڑکی کو اڑالے گئے ہو۔ وہ تمہیں تلاش کرتی پھر رہی ہے اور کہتی ہے کہ تمہیں زندہ نہیں بھڑے گی۔“

”مجھے بھی اس کی تلاش ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ جس لڑکی کی بات کر رہی، اسے وہ دو سال پہلے بڑا نوالہ سے اغوا کر کے لائی تھی۔ وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی جسے اس نے برباد کر دیا۔ اتفاق سے میرا آمتا سامنا ہو گیا اور میرے ساتھ چلی گئی۔ تاجی کے بارے میں کچھ اور انکشاف ہوئے ہیں۔ میں تو خود اس کی تلاش میں ہوں۔ لیکن تم اسے کیسے جانتے ہو؟“

”وہ بڑی کتھی شے ہے روٹی باؤ!“ شید نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”شہر کا کون سا گوشہ آدمی ہے جو اسے نہیں جانتا۔ چند سال پہلے وہ ایکسٹرا سپلائر تھی۔ کلشی پر اس نے باقاعدہ کنٹرول رکھا تھا۔ انڈسٹری کی ایکسٹرا سپلائی کرتے کرتے اس نے شہر کے بڑے بڑے لوگوں کو

انکشافات بھی ہوتے رہتے تھے۔ فلم انڈسٹری میں ایکسٹرا سپلائر کے علاوہ وہ چھوٹے پیمانے پر ہیرن اور اسلحہ بھی سپلائی کرتا تھا۔ اور اس وقت میں اسی سلسلے میں اس کے پاس آیا تھا۔ میرا پستول تاجی یا کلکیل کے قبضے میں چلا گیا تھا اور مجھے پستول کی ضرورت تھی۔

تقریباً دس منٹ بعد وہ نوجوان واپس آ گیا۔ اس نے مجھے انتظار کرنے کو کہا اور شوکیس کے بائیں طرف رکھے ہوئے فریج میں سے کوک کی بوتل نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

”بھائی صاحب ابھی آتے ہیں سر جی! آپ اتنی دیر حلق تر کر لیں۔“

میں نے اس کے ہاتھ سے بوتل لے لی اور اسٹرا سے ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ اور پھر آخری چسکی لے کر خالی بوتل شوکیس پر رکھی ہی تھی کہ شید اپہلوان گیٹ سے نکل کر تیزی سے میری طرف آ گیا۔ وہ مجھ سے اس طرح ملا جیسے برسوں سے بچھڑا ہوا ہے۔

”آؤ روٹی باؤ! اندر چلو..... انجمن کی فلم کی شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ ڈانس کا سین ہے۔ کیا غضب کا ناچتی ہے۔ دل ہلا کر رکھ دیتی ہے۔“ وہ میرا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔

”انجمن جب ڈانس کرتی ہے تو دل تو کیا، دھرتی بل کر رہ جاتی ہے۔ لیکن اس وقت شوٹنگ دیکھنے کا موڈ نہیں۔ فارغ ہو تو چلو۔ ذرا اس طرف چلتے ہیں۔“

”کیا کہتے ہو روٹی باؤ! تمہارے لئے وقت نہیں ہو گا تو کس کے لئے ہو گا۔“ شید اپہلوان نے جواب دیا۔ پھر ڈکان پر بیٹھے ہوئے نوجوان سے کچھ کہا اور مڑ کر میرے ساتھ چل پڑا۔

ہم دونوں پیدل چلتے ہوئے یتیم خانہ چوک پر بند روڈ کی طرف مڑ گئے اور تھوڑا ہی آگے ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ یہ ایئر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ تھا اور قرب و جوار میں دائمی ریسٹورانوں سے قدرے بڑے سکون تھا۔ ہمیں ایک کونے میں خالی میز مل گئی۔ میں اگرچہ کوک پی کر آیا تھا لیکن شید نے بیٹھتے ہی چائے کا آرڈر دے دیا۔

چائے آنے میں تقریباً دس منٹ لگ گئے۔ اس دوران ہم ایک دوسرے کے حالات معلوم کرتے رہے۔ اور پھر چائے کے دوران میں فوراً ہی اصل موضوع پر آ گیا۔

”مجھے ایک پستول کی ضرورت ہے۔ فوری طور پر۔“ میں نے کہا۔

”مل جائے گا روٹی باؤ! ایسی کیا بات ہے۔ مگر.....“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا پھر قدرے آگے بھٹکتے ہوئے بولا۔ ”اگر کسی بندے کو اوپر پہنچانا ہے تو اپنے اس خادم کو حکم کرو۔ تمہیں سامنے آنے کی بھی ضرورت نہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرا اپنا پستول کہیں کھو گیا ہے۔ مجھے ویسے ہی اپنی حفاظت کے لئے ایک پستول کی ضرورت ہے۔ ویسے اگر کبھی ضرورت پڑی تو

”ساب کرنا ہے۔“
”فکر ہی مت کرو۔ میں سب کچھ معلوم کر لوں گا۔ گاڑی لینے کے لئے کس وقت آؤ گے؟“

نیدے نے پوچھا۔

”تمہاری یہ دکان کتنے بجے تک کھلی رہتی ہے؟“

”رات دو بجے تک۔“ شیدا پہلوان نے جواب دیا۔ ”صادق ابھی گھر چلا گیا ہوگا۔ اس کی جگہ میرا بھانجا آ گیا ہوگا۔ رات دس بجے صادق دوبارہ آ جائے گا اور دو بجے تک وہی دکان پر رہے گا۔ ویسے میں بھی آج ساری رات اسٹوڈیو ہی میں رہوں گا۔ ایک اور فلم کی شوٹنگ کے لئے ٹی سیٹ لگا دیا ہے۔ دس بجے اس فلم کی شوٹنگ شروع ہوگی جو صبح تک جاری رہے گی۔“

”ٹھیک ہے، میں گیارہ بجے کے بعد کسی وقت آ جاؤں گا۔ تم چابی صادق کو دے دینا۔“ میں نے کہا۔

چائے کا بل بھی شیدا پہلوان ہی نے دیا تھا۔ ہم دونوں اسٹوڈیو تک پیدل ہی باتیں کرتے ہوئے آ گئے۔ اور پھر میں ایک رکشے پر بیٹھ کر شادمان کالونی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس وقت چار بج رہے تھے۔ سو لجر گھر پر نہیں تھا۔ کال تیل کے جواب میں دروازہ شبونے کھولا تھا۔ اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ پہلے سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔ اس کی رنگت اگرچہ کسی قدر سانسولی تھی لیکن چہرے کے نقوش بڑے غضب کے تھے۔ اور اس وقت تو وہ بہت نکمری ہوئی تھی بلکہ لشکارے مار رہی تھی۔ بہت سلیقے سے بنے ہوئے بال، چہرے پر ہلکا سا میک اپ اور نجمہ کے خریدے ہوئے لباس میں اس کے فکرز بہت نمایاں ہو گئے تھے۔ مجھے اس طرح اپنی طرف مگھورتے پا کر وہ شرماسی گئی۔

میں آگے بڑھا تو اس دوران نجمہ بھی برآمدے میں آ گئی۔ وہ بھی بہت بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بڑی مدد کشش تھی۔

میں ہال کمرے میں آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ نجمہ بھی میرے سامنے ہی بیٹھ گئی تھی۔ شبو باہر ہی ٹپٹنے لگی تھی۔ وہ ہمیں میاں بیوی ہی سمجھتی تھی اور شاید یہ سمجھ کر باہر ہی رہ گئی تھی کہ میں ایک دن کے کانٹے سے آیا ہوں۔ میاں بیوی کے ملنے کا انداز کچھ مختلف ہوگا۔ اور شاید وہ کباب میں ہڈی نہیں بننا چاہتی تھی۔

کچھ دیر بعد نجمہ نے اسے آواز دے کر اندر بلا لیا اور اسے چائے بنانے کو کہا۔ شبو کچن کی طرف چلی گئی۔ میں بھی اٹھ کر اپنے کمرے کے باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی سے نہا کر مل اپنے آپ کو ہلکا پن کا احساس کرنے لگا۔ کپڑے بدل کر جب میں باہر آیا تو شبو سینئر ٹیبل پر

ہے۔ پہلے تو وہ ہم جیسے لوگوں کی بغل میں بیٹھا کرتی تھی۔ اب تو سیاستدان اور وزیر بھی اسے جھک کر سلام کرتے ہیں۔“

”اس کے بارے میں، میں بھی بہت کچھ جان چکا ہوں۔ اس کا کوئی ٹھکانہ؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بڑے ٹھکانے ہیں اس کے۔“ شیدا پہلوان بولا۔ ”پہلے تو اس کی رہائش سن آباد کی ایک کوٹھی میں تھی۔ پھر اس کے کسی عاشق نے یونیورسٹی کی پیس سے آگے اسے نئی کوٹھی بنادی۔ میں نے وہ جگہ نہیں دیکھی۔ لیکن سنا ہے وہ آج کل وہیں رہ رہی ہے۔“

”وہاں نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اس لڑکی کو وہاں سے نکال کر لایا تھا۔ بلکہ وہ مجھے نکال کر لائی تھی۔“

”وہ نکال کر لائی تھی؟ کیا تم قیدی تھے؟“ شیدا پہلوان بولا۔

”کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ تم نہیں سمجھ سکو گے۔ کیا تم میرا ایک اور کام کر سکتے ہو؟“ مجھے اچانک ہی یاد آ گیا تھا کہ میری گاڑی فائو اسٹار ہوٹل کے پارکنگ لاٹ پر دو مہینوں سے کھڑی تھی۔ اس کی بیٹری تو لازمی طور پر ڈاؤن ہو گئی ہوگی۔ اور ممکن ہے ٹائر بھی قلیت ہو چکے ہوں۔ میں نے رشتی کو وہاں لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ گاڑی کم از کم آج کے دن ہمارے کام نہیں آ سکتی تھی۔

”حکم کرو روٹی باؤ!“ شیدا نے کہا۔

”میری گاڑی دو مہینوں سے فائو اسٹار ہوٹل کے پارکنگ میں کھڑی ہے۔ اس کی بیٹری ڈاؤن ہو چکی ہوگی۔“ میں نے کہا۔ اسے گاڑی کے بارے میں بتانے لگا۔

”چابی مجھے دو۔“ شیدا نے کہا۔ ”گاڑی کہاں پہنچانی ہوگی؟“

”یہیں پر لے آنا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”فلم اسٹوڈیوز کے سامنے بھائی کی دکان کے آس پاس کہیں کھڑی کر کے چابی اپنے بھائی کو دے دینا۔ میں آج ہی رات کسی وقت لے جاؤں گا۔“ میں نے چابیوں کا گچھا جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اور اس کی رقم کتنی ہے؟ میرا مطلب ہے جو چیز تم نے مجھے دی ہے۔“ میرا اشارہ پستول کی طرف تھا۔

”روٹی باؤ!“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیوں ذلیل کرتے ہو؟ اسے میری

طرف سے تحفہ سمجھ لو۔ ویسے میں تمہارے لئے کوئی اچھی چیز دیکھوں گا۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں چلا ہوں۔ اور اس کتنی شے یا اس کے آدمیوں؟ ضرور نگاہ رکھنا۔ ممکن ہو تو اس کا ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ مجھے اس سے بڑا لمبا چننا

”ہاں۔۔۔۔۔ یاد آیا۔“ رشید ترابی کا نام سن کر میں چوک گیا۔ ”یہ وہی آدمی ہے نا جس کے بارے میں تم نے۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہی۔“ اس نے نظریں جھکا کر میری بات کاٹ دی۔
”میں کل تاجی کی اس کوٹھی کی طرف جاؤں گا۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ وہ وہاں نہیں ملے گی۔ وہ میری تلاش میں ہے مگر سامنے نہیں آئے گی۔ لیکن کسی اور ذریعے سے اس کا ٹھکانہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔“

”رشید ترابی؟“ نجمہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔
”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”اس کے ذریعے ہم تاجی تک پہنچ سکتے ہیں یا اس کا ٹھکانہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے مجھے ایک بار پھر۔۔۔۔۔“
”ضروری نہیں کہ تمہارے ساتھ وہ سب کچھ ہو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔
”بہر حال، ایک دو دن تک تو میں کسی اور ذریعے سے کوشش کرتا ہوں۔ پھر۔۔۔۔۔“
شب کو اندر آتے دیکھ کر میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اسی وقت کال بیل کی آواز بھی گونج اٹھی تھی۔ شب دو دروازے ہی سے مڑ کر گیٹ کی طرف چلی گئی۔

وہ سب لوگ تھا جو گھر کا سودا سلف لے کر آیا تھا۔

میں شام سات بجے تک وہیں رہا۔ اور جب انجکشن ٹاؤن والی کوٹھی پہنچا تو آٹھ بجنے والے تھے۔ گلی سے گزرتے ہوئے میں نے رختی کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اپنی کوٹھی کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھے ہوئے میں بار بار اس کے مکان کی چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ حسب توقع دس منٹ بعد وہ چھت پر نظر آئی تو میں نے اشاروں سے اسے سمجھا دیا کہ ہم نوبے یہاں سے نکلیں گے۔

میں نے کچن میں جا کر چائے بنا لی اور برآمدے ہی میں آکر بیٹھ گیا۔ ٹھیک نوبے رختی ایک اہم چھت پر دکھائی دی اور میں اسے اشارہ کرتے ہوئے اٹھ گیا۔
”کمر سے نکلنے سے پہلے میں نے پستول کو بھی چیک کر لیا تھا۔ کسی بھی وقت اس کی ضرورت نہ پڑے گی۔“

گلی سے گزرتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے رختی کے مکان کی طرف دیکھا۔ اندر اندر اٹھا مگر دروازے میں ذرا سی بھری نظر آ رہی تھی۔ میں گلیوں سے نکل کر مین روڈ پر آ گیا

چائے لگا رہی تھی۔ میں نجمہ کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا تو شبو اپنا کپ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ چائے پیتے ہوئے میں نجمہ کوکل سے اب تک کی صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔
”تمہارے دوست نے ٹھیک کہا ہے۔ وہ واقعی کٹی شے ہے۔“ نجمہ نے میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ”حقیقت یہی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے وہ فلمی ہیر دکن بننے کے شوق میں انڈسٹری میں آئی تھی۔ اداکاری تو آتی نہیں تھی، اپنے حسن اور جوانی کی وجہ سے ہدایت کاروں کی نظر وار میں کھب گئی۔ وہ اسے کسی فلم میں دو چار منٹ کا کوئی سین دے دیتے اور ایڈیٹنگ کے دوران وہ سین بھی کاٹ دیئے جاتے۔ لیکن ہدایت کاروں کی راتیں رنگین ہو جاتیں۔ بہت عرصہ بعد تاجی نے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ فلم انڈسٹری کے لوگ اسے اپنے لئے ایک خوبصورت کھلونا سمجھتے تھے۔ اسے بھی ادراک ہو گیا کہ وہ اداکارہ نہیں بن سکتی۔ اداکاری کا جھانسدے کر اس سے دل بہلایا جا رہا ہے۔ پھر کسی ہدایت کار ہی کے مشورے پر اس نے ایکسٹرا پلاٹر کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنا باقاعدہ دفتر بنالیا تھا۔ شروع میں تو ہدایت کاروں کی طرف سے اسے بڑا پذیرائی ملی لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کا یہ کام بھی ٹھپ ہونے لگا لیکن اس دوران وہ اپنا دوسرا کام شروع کر چکی تھی۔“

نجمہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی، پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”اس نے کچھ بڑے لوگوں سے تعلقات استوار کر لئے تھے۔ یہ سب عیاش لوگ تھے۔ تاجی انہیں لڑکیاں سپلائی کرنے لگی۔ اس کے پاس لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ اور وہ لڑکیاں بھی بیک سمجھتی تھیں کہ فلم نہ سہی، دوسرا دھندہ سہی۔ انہیں تو پیسوں سے غرض تھی۔ وہ ہر تعیش زندگی گزارا چاہتی تھیں۔ ان کا سب سے زیادہ فائدہ تاجی کو پہنچ رہا تھا۔

اس دھندے میں تاجی کے قدم جم گئے۔ وہ ہاتھ پیر پھیلاتی گئی۔ اس کے کچھ ایسے لوگوں سے بھی تعلقات ہو گئے جن کا کام ملک کے مختلف حصوں سے لڑکیوں کو اغوا کرنا تھا۔ کسی کو زبردستی یا دھوکے فریب سے اٹھا کر لایا جاتا، کسی کو محبت کا جھانسدے کر یا کسی اور قسم کے ہز باغ دکھا کر اغوا کیا جاتا۔ وہ لوگ زیادہ تر کالج کی نوخیز اور حسین لڑکیوں پر ہی ہاتھ ڈالتے ہیں۔ تاجی انہیں منہ مانگی قیمت پر خرید لیتی۔ ایک مرتبہ آبرو لوٹ جانے کے بعد کوئی لڑکی واپس جانے کا تصور نہیں کر سکتی۔ تاجی کو کسی لڑکی کی قیمت یا تو پہلے ہی گاہک سے وصول ہو جاتی یا زیادہ سے زیادہ دو تین مہینوں میں وہ اپنی قیمت پوری کر لیتی۔ رشید ترابی جیسے لوگ تاجی سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں اور ایسے ہی عیاش لوگ ہیں جو ایک ہی رات میں کسی لڑکی کی پوری قیمت ادا کر دیتے

اور قدرے آگے جھک کر لڑکی سے سرگوشیانہ لہجے میں باتیں کرنے لگا۔
یہ میں اس دور کی بات کر رہا ہوں جب پاکستان میں شراب پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ بڑے
ہوٹلوں میں تو شراب چلتی ہی تھی، شہروں میں بھی قدم قدم پر شراب خانے موجود تھے۔ ٹائٹ
کلب بھی عام تھے اور ہوٹلوں میں بھی رقص کے پروگرام ہوا کرتے تھے۔
اس وقت بھی اسٹیج پر کسی معروف رقاصہ کے رقص کی تیاری ہو رہی تھی۔ میں نے کن انکھیں
سے نظری طرف دیکھا۔

وہ میرے بالکل سامنے بیٹھا ہوا تھا لیکن اس نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ اگر میرے چہرے پر
درازمی نہ ہوتی اور بال بھی چھوٹے ہوتے تو وہ مجھے فوراً ہی پہچان لیتا۔
پیک ختم ہونے سے پہلے ہی نظریہ بکنے لگا تھا۔ نظریہ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو شراب کے
دھوکھٹ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ شراب کا پہلا قطرہ معدے میں پہنچنے ہی ایسے لوگوں کا دماغ
پلٹنے لگتا ہے۔ اور جب یہ لوگ شراب کے نشے میں بہکنے لگیں تو ان سے ایسی ایسی حرکات سرزد
ہوئے لگتی ہیں جن کا وہ ہوش و حواس میں رہ کر تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور دراصل ایسے ہی لوگ
شراب کے چند گھونٹ پینے کے بعد اپنی ذلت و رسوائی کا باعث بنتے ہیں۔

ہال میں بیٹھے ہوئے بعض دوسرے لوگ بھی بہکنے لگے تھے اور اپنا اسٹینس بھول کر بازاری
ترکیں کرنے لگے تھے۔ رقاصہ اسٹیج سے اتر کر اب میزوں کے درمیان چکرار ہی تھی۔ کوئی اسے
بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہا تھا، کوئی اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس سے معانقہ کرنے کے چکر
میں تھا۔ اور ایک اوجیز عمر شخص تو نشے میں اس قدر بہک گیا تھا کہ وہ رقاصہ کے قدموں پر گر پڑا
اور اس کے پیچھا چاننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ شہر کا ایک مشہور بزنس مین تھا۔

یہ وہ لوگ تھے جو شرفاء کہلاتے تھے۔ معاشرے کا ستون تھے۔ جن کے دم سے معاشرے کا
وجود قائم تھا۔ یہ شہر کے معززین تھے۔ لیکن الکحل کے چند قطروں نے ان کی اصل اوقات اجاگر
کر دی تھی۔

ظفر بھی اب پھیلنے لگا تھا۔ وہ آگے جھک کر نہ صرف اپنی ساتھی لڑکی کو چھیڑ رہا تھا بلکہ اب وہ
رکشی کے ساتھ بھی فری ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک موقع پر اس نے رکشی کے گال کو چھونے
کی کوشش کی تو رکشی کا بھرپور تھپس اس کے گال پر پڑا۔ چٹان کی آواز ابھری۔ موسیقی کا شور ہونے
کے باوجود تھپس کی آواز پورے ہال میں گونج گئی تھی اور لوگ مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے تھے۔ اور
پھر کئی لوگ تھپتھپانے لگے۔

تھپتھپاتے ہی ظفر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا گال سہلاتے ہوئے غنوار

اور ڈکانوں سے آگے جا کر رُک گیا۔ اس وقت ڈکانیں کھلی ہوئی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی
جاری تھی۔

تقریباً دس منٹ بعد رکشی ایک گلی سے نکلتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے غنمدی سے کام لیا تھا۔ وہ
ڈکانوں کے بیچ والی گلی کی بجائے آخری گلی سے آئی تھی اور اس طرف زیادہ لوگوں کی آمد و رفت
نہیں تھی۔ گلی سے نکلتے ہی اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر مجھے دیکھ کر اس طرف چلی آئی۔
ہم دونوں کچھ دور تک چلتے رہے اور پھر ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ
گئے۔ رکشی کی وجہ سے ٹیکسی بھی ایک مسکور کن خوشبو سے مہک اٹھی تھی۔

ٹیکسی میں نے فائیو اسٹار ہوٹل کے باہر ہی رُکوالی۔ اس جگہ تیز روشنی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ
رکشی کی طرف دیکھا۔ اس کی قمیض کی ڈنگ بڑے غضب کی تھی۔ دوپٹہ ایک پٹی کی طرح تہہ کر
کے اس نے بائیں کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ دائیں کندھے سے پرس لٹک رہا تھا۔ چہرے پر ہلکے
سے مہک اپ نے اس کے حسن کو مزید نکھار دیا تھا۔

ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہو کر پارکنگ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے گردن گما
کر اس کی طرف دیکھا۔ میری گاڑی نظر نہیں آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ شاید پہلوان آج دن
میں ہی کسی دقت وہ گاڑی لے گیا تھا۔

ایک طرف لان میں بھی میزیں کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن پر رنگین چھتیاں تکی ہوئی تھیں۔
بہت سی میزیں ابھی خالی تھیں لیکن میں جانتا تھا کہ دس بجے کے بعد یہاں بھی بیٹھے کو جگہ نہیں
ملے گی۔

ہم اندر آ گئے۔ ڈائننگ ہال میں چند ہی میزیں خالی تھیں۔ ہم جیسے ہی ایک میز پر بیٹھے
ویٹر ہمارے سر پر نازل ہو گیا۔ اس نے دو خوبصورت مینو کارڈ ہمارے سامنے رکھ دیے۔ ہم نے
کارڈ دیکھ کر اپنی اپنی پسند کا آرڈر نوٹ کروا دیا۔

میں نے ہال میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن کوئی جانا پہچانا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ کھانے کے
بعد ہم ریکریشن ہال میں آ گئے۔ یہاں اکاڈا میزیں خالی تھیں۔ ہم بھی ایک خالی میز پر بیٹھ
گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ایک اور جوڑا ہماری ہی میز پر آ کر بیٹھ گیا اور اس شخص کو دیکھ کر میں چونک
بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

وہ ملک شہاب کا بہنوئی ظفر تھا۔
اس کے ساتھ لڑکی کی عمر بائیس تیس سال سے زیادہ نہیں تھی اور اس کے حسین ہونے میں
بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ ظفر نے قریب سے گزرتے ہوئے ویٹر کو بلا کر دو پیگ شیمپن کا آرڈر

ذیب کھڑی تھی۔

کئی روز بعد ملک شہاب کے کسی بندے سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ ملک شہاب کے آدمی
پورے شہر میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں اپنی جان کے خوف
نے کہیں چھپا بیٹھا ہوں۔ اور آج اتفاق سے اس کے بہنوئی سے ٹکرا گیا تھا۔ میں نہ صرف دل کی
ہراس نکال لیتا چاہتا تھا بلکہ ملک شہاب کو بھی یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ میں بزدل نہیں ہوں۔

ظفر اگرچہ قند و قامت اور طاقت کے لحاظ سے میرا ہم پلہ ہی تھا مگر میں نے اسے سنبھالنا
موقع نہیں دیا۔ منہ کے علاوہ اب اس کی ناک سے بھی خون بہنے لگا تھا۔ میرے قریب کھڑی
ہوئی رخصتی بھی موقع پا کر اسے ایک ہاتھ جڑ دیتی تھی۔ اور پھر وہ باقاعدہ اس لڑائی میں شامل ہو
گئی۔ اس نے سینڈل اتار لیا اور ظفر کی تواضع کرنے لگی۔

ہوٹل کا منیجر چند ویژز کے ساتھ دوڑتا ہوا ہال میں داخل ہوا۔ ویژز نے بڑی مشکل سے مجھے
تاکو کر کے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ منیجر رخصتی کی منت ساجت کر رہا تھا۔ اس دوران کچھ اور لوگ بھی آ
گئے تھے۔ ان میں دو عورتیں بھی تھیں جنہوں نے رخصتی کو سنبھال لیا تھا۔

یہ جھگڑا شروع ہونے سے پہلے سب ہی لوگوں نے دیکھا تھا کہ ظفر نے شراب کے نشے میں
رخی کو چھیننے کی کوشش کی تھی جس پر بات اس حد تک بڑھی تھی۔ وہ معذرت کرنے کی بجائے
دھمکیوں پر اتر آیا تھا۔

ہال میں بہت سی میزیں الٹ چکی تھیں۔ گلاس اور بوتلیں بھی پورے ہال میں بکھری ہوئی
تھیں۔ دو ویژز ظفر کو اٹھا کر ایک طرف لے گئے تھے اور باقی میزیں سیدھی کرنے لگے۔

منیجر کو پتہ چل گیا تھا کہ جھگڑا کس بات پر ہوا تھا۔ وہ بار بار مجھ سے اور رخصتی سے معذرت کر
رہا تھا۔ آج رات کا سارا پروگرام غارت ہو گیا تھا۔ اچھا خاصا نقصان ہوا تھا۔ مگر میں جانتا تھا
کہ پولیس کو اطلاع نہیں دی جائے گی۔ ایسی باتیں پولیس اور اخبارات تک پہنچ جائیں تو ہوٹل کی
رہنمائی پر فرق پڑتا ہے۔ بدنامی ہوتی ہے۔ اور پھر یہ تو فانیو اشار ہوٹل تھا جہاں صرف شرفاء اور
مہنگے آدمی ہی آتے تھے۔ اگر یہاں بھی دنگے فساد ہونے لگیں تو لوگ اس طرف آنا چھوڑ دیں۔
ال لے منیجر اس معاملے کو یہیں پر ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ظفر کو دو ویژز نے ایک کرسی پر بٹھا رکھا تھا اور وہ اب بھی دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں اٹھ کر
اس کے قریب چلا گیا۔

”منیجر ظفر!“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”وہی مجھے امید تو نہیں
لگن اگر تم میں ذرا سی بھی غیرت ہے تو آئندہ ایسی حرکت نہیں کرو گے۔ دولت آجانے کا یہ

نظروں سے رخصتی کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک ہی تھپڑ سے اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔
”تت..... تم..... تمہاری یہ جرأت.....“ ظفر کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ ”تم جانتی نہیں میں
کون ہوں..... کس پر ہاتھ اٹھایا ہے تم نے۔“
”جانتی ہوں۔“ رخصتی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”تم گندی نالی کے وہ کیڑے ہو جو گندگی ہی میں
اچھے لگتے ہو۔“

”تت..... تم.....“ ظفر کے منہ سے غصے کی شدت سے بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔
اس نے ایک بار پھر ہاتھ اٹھایا لیکن میں نے ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور
دوسرے ہاتھ سے ایک زوردار گھونسہ اس کے جڑے پر رسید کر دیا۔ وہ چیخا ہوا پیچھے دوسری میز
سے ٹکرایا۔ اس میز پر بیٹھی ہوئی دو عورتیں چیختی ہوئی اٹھ کر تیزی سے ایک طرف ہٹ گئیں۔ ان
کے ساتھی مرد بھی بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گئے تھے۔

ہال میں بہت سے لوگ اپنی کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ عورتیں چیختی ہوئی
دروازے کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ رقاہ بھی دوڑ کر اسٹیج پر چلی گئی تھی۔

میرے گھونٹنے سے ظفر کا کوئی دانت مل گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے سے خون بہہ
نکلا تھا۔ ہاتھ کی پشت سے ہونٹ پونچتے ہوئے وہ خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔
”تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر اپنی موت کو آواز دی ہے۔“ وہ غراتے ہوئے بولا۔ ”اب تم
یہاں سے زندہ نہیں جاسکتے۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔“

”میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں منیجر ظفر!“ میں نے جواب دیا۔ ”میری دوست نے
ٹھیک کہا تھا کہ تم گندی نالی کے وہ کیڑے ہو جو گندگی ہی میں اچھے لگتے ہیں۔ دولت آجانے
سے انسان کی فطرت تو نہیں بدل جاتی.... ہیروئن کی کمائی تمہیں اس ہوٹل تک تو لے آئی ہے مگر...“
”بند کرو بکواس۔“ ظفر چیخا ہوا میری طرف لپکا۔ لیکن قریب پہنچنے سے پہلے ہی میرا ایک اور
بھر پور گھونسہ اس کے جڑے پر پڑا اور وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔

ظفر کی عمر تیس سے پینتیس کے درمیان ہوگی۔ وہ خاصا صحت مند اور ہٹا کٹا آدمی تھا۔
میرے دوسرے گھونٹنے نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ وہ چند لمحوں کے لیے مجھے گھورتا رہا اور پھر حملہ کر دیا۔
اس مرتبہ اس نے ہوش و حواس سے کام لیا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے کٹھن گتھا ہو گئے۔ کسی نے ہمارے اس جھٹڑے میں مداخلت کی
کوشش نہیں کی تھی۔ عورتیں تو چیختی ہوئی ہال سے باہر بھاگ گئی تھیں اور جو مرد ہال میں رہ گئے
تھے وہ بھی دور دور کھڑے تھے۔ ظفر کی ساتھی لڑکی بھی غائب ہو چکی تھی۔ البتہ رخصتی میز کے

ہم گیت کی طرف بڑھے تو بہت سے لوگ ہماری طرف بھی متوجہ ہو گئے۔ زیادہ نظریں رختی کا طواف کر رہی تھیں۔ قد و قامت، شکل و صورت اور پُر وقار انداز میں چلتی ہوئی رختی کو کی بے رونی ہی لگتی تھی۔

پان والی دکان پر اس وقت شیدا پہلوان بھی موجود تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی دکان سے نکل کر ہماری طرف آ گیا۔

”بسم اللہ..... جی آیا نوں۔“ اس نے بڑی گرجبوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر رختی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مڑ کر لڑکے کو اشارہ کیا جو ہمارے لئے کوک کی بوتلیں لے آیا۔

”یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے رونی باؤ! کسی سے لڑ کر آرہے ہو کیا؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہوٹل میں ملک شہاب کے بہنوئی سے گراؤ ہو گیا تھا۔“

”ظفر؟“ شیدا پہلوان بولا۔ ”اس حرامی کی تلاش میں تو میں بھی ہوں۔ میرے دولاکھ مارکر بیٹھا ہوا ہے۔“

”اگر مجھے پہلے پتہ ہوتا تو اس سے تمہاری یہ رقم بھی وصول کر لیتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو چار چھ دن وہ گھر میں بیٹھا زخم سہلاتا رہے گا۔ لیکن فکر مت کرو۔ تمہاری یہ رقم مل وصول کر لوں گا۔ بہر حال، گاڑی کہاں ہے؟“

”وہ سامنے کھڑی ہے۔“ اس نے سڑک کے دوسری طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹری تو بالکل ڈاؤن ہو چکی تھی اور چاروں ٹائر بھی بیٹھ گئے تھے۔ ویسے تمہاری گاڑی بہت شاندار ہے۔“

”اسی روز تو خریدی تھی۔ اور پہلی مرتبہ ڈرائیو کر کے ہوٹل تک گیا تھا۔ واپسی پر اس گاڑی پر آنایفیب ہی نہیں ہوا تھا۔ تاجی اور نکیلیل مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے گئے تھے۔ بہر حال، کتنا خرچہ آیا ہے گاڑی پر؟“

”شرمندہ نہ کرو رونی باؤ!“ شیدا پہلوان نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دوستوں کا حساب تو دل میں ہوتا ہے۔ زبان پر نہیں آتا۔“

”تم زیادتی کر رہے ہو میرے ساتھ۔“ میں نے کہا۔

”کوئی زیادتی نہیں رونی باؤ..... موقع ملا اور مجھے کبھی ضرورت پڑی تو تمہاری جیب میں اٹھ ڈال کر بھی نکال لوں گا۔“ شیدے نے جواب دیا۔ اس نے خالی بوتلیں ہم سے لے کر

مطلب نہیں کہ تمہاری حرامزدگی معاف کر دی جائے۔“

”اس وقت تو تمہارا داؤ چل گیا ہے لیکن میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔“ وہ غراتے ہوئے بولا۔

”تمہارا سالا بھی بہت عرصے سے مجھے ایسی ہی دھمکیاں دے رہا ہے۔“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”وہ اگر پوچھے ناکہ تمہاری یہ درگت کس نے بنائی ہے تو رونی کا نام بتا دیتا۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ نام سن کر اس کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا۔

”کیوں..... ڈر گئے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آئندہ کسی سے پچکا لینے کی کوشش مت کرنا۔ ہر شخص تمہارے لئے رونی ثابت ہو گا۔“

میں اس کے سامنے سے ہٹ گیا اور رختی کے قریب کھڑے ہوئے نیجر کی طرف آ گیا۔

”مسٹر نیجر!“ میں نے کہا۔ ”آپ کا جتنا بھی نقصان ہوا ہے، وہ اس شخص سے وصول کریں۔ اگر یہ ادائیگی سے انکار کرے تو بل ملک شہاب کو بھیج دیں۔ اسے تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہیروئن کا بڑا مشہور اسمگلر ہے۔“

”اوہ.....“ نیجر کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے رختی کا ہاتھ پکڑا اور خارجی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

لابی میں بہت سے لوگ جمع تھے اور وہ سب ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم بے نیازی سے ان کے قریب سے گزرتے ہوئے لابی سے باہر آ گئے۔

ظفر کے ساتھ دھینگا مشتی سے میرے بال بکھر گئے تھے اور کپڑے بھی کچھ میلے گئے تھے۔ میں نے ایک ہاتھ سے اب بھی رختی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے چٹلون کی جیبیں ٹٹول کر دیکھیں۔ پستول موجود تھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ ہوٹل کے مین گیٹ سے نکلتے ہی ہمیں ایک رکشل گیا۔ رختی کا حلیہ تو ٹھیک ٹھاک تھا البتہ میرا حلیہ کچھ بگڑ گیا تھا۔ رکشے والے نے ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور ہمارے پیٹھے ہی رکشہ آگے بڑھا دیا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ ہم شاہ نور اسٹوڈیوز جانا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم شاہ نور اسٹوڈیوز کے سامنے رکشے سے اتر رہے تھے۔ اسٹوڈیوز زیادہ تر فلموں کی شوٹنگ رات ہی کو ہوتی تھی۔ اس وقت گیٹ کے سامنے بہت سے لوگ جمع تھے تاکہ اسٹوڈیوز میں آتے جاتے اپنے پسندیدہ اداکاروں کو دیکھ سکیں۔

رات کے بارہ بجنے والے تھے اور اس سڑک پر ٹریفک برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ ہم نے بھی چند ہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک تیز رفتار کار کو دیکھ کر میں چونک گیا۔

وہ کار تیزی سے ہمارے قریب پہنچ رہی تھی۔ میری چھٹی حس نے اس کار کو دیکھتے ہی طرے کی گھنٹی بجادی تھی۔ وہ کار جیسے ہی ہمارے برابر پہنچی، میں نے پوری قوت سے بریک ڈال دیا۔ اور ٹھیک اسی وقت فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ پے در پے تین گولیاں بالائی گئی تھیں۔ ہماری کار ایک دم رک جانے سے دوسری کار آگے نکل گئی تھی۔ اس لئے پستول یا ہاتھ سے چلائی ہوئی گولیاں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔

کار کو زوردار جھٹکا لگنے سے رختی اپنی سیٹ پر اچھلی۔ اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا اور وہ اٹھی تھی۔

”ہوشیار رختی!“ میں نے چیخ کر کہا اور بڑی پھرتی سے پتلون کی جیب سے پستول نکال

کاٹی آگے جا کر وہ کار بھی بریکوں کی تیز چرچر اہٹ کی آواز سے رک گئی تھی۔ میں نے اپنی رائے بڑھادی۔ ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالے رکھا اور دوسرا ہاتھ باہر نکال کر اگلی کار پر رنگ کرنے لگا۔ وہ کار ایک دم حرکت میں آگئی اور تیزی سے آگے دوڑنے لگی۔ اس کار سے ناہم پر فائرنگ کی جا رہی تھی۔

ان کا خیال تھا کہ میں نہتا ہوں گا۔ اس لئے وہ کار آگے جا کر رکی بھی تھی۔ لیکن میں نے رنگ شروع کی تو حملہ آور بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

رختی چند لمحوں اپنی پیشانی سہلاتی رہی۔ پھر اس نے پیچھے اپنا پرس کھول کر ریوالت نکال لیا اور باہر نکال کر فائرنگ کرنے لگی۔

میں کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ میری کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ اصولی طور پر مجھے راہ فرار یا کرنی چاہئے تھی لیکن میں جاننا چاہتا تھا کہ حملہ آور کون تھے۔ ملک شہاب کے آدمی یا تاجی بندے۔

میں منڈی اسٹاپ سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ اور پھر اچانک ہی رختی چیخ کر سیٹ پر لگی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بائیں کندھے سے ذرا نیچے بازو سے ناہم رہا تھا۔ آگے جانے والی کار سے چلائی جانے والی ایک گولی دغراسکرین میں سوراخ بنی ہوئی اس کے بازو کا گوشت چیرتی ہوئی سیٹ کی پشت میں پھنس گئی تھی۔

قریب کھڑے ہوئے لڑکے کے حوالے کر دیں اور میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی سے کہا۔ ”وہی لڑکی ہے جو تم تاجی کے ڈیرے سے اُڑا کر لائے تھے؟“

”نہیں۔ یہ کوئی اور ہے۔ اُسے میں فی الحال اس طرح ساتھ لے کر آزادی سے نہیں بھر سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ بھی ہے تو بڑی زبردست۔ کہو تو کسی ہدایت کار سے ملو ادوں؟ پہلی فلم میں ہیروئن کا پانس ل سکتا ہے۔“ اس نے پھر سرگوشی کی۔

”یہ فلمی ہیروئن سے بھی اونچی شے ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بہر حال، اب ہم چلے ہیں۔“

شیدا پہلوان بھی سڑک پار کر کے ہمارے ساتھ گاڑی تک آ گیا۔ میں نے چابی لگا کر ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھولا اور دوسری طرف جھکتے ہوئے پنجرہ سیٹ والا دروازہ بھی ان اک کر دیا۔ رختی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ میں نے انجن اشارت کیا اور شیدا پہلوان سے ہاتھ ملا کر گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

”بہت شاندار گاڑی ہے۔“ رختی نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم کاٹی عرصے سے ہمارے پڑوس میں رہ رہے ہو لیکن تمہارے پاس کبھی گاڑی تو نہیں دیکھی تھی۔“

”جب میں تمہارے پڑوس میں آ کر آباد ہوا تو اس وقت تقریباً تلاش ہو چکا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس سے کچھ عرصہ پہلے میرے پاس ایک نہیں، دو دو گاڑیاں تھیں۔ شہر کے اعلیٰ ترین طبقہ میں مجھے پذیرائی حاصل تھی۔ ہر محفل میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ مگر پھر ملک شہاب سے میرا ٹکراؤ ہوا اور اس کے ساتھ ہی میرا زوال بھی شروع ہو گیا۔ اس دوران مجھ پر ایسا وقت بھی آیا کہ میں نان شبینہ تک کو محتاج ہو گیا۔ میرے پاس سر چھپانے تک کوٹھکانہ نہیں تھا۔ میں رات کو بھی فٹ پاتھ یا پارک میں سویا کرتا تھا۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات آگے

بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”پھر قسمت مجھ پر مہربان ہونے لگی۔ میں نے یہ کوشش کرائی پرلی۔ یہ جگہ میرے لئے بہت سودمند ثابت ہوئی۔ قسمت کے در آہستہ آہستہ مجھ پر کھلتے چلے گئے اور یہ

گاڑی۔“ میں ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”یہ گاڑی میں نے دو مہینے پہلے خریدی تھی۔ اور گاڑی خریدنے کے بعد اس پر ہوٹل تک ہی گیا تھا۔ اور پھر مجھے ہوٹل سے انوا کر لیا گیا۔“

چونگی موٹر پر میں نے گاڑی بائیں طرف موڑ دی۔ یہ سڑک دور دوری تھی۔ آنے کے لئے الگ اور جانے کے لئے الگ۔ دونوں سڑکوں کے بیچ میں تقریباً بیس فٹ چوڑی کچی جگہ تھی۔

”اس وقت کسی ڈاکٹر کے پاس جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔“ میں نے گاڑی شادمان ہونی کی ایک کشادہ گلی میں موڑتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں ایسی جگہ لے جا رہا ہوں جہاں طبی امداد مل سکے گی۔“

رنشی نے ایک ہاتھ سے اپنا بازو تھام رکھا تھا اور تکلیف سے مسلسل کراہ رہی تھی۔ مزید پانچ منٹ بعد میں نے کار اپنی کوشی کے گیٹ کے سامنے روک لی۔ انجن چلتا چھوڑ دیا اور نیچے اتر کر گیٹ پر کال ہیل کے ٹن پر اٹکی رکھ دی۔



گولی گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا اور خون بھی زیادہ نہیں بہا تھا۔ لیکن رنشی زندگی میں پہلی مرتبہ اس قسم کے حادثے سے دوچار ہوئی تھی۔ اور پھر گولی کا نام ہی کی پردہشت طاری کر دینے کے لئے کافی تھا۔ رنشی بھی ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اتفاق سے گھر میں پولی فیکس مرہم موجود تھا۔ کل سوجن کی اٹکی پر کٹ لگ گیا تھا اور میرہم لایا تھا۔ میں نے زخم پر مرہم لگا کر پیٹ باندھ دی اور درد روکنے کے لئے پین کلوڈ دے دی۔

”تم تو بہادر لڑکی ہو۔ پولیس میں رہ چکی ہو۔ تمہیں تو.....“

”مجھے تو گولی کھا کر بھی آف نہیں کرنا چاہئے۔“ رنشی نے میری بات کاٹ دی۔ ”اگر یہ گولی بے پگنتی تو میں واقعی آف تک نہ کرتی اور کوئی شکوہ کئے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جاتی۔“

”ہاں..... گولی کا نام ہی ایسا ہے کہ دل پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ تمہیں تو واقعی شکر ادا کرنا ہمارے گولی گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اگر گولی اندر رہ جاتی تو مجھے چاقو یا چھری سے تمہارا بازو چیرنا پڑتا۔ بہر حال!“ میں نے خاموش ہو کر نجمہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم نجمہ سے ملنا چاہتی تھیں..... یہی ہے نجمہ۔“

رنشی نے نجمہ کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ نجمہ نے جھک کر اس کے گال پر بوسہ دیا اور اسے تسلی دینے لگی۔

”گھبراؤ نہیں، ٹھیک ہو جاؤ گی۔ صبح کوئی ایسی دوا منگوا لیں گے جس سے زخم جلد اچھا ہو جائے۔“ نجمہ نے کہا۔

ہمارے آنے سے پہلے وہ سب لوگ سو رہے تھے۔ اور اب شبو بھی جاگ گئی تھی۔ صورت یہ نکلتی تھی کہ وہ کچن میں چلی گئی اور چائے بنانے لگی تھی۔ سوجن باہر جا کر گاڑی کی سیٹ پر بیٹھا اور خون صاف کرنے لگا تھا۔

رنشی نے اب اپنے آپ پر بڑی حد تک قابو پالیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی کچھ رونق آگئی

میں نے کار کی رفتار اور بڑھادی۔ اور پھر پولیس سائرن کی آواز سن کر بھی میں چونک گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ پولیس کی وہ گاڑی اقبال ٹاؤن کی کسی سڑک سے مڑ کر ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔ میں کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا اور پھر میری ایک چلائی ہوئی گولی اس کار کے پیچھے لگا رہی تھی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور تیز رفتار کار ڈرائیور سے بے قابو ہو کر بائیں طرف کچے میں اتر کر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔

میں نے اپنی کار کی رفتار کم نہیں کی بلکہ ایکسی لیٹر پر پیر کا دباؤ کچھ اور بڑھادیا۔ پیچھے آنے والی پولیس کار سے بھی اب ہم پر فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ لیکن وہ پولیس والے تھے۔ انہیں اپنی جانیں زیادہ عزیز تھیں۔ انہوں نے درمیان میں اتنا فاصلہ رکھا تھا کہ اگر ہماری طرف سے فائرنگ ہو تو وہ محفوظ رہیں۔

اگلی کار کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اس طرف دیکھا۔ وہ کار درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی تھی اور ایک آدمی اس کار سے نکل کر سروس روڈ کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس کار کے ہیڈ لیمپس ابھی تک روشن تھے اور ان کی روشنی میں، میں نے بھاگتے ہوئے اس شخص کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ٹھیکل تھا..... تاجی کا ساتھی!

میں نے کار کی رفتار کچھ اور بڑھادی۔ پولیس کی گاڑی الٹی ہوئی کار کے قریب سڑک پر رک گئی۔ میں نے کار اقبال ٹاؤن کی طرف جانے والی ایک کشادہ گلی میں موڑ دی۔ اب میں مطمئن تھا۔ اگر پولیس کی گاڑی نے تعاقب جاری بھی رکھا تو وہ ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

”بازو کو اوپر سے دبا کر رکھو۔ تاکہ خون زیادہ نہ بہہ سکے۔“ میں نے رنشی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کار ایک اور گلی میں موڑ دی۔ رنشی کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ تکلیف ضبط کرنے کے لئے اس نے اپنے دانت سختی سے بھینچ رکھے تھے۔

میں کار کو مختلف گلیوں میں دوڑاتا ہوا وحدت روڈ پر نکل آیا۔ اس سڑک پر بھی ٹریفک کم ہو گیا تھا۔ میں کار کو دوڑاتا ہوا شاہ جمال کی طرف نکل آیا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ پولیس کی کوئی اور گاڑی ہمارے پیچھے نہ لگ جائے۔ لیکن خیریت ہی گزری۔

یہ پکار واقعی بڑی شاندار تھی۔ یہ اس کی پہلی آزمائش تھی اور اس آزمائش میں پوری اتری تھی۔ میں کار چلاتے ہوئے بار بار رنشی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات بڑھتے جا رہے تھے۔ میں اسے زبانی طور پر تسلی بھی دیتا جا رہا تھا۔

”مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو..... کہاں جا رہے ہو تم؟“ رنشی نے کراہتے ہوئے کہا۔

ناتانہ میں تھا۔ میں تو بال بال بچ گیا البتہ رختی زخمی ہو گئی۔ اور ان کی کار بھی درخت سے ٹکرا کر ان گئی۔

میں نے ٹکیل کو کار سے نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور ظاہر ہے وہ اس کار میں اکیلا نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا جسے میں نے کار سے اترتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بوکی بھی تھا، پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔

یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے راستے میں ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ اگر وہ خاموشی سے تعاقب جاری رکھ کر میرے ٹھکانے کا پتہ چلا لیتے اور بعد میں مکان کو گھیرے میں لے کر حملہ کرتے تو میں ان کا شکار ہو سکتا تھا۔ جس جگہ ہم پر حملہ کیا گیا تھا، وہاں سڑک کے دوسری طرف ہی تو زبیری یا چوٹی گلی میں میری گٹھی تھی۔ اگر وہ تعاقب میں لگے وہاں تک پہنچ جاتے تو معاملہ زیادہ خطرناک ہو سکتا تھا۔

ایک بات بہر حال طے ہو گئی تھی کہ رختی اب فی الحال اپنے گھر نہیں جاسکتی تھی۔ میں نے جب یہی بات کی تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں پہلے بھی پھوپھی کے ہاں جا کر رہتی رہی ہوں۔ اور ابے بھی گھر میں میرے علاوہ اور کون ہے جسے میری فکر ہوگی۔“

”تمہارے سامنے والی بڑوں۔“ میں نے کہا۔ ”اسے شاید تم پر یا مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ آج بھی جب میں گلی سے گزرا تھا تو وہ مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔“

”بڑوسیوں کی پرواہ کسے ہے۔“ رختی نے جواب دیا۔ ”سب جانتے ہیں کہ میں پولیس میں رہ چکی ہوں اور اب بھی میرے تعلقات ہیں۔ اس لئے کوئی بھی میرے خلاف زبان کھولنے کی کوشش نہیں کرتا۔ ویسے بھی اس گلی میں کسی کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ رہ گئی سامنے والی بڑوں۔“ وہ ایک لمحہ کو خاموش ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ ”اسے بھی میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ کھسم گھر پر نہیں ہوتا تو وہ برقعہ پہن کر اپنے پار سے ملنے چلی جاتی ہے۔“

”گویا اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔“ میں نے ہلکا سا تہقہہ لگایا۔ ”میرا خیال ہے دوسرے لوگوں کا وقت ہو چکا ہے۔ اب سو جانا چاہئے۔“

اور پھر نجمہ، رختی کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ دوسرے کمرے میں دو چار پائیاں تھیں۔ ایک بڑی سواری تھی۔ دوسری چار پائی سو لجر اٹھا کر ہال کمرے میں لے آیا تھا۔ میں صوفے پر لیٹ گیا۔

سو لجر تو تھوڑی دیر بعد سو گیا لیکن میں دیر تک جاگتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شیدا پہلوان ان

تھی۔

”چلو، میں تمہارے کپڑے بدل دوں۔ یہ تو خون میں تر ہو رہے ہیں۔“ نجمہ نے رختی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پہلے چائے پی لینے دو بھی۔“ رختی نے شبو کو ٹرے اٹھائے لیکن سے برآمد ہونے دیکھ کر کہا۔ ”میرا تو دل ابھی تک کانپ رہا ہے۔ چائے پی کر شاید یہ وحشت کچھ کم ہو۔“

چائے پینے کے بعد واقعی اس کی وحشت کم ہو گئی تھی۔ اور پھر نجمہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں باہر نکلیں تو رختی کے جسم پر نجمہ کے کپڑے نظر آ رہے تھے۔ نجمہ اس کے ساتھ واقعی بڑی ہمدردی اور خلوص سے پیش آ رہی تھی۔

میں نے سو لجر کو اشارہ کیا۔ اس نے شبو کو سونے کے لئے بھیج دیا۔

اس وقت رات کے دو بجتے والے تھے۔ مگر ہم میں سے کسی کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اور میں تو صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ٹکیل ہمارے پیچھے کیسے لگا تھا؟ یہ محض اتفاق تھا یا ہماری نگرانی کی جارہی تھی؟ لیکن مجھے یاد تھا کہ جب ہم ہوٹل سے نکلے تھے تو میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہمارے پیچھے تو کوئی نہیں آ رہا۔ اس وقت مجھے شبہ تھا کہ ظفر کا کوئی آدمی ہمارا تعاقب نہ کرے۔ لیکن ہمارے پیچھے ایسا کوئی مشتبہ آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ تو پھر یہ ٹکیل ہمارے پیچھے کہاں سے لگا تھا؟

دفعۃً میرے دماغ میں جھماکہ سا ہوا اور ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔

پچھلی مرتبہ تاجی اور ٹکیل نے فائبرو اشار ہوٹل کے پارکنگ میں اس وقت گن پوائنٹ پر لیا تھا جب میں اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ اور وہ لوگ مجھے اپنی کار پر لے گئے تھے۔ ان کی قید سے بھاگنے کے بعد میں تقریباً دو مہینے غائب رہا تھا اور میری کار ہوٹل کے پارکنگ ہی میں کھڑی رہی ہوگی۔ تاجی نے یقیناً میری کار کی نگرانی شروع کر دی ہوگی۔ ہوٹل کا کوئی گارڈ، گیٹ کیپر یا مالی وغیرہ ہی یہ خدمت انجام دے سکتے تھے۔

یقیناً ایسی ہی بات تھی۔ نگرانی کرنے والے نے آج دن میں شیدا پہلوان یا اس کے کسی آدمی کو کار لے جاتے دیکھا تو اس کا پیچھا کر کے اس نے ٹھکانے کا پتہ چلا لیا اور پھر تاجی کو اطلاع دے دی۔ لیکن ہے تاجی کے آدمی شام ہی سے کار کی نگرانی کر رہے ہوں۔ اور جیسے ہی میں رختی کے ساتھ اسٹوڈیوز کے سامنے سے کار پر روانہ ہوا، ہمارا تعاقب شروع کر دیا گیا۔ اور پھر ویران سڑک پر آتے ہی انہوں نے ہمیں موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ ان کا

معرف ہو گیا۔

”یہ گاڑی تو بڑی زبردست ہے رونی باؤ!“ اس نے کام کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر

کہا۔
”رات کو اس گاڑی نے ہمیں بچالیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اب دو چار دن تو اسے باہر نہیں لے جاسکتے۔ ذرا ہنگامہ ٹھنڈا ہو تو اسے ٹھیک کروایا جائے گا۔“

دوپہر کے بعد ہی میں نے سولجر کو شاہ نور اسٹوڈیوز کی طرف بھیج دیا تاکہ وہ شیدا پہلوان کو بھی خبردار کر دے۔ مجھے یقین تھا کہ مجھ پر حملے میں ناکام ہونے کے بعد تاجی، شیدا پہلوان پر آٹھ ڈالنے کی کوشش کرے گی تاکہ اس سے میرے ٹھکانے کا پتہ معلوم کر سکے۔

سولجر کی واپسی شام چھ بجے کے قریب ہوئی تھی۔ اور اس نے جو اطلاع دی وہ بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق شیدا پہلوان سے اس کی ملاقات پانچ بجے کے قریب ہوئی تھی۔ ایک طرف کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ ایک آدمی ان کے پاس آیا اور شیدا پہلوان کو ایک طرف لے گیا۔ چند گز دور ایک کار کھڑی تھی۔ ایک آدمی اس کار سے اتر آیا اور پھر وہ شیدا پہلوان کو کار میں بٹھا کر لے گئے۔

سولجر نے بعد میں کار سے اترنے والے شخص کا جو حلیہ بتایا تھا، وہ چونکا دینے والا تھا۔ وہ ٹھیک تھا۔۔۔۔۔

وہ میری توقع کے خلاف بہت جلد حرکت میں آ گئے تھے۔ اور ٹھیک، شیدا پہلوان کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ شیدے پر تشدد کر کے میرا ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ میرے خیال میں اب میرے لئے بھی اگلا قدم اٹھانے کا وقت آ گیا تھا۔ زیادہ تاخیر شیدا پہلوان کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نجمہ کو ایک طرف لے گیا اور اس سے پروگرام بنانے لگا۔

”آج رات؟“ نجمہ چونک گئی۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے دوست کی زندگی خطرے میں ہے۔ اور تاجی کا ٹھکانہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ دیر ہوگی تو اس کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ بولی۔ ”کس وقت جانا ہے؟“

”تمہارے خیال میں وہ گھر پر کس وقت مل سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اٹھ نو بجے تو اسے گھر پر ہی ہونا چاہئے۔“ نجمہ نے جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم ساڑھے آٹھ بجے یہاں سے نکلیں گے۔“

کی نظروں میں آ گیا تھا۔ اسے خبردار کرنا ضروری تھا ورنہ وہ بھی دھوکے میں مارا جاسکتا تھا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میری بھی آنکھ لگ گئی۔



صبح اٹھ کر پتہ چلا کہ رخصتی کی رات تکلیف ہی میں گزری تھی۔ چین کھرکا اثر زائل ہونے کے بعد زخم میں درد شروع ہو گیا تھا اور وہ رات بھر بے چین رہی تھی۔

سولجر مارکیٹ چلا گیا اور میڈیکل اسٹور سے زخم پر لگانے کے لئے دوا لے آیا اور کچھ چین کھر گولیاں بھی۔ نجمہ، رخصتی کی ڈریسنگ کرنے لگی۔ سولجر اخبار بھی لے آیا تھا۔ میں اخبار دیکھنے لگا۔ وہ خبر آخری صفحہ پر تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔

رات والے واقعہ کی وہ خبر پولیس کے حوالے سے شائع ہوئی تھی۔ پولیس کے بیان کے مطابق مجرموں کے دو گروہ آپس میں ٹکرائے تھے جس کے نتیجے میں ایک پارٹی کی کار درست سے ٹکرا کر الٹ گئی تھی اور کار کا ڈرائیور ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

ہلاک ہونے والے ڈرائیور کا نام پڑھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ فیقا تھا۔ جس کے بارے میں پولیس ذرائع نے بتایا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے وہ ہیرامنڈی کی ایک طوائف کے پاس تھا۔ پھر ہیرامنڈی سے غائب ہو گیا۔ پولیس نے کار کے نمبر کے حوالے سے بھی تحقیقات شروع کر دی تھیں۔

نجمہ نے بھی وہ خبر پڑھی اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”نمبر تو تاجی کی کار کا ہے۔ لیکن اس سے تاجی کے ٹھکانے کا پتہ چلانا ممکن نہیں۔ پولیس اندھیرے میں بی ٹامک ٹوئیاں مارتی رہے گی۔“

”لیکن..... ہم اس کے ٹھکانے کا پتہ چلا لیں گے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ”ایک دو دن تو ہمیں خاموش ہی رہنا پڑے گا۔ اور اس کے بعد تمہیں ہی.....“ میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

نجمہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”تم جو کہو گے میں کرنے کو تیار ہوں۔“

رخصتی بھی کمرے سے نکل کر آ گئی تھی۔ ہم سب نے اکٹھے ہی ناشتہ کیا اور پھر میں باہر آ کر گاڑی کا جائزہ لینے لگا۔ وٹا اسکرین میں سوراخ ہو گیا تھا اور اس کے اطراف میں مکڑی سے جالے کی طرح دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ رات کو سولجر نے اگر چیٹ وغیرہ صاف کر دی تھی مگر فون کے وجہ اب بھی نظر آ رہے تھے۔ سولجر پانی کی بالٹی بھر کر لے آیا اور فوراً ہی اپنے کام میں

اس صورت حال سے نجمہ پریشان ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ اس سے پہلے وہ کبھی ایسی چیزیں سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ اس کا پریشان ہونا فطری امر تھا۔ لیکن میں تو ایسے حالات کا عادی ہو چکا تھا۔ میری تو زندگی ہی پولیس اور جرائم پیشہ لوگوں سے آنکھ پٹی کھلتے ہوئے گزری تھی۔ میں نے اپنی کیفیت پر قابو پائے رکھا اور سرگوشیاں نہ لے کر نجمہ کو بھی تسلی دینے لگا اور گردن گھما کر اس پولیس آفیسر کی طرف دیکھنے لگا جو ہاتھ میں ریوالتور پکڑے غریب سے کار کی طرف آ رہا تھا۔

”اوائے..... نیچے اترو نا ذرا..... کون ہو تم؟ تمہیں اشارہ کیا تھا تو کار روکی کیوں نہیں تھی؟“

”سو لجر پر عرب جھاڑتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں بڑی رعوت تھی۔

”چوک کے بیچ میں تو کار نہیں روک سکتا تھا سرجی!“ سو لجر نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”یہی ہم کوئی جرائم پیشہ نہیں ہیں مجید صاحب! میرے ساتھ کار میں ایک معزز فیملی بیٹھی ہوئی ہے۔“

”اوائے..... کون ہو تم..... میرا نام کیسے جانتے ہو؟ نیچے اترو نا ذرا۔“ آفیسر نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ کندھے پر ایک اسٹار چمک رہا تھا جو اس کے لباس کی نشاندہی کر رہا تھا۔ وہ اے ایس آئی تھا۔

کار کا ڈرائیور سائیڈ والا دروازہ کھل گیا۔ سو لجر پہلے ہی انجن بند کر چکا تھا۔ وہ نیچے اتر گیا۔ اس کے چہرے پر بھی طمانیت تھی۔

”کمال ہے مجید صاحب! آپ اپنے پرانے خادم کو نہیں پہچان سکے۔ دو سال آپ کی ماتحتی میں رہ کر خدمت کی ہے آپ کی۔ اس وقت آپ ہیڈ کانسٹیبل تھے۔ اب تو شولڈر پر پھول چمک رہے۔ بڑی بڑی مبارک ہو.....“

”اوائے بندہ کر اپنی بکواس۔ میں نے پہچان لیا ہے تمہیں۔“ آفیسر نے اس کی بات کاٹ کر ”ہم تو بڑے بد معاش بنے پھرتے تھے۔ اس وقت تو بڑے شریف نظر آ رہے ہو۔“

میں نے کہا۔

اور پھر ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم گھر سے روانہ ہو گئے۔ نتائج کی پرواہ کئے بغیر میں نے یہی گاڑی استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور سو لجر کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ میرے پاس بھی ہسٹول تھا اور سو لجر نے بھی ریشی والا ریوالتور لے لیا تھا۔

گلبرگ میں رشید ترابی کی کوٹھی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اتفاق سے رشید ترابی کوٹھی پر ہی موجود تھا۔ سو لجر کو گاڑی میں ہی چھوڑ دیا۔ میں چند گز آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔ فجر کوٹھی میں چلی گئی۔

تقریباً بیس منٹ بعد نجمہ رشید ترابی کے ساتھ کوٹھی کے گیٹ سے برآمد ہوئی۔ وہ دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ سو لجر نے کار چند گز آگے بڑھا کر روک لی اور میں دوڑ کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ رشید ترابی بدحواس سا ہو گیا۔ میں نے ہسٹول اس کے پہلو سے لگا دیا۔ وہ بہت ہی بزدل ثابت ہوا۔ میں نے تاجی کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے فوراً ہی زبان کھول دی۔ رشید ترابی کے کہنے کے مطابق تاجی ان دنوں گلبرگ فائر فو کی ایک کوٹھی میں تھی۔ اس نے کوٹھی کا نمبر اور پتہ بھی بتا دیا۔

سو لجر کار کو مختلف سڑکوں پر دوڑاتا رہا۔ اور پھر ایک ویران سڑک پر پہنچ کر میں نے ہسٹول کا دستہ پوری قوت سے رشید ترابی کی کھوپڑی پر رسید کر دیا۔ وہ کراہتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

سو لجر نے کار روک لی۔ میں نے رشید ترابی کو کھینچ کر کار سے نیچے اتارا اور اسے تھمٹ کر سڑک سے دور درختوں کے نیچے ڈال دیا اور دوڑ کر دوبارہ کار میں بیٹھ گیا۔

ایک طویل چکر کاٹ کر کار ایک بار پھر گلبرگ کی طرف مڑ گئی۔

لبرٹی چوک پر کپہری سینما والی سڑک پر مڑتے ہی ایک پولیس والے نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ سڑک کے کنارے پر موبائل بھی کھڑی تھی۔ سو لجر نے کار کی رفتار بڑھانے کی کوشش کی مگر میں نے اسے منع کر دیا۔

”کوئی فائدہ نہیں سو لجر!“ میں نے کہا۔ ”اگر پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی تو ان سے بچنا جھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ کار روک لو۔ ہم ان سے غصے کی کوشش کریں گے۔“

سو لجر نے کافی آگے جا کر کار روک لی۔ اس کے چند سینکڑے بعد ہی موبائل بھی بریکوں کی تیز چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ ہمارے قریب آ کر رکی اور تقریباً نصف درجن پولیس والوں نے موبائل سے چھلانگیں لگا کر ہماری کار کو گھیرے میں لے لیا۔



”جی سرجی؟“ وہ جلدی سے میری طرف کھڑکی کے قریب جھک گیا۔
 ”کچھ دے دلا کر جان چھڑاؤ۔ کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟“ میں نے کہا۔ سولجر سیدھا ہو گیا۔ اس نے اپنی جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اے ایس آئی کی مٹھی میں دبا دیا۔
 ”ہمارے ملک بخت حیات صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔“ وہ سرگوشی میں بولا۔ ”آج تک انہوں نے کسی پولیس والے کو رشوت نہیں دی۔ وہ ابھی فون کر دیں تو ڈی آئی جی صاحب بھی روٹے ہوئے یہاں آجائیں گے۔ مگر تم خوش قسمت ہو مجید سرجی! ملک صاحب ایک پارٹی سے آرہے ہیں اور بہت تھکے ہوئے ہیں۔ نیگم صاحبہ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے تمہاری خدمت میں قائد اعظم کا نذرانہ پیش کر دیا ہے۔“

”کوئی گل نہیں ہے یار!“ اے ایس آئی کا ہاتھ پتلون کی جیب میں چلا گیا۔ ”لیکن تم یاد رکھو۔ آئندہ کوئی پولیس والا اشارہ کرے تو فوراً گاڑی روک لینا۔“
 ”آئندہ تو میں اشارے کے بغیر بھی ہر پولیس والے کے پاس گاڑی روک لیا کروں گا۔ سلام کرنے کے لئے۔“ سولجر نے جواب دیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا اور انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔

اے ایس آئی نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ لوگ موبائل میں سوار ہو گئے اور موبائل حرکت میں آ گئی۔

سولجر بھی کار کو حرکت میں لے آیا اور کار مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی گلبرگ کے فائر ٹرمینل داخل ہو گئی۔ گلبرگ مین بلیوارڈ سے ہم مین مارکیٹ کے قریب زونو بی ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک اور سڑک پر مڑ گئے اور پھر سولجر کار کو اس طرح مختلف سڑکوں اور کشادہ گلیوں میں گھماتا رہا جیسے اسے تمام راستے معلوم ہوں۔ اور بالآخر اس نے کار ایک کشادہ گلی کے موڑ پر روک لی۔

”وہ کوئی اس گلی میں ہے رونی باؤ!“ اس نے کشادہ گلی میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے پہلے بھی یہاں آچکے ہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پولیس میں سروس تو چند سال ہی کی ہے رونی باؤ! لیکن اس عرصہ میں شہر کا چپہ چپہ دیکھ لیا ہے۔ اس شہر سے تو میں اپنے ہاتھ کی کیمروں کی طرح واقف ہوں۔“ سولجر نے جواب دیا۔
 ”شہر تو ابلی نے بی بلاک کا پتہ بتایا تھا نا..... یہی بی بلاک ہے۔ وہ دیکھو..... بورڈ لگا ہوا ہے۔ جس پر لکھا ہوا ہے کہ اس گلی میں کہاں سے کہاں تک نمبروں والی کوٹھیاں ہیں۔ ہر گلی کے موڑ پر

”میں واقعی شریف ہو گیا ہوں مجید سرجی!“ سولجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ملک بخت حیات صاحب کے پاس نوکری کر لی ہے۔ ڈرائیور ہوں ان کا..... بڑے بھلے آدمی ہیں۔“

”تم ڈرائیور ہو اور پولیس میں بھی رہ چکے ہو۔“ آفیسر نے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں معلوم نہیں کہ جب کوئی پولیس والا اشارہ کرے تو گاڑی کو فوراً روک لینا چاہئے۔“
 ”سرجی! چوک کے بیچ میں گاڑی روک لینا تو آپ پھر بھی ناراض ہوتے۔ کوئی ایکسٹرنل بھی ہو سکتا تھا۔“ سولجر نے جواب دیا۔

”لائسنس ہے تمہارے پاس؟“ اے ایس آئی نے پوچھا۔
 ”آپ جیسے مہربانوں کے ہوتے ہوئے مجھے لائسنس کی کیا ضرورت ہے سرجی؟“ سولجر مسکراتے ہوئے بولا اور بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”تم ایک پولیس آفیسر سے بات کر رہے ہو۔ سیدھے کھڑے رہو۔“ اے ایس آئی کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

سولجر نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔
 ”اوئے..... یہ تمہاری کار کا شیشہ کیسے ٹوٹا ہے؟“ اے ایس آئی نے سامنے آ کر ونڈ اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔

”کرکٹ سرجی! کرکٹ۔“ سولجر نے جواب دیا۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اے ایس آئی نے اسے گھورا۔

”سرجی! آپ کو معلوم ہے آج کل پوری قوم پر کرکٹ کا بھوت سوار ہے۔ میدانوں میں سڑکوں پر اور گلیوں میں بھی کرکٹ کھیلی جاتی ہے۔ آج صبح سویرے ہی بچوں نے گلی میں وکٹ اڑانے کی بجائے ہماری کار کا شیشہ اڑا دیا۔ ملک صاحب مصروف آدمی ہیں۔ کار کو روکنا آپ لے جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ صبح سب سے پہلے میں کار کا شیشہ لگواؤں گا تا کہ کل آپ سے سامنا ہو تو شکایت کا موقع نہ ملے۔“

”گاڑی کے کاغذات اور لائسنس دکھاؤ۔“ آفیسر نے کہا۔
 میں باتوں ہی سے سمجھ گیا تھا کہ وہ اے ایس آئی بہت بد لحاظ اور بے حرمت قسم کا آدمی ہے۔ وہ ہنسی خنکی نکال رہا تھا اور میں اس کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا۔
 ”ڈرائیور!“ میں نے سولجر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

کال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اس کا سیفٹی کیچ میں نے ہٹا دیا ہے۔ تمہیں صرف ٹرائیگر دانا ہے۔ مگر ذرا محتاط رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ خود ہی نشانہ بن جاؤ۔“
 ”اتنی بیوقوف بھی نہیں ہوں۔“ نجمہ نے جواب دیا۔

میں نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔ میرے ساتھ نجمہ بھی پچھلی سیٹ سے اتر کر ڈرائیوگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بھی بند کر لیا تھا۔

میں نے چند قدم گلی میں چلنے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جس جگہ کار کھڑی تھی، وہاں اندھیرا تھا اور نجمہ غالباً سیٹ پر نیچے ہو کر بیٹھی تھی۔ اندھیرے میں وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

گلی میں چلتے ہوئے سولجر نے رخشی والا رپو اور میرے ہاتھ میں تھما دیا جسے میں نے جیب میں ڈال لیا۔

مطلوبہ کوٹھی کے سامنے پہنچ کر ہم رک گئے۔ میں نے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ کسی کوٹھی کے سامنے کوئی چوکیدار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویسے بھی رات کو چوکیدار کوٹھیوں کے گیٹ کے اندر ہی رہتے ہیں۔

میں نے گیٹ کے قریب دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ برآمدے میں زیر و کابلبل مل رہا تھا جس کی مدھم سی روشنی صرف برآمدے تک ہی محدود تھی۔ برآمدے کے دائیں طرف کمرے کی کھڑکی تھی۔ مگر وہ کھڑکی بھی تاریک نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں دیوار کو دکر آہستگی سے اندر آ گئے۔

عمارت کے دائیں بائیں دونوں طرف گلیارے سے تھے۔ میں نے سولجر کو دائیں طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود بائیں طرف بڑھ گیا۔

یہ گیارہ چھ فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ ساتھ والے بنگلے کی دیوار کے ساتھ ساتھ تھوڑے فاصلے پر قد آور پودے لگے ہوئے تھے جن کی شاخیں دیوار سے بھی اوپر نکلی ہوئی تھیں۔ بنگلے کی اصل عمارت کے ساتھ ساتھ پودوں کے گیلے رکھے ہوئے تھے۔

اس طرف ایک کمرہ بھی تھا اور اس کی کھڑکی بھی تاریک تھی۔ اس سے چند فٹ آگے ایک دروازہ تھا۔ میں اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ پیرایک کمرے سے نکلا گیا۔ گلاڑھک گیا۔ سنائے میں اچھی خاصی آواز پیدا ہوئی تھی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیزی سے ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ پودوں کی پھیلی ہوئی شاخوں میں دبک کر بیٹھ گیا۔ میں نے جنر کی پتلون اور سبز رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کمرے کے کپڑے بھی اندھیرے ہی کا حصہ بن گئے تھے۔ میرے چہرے کے عین سامنے ایک شاخ

ایسا ہی بورڈ لگا ہوا ہے۔ رشید ترابی نے جو نمبر بتایا تھا وہ کوٹھی اسی گلی میں ہونی چاہئے۔“
 سیدی سی بات بھی جو میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ مگر سولجر نے اسے سمجھ لیا تھا۔ بلاک بی میں داخل ہونے کے بعد وہ ہر گلی کے موڑ پر لگے ہوئے بورڈ دیکھتا رہا اور بالآخر کار یہاں روک لی تھی۔

میں گلی کی طرف دیکھنے لگا۔ رات کا ڈیڑھ بجنے والا تھا۔ گلی میں سناٹا تھا۔ تین چار کوٹھیوں کے سامنے کاریں کھڑی تھیں۔ بیشتر کوٹھیاں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ البتہ کسی کی کوٹھی کے برآمدے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ گلی میں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔
 ”دیکھ کر آؤ، وہ کون سی کوٹھی ہے؟“ میں نے سولجر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سولجر دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ گلی کا نصف راستہ طے کر کے وہ ایک جگہ رکا۔ چند لمبے ایک کوٹھی کے گیٹ کو دیکھتا رہا، پھر واپس آ گیا۔

”وہ کوٹھی اسی گلی میں ہے رونی باؤ! اس طرف نیلے گیٹ والی۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم گاڑی ڈرائیو کر سکتی ہو؟“ یہ سوال میں نے نجمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں..... تاجی نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔“ نجمہ نے جواب دیا۔

”یہاں تمہیں اکیلے ڈر تو نہیں لگے گا؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”کیا مطلب؟“ نجمہ نے مجھے گھورا۔

”میں اور سولجر کوٹھی کے اندر جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم کار میں ڈرائیوگ سیٹ پر بیٹھی رہو گی۔ جیسے ہی ہمیں واپس آتے دیکھو، انجن اسٹارٹ کر دیتا۔“

”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں تمہارے ساتھ ہی اندر چلوں؟“ نجمہ بولی۔

”کوٹھی کے اندر نہ جانے کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے۔ خطرے کی صورت میں تمہیں اس گاڑی پر فرار ہونے کا موقع تو مل جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے اگر تم لوگوں کو کوئی خطرہ ہو تو میں تمہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں..... نہیں رونی یہ نہیں ہوگا۔“ نجمہ نے غصے میں جواب دیا۔

”تو پھر تم یہیں رک کر ہمارا انتظار کرو۔“ میں نے کہا۔ ”کوٹھی سے باہر رہ کر تم ہمارے لئے زیادہ مددگار ثابت ہو سکتی ہو۔ ویسے میرا خیال ہے تمہیں یہاں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ کار کی اندر

کی جی بھی بھی ہوئی ہے۔ یہاں اور بھی کئی کاریں کھڑی ہیں اس لئے کسی کو اس کار پر شبہ نہیں ہو گا۔ تم سیٹ پر ڈرائیو کر بیٹھی رہنا۔ اور یہ اپنے پاس رکھ لو۔“ میں نے اپنی جیب سے پتول

میا۔ میں نے پستول کے دستے سے اس کے سر پر وار کرنا چاہا تھا مگر اس کے گھوم جانے سے وار اس کے کندھے پر پڑا۔ پستول اس کے اسی ہاتھ میں تھا جو کندھے پر ضرب لگنے سے چھوٹ گیا۔ اس کے منہ سے کراہی خارج ہوئی اور وہ پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں نے پستول سے دوسرا حملہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ شخص مجھ سے ہٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میری ٹانگ میں اڑنگا مارا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لیکن میں گرا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی تھا۔

ہمارے گرنے سے کئی گیلے اُلٹ گئے تھے اور مجھے اندیشہ تھا کہ آواز سن کر کوئی اور باہر نہ آ جائے۔ سو بھر دوسری طرف تھا اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس پوزیشن میں تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ ایک دو گیلے اور لڑھک گئے۔ میں اسے رگیدتا ہوا دیوار کے ساتھ والے پودوں کی طرف لے آیا اور بالآخر مجھے موقع مل گیا۔

میرا پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا اور بڑی تیزی سے نیچے آیا۔ ضرب اس کی ٹینٹی پر لگی۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی اور پھر وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے چند لمبے اسے دبوچے رکھا اور پھر اسے چھوڑ کر اٹھ گیا۔ ابھی میں پوری طرح سنبھل ہی نہیں پایا تھا کہ اسی دروازے سے ایک نسوانی سرگوشی ابھری۔

”ریاض..... کہاں ہو تم..... کیا کر رہے ہو ادھر؟“ یہ تاجی کی آواز تھی۔

میں منہ سے آواز نکالے بغیر تیزی سے قدم اٹھا کر دروازے میں آ گیا اور پستول کی نال ٹکی کے سینے پر رکھ دی۔

”اگر تمہارے منہ سے آواز نکلی تو ساری گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔“ میرے حلق سے بھڑبھڑاتی جیسی خراہٹ نکلی۔

”ت..... تم.....؟“ تاجی کے منہ سے بمشکل آواز نکلی سکی تھی۔ ”ریاض..... کک..... کہاں ہے؟“

”وہ ذرا سیر کرنے گیا ہے۔ آدھے گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کچھ دیکھ کر تم ڈر کیوں گئیں؟ تمہیں تو میری تلاش تھی۔ میں خود ہی یہاں آ گیا ہوں تو تمہاری بات کیوں نکلی جا رہی ہے؟“

”ت..... تم یہاں کیسے آ گئے؟“ تاجی نے کہا۔

”اپنے بھروسے پر چل کر آیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اندر کون کون ہے..... میرا طلب ہے کتنے آدمی ہیں؟“

تھی۔ اس کے پتے میرے جسم کو چھو رہے تھے اور مہک میرے نتھنوں سے نکل رہی تھی۔ اس خوشبو سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ لیموں کے پودے تھے۔

وہ بہت ہلکی سی آہٹ تھی جس نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا اور کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ آہٹ اسی طرف سے سنائی دی تھی۔ غالباً کوئی اس کمرے میں موجود تھا جس نے بڑی آہستگی سے کھڑکی کا تھوڑا سا پردہ ہٹایا تھا۔

کھڑکی کا پردہ تقریباً چھ انچ کے قریب ہٹ گیا تھا اور پیچھے کسی کمرے میں مدھم روشنی نظر آئی تھی۔ ایک ہیولہ سا کھڑکی کے دوسری طرف دکھائی دیا۔

کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے اس شخص کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کھڑکی کی جالی سے باہر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا اور پردہ بھی برابر ہو گیا۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو دوسری مرتبہ آہٹ سن کر پھر دب گیا۔ وہ قدموں کی ہلکی سی آہٹ تھی جو اس مرتبہ دروازے کے پچھلی طرف سے سنائی دی تھی۔

پہلے چننی گرائے جانے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس کے فوراً ہی بعد ہلکے سے کلک کی آواز ابھری اور آہستہ آہستہ ہینڈل گھمایا جانے لگا۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا اور پھر ایک آدمی بہت محتاط انداز میں باہر آ گیا۔ وہ ٹکیل ہرگز نہیں تھا۔ ٹکیل لمبے قد کا مالک تھا اور اسے تو میں اندھیرے میں بھی پہچان سکتا تھا۔ جبکہ یہ آدمی درمیانے قد کا مالک تھا۔

اچانک ہی مجھے سولجر کی بات یاد آ گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ شاہ نور اسٹوڈیوز کے سامنے شیدے پہلوان کو اغوا کر کے لے جانے والے دو آدمی تھے۔ ان میں ایک کا حلیہ تو ٹکیل سے ملتا جلتا تھا اور دوسرے کے بارے میں کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے وہ بھی ہو جو اس وقت اندھیرے میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ کیا ان دو کے علاوہ اور کوئی بھی یہاں ہو سکتا ہے؟

میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ آدمی محتاط انداز میں چلتا ہوا کھڑکی کے سامنے والے حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں بے حس و حرکت ہو گیا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا جسے میں نے دستے کی طرف سے پکڑ لیا۔

وہ شخص بہت محتاط انداز میں چل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول بھی تھا۔ وہ جیسے ہی میرے سامنے سے گزرا، میں بڑی بھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس پر حملہ آور ہوا۔

میرے اٹھنے سے شاخوں میں سرسراہٹ کی آواز ابھری تو وہ شخص بھی تیزی سے پیچھے گھوم

بت لبا چڑا حساب کرتا ہے۔ آگے بڑھو۔“

ہم اس راہداری سے نکل کر ہال کمرے میں آگئے تھے۔ بہت بڑا ہال تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچا ہوا تھا اور شاندار فرنیچر آراستہ تھا۔ دھینگا مشتی کی آوازیں سامنے کی راہداری کے ایک کمرے آ رہی تھیں۔ میں تاجی کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔

ٹھیک اسی وقت اس کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک دوسرے سے کھٹم گتھا دو آدمی راہداری میں آگئے۔ راہداری میں تو کوئی جی نہیں جل رہی تھی لیکن کمرے کی روشنی باہر آ رہی تھی اور میں نے اس روشنی میں ان دونوں کو پہچان لیا تھا۔

ان میں ایک سولجر تھا اور دوسرا ٹکیل۔ سولجر کی پوزیشن کمزور تھی۔ ٹکیل نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلہ دبوچ رکھا تھا اور سولجر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران ایک اور آدمی کمرے سے نکل آیا اور اس نے سولجر پر گھونسوں کی بارش کر دی۔

میں نے تاجی کو زوردار دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی راہداری میں گری۔

”اسے چھوڑ دو اور تم دونوں ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اچھل پڑے۔ دوسرا آدمی جیدی تھا۔ اسے بھی میں نے پہچان لیا تھا۔ وہ ایک رتبہ پہلے بھی ہمارے ہاتھ سے پٹ چکا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لے۔ ٹکیل نے بھی پہلے زمین پر گری ہوئی تاجی کی طرف دیکھا اور پھر سولجر کو چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔ میری شکل دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا تھا۔

”تم تو تمہاری تلاش میں پورے شہر کی خاک چھان رہے تھے۔ اچھا ہوا تم خود ہی یہاں آ گئے۔ اب تم اپنے پیروں پر نہیں، چار پائی پر ہی یہاں سے واپس جاؤ گے۔“

”چار پائی پر کسے یہاں سے لے جایا جاتا ہے یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے یہ بتاؤ شیدا پہلوان کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔

”کون شیدا پہلوان؟“ ٹکیل نے کہا۔ ”ہم کسی شیدا پہلوان کو نہیں جانتے۔“

”وہ ہمیں ہے روٹی باؤ!“ سولجر ایک ہاتھ سے گلا سہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس کوٹھی کے نیچے نہ خانہ ہے اور راستہ اس کمرے میں ہے۔ میں نے اسے تہہ خانے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”کو اس کرتا ہے یہ..... ہم کسی شیدے پہلوان کو نہیں جانتے۔“ ٹکیل بولا۔

”حالانکہ آج شام تم نے اسی کی موجودگی میں اسے اغوا کیا تھا۔“ میں نے کہا اور ایک قدم بڑھ گیا۔

”اب تم اپنے پیروں پر چل کر واپس نہیں جاسکو گے۔“ تاجی نے جواب دیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میری بات کا جواب دو۔“ میں نے غراتے ہوئے پستول کی نال سے اس کے سینے پر دباؤ ڈالا۔

تاجی کراہ کر پیچھے ہٹی۔

”دو..... دو آدمی ہیں۔“ وہ بولی۔ ”ٹکیل اور جیدی۔“

”چلو..... اندر چلو..... اگر تم نے چیخ کر یا کسی اور ذریعے سے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کرنے کی کوشش کی تو.....“ میں نے اس کے سینے پر پستول کا دباؤ بڑھا دیا۔

”چیخ..... چل رہی ہوں..... اس کو پیچھے ہٹاؤ۔“ وہ ایک بار پھر کراہ اٹھی۔

میں نے پستول اس کے سینے سے ہٹا لیا اور اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی میں نے اسے پستول کی زد پر لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر کے تالے کی تاب اوپر اٹھا دی۔ اب باہر سے ریاض کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔ ویسے بھی مجھے یقین تھا کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد اندر آنے کی کوشش کرنے کی بجائے سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔

”کہاں ہیں وہ دونوں..... خاموشی سے آگے بڑھو۔“ میں نے اس کی پشت پر پستول رکھ کر ہلکا سا دھکا دیا۔

اور پھر ٹھیک اسی وقت کوٹھی کے کسی اندرونی حصے سے دھینگا مشتی کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ سولجر بھی کسی طرح اندر آنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور ان میں سے کسی کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

”آگے بڑھو..... جلدی۔“ میں نے غراتے ہوئے تاجی کو زوردار دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا گئی اور پھر سنبھل کر آگے بڑھنے لگی۔

”تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاسکو گے روٹی!“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں تمہیں ایک منٹ دے رہی ہوں۔ ہمارے ساتھ سمجھوتہ کر لو۔ تم نے دھکے کی کوٹھی سے جو مال چرایا ہے اس میں سے آدھا حصہ مجھے دے دو۔ میں سب کچھ بھول جاؤں گی اور تمہارا خیال بھی ذہن میں نہیں لاؤں گی۔“

”لیکن میں تمہیں نہیں بھول سکوں گا تاجی!“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر میں تمہیں ہاتھ تائی ہوئی دولت میں جسے دار بنالوں تو مجھ سے بڑا بیوقوف اور کوئی نہیں ہوگا۔ تم سے تو ابھی میں نے

اس دوران سو لجر نے موقع پا کر جیدی کو بھی ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی تھی۔ وہ ٹھوکر جیدی کی ہڈی کی ہڈی پر لگی۔ وہ بلبلاتا تھا۔

جیدی سے تو مجھے وقتی طور پر نجات مل گئی تھی مگر تاجی مجھ سے اس طرح لپٹ گئی تھی کہ میں ہاتھ بھر چلانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے دھکا دے کر مجھے نیچے گرا دیا۔ اس دوران جیدی میری طرف بڑھا تو میں نے لات چلا دی۔ ٹھوکر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں لگی۔ وہ ایک بار پھر بلبلاتا ہوا دوہرا ہو گیا۔

تاجی اب بھی مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی تو اس کی قمیض میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے سر کو جھٹکا دے کر چہرہ بچایا تو اس کے ناخن میرا زخروہ اڑنے لگے۔ میں نے اپنے اوپر لدی ہوئی تاجی کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس کی قمیض نیچے تک چلتی چلی گئی۔ اگر کوئی شریف عورت ہوتی تو اس طرح برہنہ ہو جانے پر وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتی۔ مگر اس میں شرافت نام کی تو کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ اگر اس میں شرافت کا مادہ ہوتا تو یہ مارے دھندے نہ کرتی۔

وہ میرے گلے پر اپنے نیچے جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ایک ٹانگ سمیٹ کر پیر اس سے بچا۔ رکھا اور اسے اوپر اٹھاتے ہوئے ایک طرف الٹ دیا۔ اس وقت جیدی بھی سنبھل کر آگے بڑھ رہا تھا۔ تاجی اس سے ٹکرا گئی اور وہ دونوں دوسری طرف ڈھیر ہو گئے۔ سو لجر ایک بار پھر ٹکلیل کے قابو میں آ گیا تھا۔ میں نے پھرتی سے اٹھ کر ٹکلیل پر ٹھوکریں برسائیں۔

اس دوران تاجی اور جیدی سنبھل گئے تھے۔ جیدی نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر یا سو لجر پر حملہ کرے گا۔ لیکن اس نے ہال کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں چوٹے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اب بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”سو لجر..... پکڑو اسے..... جانے نہ پائے۔“ میں چیخا۔

سو لجر نے جیدی کے پیچھے چھلانگ لگانا چاہی تو ٹکلیل نے اس کی ٹانگ میں اڑنکا لگا دیا۔ سو لجر منہ کے بل گرا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے جیدی کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اس وقت کمرے کا قہقہہ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ جیدی باہر نکل رہا تھا۔

ایک لمبے کو میری توجہ ہٹی تھی اور تاجی اور ٹکلیل نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ تاجی میرے بالوں کو پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دے رہی تھی۔ اس کے منہ سے ایسی ایسی گندی کالیاں نکل رہی تھیں کہ مجھے بھی شرم آنے لگی۔ لیکن یہ وقت شرمانے کا نہیں، اپنے آپ کو بچانے

تاجی بھی اس دوران اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”میری پیشکش مان لو روئی!“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”فائدے میں رہو گے۔“

”جھگڑا تو ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”چنگا تو تم لوگوں نے خود ہی لیا تھا۔ میں وہ مار نہیں بھولا ہوں۔ اور پھر یہ کیسے بھول جاؤں کہ تم نے ایک غیر ملکی سفارت کار مارا۔ دھکے کو قتل کیا تھا اور کل رات ہی مجھے بھی ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ الگ بات ہے کہ تمہارے ہی آدمیوں کو لینے کے دینے پڑ گئے اور کار الٹ جانے سے تمہارا ہی ایک آدمی جہنم رسید ہو گیا۔ اور پھر تم نے ایک ایسے آدمی کو اٹھالیا جس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بتاؤ شیدا کہاں ہے؟“

”شیدا پہلو ان.....“ تاجی نے کہا اور پھر اچانک ہی وہ اپنی جگہ سے اچھل کر قریب کھڑے ہوئے سو لجر سے ٹکرا گئی۔

لڑائی بھڑائی میں ایسے موقع سے فائدہ نہ اٹھانا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہوتی ہے۔ ٹکلیل وغیرہ نے بھی اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

ٹکلیل نے سو لجر کو دبوچ لیا جبکہ جیدی نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ پہلے تو وہ مجھے رگیدتا رہا، پھر اٹھ کر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا رہا۔

پستول میرے ہاتھ میں تھا لیکن میں اسے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پستول پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا اور جیدی نے جیسے ہی ایک اور ٹھوکر مارنے کی کوشش کی، میں نے اس کا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ ایک ٹانگ پر نالچ کر رہ گیا۔ میں نے اس کے پیر کو ایک اور جھٹکا دیا تو وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔

میں تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمبے کو سو لجر کی طرف دیکھا۔ اب وہ ٹکلیل پر حاوی ہو رہا تھا۔ میں جیدی کی طرف متوجہ ہو گیا اور ایک زوردار ٹھوکر اس کی کھوپڑی پر رسید کر دی۔ وہ بلبلاتا تھا۔ میں نے دوسری ٹھوکر مارنا چاہی تو اس نے بھی وہی حربہ استعمال کیا اور میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تاجی نے میرے بال پکڑ لئے اور اس زوردار جھٹکا دیا کہ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔

تاجی کو موقع مل گیا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے میرے بال نوچ رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے میرے سینے پر گھونے برسا رہی تھی۔ جیدی بھی اٹھ گیا اور مجھ پر ٹھوکریں برسانے لگا۔ وہ دونوں میری پٹائی کر رہے تھے۔ میرا دواؤ نہیں چل رہا تھا اور میں بری طرح پٹ رہا تھا۔

اسے جھلکے سے کھینچ لیا۔ میں نے کچھ زیادہ ہی زور کا جھٹکا لگا دیا تھا۔ تاجی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے نجمہ کو چھوڑ دیا اور میری گرفت سے اپنے بال چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

نجمہ دیوار کے ساتھ گھسکتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے تھے اور گہرے سانس لے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اسے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ تاجی پلٹ کر ایک بار پھر مجھ سے پلٹ گئی۔ اور پھر اس نے میرے ایک بازو پر دانت گاڑ دیئے۔ میں بلبلاتا اٹھا۔ اس کے دانت میرے گوشت میں پیوست ہو چکے تھے اور غالباً وہ بازو کو پاؤں والا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے بال چھوڑ دیئے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ پر ٹکڑے مارنے لگا۔ لیکن میرے بازو پر اس کے دانتوں کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی۔

نجمہ نے بھی یہ صورت حال دیکھ لی۔ اس نے اٹھ کر دو تین قدم دور پڑا ہوا پستول اٹھا لیا اور اسے بال کی طرف سے پکڑ کر دتے سے تاجی کی کھوپڑی پر زوردار ضرب لگائی۔ تاجی میرے بازو کو اور بھی زور سے بھنبھونڈنے لگی۔ نجمہ نے ایک اور ضرب لگائی۔ اور اس مرتبہ یہ ضرب کارگر ثابت ہوئی۔ تاجی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ اس کے منہ میں خون بھرا ہوا تھا۔

میں نے اپنے بازو کی طرف دیکھا اور کانپ اٹھا۔ اس نے بوٹی اوجھڑا لی تھی۔ دانت گوشت میں بہت اندر تک گڑے تھے اور بازو سے خون بہنے لگا تھا۔

نجمہ نے تاجی کے سر پر پستول کے دتے سے اگرچہ بھرپور ضربیں لگائی تھیں مگر وہ ابھی تک وہاں میں تھی اور ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہونے کے لئے پرتول رہی تھی۔

ایسی خوفناک عورت میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اتنی پٹائی اگر کسی آدمی کی ہوتی تو وہ بھی بے ہوش ہو چکا ہوتا۔ اس کے دو ساتھی تو پٹائی برداشت نہ کر سکے تھے اور بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن تاجی میری سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔

اس نے ایک بار پھر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ میں نے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے اس کے پیٹ میں زوردار گھونسنہ رسید کر دیا۔ وہ کراہتی ہوئی دوہری ہو گئی۔ لیکن میرا ہاتھ نہیں رکا۔ میں اس پر گونسنے پر سنا ہوا تھا۔ مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہیں آ رہا تھا۔

اس دوران باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ نجمہ پستول تان کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی جھجک بھی اب دور ہو گئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی خطرہ ہوا تو وہ بے دریغ گولی چلا دے گی۔

دھولچرخ جودوڑتا ہوا پہلو والے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا۔
”روٹی باؤ..... جلدی کرو۔ نکلو یہاں سے۔“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ”وہ دونوں بھاگ گئے۔“

کا تھا۔ تاجی نے میرے بال جکڑ رکھے تھے اور ٹکیل میرے جسم پر ٹھوکریں برسا رہا تھا۔ اور پھر دفعۃً ایک آواز سن کر میں بھی چونک گیا۔

”چھوڑ دو اسے تاجی! ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گی۔“

وہ نجمہ کی آواز تھی۔ تاجی اور ٹکیل کی توجہ ایک لمحہ کو ہٹتی تھی۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تاجی کی بغل میں زوردار گھونسنہ رسید کر دیا۔ وہ چیخ اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے بال اس کی مٹھی سے چھوٹ گئے۔ میں نے سنبھل کر دوسرا گھونسنہ ٹکیل کو جڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔

میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوگا۔ لیکن اس نے نجمہ پر چھلانگ لگا دی۔ نجمہ غافل نہیں تھی۔ اس نے پستول کا ٹرائیگر دبا دیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی ٹکیل کی چیخ بھی گونجی تھی۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی۔ وہ پہلے نیچے جھکا پھر اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا مگر تاجی نے چھلانگ لگا کر میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں منہ کے بل گرا اور اپنی ٹانگ چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن تاجی چونک کی طرح مجھ سے چٹ گئی تھی۔

نجمہ نے پستول کے دتے سے تاجی کے سر پر ضرب لگانے کی کوشش کی مگر ضرب اس کے کندھے پر لگی۔ تاجی مجھے چھوڑ کر نجمہ سے پلٹ گئی۔ اس مرتبہ نجمہ دھوکے میں مار کھا گئی۔ تاجی اسے رگیدتی ہوئی دور لے گئی۔

نجمہ دیوار سے ٹکرائی۔ تاجی نے اس کے سینے پر سر سے ٹکڑی ماری۔ نجمہ چیخ اٹھی۔ ٹکڑی زوردار لگی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا اور وہ چیختی ہوئی اپنے آپ کو تاجی کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

میں ٹکیل کا پیچھا کرنا چاہتا تھا مگر پھر یہ ارادہ ترک کر کے تاجی کی طرف لپکا۔ تاجی ہٹتی کئی عورت تھی۔ اس نے مجھے لوہے کے چنے چوا دیئے تھے۔ نجمہ تو اس کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی۔ وہ دھان پانی لڑکی لڑنا کیا جانتی تھی۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ وہ کوئی کے اندر کیسے آگئی تھی اور اس نے ٹکیل پر گولی کیسے چلا دی تھی۔

تاجی نے اس کے سینے پر سر کی ایک اور ٹکڑی ماری۔ نجمہ پھر چیخ اٹھی۔ تاجی کے حلق سے خوفناک بلی جیسی غرائشیں اور گندی گالیاں نکل رہی تھیں۔

”نکبیری..... تمہیں تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی گشتی۔“ اس کے منہ سے گالیوں کا سڑا مل رہا تھا۔ ”تمہاری تو میں ناگس چیر کر پھینک دوں گی۔ تمہاری وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔“
آج تم میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکو گی۔“

اس نے سر کی ایک اور ٹکڑی مارنا چاہی مگر میں نے بروقت پیچھے سے اس کے بال پکڑ لئے اور

سولجر، شید اپہلوان کے ساتھ کمرے میں برآمد ہوا تو میں شیدے کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ اسے بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کا چہرہ زخمی اور سوجا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں اسے پہچان لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

”کمرے کے ہاتھ روم میں تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔“ سولجر نے کہا۔ ”اس کے ہاتھ دبندھے ہوئے تھے۔ میں رسیاں کھول کر بڑی مشکل سے اسے سہارا دے کر لایا ہوں۔“

”چلو اٹھو!“ میں نے پستول سے تاجی کو اشارہ کیا۔ ”اس کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل کر اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں بلا جھجک گولی مار دوں گا۔“

تاجی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اگر چاہتی تو قمیض کے دونوں کناروں کو پکڑ کر اپنی برہنگی چھپا سکتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔

سولجر، شیدے پہلوان کو سہارا دے کر چلا تا ہوا باہر لے گیا۔ ہم پہلو والے اس دروازے سے باہر نکلے تھے جہاں سے میں اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے پستول کی تالی تاجی کی پشت سے لگا رکھی تھی تاکہ وہ کوئی گڑبڑ نہ کر سکے۔ اسے آگے دھکیلتے ہوئے میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ جس آدمی کو سب سے پہلے میں نے بے ہوش کر کے یہاں ڈالا تھا، وہ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا تھا کہ وہ ہوش میں آتے ہی بھاگ جائے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ سولجر نے باہر والے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول دیا اور باہر کی طرف جھک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر باہر نکل کر اس نے شید اپہلوان کو بھی بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ شید اپہلوان لڑکھڑا رہا تھا۔

سولجر نے جھک کر اسے کندھے پر لا دیا اور تیزی سے اس طرف چلنے لگا جہاں موٹر پر ہماری گاڑی کھڑی تھی۔

نجمہ ہم سے پہلے گیٹ سے نکلی۔ اور پھر میں بھی تاجی کو دھکیلتا ہوا باہر آ گیا۔ موٹر کی طرف چلے ہوئے میں نے ساتھ والی کوٹھی کی طرف دیکھا۔ اس کوٹھی کا ذیلی دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور ایک آدمی آڑ میں کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہم جیسے ہی گیٹ کے سامنے پہنچے، اس نے ہڑے دروازہ بند کر دیا۔ سامنے والی کوٹھی کے برآمدے میں بھی دو آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ہر خیال ہے بعض دوسری کوٹھیوں کے کین بھی جاگ گئے تھے اور چھپ کر باہر دیکھ رہے تھے۔ میں کی میں باہر آنے کی ہمت نہیں تھی۔

میرے کہنے پر سولجر نے شیدے پہلوان کو آگے بٹھا دیا۔ وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے پچھلی سیٹ پر آنے کو کہا اور نجمہ کو اسٹرنگ سنبھالنے کا اشارہ کیا۔ نجمہ

مجھے شبہ ہے کہ وہ کہیں سے پولیس کو فون کر دیں گے۔ اور ویسے بھی یہاں گولی چلنے اور چیخ کی آوازیں سن کر قریبی کوٹھیوں کے لوگ جاگ گئے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے پولیس کو فون کر دیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔“

”تم اندر جا کر شیدے پہلوان کو تلاش کرو۔ وہ اس کمرے میں ہو گا۔“ میں نے کہا اور جیب سے ریوا اور نکال کر تاجی کے سینے پر رکھ دیا۔ ”اب اگر تم نے بہادری دکھانے کی کوشش کی تو اس پستول کی ساری گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔“ میں غرایا۔ ”اپنی زندگی کے لمحات کم مت کرو۔ ہم میں سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اب اگر کوئی سمجھوتہ ہوا تو میری شرائط پر ہو گا۔“

جواب میں پہلے تو تاجی نے ایک خوفناک قسم کی گالی دی اور پھر بلی کی طرح غراتے ہوئے بولی۔ ”یہ مت سمجھنا کہ میں نے شکست تسلیم کر لی ہے۔ تم تاجی کو ابھی تک نہیں جان سکے۔ میں تو تمہاری بوٹیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گی۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ لیکن فی الحال کوئی اور حماقت مت کرنا۔ اب میں کوئی بد تیزی برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

نجمہ نے بھی تاجی پر پستول تان رکھا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی بتا رہے تھے کہ اب کسی گڑبڑ کی صورت میں وہ بلا جھجک گولی چلا دے گی۔

”ذرا اس کو تو دیکھو۔ چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں۔“ تاجی نے نجمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہلکا سا ہتھکڑ لگایا۔ ”اس کا تو میں وہ حشر کروں گی کہ یاد کرے گی۔“

”اب تم دوسروں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔ صرف اپنے انجام کی فکر کرو۔“ نجمہ نے جواب دیا۔

”میرا انجام۔“ تاجی نے ایک بار پھر ہلکا سا ہتھکڑ لگایا۔ ”میرے ساتھ پنگا لینے والا کوئی شخص آج تک زندہ نہیں رہ سکا۔ تم دونوں کو جہنم میں پہنچانے بغیر میں اس دنیا سے نہیں جاؤں گی۔“

مجھے تاجی کے اس اطمینان پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ واقعی بڑی عجیب فطرت کی عورت تھی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اس میں دم ختم باقی تھا۔ وہ موت کے منہ میں تھی۔ میری انگلی کی معمولی سی حرکت اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میں اس کے ایک ایسے راز سے بھی واقف ہوں جس کا انکشاف اسے پھانسی کے تختے پر بٹھا دے گا۔ لیکن وہ خوفزدہ ہونے کی بجائے مجھے خوفناک انجام کی دھمکیاں دے رہی تھی۔

دھمکا مشتی اور اٹھا شیخ میں اس کی قمیض بالکل پھٹ چکی تھی اور سینہ برہنہ ہو رہا تھا۔ لیکن شاید اسے برہنگی کی پروا نہیں تھی۔ میں نے پستول اس کے سینے سے ہٹا لیا۔

ہاجی نے اس طرح سر ہلادیا جیسے میری بات سمجھ گئی ہو۔ میں سیٹ سے اٹھ کر فٹ میٹ پر میناٹک کر اس طرح بیٹھ گیا کہ میرا رخ پیچھے کی طرف ہو گیا۔ میں نے پستول والا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال لیا اور پھر خود بھی کسی قدر باہر جھکتے ہوئے یکے بعد دیگرے ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ وہ پانچویں گولی تھی جو پولیس وین کے اگلے ایک پہنچے پر لگی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور وین لڑکھڑائی۔

ٹھیک اسی وقت نجمہ نے کار ایک اور گلی میں موڑ لی تھی۔ اس نے رفتار کم کئے بغیر اس خطرناک طریقے سے موڑ کاٹا تھا کہ کار کے ایک طرف کے دونوں پہنچے اوپر اٹھ گئے تھے اور اس کے الٹ جانے میں بہت معمولی سی کسر رہ گئی تھی۔ لیکن نجمہ نے بڑی مہارت سے کار سنبھال لی تھی۔

دو تین اور گلیوں میں گھومنے کے بعد کار گلبرگ نہر پر آگئی اور کینال بینک روڈ پارک کے شاہ جمال روڈ پر آگئی اور شاہ جمال کے مزار کے قریب سے ہوتی ہوئی شادمان مین روڈ پر نکل آئی اور دو تین گلیاں گھومنے کے بعد پارک کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی اپنی کونٹھی والی گلی میں داخل ہو گئی اور جب کار کونٹھی کے گیٹ کے سامنے رکی تو نجمہ کے منہ سے اس قدر گہرا سانس نکلا جیسے کسی بڑے غبارے کی ہوائ نکل گئی ہو۔

اس وقت تین بجنے والے تھے۔ گلی میں سناٹا تھا۔ سولجر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کال تیل کا بن دباے گا لیکن اسے گیٹ کی دیوار پر چڑھتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ بندر کی سی پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا اور پھر تقریباً تیس سیکنڈ بعد اس نے گیٹ پوری طرح کھول دیا۔

انجمن اشارت ہی تھا۔ نجمہ نے گاڑی آگے بڑھادی اور پورچ میں جا کر روک لی اور انجمن بند کر دیا۔ سولجر بھی گیٹ بند کر کے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ برآمدے میں مدھم دھم کی کابلب جل رہا تھا۔

میں بھی کار سے اتر آیا تھا اور برآمدے کی طرف دیکھنے لگا۔ سولجر نے دستک دینے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ وہ شبو تھی۔ سولجر واپس آ گیا۔ اس نے تاجی کو کھینچ کر کار سے اتر لیا اور اسے پستول دکھاتے ہوئے بولا۔

”اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔“ نجمہ بھی کار سے اتر آئی تھی۔ سولجر تو تاجی کو پستول کی زد پر لے کر برآمدے کی طرف چلا گیا اور میں اگلا دروازہ کھول کر

نے پستول سولجر کے حوالے کر دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجمن اشارت کر دیا۔ میں نے پچھلا دروازہ کھول کر تاجی کو سیٹ پر دھکیلا اور خود بھی اندر گھس گیا۔ دوسری طرف سے سولجر، تاجی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

میں نے نجمہ کو پیچھے اس لئے نہیں بٹھایا تھا کہ شاید اس پر تاجی کا کوئی داؤ چل جاتا۔ نجمہ انجمن اشارت کر چکی تھی۔ ٹھیک اسی وقت گلی کے دوسری طرف سے ایک گاڑی گلی میں داخل ہوئی۔ وہ پولیس کی گاڑی تھی۔

”نجمہ! ہری اپ.....“ میں چنچا۔

اور پھر دوسرے ہی لمحہ کار ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ میں نے مڑ کر گلی کی طرف دیکھا، پولیس کی گاڑی گلی میں داخل ہونے کے بعد رک رہی تھی۔ لیکن ہماری کار کو روانہ ہونے دیکھ کر اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ نجمہ کار کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔



میں سوچ رہا تھا کہ شاید میں نے نجمہ کو اسٹیرنگ کے سامنے بٹھا کر غلطی کی تھی۔ لیکن نجمہ نے جلد ہی میرا یہ خیال غلط ثابت کر دیا۔ وہ ایک ماہر ڈرائیور ثابت ہوئی تھی۔ کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے اس نے اتنی مہارت سے اسٹیرنگ پر قابو پائے رکھا کہ میں بھی دم بخود رہ گیا۔ کار گلبرگ کی گلیوں میں دوڑتی رہی۔ پولیس کی گاڑی مسلسل ہمارے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ پولیس نے ابھی تک فائرنگ شروع نہیں کی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری طرف سے ایسی کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ اور غالباً پولیس والے ہمیں گھیر کر پکڑنا چاہتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ نجمہ بہترین ڈرائیور ثابت ہوئی تھی۔ اس نے پولیس کی گاڑی کو اگرچہ اپنے سے دور ہی رکھا تھا لیکن وہ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکی تھی۔ جبکہ پولیس سے پیچھا چھڑانا ضروری تھا۔

”دیکھو.....“ میں نے تاجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پولیس کو جتنے مطلوب ہم ہیں، اس سے کہیں زیادہ انہیں مادام دھکے کے قاتلوں کی تلاش ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”اس وقت پولیس سے پیچھا چھڑانا بہت ضروری ہے۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو..... تم میرا مطلب سمجھ گئی ہو۔ اس لئے اپنی جگہ پر آرام سے بیٹھی رہنا۔“

میں نے سولجر کو اشارہ کیا۔ وہ دوڑ کر پانی لے آیا اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی پلانے کے بعد میں نے کپڑے کا ایک گولا اس کے منہ میں ٹھونس دیا اور اوپر سے پٹی باندھ دی تاکہ کپڑے کا گولہ باہر نہ نکل سکے۔

”اب تم آرام سے پڑی رہو۔ صبح ملاقات ہوگی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے سولجر کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے اور میں نے دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا لگا دیا۔

شید ا پہلوان صوفے پر لیٹا ہوا تھا اور نجمہ ایک گیلے کپڑے سے اس کے چہرے پر جما ہوا خون صاف کر رہی تھی۔ میں ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ نجمہ اگرچہ ایک خوفناک تجربے سے گزر کر آئی تھی مگر میرے لئے حیرت کی بات تھی کہ اس نے اپنے حواس بحال رکھے تھے۔

شید ا پہلوان کی حالت دیکھ کر مجھے واقعی افسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بیچارہ مفت میں ہی مارا گیا تھا۔ یہ بھی غیبت تھا کہ پچھلے چند روز کے دوران سولجر نے کچھ ایسی دوائیں جمع کر لی تھیں جو ایسی ہیگانی صورت حال میں کام آ سکتی تھیں۔ کچھ دوائیں تو آج صبح وہ رشتی کے لئے بھی لے کر آیا تھا۔

نجمہ شید ا پہلوان کے چہرے اور گردن پر خون صاف کر رہی تھی اور شید ا بار بار کراہ رہا تھا۔ میں نے نجمہ کو ہٹا دیا اور خود شید ا کے کاچرہ صاف کرنے لگا۔ سولجر اس دوران اپنے کمرے سے وہ پاکس اٹھا لایا جس میں وہ دوائیں رکھی ہوئی تھیں۔

”تم اسپرٹ کی بوتل بھی تو لائے تھے۔ کہاں ہے؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے سولجر کی طرف دیکھا۔

”وہ اندر رکھی ہے۔ ابھی لاتا ہوں۔“ سولجر کہتے ہوئے تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

”اسپرٹ لے کر آیا تو میں کاٹن، اسپرٹ میں بھگو کر زخم صاف کرنے لگا۔ شید ا بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ اس کی پیشانی، گالوں، گردن اور سینے پر جگہ جگہ سے کھال خچی ہوئی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کھال کو کسی دھار دار چٹنی وغیرہ سے نوچا گیا تھا۔ تمام زخم اگرچہ چھوٹے چھوٹے تھے مگر ظاہر ہے ان میں تکلیف تو ہونا ہوگی۔

زخم صاف کر کے میں نے وہ مرہم لگا دیا جو رشتی کے زخم پر لگایا تھا۔ اس کے تھوڑی سی

شید ا پہلوان کو اتارنے لگا۔ اس سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ رشتی بھی ہال کمرے میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ رشتی اور شبو، تاجی کو برہنہ دیکھ کر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔ اور پھر شبو نے اپنی چادر اتار کر تاجی پر ڈال دی۔ تاجی بڑی بے تکلفی سے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے شید ا پہلوان کو کبھی ایک صوفے پر لٹا دیا۔

”میرے یہاں سے جانے کے بعد تم اپنا یہ ٹھکانا بدل لینا۔“ تاجی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں عورت نہیں زہریلی ناگن ہوں اور تم جانتے ہو کہ ناگن جب زخمی ہوتی ہے تو پہلے سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے اور اپنے دشمن کو کبھی نہیں بھولتی۔“

”میں بھی اپنے دشمن کو کبھی نہیں بھولتا۔“ میں نے کہا اور پھر سولجر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اسے خالی کمرے میں پہنچا دو۔ رات آرام کر لے تو صبح اس سے بات کریں گے۔“

”چل مائی! تمہیں تمہارے بیڈروم میں پہنچا دوں۔“ سولجر نے تاجی کے کندھے پر ہاتھ پڑھ کر اسے کچھ کا لگاتے ہوئے کہا۔

”تمیز سے بات کرو مجھ سے۔“ تاجی غراتے ہوئے اٹھ گئی۔

میں بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔ تیسرے بیڈروم میں ایک چار پائی پڑی ہوئی تھی جس پر بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ میں نے بستر کی چادر اٹھا کر اسے پیٹوں کی صورت میں پھاڑ لیا اور ہم دونوں مل کر اس کے ہاتھ پیر باندھنے لگے۔

”پلیز! مجھے مت باندھو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ رات یہاں پر آرام سے پڑی رہوں گی۔ کوئی گڑبڑ نہیں کروں گی۔“ تاجی گھکھکیائی۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر خوف کے ہلکے سے سائے نمودار ہوتے دیکھے تھے۔ بالآخر اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔

صورت حال ہی ایسی تھی۔ بڑے سے بڑے جگر والا بھی ہمت ہار جاتا۔ وہ تو عورت تھی۔ بلاشبہ وہ آہنی اعصاب کی مالک ثابت ہوئی تھی لیکن بالآخر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

”شاید تم بھول گئی ہو کہ ایک مرتبہ تم نے بھی مجھے اسی طرح ہاتھ پیر باندھ کر ڈالا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے تو بڑی بے دردی سے گرد آلود ننگے فرش پر پھینک دیا تھا۔ اور تمہیں تو یہاں

آرام دہ بستر دیا جا رہا ہے۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اور پھر اس کی مزاحمت کے باوجود میں نے اور سولجر نے اس کے پیر رتی میں جکڑ دیئے اور

ہاتھ دوسری پٹی سے پشت پر باندھ دیئے۔

”م..... مجھے پانی پلا دو..... پلیز!“ وہ پتلی لہجے میں بولی۔ اس پر واقعی خوف طاری ہوا تھا۔

نجمہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”اور یہ رنجی ہے۔“ میں نے شیدے کی توجہ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”اس سے تو کل تمہاری ملاقات ہو گئی تھی۔“

”ہاں۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ مگر اس کے بازو پر پٹی کیوں بندھی ہوئی ہے؟“

شیدے نے کہا۔

”کل رات جب ہم تم سے اپنی گاڑی لے کر واپس آرہے تھے تو ٹھیکل اور اس کے ایک رانچی فینے نے ہمارا پیچھا شروع کر دیا تھا۔“ میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے کل رات والے واقعہ کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا۔ ”اور پھر آج مجھے خیال آیا کہ ٹھیکل نے ہمارا تعاقب اسٹوڈیو کے سامنے سے شروع کیا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ تم بھی ان کی نظروں میں آ چکے ہو۔ میں نے سولجر کو معلوم کرنے کے لئے بھیجا تو یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ انہوں نے تمہیں بھی اغوا کر لیا ہے۔ سولجر نے جس آدمی کا حلیہ بتایا تھا، وہ ٹھیکل سے ملتا جلتا تھا۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں تاجی کے کسی ٹھکانے کا علم نہیں تھا۔ لیکن ہم نے اس کے ایک پرانے گاہک کو پکڑ لیا۔ اس سے ہمیں پتہ چل گیا کہ تاجی سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔ اس طرح ہم اس کو بھی تک پہنچ گئے۔ ٹھیکل اور اس کے دو ساتھی تو راکھا کر بھاگ گئے اور تاجی.....“

”تاجی کا کیا ہوا؟“ شیدا پہلوان جلدی سے بولا۔ ”کیا وہ بھی بھاگ گئی؟“

”نہیں.....“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ ہمارے قبضے میں ہے۔“

”اوہ! کہاں ہے وہ؟“ شیدا اُچھل پڑا۔

”یہیں..... اسی کوٹھی میں۔ لیکن اس سے تمہاری ملاقات صبح ہوگی۔ اب تم آرام کرو۔ رات تم ہونے والی ہے۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔“ میں نے کہا اور پھر سولجر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سولجر! اسے اپنے کمرے میں چار پائی پر لٹا دو۔“

سولجر نے سہارا دے کر شیدا پہلوان کو اٹھالیا اور اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

”اب تم لوگ بھی سو جاؤ بھئی۔“ میں نے باری باری تینوں لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نجمہ اور رنجی! تم دونوں میرے کمرے میں بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ اور شبو! تم بھی اپنی چار پائی پر لٹ کرے میں ڈال لو۔ میں اور سولجر یہیں سو جائیں گے۔“

سولجر نے شیدے پہلوان والے کمرے سے دوسری چار پائی نکال کر میرے بیڈ روم میں ڈال دی۔ تینوں لڑکیاں اس کمرے میں چلی گئیں۔ میں اور سولجر ہال کمرے میں صوفوں پر لیٹ

بعد شیدا پہلوان بتدریج پُر سکون ہوتا چلا گیا۔

”رونی باؤ!“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے ایک بار پھر میری زندگی بچائی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ ایک مہربانی اور کرو۔ میرے گھر پر ٹیلی فون کر دو۔ وہ لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”شیدے پہلوان!“ میں نے کہا۔ ”دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔ میں نے تمہیں بچا کر کوئی احسان نہیں کیا۔ بلکہ مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ میری وجہ سے تم اس لپیٹ میں آ گئے۔ حالانکہ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”اب تو تعلق ہو گیا ہے رونی باؤ!“ شیدے نے کہا۔ ”اس کنجری کو تو اب میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اور اس کا وہ یار ٹھیکل..... اس کے تو میں اتنے ٹکڑے کروں گا کہ کتنی مشکل ہو جائے گی۔ مجھے ٹھیک ہو جانے دو۔ ایک دن میں ہی انہیں تلاش کر لوں گا۔“

شیدے پہلوان کو شاید پتہ نہیں تھا کہ تاجی اس وقت ہمارے قبضے میں تھی۔ اسے جب ہم تاجی کی کوٹھی سے نکال کر لائے تھے تو وہ حواس میں نہیں تھا اور اسے پتہ نہیں چل سکا تھا کہ ہم تاجی کو کبھی ساتھ لے کر آئے تھے اور وہ ایک کمرے میں بندھی پڑی ہے۔

”اپنے گھر کا نمبر بتاؤ۔ میں فون کر کے صادق کو بتا دیتا ہوں کہ تم خیریت سے ہو۔ وہ لوگ پریشان نہ ہوں۔“ میں نے کہا۔

شیدے پہلوان نے نمبر بتایا اور میں اٹھ کر دوسرے صوفے پر آ گیا جہاں قریب ہی ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ میں ریسور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ کال شیدے کے بڑے بھائی صادق ہی نے ریسپونڈ کی تھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ شیدا میرے پاس ہے۔ وہ لوگ پریشان نہ ہوں۔

میں دوبارہ شیدے کے پاس آ گیا۔ وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اس کی خوب دھنکی کی گئی تھی۔ اور وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کے منہ سے کراہ بھی خارج ہو جاتی۔

شیدا پہلوان باری باری تینوں لڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کل رنجی تو میرے ساتھ تھی اور شیدے سے اس کی ملاقات ہو چکی تھی۔ نجمہ اور شبو اس کے لئے اجنبی تھیں۔ میں نے اس کی آنکھیں دور کرنے کے لئے ان کا تعارف کر دینا ضروری سمجھا۔

”یہ شبو ہے۔ سولجر کی بیٹی۔ اور یہ نجمہ ہے۔ وہ لڑکی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے تاجی کی کوٹھی سے اُڑا لیا ہوں۔“

”اوہ.....“ شیدے کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”بہت حسین۔ اسی لئے تاجی پاگل ہوئی جا رہی ہے۔ ایسی حسین لڑکیاں تو تاجی جیسی عورتوں کے لئے سونے کی چڑیاں ہوتی ہیں۔“

کھول دو۔ میں..... میں مر جاؤں گی۔“

”تم اس طرح آسانی سے نہیں مرو گی۔“ میں نے کہا۔ ”تم عورت ہو۔ مجھے تم پر ہاتھ اٹھانے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ مگر تم تو عورت کے نام پر دھبہ ہو۔ تم میں تو عورتوں والی کوئی بات ہی نہیں۔ نہ فطری شرم دھیا اور نہ کوئی اور بات..... تم حیوان ہو حیوان۔“

”م..... مجھے پانی پلاؤ۔ خدا کے لئے مجھے پانی دو۔“ وہ کراہ رہی تھی۔ میں نے نجمہ کو آواز دے کر پانی لانے کو کہا۔ وہ پورا جگ اٹھالائی تھی۔ تاجی کی صورت حال دیکھ کر وہ بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ اس نے تاجی کو سہارا دے کر اٹھایا اور جگ اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ کچھ پانی ٹھوڑی پر بہتا ہوا اس کے سینے پر بہنے لگا۔ اور پھر جگ میں جو پانی باقی بچا، وہ نجمہ نے تاجی پر اٹیل دیا۔ تاجی خوشخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”مجھے امید نہیں تھی کہ تم میرے ساتھ اس طرح دھوکا کرو گی، ایسا سلوک کرو گی۔“ تاجی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہارے ساتھ کیا کر کیا تھا جو مجھے اس طرح.....“

”میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔“ نجمہ نے اسے زوردار ٹھوکا رسید کر دی۔ ”مجھ سے ثرافت کی زندگی چھین کر گندگی کی دلدل میں دھکیل دیا اور کہتی ہو تم نے میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ تمہارا تو میں وہ حال کروں گی کہ تم زندگی کی بھیک مانگو گی یا موت کی۔ لیکن تم نہ جی سکو گی نہ مر سکو گی۔“ اس نے تاجی کو ایک اور ٹھوکا ماردی اور جھک کر غصے میں اس کے جسم پر سے ہٹی ہوئی قمیض بھی نوج کر پھینک دی۔

فرش کا کچھ حصہ ایک بار پھر گریلا ہو گیا۔ تاجی پر بے پناہ خوف طاری تھا۔ اور یہ اس خوف ہی کا نتیجہ تھا کہ اس کی یہ حالت ہو رہی تھی۔

”م..... مجھے..... ہاتھ روم جانا ہے۔“ وہ میری طرف دیکھ کر ہلکائی۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر کھول دیئے اور شبو کو کمرے میں بلا کر خود باہر نکل گیا۔ شبو ایک سو فیصد گھر بلوڑی تھی۔ نائی کو برہنہ دیکھ کر وہ رات کو بھی شرما گئی تھی اور اس وقت بھی اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد شبو نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

”تاجی کو ناشتہ دو اور نجمہ سے کہو فی الحال اس پر زیادہ سختی نہ کرے۔ ناشتہ کرانے کے بعد اس سے بات کریں گے۔“ میں نے کہا اور شیدے پہلوان والے کمرے میں آ گیا۔

ایک گھنٹے بعد میں ایک بار پھر تاجی والے کمرے میں موجود تھا۔ وہ چار پائی پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ پیر کھلے ہوئے تھے۔ شبو نے اسے اپنی ایک قمیض لا کر پہنا دی تھی۔ اس وقت کمرے میں نجمہ کے علاوہ سو لجر بھی موجود تھے۔

گئے۔

اگرچہ رات کا آخری پہر ختم ہونے والا تھا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور سو لجر کو بھی شاید نیند نہیں آرہی تھی۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میری طرح سو لجر کو بھی نجمہ پر حیرت ہو رہی تھی۔

”میں تو اسے بہت بزدل اور ڈرپوک سمجھتا تھا۔“ سو لجر کہہ رہا تھا۔ ”لیکن آج تو اس نے کمال ہی کر دیا۔“

”ہاں..... نجمہ نے واقعی کمال کر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم تو جیدے کے پیچھے بھاگ گئے تھے اور ٹکلیل اور تاجی نے مجھے دبوچ لیا تھا۔ تاجی کجنت بڑی خوشخوار قسم کی عورت ثابت ہوئی ہے۔ اگر نجمہ بروقت نہ پہنچ جاتی تو وہ دونوں مجھے مار ہی ڈالتے۔“

”نجمہ تو واقعی بڑی دلیر ثابت ہوئی۔“ سو لجر بولا۔ ”وہ جس طرح کارڈرائیو کر کے لائی تھی، میں تو حیران ہی رہ گیا۔ پولیس پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو بدحواس ہو کر گاڑی کہیں مار دیتا۔“

نجمہ پر واقعی مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے واقعی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے بالآخر میری آنکھ لگ گئی۔

میں صبح گیارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھ سکا تھا۔ شبو اور خشی مجھ سے پہلے ہی جاگ چکی تھیں۔ سو لجر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نجمہ اور شیدا پہلوان اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔

بارہ بجے تک سب لوگ جاگ چکے تھے۔ ناشتہ بھی کر لیا گیا۔ میں تاجی والے کمرے میں آ گیا۔ وہ چار پائی سے نیچے فرش پر پہلو کے بل پڑی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اٹھنے کی کوشش میں چار پائی سے گر گئی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر بے پناہ وحشت تھی۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تو ٹھک سا گیا۔ بستر کی چادر گیلی ہو رہی تھی۔ اور تاجی جس جگہ فرش پر پڑی تھی وہاں فرش بھی گریلا ہو رہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”مجھے بھی اسی طرح باندھ کر ڈالا گیا تھا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تمہیں پتہ چل گیا نا کہ اس رات مجھے کتنی اذیت ہوئی ہوگی۔“

تاجی زور زور سے سر جھٹکنے لگی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ کر جھک گیا اور منہ پر بندھی ہوئی پٹی کھول کر کپڑے کا گولہ نکال لیا۔ تاجی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

”خدا کے لئے مجھے کھول دو۔“ وہ کراہی۔ ”مجھے پانی پلاؤ۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔ مجھے

شاہد سمجھتی تھی کہ نجمہ نے سولجر کو کسی خاص مقصد سے باہر بھیجا ہے اور اس کے واپس آنے پر ہی اس پر کسی قسم کا تشدد کیا جائے گا۔

سولجر تقریباً آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شیشے کی ایک بوتل تھی۔ اینو فروٹ سالٹ کی بوتل۔ لیکن اس میں فروٹ سالٹ نہیں، بڑے بڑے سیاہ چیونٹے بھرے ہوئے تھے۔ اس قسم کے مونٹے سیاہ چیونٹے عام طور پر پینٹل یا بامگد کے درختوں پر پائے جاتے ہیں۔ ان کی خونخواری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب یہ کسی انسان کو کاٹنے ہیں تو ان کے نوکیلے دانت انسانی جسم میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں پکڑ کر کھینچا جائے تو یہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان کی گرفت نہیں چھوٹی۔ ان کا سر گوشت ہی سے چپکا رہ جاتا ہے۔ اور اگر سر کو بھی کھینچ کر نکالا جائے تو اس کے ساتھ ہی جسم سے خون کی دھار بھی بہہ نکلتی ہے اور اس کے کانٹے کی اذیت اچھے خاصے آدمی کو بھی چیخنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

”نجمہ باجی..... جلدی میں اتنے سے ہی جمع کر سکا ہوں۔ کہو تو اور لے آؤں؟“ سولجر نے اوبول نجمہ کی طرف بڑھا دی۔

”اتنے ہی کافی ہیں۔“ نجمہ نے وہ بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی۔

میں نے بوتل کی طرف دیکھا۔ اس میں کلبلا تے ہوئے سیاہ گوشت خور چیونٹیوں کی تعداد بچیں تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

”یاد ہے پہلی مرتبہ جب میں نے تمہاری بات ماننے سے انکار کیا تھا تو تم نے اور ٹکیلنے لہو پر کسی قدر تشدد کیا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے تین دن تک بھوکا رکھا گیا تھا۔“ نجمہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کہہ رہی تھی۔ ”لیکن ہم نے تمہیں ناشتہ بھی کروادیا ہے اور تم میں سے کوئی تم پر تشدد نہیں کرے گا۔ کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ لیکن اس بوتل میں بھرے ہوئے چیونٹے تمہیں بولنے پر مجبور کر دیں گے اور تم ہر اس بات کا جواب دو گی جو روئی جانا چاہتا ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی، پھر بولی۔ ”میں تمہیں صرف تین منٹ کا وقت دے رہی ہوں۔ اس کے بعد بھی تم نے زبان نہ کھولی تو میں اپنی کارروائی شروع کر دوں گی۔“

”نہیں نہیں..... میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ تاجی نے کہا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔

”زندہ تو تمہیں ہم بھی نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن یہاں تمہاری موت کا انداز مختلف ہوگا۔“ بحال..... تمہیں دی گئی مہلت میں تمیں سینڈ گزر چکے ہیں۔“ نجمہ نے جواب دیا۔ اور دیوار پر لٹائی گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم نے دیکھ لیا اب میں تمہارا کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔ اور یہ نجمہ بھی تم سے اپنی بربادی کا بدلہ لینے کو بے تاب ہے۔“ میں نے تاجی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے تعلقات بھی اب کام نہیں آئیں گے۔ جو بھی تمہیں بچانے کے لئے آگے آئے گا، مارا جائے گا۔“ میں ایک لمحے کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”اگر تم میری چند باتوں کا جواب دے دو تو تمہارے ساتھ کسی حد تک رعایت ہو سکتی ہے۔ بصورت دیگر.....“ میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ تاجی نے سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”مادام دھکہ ایک نہایت اہم اور خفیہ مشن پر تھی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا تھا۔ ”اس میں تو اب کوئی شبہ نہیں رہا کہ اسے تم نے اور ٹکیلنے نے قتل کیا ہے۔ تمہاری یا ٹکیلنے کی تو اس سے کوئی دشمنی نہیں ہو سکتی۔ میں صرف دو باتیں جانا چاہتا ہوں۔“ میں خاموش ہو کر اس کے چہرے کو تکتا رہا، پھر بولا۔ ”سب سے پہلے تو میں یہ جانا چاہتا ہوں کہ دھکہ کس مشن پر تھی اور تم نے اسے کس کے کہنے پر قتل کیا تھا؟“

”م..... میں نے اسے قتل نہیں کیا۔“ تاجی نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ خوف سے اس کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔

”اگر تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے تو تم بڑی آسانی سے زبان کھول دو گی۔ اور یہ بات ذہن سے نکال دو کہ اب کوئی اعلیٰ آفیسر، سیاستدان یا وزیر تمہاری مدد کو آگے آئے گا۔ معاملہ ایک غیر ملکی سفارت کار کے قتل کا ہے اور کوئی بھی شخص اپنی گردن پھنسانا پسند نہیں کرے گا۔ دیئے زبان تو تمہاری میں بھی کھلوایں لوں گا اور میرا طریقہ کار ذرا مختلف ہوگا۔ اس کا اندازہ تم لگا چکی ہو۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ میری صرف دو باتوں کا جواب دے دو۔ اذیت سے قفا جاؤ گی۔ مادام دھکہ کو کس کے کہنے پر قتل کیا تھا اور اس کا مشن کیا تھا؟“

”نن..... نہیں۔“ تاجی کی سرخ آنکھوں میں دھشت سی بھر گئی۔ ”م..... میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ م..... میں کچھ نہیں جانتی۔“

”تم سب کچھ جانتی ہو۔“ میری بجائے نجمہ بولی۔ ”تم سب کچھ جانتی ہو اور سب کچھ بتاؤ گی۔ میں دیکھتی ہوں کہ تم کتنی دیر تک اپنی زبان بند رکھتی ہو۔“ وہ چند لمحے خاموشی سے تاجی کی طرف دیکھتی رہی اور پھر سولجر کو کمرے کے ایک کونے میں لے جا کر سرگوشیاں کرنے لگی۔ سولجر سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

نجمہ میرے قریب آگئی اور تاجی کے کروتوتوں کے بارے میں بتانے لگی۔ تاجی چار پائی پرچہ لٹکائے بیٹھی باری باری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔

ہائیں جھٹک رہی تھی۔ پھر وہ چارپائی سے لڑھک کر فرش پر گر گئی اور ٹانگیں چلاتے ہوئے ادھر ادھر لوٹنے لگی۔

اور پھر وہ کسی طرح اٹھ کر کھڑی ہونے میں کامیاب ہو گئی اور ٹانگوں کو جھٹکے دیتے ہوئے کمرے میں ادھر ادھر دوڑنے لگی۔

میں نے نجمہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی عجیب سی چمک تھی۔ تاجی کی اس اذیت پر شاید وہ بڑی طمانیت محسوس کر رہی تھی۔ عورت جب اپنی بربادی کا انتقام لینے پر آتی ہے تو وہ واقعی اندھی ہو جاتی ہے۔ اسے یہ احساس بالکل نہیں رہتا کہ اس کے انتقام کا نشانہ بننے والا کتنی اذیت کا شکار ہے۔

نجمہ بھی تاجی کے ہاتھوں برباد ہوئی تھی۔ اس کی روح تک گھائل ہو گئی تھی۔ اور اب تاجی کو زچے دیکھ کر وہ کس قدر سکون محسوس کر رہی تھی اس کا اندازہ اس کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کی چمک سے لگایا جاسکتا تھا۔

”دیکھو دیکھو.....“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ یہ بہت اچھی رقاصہ ہے۔ ناچنے میں تو انجمن بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دیکھ لو..... ایسا ڈانس تم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔“

تاجی واقعی پورے کمرے میں ناچ رہی تھی۔ اور پھر وہ نیچے گر گئی اور ایک بار پھر فرش پر لوٹنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بڑھ گئے تھے۔ خوف کی شدت سے اس کی آنکھیں جیسے باہر کو ابلی پڑ رہی تھیں۔

”کیا خیال ہے تاجی!“ میں نے جھٹک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب بھی کچھ بتانے کو تیار ہو یا نہیں؟“

تاجی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ صرف دو منٹ گزرے تھے اور گوشت خور چیونٹوں نے اس کا جو حشر کیا تھا اس کا میں اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس کی سفید شلوار پر لاتعداد سرخ دھبے نظر آ رہے تھے۔

نجمہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”میں نے کہا تھا نا کہ ہم تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے اور تم فر فر بولنے لگو گی۔“ اس نے تاجی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں باہر جا رہی ہوں۔ تم دونوں اسے اس مصیبت سے نجات دلاؤ..... فارغ ہو جاؤ تو دروازہ کھول دینا۔“

نجمہ کمرے سے چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میں نے اور سو بھر نے ابھی ہوئی

”نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ تاجی نے جواب دیا۔ میں اس کا لہجہ محسوس کر کے چونک گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے تھے۔ لگتا تھا جیسے اس نے اپنے دل و دماغ سے سارا خوف جھٹک دیا ہو۔

”ٹھیک ہے۔“ نجمہ نے جواب دیا اور ایک بار پھر کھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے ہی تین منٹ پورے ہوئے، وہ سو بھر کی طرف گھوم گئی۔

”اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دو اور منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔ تاکہ اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکے۔“

”نہیں..... تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ تاجی چیختی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سو بھر نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ تاجی کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ چارپائی پر گر گئی۔ سو بھر نے سب سے پہلے اس کے ہاتھ پشت پر باندھے اور پھر بڑی پھرتی سے اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا اور اس پر پٹی باندھ دی۔

”اس کے پیر بھی باندھ دوں نجمہ باجی؟“ سو بھر بولا۔

”نہیں۔“ نجمہ نے جواب دیا۔ ”تم لوگ یہ تو جانتے ہو کہ یہ بہت اونچی طوائف ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ بہت اچھی رقاصہ بھی ہے اور بہت اچھا ڈانس کرتی ہے۔ آج میں تمہیں اس کا ڈانس دکھاؤں گی۔ بالکل مفت۔ بغیر ٹکٹ۔“

نجمہ نے چادر سے دو اور پٹیاں پھاڑ لیں اور تاجی کے قریب آ گئی اور سو بھر کو اشارہ کیا۔ سو بھر نے تاجی کا ایک پیر گرفت میں لے لیا۔ نجمہ نے بوتل کا ڈھکنا کھولا اور تاجی کی شلوار کا پاؤنچہ پکڑ کر بوتل میں بھرے ہوئے گوشت خور چیونٹے اس میں اندھیلنے لگی۔ تاجی بری طرح دونوں ٹانگیں چلا رہی تھی مگر سو بھر نے اسے بڑی سختی سے گرفت میں لے رکھا تھا۔

نجمہ نے بوتل کے آدھے چیونٹے شلوار کے پائینچے میں اندھیل دیئے اور پائینچے پر پٹی باندھ دی تاکہ کوئی چیونٹا باہر نہ نکل سکے۔ بوتل میں بچے ہوئے باقی چیونٹے دوسرے پائینچے میں ڈال کر اسے بھی پٹی سے باندھ دیا گیا۔

وہ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ تاجی چارپائی پر پڑی لاتیں چلاتی رہی۔ اور پھر چیونٹوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ تاجی چارپائی پر بری طرح اچھل رہی تھی۔ ٹانگوں کو کبھی بستر پر رگڑنے لگتی اور کبھی زور زور سے جھٹکتی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا۔ آنکھیں بھی خوف سے پھٹا پھٹ رہی تھیں۔ اگر اس کے منہ میں کپڑا نہ ٹھنسا ہوتا تو اس کی چیخیں پورے محلے میں سنی جاتیں۔ گوشت خور چیونٹوں نے ٹانگوں پر اوپر کی طرف سفر شروع کر دیا تھا۔ تاجی اب بری طرح

میں نے پوچھا۔
 ”تقریباً چھ مہینے پہلے ہماری ملاقات ہوٹل فلینیز میں ہوئی تھی۔“ تاجی نے جواب دیا۔ ”اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ وہ دونوں پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے بے تکلف ہو گئے۔ اور پھر ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلی ملاقات کے بعد وہ عورت دوبارہ اس کے ساتھ نظر نہیں آئی۔“

ایک روز رانا مقبول مجھے اپنی کوٹھی میں لے گیا۔ کوٹھی میں ایک ملازمہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس رات رانا مقبول نے مجھے سونے کا ایک قیمتی لاکٹ پیش کیا اور پھر مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گیا۔ روپیہ اور زیور میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ دولت کی یہ ہوس ہی مجھے گندگی کی اس دلدل میں لے آئی تھی اور میری زندگی اس گندگی میں گزر رہی تھی۔ رانا مقبول مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گیا تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور تب یہ انکشاف ہوا کہ وہ مسلمان نہیں، ہندو ہے۔ اور پھر اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس کا نام جسونت سنگھ ہے اور وہ راجستھان کے شہر جے پور کا رہنے والا ہے۔ وہ بہت عرصہ سے کراچی میں تھا۔ چند مہینے پہلے لاہور آیا تھا اور اپنے آپ کو رانا مقبول کے نام سے بزنس میں کے طور پر متعارف کرایا تھا۔“

تاجی چند منٹ کو خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر اب بھی کرب و اذیت کے تاثرات نمایاں تھے اور وہ بار بار ٹانگیں میچ رہی تھی۔

”چند ملاقاتوں کے بعد وہ کچھ اور کھل گیا۔“ تاجی کہہ رہی تھی۔ ”اس رات اس نے مجھے میرے کے بڑاؤ والا ایک بہت خوبصورت اور قیمتی طلائی سیٹ پیش کیا۔ میں سمجھ گئی کہ جنسی ہوس پوری کرنے کے علاوہ مجھ سے کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ اور پھر جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ مادام دھک نامی ایک عورت کو قتل کرنا چاہتا ہے تو میں اچھل پڑی۔ مادام دھک کو میں بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ فائبر اشار ہوٹل میں اکثر اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔“

رانا مقبول نے اس کے قتل کے لئے مجھے دس لاکھ کی پیشکش کی تھی اور میں انکار نہیں کر سکی۔ میں جانتی تھی کہ دھک ایک غیر ملکی سفارت کار ہے۔ اس کے قتل سے ابک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا۔ لیکن مجھے اس کی کیا پروا تھی۔ مجھے دس لاکھ روپے مل رہے تھے۔ میں نے اس کام کی حامی بھر لی اور ٹیکس کو بھی دو لاکھ کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ ٹیکس میرا پرانا خدمت گار ہے۔ وہ میرے حسن و شباب سے بھی فیض یاب ہوتا رہتا ہے۔ میرے خیال میں اس کام کے لئے اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ دو لاکھ کے لالچ میں وہ بھی فوراً راضی ہو گیا۔

میں نے مادام دھک سے دوستی بڑھالی۔ وہ مجھے بہت معزز عورت سمجھتی تھی۔ ایک روز میں

نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سو بجر نے کندھے اچکا دیئے اور فرش پر تڑپتی ہوئی تاجی پر جھک گیا۔
 اور پھر تاجی کو اس اذیت سے نجات دلانے کے لئے میں بھی سو بجر کی مدد کرنے لگا۔



تاجی کی حالت دیکھ کر میں کانپ اٹھا تھا۔ خوفناک سیاہ چیونٹوں کو اس کے گوشت سے نوچنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔ ہم ان گوشت خور چیونٹوں کو نوچ نوچ کر پھینک رہے تھے۔ ایک چیونٹا میرے ہاتھ کی پشت پر چپک گیا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے نوچ کر پھینکا تھا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ خون کی دھار بہہ نکلی۔ میں ایک چیونٹے کے کانٹے سے ہونے والی اپنی تکلیف سے تاجی کی اذیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ اب بھی بری طرح تڑپ رہی تھی۔ تاجی کے کپڑے بھی بدل دیئے گئے اور اسے دوسرے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ چیونٹے پورے کمرے میں پھیل گئے تھے۔ سو بجر نے انہیں جھاڑو سے سمیٹ کر ہاتھ روم کے فلش میں بہا دیا۔

ہم تینوں ایک بار پھر اس کمرے میں موجود تھے جہاں تاجی چار پائی پر بڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ اذیت کے تاثرات تھے اور وہ اب بھی ٹانگیں جھک رہی تھی۔

”اب تم شروع ہو جاؤ۔ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔“ میں نے تاجی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”مادام دھک کو تم لوگوں نے کس کے کہنے پر قتل کیا تھا؟“

”وہ..... وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ تاجی رک رک کر بولی۔

”نئے چیونٹے منگوائے جائیں؟“ میں نے اسے گھورا۔

”نہیں..... نہیں..... خدا کے لئے ایسا مت کرنا۔“ وہ چیخ اٹھی۔

”تو پھر شروع ہو جاؤ۔ میں تمہیں صرف ایک منٹ کا وقت دے رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

ایک منٹ خاموشی سے گزر گیا اور پھر تاجی کی سہمی سہمی مدھم سی آواز سنائی دی۔

”رانا مقبول۔ وہ سمن آباد میں رہتا ہے۔ لیکن وہ.....“

”کیا.....؟ آگے بولو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”وہ ہندو ہے۔“ تاجی نے جواب دیا۔

”کیا؟“ میں اچھل پڑا۔ ”رانا مقبول..... یہ نام تو.....“

”اس کا اصل نام جسونت سنگھ ہے اور وہ راجستھان کا رہنے والا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اس سے تمہاری ملاقات کب اور کیسے ہوئی تھی؟ اور تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ ہندو ہے؟“

”تو پھر میں کسی اور خطرے کو بھی خاطر میں نہ لاتی۔ اور.....“

”وہ دولت میرے ہاتھ نہ لگتی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اور میں نے لاش کے محلے سے وہ لاکٹ بھی اتار لیا۔ مجھے بعد میں تم لوگوں نے پہچان لیا اور اپنے لئے خطرہ سمجھ کر مجھے اغوا کر لیا۔ اس طرح ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔ اور جب میں تمہاری کوٹھی سے فرار ہو گیا تو تم لوگوں کو میری فکر ہوئی۔ میں تمہارے لئے موت کا وارنٹ تھا اور تم لوگ ہر قیمت پر مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا جس میں تمہارا ہی ساتھی فیقا مارا گیا۔ اور پھر تم لوگوں نے شیدا پہلوان کو اغوا کر لیا میرا پتہ معلوم کرنے کے لئے۔ جبکہ نہ تو وہ اس معاملے میں ملوث تھا اور نہ ہی اسے میرے گھر کا پتہ معلوم تھا۔ اگر میں تمہیں شدیدے پہلوان کے حوالے کر دوں تو وہ تمہارا چہرہ اس طرح بگاڑ دے گا کہ تم خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہیں سکو گی۔ لیکن فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے تم سے اور بھی بہت کچھ پوچھنا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ جسونت سنگھ عرف رانا مقبول نے مادام دھکے کو قتل کیوں کر دیا تھا؟ کوئی غلط بیانی کی کوشش مت کرنا۔ میں تمہاری باتوں سے سمجھ گیا ہوں کہ تم اس کے بہت قریب رہ چکی ہو اور اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکی ہو۔ اس لئے میں وہ بات جاننا چاہتا ہوں جو سچ ہو۔“

”اور سچ یہ ہے کہ جسونت سنگھ انڈیا کی انٹیلی جنس کا ایجنٹ ہے۔“ تاجی نے جواب دیا۔ ”وہ طویل عرصہ سے کراچی میں اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کئی مرتبہ سرحد پار کر کے ہندوستان جا چکا ہے۔ سندھ کے سرحدی دیہاتوں میں رہنے والے ہندو اس کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں۔ کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں میں ہونے والی دہشت گردی میں بھی رانا مقبول عرف جسونت سنگھ کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ راجستھان کی طرف سے اٹھ اور رقم منگوا کر دہشت گردوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ہندوستان میں پاکستانی کرنسی بھی چھاپی جاتی ہے جس پر جعلی ہونے کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہی کرنسی پاکستان اسمگل کر کے دہشت گردوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ پاکستان کی سرحد پر آباد ہندو ایسے کاموں میں جسونت سنگھ جیسے لوگوں کی پوری پوری مدد کرتے ہیں۔ وہ ہندو ہیں تو پاکستانی مگر ان کی تمام تر ہمدردیاں ہندوستان کے ساتھ ہیں۔“

”میں نے مادام دھکے کے قتل کی وجہ پوچھی تھی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”مادام دھکے کو کیوں قتل کر دیا گیا تھا؟“

”رانا مقبول مجھ پر بہت بھروسہ کرنے لگا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں بھی پاکستان کے وجود کے خلاف ہوں۔ اس لئے وہ مجھے بہت سی باتیں بتا دیا کرتا تھا۔ ویسے بھی جب کوئی مرد کسی حسین

نے اس کے گھر جانے کی خواہش کی تو اس نے بخوشی اگلے روز مجھے اپنی کوٹھی میں مدعو کر لیا۔ اور پھر میں چند روز بعد اس کے ہاں جانے لگی۔ دراصل میں صورتحال کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔ اس کی کوٹھی پر صرف ایک پرائیویٹ گاڑڈ تعینات تھا جو ہمیں اچھی طرح جان گیا۔ ہم جب بھی جاتے وہ ہماری گاڑی دیکھتے ہی گیٹ کھول دیتا۔ اس گن مین کے علاوہ ایک اویسر ملازمہ بھی جو صبح چھ بجے آتی اور رات دس بجے چھٹی کر کے اپنے گھر چلی جاتی۔ مجھے رانا مقبول عرف جسونت سنگھ کی طرف سے سنگل کا انتظار تھا۔ اور پھر ایک روز یہ سنگل مل گیا۔ میں نے ٹھیکل سے مل کر پروگرام بنایا اور اسی رات مادام دھکے کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مادام دھکے رات کو دیر تک بیٹھی کتاب پڑھتی رہتی ہے۔ اس لئے میں اور ٹھیکل آدھی رات کے بعد وہاں پہنچے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ گن مین نے ہمارے لئے گیٹ نہیں کھولا۔ ہم عام طور پر آٹھ بجے کے قریب وہاں جایا کرتے تھے اور اس روز آدھی رات بیت چکی تھی۔ وہ مادام کی اجازت کے بغیر گیٹ نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ ہمیں انتظار کرنے کو کہہ کر وہ اندر چلا گیا اور پھر چند منٹ بعد واپس آ کر اس نے گیٹ کھول دیا۔

مادام دھکے اپنے بیدروم میں بستر پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ہمیں بھی اس نے وہیں بلا لیا اور پھر موقع ملے ہی ٹھیکل نے اسے دبوچ لیا اور اس کا گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مادام کی لاش چھپانے کے لئے کوئی جگہ نظر نہیں آئی تو میں نے الماری کھول دی۔ ٹھیکل نے لاش کو الماری میں ٹھونس کر دروازہ بند کر دیا۔ اور پھر اس نے گن مین کو اندر بلا لیا۔ گن مین کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی مالکن کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ ٹھیکل ہال کمرے میں کھڑا اس سے باتیں کرتا رہا اور پھر اسے بھی ٹھکانے لگانے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

مادام دھکے کی دولت مندی کے قصے بہت مشہور تھے۔ اور میں بھی جانتی تھی کہ اس کے پاس بہت دولت تھی۔ میرا ارادہ اس کے گھر کی تلاشی لینے کا بھی تھا لیکن عین اسی وقت کوٹھی کے باہر فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم ڈر گئے اور فائرنگ رکتے ہی کوٹھی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ اس کے گلے سے لاکٹ ہی اتار لیتی۔ مگر اس وقت تو میں اس قدر بدحواس تھی کہ مجھ گئے کے علاوہ کوئی اور بات ہی ذہن میں نہیں آئی تھی۔“

”اور انہیں پتہ ہوتا کہ اس الماری میں نقدی اور زیورات کی صورت میں کروڑوں کی دولت موجود ہے تو شاید.....“

نہیں سمجھتا تھا۔ اسرائیل نے اپنے پڑوسی مسلم ممالک کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ وہ امریکہ اور برطانیہ کی شہ پر بزرور طاقت پڑوسی ممالک کی زمینوں پر قبضہ کر کے اپنی بستیاں بسا رہا تھا اور بھارت بھی اسی پالیسی پر گامزن تھا۔ سکم اور بھوٹان جیسی چھوٹی پڑوسی ریاستوں پر وہ قبضہ جما چکا تھا۔ اس کی چین کے سرحدی علاقوں پر بھی نظریں تھیں اور پاکستان کے ساتھ بھی ہنگے بازی کرتا رہتا تھا۔ بھارت ہی کی سازشوں سے پاکستان دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پاکستان کی آدمی قوت ختم ہو چکی ہے۔ اس خطے کو نقصان پہنچانے کے لئے بھی اس کی ریشہ دوانیاں جاری تھیں اور اس سلسلے میں اسرائیل اس کی پوری پوری مدد کر رہا تھا۔ اسرائیلی ایجنٹ، بھارتی ایجنٹوں کو پاکستان کے خلاف دہشت گردی اور تحریک کاری کی جدید ترین ٹیکنالوجی کی تربیت دے رہے تھے اور وقتاً فوقتاً پاکستان کے خلاف اس کے تجربات بھی کئے جا رہے تھے۔

پاکستان کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ مادام دھکے کا قتل اس کی تازہ ترین مثال تھی۔ اس طرح پاکستان اور لبنان کے درمیان تعلقات خراب کرنے کی ایک بھرپور کوشش کی گئی تھی۔

مادام دھکے کے قتل میں اگرچہ پاکستانیوں ہی کو آلہ کار بنایا گیا تھا۔ لیکن بھارتی انٹیلی جنس کے ایجنٹ اس میں پوری طرح ملوث تھے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک تاجی اور کھلیل جیسے بے ضمیر لوگ اس ملک میں موجود ہیں، رانا مقبول جیسے غیر ملکی ایجنٹ ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

تاجی کے کہنے کے مطابق جمونت سنگھ عرف رانا مقبول طویل عرصہ سے کراچی میں پاکستان کی سلامتی کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ ظاہر ہے وہ اکیلا نہیں ہوگا۔ کراچی میں اور بھی بھارتی ایجنٹ موجود ہوں گے اور انہیں تاجی اور کھلیل جیسے بے ضمیر مقامی باشندوں کی بھی مدد حاصل ہوگی۔

جمونت سنگھ پچھلے چھ مہینوں سے رانا مقبول کے نام سے لاہور میں مقیم تھا۔ اس کا اونچی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ لاہور آتے ہی اس نے ایسے لوگوں کی تلاش شروع کر دی ہوگی جنہیں آلہ کار بنایا جاسکے۔ اور پھر تاجی اس کی نظروں میں آگئی۔ غیر ملکی ایجنٹ ایسے مقامی باشندوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو چند لوگوں کے لالچ میں اپنی ماں کا سودا کرنے سے بھی نہیں ہانکتے اور تاجی اس کے معیار پر پوری اترتی تھی۔

میں یہ سب کچھ سوچتے ہوئے تاجی کی طرف دیکھ رہا تھا جو بستر پر ٹانگیں رگڑ رہی تھی۔ میرے ہاتھ کی پشت پر صرف ایک چیونٹے نے کاٹا تھا۔ اس جگہ بار بار خون کا قطرہ نمودار

عورت کے ساتھ بستر پر لیٹا ہوا ہو تو وہ اپنی بہادری کے قصے سنانے کے ساتھ ایسی ایسی باتیں بھراگل دیتا ہے جو عام حالات میں اس کی زبان پر نہیں آسکتیں۔ ایسے ہی موقعوں پر رانا مقبول مجھے بھی بہت سی باتیں بتا دیا کرتا تھا۔

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”دھکے کا تعلق لبنان سے تھا۔ اسرائیل اور لبنان میں بہت عرصہ سے جنگ ہو رہی ہے۔ اسرائیل نے اگرچہ لبنان کو کھینچنا دیا ہے لیکن وہ شاید اس ملک کو صفحہ ہستی ہی سے مٹا دینا چاہتا ہے۔ اسرائیل کی انٹیلی جنس کے ایجنٹ انڈیا کی انٹیلی جنس کے ساتھ مل کر لبنان کے خلاف کوئی طویل المیعاد منصوبہ بنا رہے تھے۔ لبنان کے ایک پڑوسی ملک کو کسی طرح اس کی بھٹک ل گئی اور وہاں کی حکومت نے لبنانی حکومت کو خبردار کر دیا۔ لبنان کی حکومت نے اس منصوبے کا سراغ لگانے کی ذمہ داری پاکستان میں اپنے سفیر مادام دھکے کو سونپ دی۔ مادام دھکے محض لاہور سے محبت کی وجہ سے یہاں نہیں آتی تھی۔ وہ اس خفیہ مشن پر تھی کہ کسی طرح بھارت اسرائیل منصوبے کے بارے میں کچھ معلوم کر لے۔ سرحد کے قریب رہتے ہوئے وہ زیادہ آسانی سے کام کر سکتی تھی۔ اسی لئے وہ مبینے میں کم از کم ایک ہفتہ یہاں گزارتی تھی۔

تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مادام دھکے کم از کم تین مرتبہ چوری چھپے ہندوستان بھی چکی ہے۔ یہاں اس نے خفیہ طور پر کچھ آدمیوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ انڈیا میں بھی اس کے ایجنٹ موجود تھے۔ وہ ان سے ملنے کے لئے ہی ہندوستان جاتی تھی۔ لیکن دو تین ہفتے پہلے انڈیا میں اس کے ایجنٹ پکڑے گئے اور ان کے بارے میں کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دی گئی۔ یہاں لاہور میں بھی مادام دھکے کے تین آدمی مارے گئے۔ آخری ملاقاتوں میں، میں نے مادام دھکے کو خاصا پریشان دیکھا تھا۔ مجھے یہ ساری باتیں رانا مقبول نے بتائی تھیں۔“

تاجی خاموش ہو گئی۔ میں اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔

اس کی باتوں سے مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اسرائیل ہشت پا کی طرح پھیل رہا تھا۔ امریکہ، برطانیہ اور یورپی ممالک اس کی مکمل حمایت کر رہے تھے۔ کسی ملک میں اسرائیل کا کوئی ایک آدمی مارا جاتا تو امریکہ سمیت دنیا کے تمام لادین ممالک چیخ اٹھتے تھے۔ اس ملک کی حکومت کی شدید مذمت کی جاتی تھی اور اسرائیل جو اپنی کارروائی کر کے اس ملک میں خون کی ندیاں بہا دیتا تھا۔

اب بھارت اور اسرائیل میں بھی گٹھ جوڑ ہو گیا تھا۔ میں یہودیوں اور ہندوؤں میں کوئی فرق

لگانے کے لئے رکھا گیا تھا۔ لیکن وہ بزدل نکلے۔ اگر وہ اپنی جانیں بچا کر نہ بھاگتے تو لوگوں پر قابو پایا جاسکتا تھا۔ اور اس وقت تم میرے رحم و کرم پر ہوتے۔“

”ہاں..... وہ بزدل بھاگنے کی بجائے ہمیں پکڑنے کی کوشش کرتے تو کامیاب ہو سکتے تھے۔“ میں نے تاجی سے اتفاق کیا۔ ”لیکن میں ان کا ٹھکانہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ جیدی اور ریاض سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ ٹھیک کہاں ملے گا۔ وہ کہاں جاسکتا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ تاجی نے جواب دیا۔

”تمہیں معلوم ہے۔ تم سب کچھ جانتی ہو۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”اس شہر میں تمہارے کئی ٹھکانے ہیں اور تم جانتی ہو جس طرح میں نے تمہاری گلابی والی کوٹھی کا پتہ لگایا تھا اسی طرح دوسرے ٹھکانے بھی تلاش کر سکتا ہوں لیکن اس میں وقت لگے گا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم خود ہی بتا دو کہ ٹھیک فرار ہو کر کہاں گیا ہوگا؟“

”یہ درست ہے کہ میں نے لاہور میں بہت سے ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔ لیکن وہ ان میں سے کسی جگہ نہیں گیا ہوگا۔“ تاجی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ ”ہاں..... یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی بہن کے گھر چلا گیا ہو۔“

”کہاں..... اس کی بہن کا گھر کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کی بہن سلامت پورہ میں رہتی ہے۔ داروغہ والا سے ذرا آگے۔“ تاجی نے جواب دیا اور مجھے پتہ سمجھانے لگی۔ ”سلامت پورہ کی نگینہ اسٹریٹ میں اس کے بہنوئی تاج دین کی کریانہ کی دکان ہے۔ اس دکان کے پیچھے رہائشی مکان بھی ہے۔ مجھے یقین ہے ٹھیک وہیں گیا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم شرافت کا ثبوت دینے کا وعدہ کرو تو تمہیں صرف اس کمرے میں بند رکھا جائے گا اور تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دی جائے گی۔ بصورت دیگر تمہارے ہاتھ پیر باندھ.....“

”نہیں نہیں..... خدا کے لئے ایسا مت کرنا۔“ وہ جلدی سے بول پڑی۔ ”میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گی۔ مجھے باندھنا مت..... میں وعدہ کرتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ جب تک تم شرافت کا مظاہرہ کرو گی، تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔“ میں نے کہا۔

”جیسے پانی پلاؤ۔ اور خدا کے لئے میرا کوئی علاج کرو۔ میری ٹانگیں چٹلی ہو رہی ہیں۔ میں تکلیف سے مری جا رہی ہوں۔“ تاجی گھکھکیائی۔

”ٹھیک ہے۔ میں لگانے کے لئے کوئی دوا منگواتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

ہو رہا تھا اور شدید جلن ہو رہی تھی۔ مجھے صرف ایک چپوٹے نے کاٹا تھا اور میں بری طرح بے چین ہو رہا تھا اور تاجی کی دونوں ٹانگیں اوپر تک چھلنی ہو رہی تھیں۔ اس کی اذیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

نچھ اور سو لچر بھی ایک طرف خاموش کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاجی کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی اور کبھی پھر لیٹ جاتی۔

”تاجی!“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بتایا تھا کہ رانا مقبول سمن آباد میں رہائش پذیر ہے۔ تمہارے خیال میں کیا وہ اب بھی وہیں ہوگا؟“

”مادام دھکے کے قتل کے دو مہینے بعد میں نے اسے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں دیکھا تھا۔“

تاجی نے جواب دیا۔ ”وہ میرے قریب نہیں آیا تھا اور نہ ہی میں نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے بھی اپنی سرگرمیاں محدود کر لی تھیں۔ ہو سکتا ہے وہ لاہور ہی میں ہو یا ممکن ہے کام ہو جانے کے بعد کچھ عرصہ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد واپس چلا گیا ہو۔“

”تمہارے کہنے کے مطابق اس نے تمہیں بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ تو پھر یہ بھی بتایا ہوگا کہ وہ کراچی میں کیا کرتا ہے اور کہاں رہتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ایسے لوگوں کے پاس دولت کی کمی نہیں ہوتی۔“ تاجی نے جواب دیا۔ ”جسوت سنگھ کو بھی اپنی حکومت کی طرف سے لامحدود فنڈز ملتے ہیں جن کا کوئی حساب بھی نہیں لیا جاتا۔ لیکن رانا مقبول نے بتایا تھا کہ آذر کھنے کے لئے اس نے کراچی کی سبزی منڈی میں پھلوں کی آڑھت کا کام شروع کر رکھا ہے جہاں اس کے ملازم کاروبار کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اس کی رہائش بھی سبزی منڈی کے قریب ہی ہے۔ مجھے اس جگہ کا نام یاد نہیں رہا۔“

”کیا تم نے رانا مقبول کو بتایا تھا کہ میں تمہارے راز سے واقف ہو چکا ہوں۔ یعنی میں نے تمہیں قتل والی رات مادام دھکے کی کوٹھی سے فرار ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اتنی بیوقوف نہیں ہوں۔“ تاجی نے جواب دیا۔ ”اسے جیسے ہی پتہ چلا، مجھے اور ٹھیک کو قتل کر دیتا۔“

”کل رات گلابی والی کوٹھی میں تمہارے ساتھ ٹھیک کے علاوہ جیدی اور ریاض بھی تھے جو مار کھانے کے بعد بھاگ گئے۔ تمہارے خیال میں وہ کہاں ہوں گے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور کیا جیدی اور ریاض کو بھی اصل بات معلوم ہے؟“

”نہیں۔“ تاجی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”ان دونوں کو معاوضہ دے کر تمہاری تلاش اور تمہیں

ابھی تک تاجی والے کمرے ہی میں تھیں۔ سو لجر باہر لان میں جا کر پودوں کو پانی دینے لگا۔ میں رنشی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”اب تمہارے بازو کی تکلیف کیسی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”شکر ہے تمہیں میرا خیال تو آیا۔“ وہ شاکی لہجے میں بولی۔ ”میں تو سمجھی تھی کہ تم بھول ہی گئے تھے کہ میں بھی یہاں ہوں۔“

”تم کوئی بھولنے والی چیز ہو؟“ میں مسکرا دیا۔ ”تاجی جیسی عورت سے نمٹنا آسان نہیں۔ اس جیسی عورت تو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے۔ بہت ہی مضبوط اور آہنی اعصاب کی مالک۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ایسے لوگوں کو جھکانا توڑنا آسان نہیں ہوتا۔ سخت ترین تشدد بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی معمولی سی بات انہیں توڑ کر رکھ دیتی ہے۔“

”مثلاً؟“ رنشی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں چند لمحوں کو خاموش رہا، پھر بتانے لگا کہ کس طرح تاجی کو زبان کھولنے پر مجبور کیا گیا تھا۔

”اگر اس پر شدید ترین تشدد کیا جاتا تو مجھے یقین ہے وہ زبان نہ کھولتی۔ لیکن ان چیونٹوں نے اسے فر فر بولنے پر مجبور کر دیا۔“

”تو گویا اس نے اعتراف کر لیا کہ دھکے کے قتل میں اس کا ہاتھ ہے؟“ رنشی نے میرے خاموش ہونے پر کہا۔

”انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس نے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ اس رات کھیل کے ساتھ دھکے کی کوشی میں گئی تھی۔ اس نے یہ بھی تفصیل بتادی ہے کہ انہوں نے مادام دھکے اور اس کے گن مین کو کس طرح گھا گھونٹ کر ہلاک کیا تھا۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تاجی نے بتایا ہے کہ اس نے مادام دھکے سے دوستی کر لی تھی اور اکثر اس کی کوشی پر جاتی رہتی تھی۔ لیکن اس نے کہا اس کا حوالہ نہیں دیا۔ کیا تمہارا کبھی اس سے آشنا سامنا ہوا تھا؟“

”یہ میرے بعد کی بات ہے۔“ رنشی نے جواب دیا۔ ”میں اس سے پہلے مادام کی نوکری چھوڑ چکی تھی اور ظاہر ہے میں اتنی دولت مند نہیں ہوں کہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں آنا جانا ہوتا کہ ان لوگوں سے کبھی آشنا سامنا ہوتا۔ ولسے ایک مرتبہ میں نے تاجی کو دھکے کی کوشی سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”تم نے بتایا تھا کہ مادام دھکے کب اہم مشن کے سلسلے میں یہاں آئی ہوئی تھی۔“ میں نے

سو لجر نے پانی لا کر پلا دیا۔ ہم کمرے سے نکل آئے۔ دروازے کو باہر سے کھٹا لگا دیا گیا۔ پچھلی طرف کی کھڑکی میں مضبوط گرل لگی ہوئی تھی اس لئے تاجی کے فرار کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ میں چند لمحے ہال میں رکا اور پھر باہر نکل آیا۔ مارکیٹ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں نے ضرورت کی کچھ چیزیں خریدیں اور پھر ایک میڈیکل اسٹور پر پہنچ گیا اور کیسٹ کو ہاتھ دکھاتے ہوئے بولا۔

”کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔ کالا چیونٹا جو عام طور پر برگد اور پتیل کے درختوں پر ہوتا ہے۔ شدید جلن ہو رہی ہے۔ کوئی ایسی دوا دیں جو اس تکلیف سے نجات دلا سکے۔“

”انیکٹ بائیٹ سے انفیکشن ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔“ ڈکاندار میرے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک ٹیوب دے رہا ہوں۔ دن میں دو تین مرتبہ لگا لیجئے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے الماری میں سے ٹیوب والی ایک ڈبیہ نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ وہ چھوٹی ٹیوب تھی۔ تاجی کے لئے تو صرف ایک ہی مرتبہ کے استعمال سے ختم ہو جاتی۔ میں نے اس کے ساتھ ایک بڑی ٹیوب بھی خرید لی۔

گھر واپس آ کر میں نے بڑی ٹیوب نچھ کے حوالے کر دی۔

”شیبو کو ساتھ لے جاؤ اور اس کے زخموں پر یہ مرہم لگا دو۔“

”اگر اس نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گی۔“ نچھ اٹھتے ہوئے بولی۔

”اس موقع پر وہ کوئی گڑبڑ نہیں کرے گی۔ ویسے میری طرف سے اجازت ہے۔ اگر وہ کوئی ایسی حرکت کرے تو تم اپنے طریقے سے اس سے نمٹ سکتی ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

نچھ شیبو کو لے کر تاجی کے کمرے میں چلی گئی اور میں شیدا پہلوان والے کمرے میں آ گیا۔ وہ چار پانی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ گیا۔

”کیا گڑبڑ ہے روٹی باؤ؟“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے بتایا تھا کہ تاجی بھی یہیں ہے۔ کہاں ہے وہ؟“

”یہیں ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کی کچھ خاطر تواضع کی گئی ہے۔ دوسرے کمرے میں پڑی ہے۔ ویسے تم اطمینان رکھو۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو چکا ہے اسے وہ مرتے دم تک نہیں بھلا سکے گی۔“

میں پندرہ بیس منٹ تک شیدے پہلوان کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ نچھ اور شیبو

بہت اوپر سے ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تاجی کی پہنچ بھی بہت ادھر تک تھی۔ اسے بچانے والے بہت تھے۔ لیکن اب.....“

”لیکن اب کیا؟“ رخصی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”لیکن اب صورت حال بہت مختلف ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تاجی کی طرف داری کر کے اب کوئی بھی اپنی گردن پھنسانا پسند نہیں کرے گا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ مادام دھکے ایک ملک کی سفیر تھی اور اس کیس میں اپنے ملک کی سلامتی بھی وابستہ ہے۔ کوئی بھی تاجی کو بچانے کے لئے آگے نہیں آئے گا۔“

”تاجی تمہارے قبضے میں ہے۔ اس نے تمہارے سامنے اپنے جرم کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔ کیا تم اسے پولیس کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ رخصی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پولیس کے حوالے تو کیا جائے گا مگر اس طرح نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پولیس میں جبری کرپشن ہے وہ تم جانتی ہو۔ اگر میں تاجی کو اس وقت مقامی تھانے کے حوالے کر دوں تو یقیناً کروایک گھنٹے بعد نہ صرف تاجی آزاد ہوگی بلکہ پولیس مجھے پکڑنے کے لئے اس کوٹھی پر ہلہ بول دے گی۔ نہیں رخصی! میں ایسا نہیں کروں گا۔ اسے پولیس کے حوالے تو کیا جائے گا مگر اس طرح نہیں۔“

”تو پھر کس طرح؟“ اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”پولیس کے محکمے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو فرض شناسی اور دیانت داری کو ہر بات پر اولیت دیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں ایک ایسے پولیس آفیسر کو جانتا ہوں جس نے نتائج کی پرواہ کے بغیر ملک شہاب جیسے مگر کچھ کو آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا تھا۔“

”اور سزا کے طور پر اس دیانت دار اور فرض شناس آفیسر کو یہاں سے ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔“ رخصی بولی۔ ”تم یقیناً ایس پی سعید کی بات کر رہے ہو۔“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اسے ملک شہاب کو گرفتار کرنے کی پاداش میں جھنگ ٹرانسفر کر دیا گیا تھا لیکن آج کل وہ قصور میں ہے۔ میرے خیال میں وہی ایک ایسا شخص ہے جو صحیح طور پر قانونی کارروائی کر سکتا ہے۔ میں کل صبح ہی قصور جا کر اسے صورت حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔“

”لیکن وہ اپنے علاقے سے باہر کسی دوسری جگہ کارروائی نہیں کر سکتا۔“ رخصی نے کہا۔

”ضروری نہیں کہ تاجی کو لاہور ہی سے گرفتار کیا جائے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس کی

اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اسلام آباد میں مادام دھکے کا چیف سکیورٹی آفیسر مخدوم تمہارا دوست ہے۔ اس نے تمہیں اس مشن کے بارے میں بتایا ہوگا۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ مادام کا وہ مشن کیا تھا؟“

”وہ ان کا کوئی سفارتی معاملہ تھا۔ میں اس سلسلے میں زیادہ تفصیل نہیں جانتی۔ لیکن مخدوم نے بتایا تھا کہ انڈیا اور اسرائیل کے ایجنٹ مل کر مادام کے ملک کے خلاف کوئی سازش تیار کر رہے ہیں۔ انہوں نے جو بھی منصوبہ بنایا تھا اس کے لئے پاکستان کی زمین استعمال کی جائے گی اور اس طرح پاکستان کو بھی اس میں ملوث کر دیا جائے گا تاکہ نہ صرف لبنان بلکہ بعض دوسرے عرب ممالک سے بھی پاکستان کے تعلقات بگڑ جائیں۔ اس سلسلے میں وہ لوگ کیا کارروائی کرنا چاہتے تھے؟ اس کے بارے میں مخدوم کو بھی معلوم نہیں تھا اور شاید مادام دھکے بھی نہیں جانتی تھی۔ بلکہ وہ یہی سب کچھ معلوم کرنے کے لئے یہاں آئی ہوئی تھی۔“

”مخدوم اب بھی اسلام آباد کے لبنانی سفارت خانے میں موجود ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی نظر مادام کی دولت پر تو تھی لیکن کیا اس کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ اپنی حکومت کو اس سازش سے آگاہ کرتا؟“

”اس نے وزارت داخلہ کے ایک آفیسر کو سب کچھ بتا دیا تھا۔“ رخصی نے جواب دیا۔ ”اب یہ حکومت کا کام تھا کہ ایسی کسی سازش سے آگاہ ہونے کے بعد اس کے حوالے سے کوئی اقدامات کرتی۔ کم از کم خفیہ طور پر مادام کی حفاظت کا بندوبست ہونا چاہئے تھا یا اس کی نگرانی کر کے یہ معلوم کیا جانا چاہئے تھا کہ وہ کن سرگرمیوں میں مصروف ہے؟ اس طرح کوئی بات سامنے آ سکتی تھی۔ لیکن لگتا ہے ہماری حکومت نے کچھ نہیں کیا۔ اسی لئے تو مادام دھکے آسانی سے ماری گئی اور اس کے قاتل اب بھی آزادی سے دندناتے پھر رہے ہیں۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ پولیس نے اب تک تاجی سے رابطہ کر کے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ حالانکہ سب ہی جانتے ہیں کہ اس کے مادام دھکے سے قریبی تعلقات تھے۔ ایسی کوئی بات ہوتی ہے تو پولیس سب سے پہلے مقتول کے قریبی دوستوں سے رابطہ کرتی ہے۔ اگر ان میں سے کسی کا کردار مشکوک ہو تو اسے شامل تفتیش کر لیا جاتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تاجی آج بھی آزاد ہے۔ اگر پولیس اس سے رابطہ کر لیتی تو یہ کیس پہلے ہی روز حل ہو چکا ہوتا جسے پولیس نے ایک پیچیدہ معمہ بنا دیا ہے۔“

”تم تو خود پولیس میں رہ چکی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ پولیس کس طرح ایک سیدھے سادے کیس کو اس طرح الجھا دیتی ہے کہ اس کا کوئی حل ہی نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کسی پولیس آفیسر کے ذہن میں تاجی کا خیال آیا ہو۔ تاجی جیسی عورتوں پر ہاتھ ڈالنے کے لئے

چروں سے بھی نقاب اتر جائیں گے۔ لوگ بھی یہ جان لیں گے کہ جن لوگوں کو وہ معزز سمجھتے ہیں، جنہیں ووٹ دے کر اسمبلیوں میں پہنچاتے ہیں ان کے کردار کتنے گھناؤنے ہیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑے گا؟“ نجمہ بولی۔ ”ایک بدکردار کو ہنایا جائے گا تو اس کی جگہ دس اور آجائیں گے۔ یہاں تو شروع سے یہی ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لوگ اتنے سادہ لوح بھی نہیں ہیں کہ ان معززین کے کرتوتوں سے واقف نہ ہوں۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں اور اس کے باوجود انہیں ووٹ دے کر اپنے آپ پر مسلط کر لیتے ہیں۔“

”تم بھی ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن خاموش رہنا بھی مناسب نہیں ہے۔ ان لوگوں کو بے نقاب کرنا ضروری ہے۔ تاکہ.....“

”ٹھیک ہے۔“ نجمہ نے میری بات کاٹ دی۔ ”تو پھر تم وہی کرو جو کرنا چاہتے ہو۔

لیکن..... میں اب اس حرام زادی کی تیار داری اور خدمت نہیں کروں گی۔“

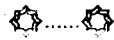
”اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے شبو دیکھ لیا کرے گی۔ اور رخصتی اتنی دیر اس کے

پاس کھڑی رہا کرے گی۔ بس تین چار دنوں کی بات ہے۔ اس کے بعد سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“

شبو چائے لے آئی اور ہماری گفتگو ہمیں پر ختم ہو گئی۔

میں چائے پیتے ہوئے شبو کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجب سے تاثرات تھے۔ وہ بچاری غریب گھرانے کی سیدھی سادھی لڑکی تھی۔ مجھے اور نجمہ کو وہ میاں بیوی سمجھتی تھی۔ ہم اس کی نظروں میں بہت شریف تھے۔ لیکن اب ہماری شرافت کا بھرم اس کے سامنے کھل گیا تھا۔ وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ نجمہ میری بیوی نہیں تھی۔ یہ راز کھلنے کے بعد اس نے کیا سوچا ہوگا۔ اور اب جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی؟ یہی کہ ہم جرائم پیشہ ہیں۔ قاتل اور لبرے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس نے سولجر سے اس بارے میں کوئی بات کی ہو۔ لیکن سولجر نے ابھی تک مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔

میں ان لوگوں کے قریب سے اٹھ کر شیدے پہلوان والے کمرے میں آ گیا اور اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔



ایک ہفتہ گزر گیا۔

میں نے اور سولجر نے ٹھیک کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی بہن کے گھر نہیں گیا تھا۔ لیکن اور روپوش ہو گیا تھا۔

گرفتاری قصور کے کسی علاقے سے بھی کی جاسکتی ہے۔ بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں۔ میں بھی ایک ایسا طریقہ جانتا ہوں کہ اسے قصور ہی سے گرفتار کیا جائے گا۔ لیکن اسے پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے ہمیں یہ جگہ چھوڑنی پڑے گی۔“

”کیا مطلب؟“ رخصتی نے مجھے گھورا۔

”تاجی کو جب یہاں لایا گیا تھا تو ہم سے یہ غلطی ہو گئی تھی کہ اس کی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی گئی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”گرفتاری کے بعد وہ یقیناً پولیس کو میرے بارے میں بتائے گی کہ اسے کہاں رکھا گیا تھا۔ اور پھر پولیس یہاں بھی چھاپہ مارے گی۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں اپنا بھی بندوبست کرنا پڑے گا۔“

”یہ کونسی کس کی ہے؟“ رخصتی نے پوچھا۔

”میں نے کرائے پر لے رکھی ہے اور اچھی خاصی رقم خرچ کر کے یہ سامان جمع کیا ہے۔ یہ سب کچھ چھوڑنے کا مجھے افسوس ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا منصوبہ کیا ہے؟“ رخصتی نے پوچھا۔

”میرا منصوبہ۔“ میں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ”تاجی کو اس طرح یہاں سے لے جایا جائے کہ اسے بھی کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔“ اور پھر میں اس منصوبے کی تفصیل بتانے لگا جو فوری طور پر میرے ذہن میں ابھرا تھا۔

”تو پھر اس کو بھی کو چھوڑنے کی بھی کیا ضرورت ہے؟“ رخصتی نے میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ”تم لوگ چند روز کے لئے اس کو کھٹی میں شفٹ ہو جاؤ۔ میرا مطلب ہے میرے پڑوس میں۔ اور جب معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ جائے تو یہاں سے اپنا سامان لے جاؤ۔“

”اس قسم کے معاملات آسانی سے ٹھنڈے نہیں ہوا کرتے۔ لیکن بہر حال تمہارے مشورے پر عمل کرنا پڑے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ نجمہ اور شبو بھی تاجی والے کمرے سے نکل آئیں۔ شبو تو کچن کی طرف چلی گئی اور نجمہ ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے نجمہ کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو وہ بولی۔

”پولیس کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ختم کر دو اس کتیا کو۔“ نجمہ کے لہجے سے میں اس کی نفرت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

”ختم کرنا ہوتا تو گلبرگ والی کو کھٹی ہی میں مار دی گئی ہوتی۔ اسے یہاں لانے کی ضرورت نہیں تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پولیس کے حوالے کرنے کا فائدہ یہ ہو گا کہ دوسروں کے

”ہو سکتا ہے پولیس تمہیں تلاش نہ کر سکے۔ لیکن مجھے تو تمہاری طرف سے خطرہ رہے گا۔ تم پس منظر میں رہ کر کسی بھی وقت میرے خلاف کوئی کارروائی کر سکتی ہو۔ نہیں..... میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔“

”تو پھر..... کیا چاہتے ہو تم؟“ اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔
”میں نے سنا ہے تم ایک دومرتبہ ہندوستان بھی جا چکی ہو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”م..... میں دومرتبہ فیروز پور گئی تھی۔ مگر تمہیں کیسے پتہ چلا؟“
”میں اپنے دوستوں کے بارے میں پوری معلومات رکھتا ہوں۔“ میں نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے اندھیرے میں جو تیر مارا تھا وہ نشانے پر لگا۔
”فیروز پور میں کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک اسمگلر ہے جو پاکستان آتا رہتا ہے۔ وہ یہاں جب بھی آتا ہے، چھپ چھپا کر ایک دونوں کے لئے میرے پاس بھی آ جاتا ہے۔ دومرتبہ وہی مجھے اپنے ساتھ فیروز پور لے کر گیا تھا۔ مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔
”مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اگر تم چاہو تو۔“ میں نے کہا۔ ”تم بھی بچ جاؤ گی اور میں بھی تمہارے شر سے محفوظ رہوں گا۔ میرا مطلب ہے مجھے بھی تمہاری طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”تم فیروز پور چلی جاؤ۔ اپنے چاہنے والے اسمگلر کے پاس۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر چاہو تو میں تمہیں سرحد پار کروا سکتا ہوں۔ اس طرح ہم دونوں محفوظ بھی رہیں گے اور مطمئن بھی۔“
”اور اس طرح تم وہ ساری دولت بھی اکیلے ہی ہضم کرنا چاہتے ہو جو مادام دھکے کی کوشی سے اڑائی تھی۔“ وہ بولی۔

”وہ دولت پہلے بھی میری تھی اور اب بھی میری ہے۔ اس پر کسی دوسرے کا کوئی حق نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب میں تمہارا فیصلہ سنا چاہتا ہوں۔ کل دو پہر تک مجھے بتا دینا۔ اور ایک بات اور بھی ہے۔“ میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ ”تم نے نجمہ کی زندگی برباد کی ہے۔ وہ تم سے خار کھائے بیٹھی ہے۔ اس کی نفرت کا اندازہ تم لگا چکی ہو۔ وہ تو تمہیں پولیس کے حوالے کرنے کے حق میں بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں تمہیں تمہارے انجام

میں سمن آباد کی اس کوشی پر بھی گیا تھا جس کے بارے میں تاجی نے بتایا تھا اور میری توقع کے عین مطابق رانا مقبول عرف جسونت سنگھ وہاں نہیں تھا۔ وہاں کوئی بڑی فیملی رہائش پذیر تھی۔ کئی بچے کوشی کے لان میں کھیلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کال بیل کے جواب میں دروازے پر آنے والی ایک بڑی بی نے بتایا کہ وہ رانا مقبول نام کے کسی شخص کو نہیں جانتی۔ وہ لوگ تو دو ہفتے پہلے گلشن راوی سے اس کوشی میں منتقل ہوئے ہیں۔

تاجی اب بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس کی ٹانگوں پر کہیں کہیں زخموں کے نشان رہ گئے تھے۔ ویسے اب اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اسے اگرچہ کمرے میں بند کر کے ہی رکھا جاتا تھا اور اس نے اپنے وعدے کا بھی لحاظ رکھا تھا اور اس دوران کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ کسی گڑبڑ کے نتیجے میں اسے پہلے سے زیادہ کڑی سزا مل سکتی تھی۔

اس رات کھانے کے بعد میں اکیلا اس کے کمرے میں آ گیا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اسے ٹھیک اور رانا مقبول کی روپوشی کے بارے میں بھی بتایا۔

”رانا مقبول اب کراچی میں بھی نہیں ملے گا۔“ میں نے کہا۔ ”غیر ملکی جاسوس کچی گولیاں نہیں کھیلے ہوتے۔ ہو سکتا ہے اس نے نشے میں تمہیں کچھ باتیں بتادی ہوں۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں بتائی ہو گی جس سے وہ گرفت میں آ جائے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کراچی میں بھی اس پتے پر نہیں ملے گا جو اس نے تمہیں دیا تھا۔“

”تو پھر میں کیا کروں..... مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ تاجی نے کہا۔
”میں تمہیں زندگی بھر کے لئے تو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے تو بہت سی باتیں سامنے آئیں گی۔ بہت سے چہرے بے نقاب ہوں گے۔ تمہارے خلاف غداری اور جاسوسی کا مقدمہ چلے گا۔ اور جانتی ہو ایسے مقدمات کا فیصلہ کیا ہوتا ہے؟ موت..... بھیا تک موت..... تمہیں پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جائے گا۔ تم نے کسی پھانسی پانے والے کو دیکھا ہے۔ گردن کھنچ کر لمبی ہو جاتی ہے۔ زبان کتے کی طرح منہ سے لٹک جاتی ہے اور آنکھیں حلقوں سے ابل پڑتی ہیں۔ چہرہ اتنا بھیا تک ہو جاتا ہے کہ.....“
”بس بس.....“ تاجی چیخ اٹھی۔ ”بس کرو۔ میں مزید کچھ نہیں سن سکتی۔“

”اگر تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے تو تمہارا یہ انجام تو ہونا ہی ہے۔“ میں نے کہا۔
”اب تم ہی بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

”مجھے چھوڑ دو۔“ وہ بولی۔ ”میں کسی ایسی جگہ چلی جاؤں گی جہاں پولیس مجھے تلاش نہ کر سکے۔“

جی۔ مجھے بھکانے کے لئے اس نے بے لباس ہونے کی کوشش کی تو میں نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ چیخ کر چارپائی پر گر گئی۔

”آج کی رات سکون سے گزار لو۔“ میں نے کہا۔ ”کل تم فیروز پور پہنچ جاؤ گی۔ کپڑے اپنے اسمگلر عاشق کے سامنے اتارنا۔ وہ تمہیں پناہ دیدے گا۔“

اور پھر میں نے اور سولجمر نے وہ رات تقریباً جاگتے ہوئے ہی گزاری تھی۔ میرا خیال تھا کہ آج کی رات تاجی کوئی گڑبڑ کی کوشش کرے گی مگر وہ اپنے کمرے میں خاموش پڑی رہی تھی۔

رات کے آخری پہر میں سو گیا تھا۔ دس بجے کے قریب سولجمر نے مجھے جگا دیا اور خود ناشتہ کرنے لگا۔

دوپہر کے کھانے کے لئے فریج میں سالن موجود تھا۔ روٹیاں سولجمر بازار سے لے آیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھاتے ہی ہم کٹھی سے روانہ ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سولجمر بیٹھا ہوا تھا اور میں تاجی کے ساتھ بجلی سیٹ پر تھا۔ میری جیب میں پستول موجود تھا اور میں نے تاجی کو خبردار کر دیا تھا کہ اگر اس نے راستے میں کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں بلا جھجک اسے گولی مار دوں گا۔

کار شہر سے نکل کر قصور کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ تاجی سبھی ہوئی خاموش بیٹھی تھی۔

”شکر کرو تمہاری جان بخشی ہو گئی۔“ میں نے کہا۔ ”انڈیا میں تمہارے جیسی عورتیں راج کرتی ہیں۔ تم بھی عیش کرو گی۔“

تاجی نے کوئی جواب نہیں دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

قصور شہر سے چند میل پہلے میں نے کار بائیں طرف کھیتوں میں ایک کچے راستے پر مڑ والی۔ اس سڑک پر تیل گاڑیاں اور ٹریکٹر وغیرہ چلتے رہتے تھے جن کی وجہ سے کچے راستے پر کھڈے پڑے ہوئے تھے۔ اسی لئے سولجمر نے کار کی رفتار کم کر لی تھی۔ اس کے باوجود جھٹکے لگ رہے تھے۔ یہی کچا راستہ دو تین دیہاتوں کو ملاتا ہوا بھارتی سرحد کی طرف چلا گیا تھا تاہم سرحد وہاں سے بہت دور تھی۔

ایک گاؤں سے ہوتے ہوئے ہم آگے نکل گئے اور تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میرے کہنے پر سولجمر نے کار ایک اور کچے راستے پر موڑ لی۔ یہ راستہ تنگ سا تھا اور تقریباً دو فٹ اونچے آگے جا کر درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس ختم ہو گیا تھا۔ بائیں کے درختوں کے اس جھنڈ کے نیچے تین کمروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی کچی عمارت تھی۔ اس کے دوسری طرف بہت بڑی جگہ جنگل میں گھری ہوئی تھی جہاں کبھی مویشی باندھے جاتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ باڑہ اور یہ

کو پہنچانا چاہتی ہے۔ اس کے پاس کچھ ایسی لڑکیوں کے پتے بھی موجود ہیں جنہیں تم برباد کر چکی ہو۔ اب تک نجانے تم نے کتنے گھر اجاڑے ہیں۔ اگر سب لوگ سامنے آ گئے تو تم خود سوچ سکتی ہو کہ تمہارا کیا حشر ہو گا۔ تمہارے جسم کے اتنے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے کہ کوئی ماہر سے ماہر حساب دان بھی ان کی گنتی نہیں کر سکے گا۔ اس لئے تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ میری پیشکش پر سنجیدگی سے غور کر لو۔“

”میرے ساتھ دھوکا تو نہیں ہو گا؟“ تاجی نے کہا۔ نجمہ کے نام پر اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھرائے تھے۔

”کیسا دھوکا؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے تمہارے ساتھ دھوکا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں اگر چاہوں تو تمہارا گلا گھونٹ کر لاش کسی سڑک پر پھینک دوں۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے والا کون تھا۔ میں نے تو اس مسئلے کا ایک ایسا حل تلاش کیا ہے کہ ہم دونوں زندہ بھی رہیں اور محفوظ بھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے بالآخر گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”قصور سے تھوڑا آگے سرحد پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے کجیاں والا..... مجھے اس گاؤں میں چوہدری نور حسین کے گھر تک پہنچا دو..... وہ مجھے سرحد پار کرادے گا۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا اور اس وقت تک اس گاؤں میں رہوں گا جب تک تمہیں سرحد کے پار نہ پہنچا دیا جائے۔ میں اطمینان کر لیتا چاہوں گا کہ تمہیں سرحد کے اس پار پہنچا دیا گیا ہے یا نہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہمیں یہاں سے کب جانا ہو گا؟“ تاجی نے پوچھا۔

”پرسوں دوپہر کے بعد۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کل دن میں مجھے کچھ انتظامات کرنے ہیں۔ پرسوں دوپہر کو ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

میں نے اگلا دن واقعی بڑی مصروفیت میں گزارا تھا۔ شام ہوتے ہی نجمہ، شبو اور رشتی کو سولجمر کے ساتھ رشتی کے گھر بھیج دیا۔ سولجمر انہیں چھوڑ کر تقریباً دو گھنٹوں بعد واپس آ گیا۔ اور پھر سولجمر ہی شیدے پہلوان کو چھوڑنے کے لئے چلا گیا۔ شیدہ پہلوان ایک ہفتہ ہمارے ہی پاس رہا تھا۔ اس دوران اس کے زخموں کا علاج ہوتا رہا اور اس نے ٹیلی فون پر اپنے گھر والوں سے مسلسل رابطہ بھی رکھا تھا تا کہ وہ پریشان نہ ہوں۔

میں کٹھی میں اکیلا رہ گیا اور تاجی کے کمرے میں آ گیا۔ تاجی کو بھی پتہ چل گیا کہ سب لوگ جا چکے ہیں۔ وہ مجھے لالچ دینے لگی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ وہ یہاں سے بہت دور چلی جائے

نوبچ کے قریب سولجر کار پر چلا گیا۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ سولجر سے جانے کے بعد بھی میں اور تاجی باہر ہی بیٹھے رہے۔ اگرچہ پچھروں کی بھرمار تھی۔ جھنڈ کے جھنڈ چاروں طرف سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ لیکن کمرے میں ٹھٹھن ہو رہی تھی اس لئے ہم نے باہر ہی بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ تاجی نے میرے ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے معاف کر دو۔ ہم واپس چلے چلیں۔ میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔“

”اب وقت گزر چکا ہے تاجی!“ میں نے جواب دیا۔ ”اور ویسے بھی تمہیں ایسی جگہ بھیج رہا ہوں جہاں زیادہ محفوظ رہو گی۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔“

تاجی اپنے مخصوص جھنڈوں پر اتر آئی تھی۔ کسی جوان اور حسین عورت کے ایسے حربے زاہد و عابد شخص کو بھی ڈیر کر دیتے ہیں لیکن میں ایسی باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے ان حربوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں بڑے اطمینان سے بیٹھا رہا۔ وہ مجھے برکانے کی بھرپور کوشش کرتی رہی۔ اور جب یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ اس پتھر میں جو تک نہیں لگ سکتی تو وہ جھنجھلا کر مجھ سے الگ ہو گئی۔

اور پھر دو رکھیتوں میں کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں دیکھ کر میں سنبھل گیا۔

”وہ لوگ آرہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لائٹین بھادو۔“

تاجی چارپائی سے اٹھ کر تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف چلی گئی اور لائٹین بھادو کی۔ وہ دوبارہ میرے قریب آ کر بیٹھی تو اس کے بدن میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

میں کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کچے راستے پر گاڑی کو جھٹکے لگ رہے تھے اور ہیڈ لیمپس کی روشنیاں اچھلتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد ہی وہ گاڑی کھیتوں کے درمیان کشادہ راستے سے ڈیرے کی طرف آنے لے تنگ راستے پر مڑ گئی۔ اب ہیڈ لیمپس کی روشنیوں کا رخ ہماری طرف تھا۔ وہ گاڑی سیدھی ری طرف آرہی تھی۔ اور پھر وہ گاڑی درختوں کے جھنڈ سے کچھ دور رک گئی اور تین چار آدمی اتر کر ہیڈ لیمپس کی روشنی میں آ گئے۔

”پولیس.....“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں پولیس کی وردیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ ”بھاگو تاجی..... اس طرف آؤ..... میرے ساتھ.....“

میں نے تاجی کا ہاتھ پکڑ لیا اور مخالف سمت میں دوڑنے لگا۔ تاجی خوف سے تھر تھر کانپ رہی

عمارت بھی سسنان پڑی تھی۔

یہ دراصل میرے ایک پرانے دوست کا ڈیرہ تھا۔ اور اس کے آس پاس کی زمینیں بھی اسی کی ملکیت تھیں۔ اس نے وہاں سے کافی آگے ایک جگہ پر ٹیوب ویل لگوا کر وہاں نیا ڈیرہ بنوا لیا تھا اور یہ ڈیرہ ویران پڑا تھا۔ میں کل اس سلسلے میں اس سے بھی ملا تھا اور اس نے نئے ڈیرے پر اپنے آدمیوں کو اطلاع بھجوا دی تھی کہ آج شام کے بعد پرانے ڈیرے کی طرف کوئی نہ جائے۔ البتہ اس پرانے ڈیرے میں اس نے ہمارے لئے کچھ انتظام کر دیا تھا۔

سولجر نے کار درختوں کے نیچے روک لی۔ اس وقت سہ پہر ہونے والی تھی۔ ڈیرے میں ایک ادھیڑ عمر آدمی ہمارا منتظر تھا۔ اس نے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا۔ ہمارے ساتھ ایک عورت کو دیکھ کر اس کے آنکھوں میں تشکیک کی جھلک ابھر آئی تھی۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔

دو چار پائیوں پر صاف ستھرے بستر بچھے ہوئے تھے۔ دروازے کے قریب ہی دیوار کے ساتھ لائٹن اور اس کے ساتھ ماچس بھی رکھی ہوئی تھی۔ دروازے کے باہر ایک پانی سے بھرا ہوا مڈکا اور اس پر شیشے کا گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہہ کر ایک چارپائی باہر نکلوا لی تاکہ وہاں بیٹھا جا سکے۔

اس ادھیڑ عمر آدمی کو میں نے فوراً ہی رخصت کر دیا اور آدھے گھنٹے بعد میں بھی کار پر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ تاجی کو میں نے بتایا تھا کہ میں ان لوگوں سے پروگرام طے کرنے جا رہا ہوں جو آج رات کسی وقت ہمیں سرحدی گاؤں کی طرف لے جائیں گے۔ سولجر سے میں نے تاجی کے سامنے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر تاجی بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے بلا درلغ گولی مار دی جائے۔

قصور میں ایس پی سعید سے ملاقات میں زیادہ ڈشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں نے اسے شروع سے آخر تک صورت حال سے آگاہ کر دیا اور اس سے پروگرام طے کرنے کے بعد ڈیرے پر واپس آیا تو شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔

”وہ لوگ دس بجے کے قریب یہاں پہنچیں گے۔“ میں نے تاجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تاجی اور سولجر باہر چارپائی پر ہی بیٹھے ہوئے تھے اور کمرے میں دروازے کے قریب رکھی ہوئی لائٹن بج رہی تھی۔

”میں کیاں والا تک تمہارے ساتھ جاؤں گا اور سولجر! تم تھوڑی دیر بعد گاڑی لے کر واپس چلے جانا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح واپس پہنچ جاؤں گا۔“

میں درختوں کے جھنڈ سے نکل کر کھیتوں میں ایک گھنڈی پر چلنے لگا اور تقریباً دو فرلانگ دور آ کر کشادہ راستے کے کنارے درختوں کے ایک اور جھنڈ کے قریب رک گیا۔ چند لمبے وہاں کھڑا تاریکی میں ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر دو انگلیاں منہ میں ڈال کر زور سے سیٹی بجاتی۔

وقفے وقفے سے تیسری بار سیٹی بجانے کے بعد کھیت کے اندر کسی جگہ کار کا انجن اشارت ہونے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی دکھائی دینے لگی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد کار کھیت سے نکل کر کشادہ راستے پر آ گئی۔ میں پلنجر سائیکل کا دروازہ کھول کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”معاف کرنا روٹی باڈا!“ سو لجر بجاتی لیتے ہوئے بولا۔ ”کل رات سے جاگا ہوا ہوں۔ سیٹ پر لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔ اس کا کیا ہوا؟“

”پولیس لے گئی اسے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی تھی؟“

”فائرنگ کی آواز؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”تو یہاں فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ یعنی پولیس مقابلہ۔“

”مقابلہ تو نہیں، صرف پولیس نے فائرنگ کی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بہر حال پولیس تاجی کو لے گئی۔ اب لاہور واپس چلو۔“

کار کچھ دیر تک کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر دوڑتی رہی، پھر ہکی سڑک پر آ گئی۔ سو لجر نے اس کا رخ لاہور کی طرف موڑ دیا۔

ہم ایجوکیشن ٹاؤن والی کوچی پر پہنچے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ نجمہ اور شبو، رشتی کے گھر میں ہوں گی۔ لیکن اپنی کوچی میں بتیاں جلتے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں گیٹ کے سامنے کار رکتے ہی نیچے اتر گیا اور کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی اور گیٹ کے اوپر سے برآمدے کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند سیکنڈ بعد ہی برآمدے والا دروازہ کھلا اور نجمہ برآمد ہوئی۔ اس کے پیچھے ہی شبو اور رشتی بھی تھیں۔ میری آواز سن کر رشتی نے آگے آ کر گیٹ کھول دیا۔

”یہ دروازہ تم نے کیسے کھولا تھا؟“ میں نے رشتی کو گھورا۔

”مجھے معلوم تھا تم چاہا یا کہاں رکھتے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ.....“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ایک دفعہ پہلے بھی تم نے.....“

”ہاں..... میں تمہاری عدم موجودگی میں دو مرتبہ یہاں آ چکی ہوں۔ لیکن یقین کرو میں نے تمہارے گھر میں کسی چیز کو کبھی نہیں چھوا تھا۔“

”ٹھی۔ اس سے دوڑا بھی نہیں جا رہا تھا لیکن میں اسے ہاتھ سے پکڑے کھینچتا رہا۔ ہمارے پیچھے اب بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اور پھر ایک جھپٹی ہوئی بھاری آواز سنائی دی۔“

”اے رک جاؤ..... ورنہ گولی مار دوں گا۔“

میں تاجی کا ہاتھ پکڑے کھیتوں کی طرف دوڑتا رہا۔ اور پھر فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ تاجی کے منہ سے چیخ نکلی۔ وہ لڑکھرائی اور زمین پر گر گئی۔

”تاجی اٹھو۔“ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر چیخا۔ ”بھاگو.....“

”مجھ سے نہیں اٹھا جاتا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔“ وہ رو دی۔ ”مجھے بچا لو روٹی! خد کے لئے مجھے بچالو۔“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو دو قدم بعد وہ پھر گر گئی۔ اس پر اس قدر خوف طاری تھا کہ اپنے قدموں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ ایک اور فائر ہوا۔ تاجی ایک بار پھر چیخ اٹھی۔ میں نے ایک بار پھر تاجی کو کھینچنے کی کوشش کی اور پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر قریبی کھیت میں چھلانگ لگا دی اور کچھ دور دوڑنے کے بعد گر گیا۔ اور اس کے بعد میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ایک اور فائر ہوا۔ بھاگ دوڑ کا شور ہوا اور پھر تاجی کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ وہ پکڑی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بھاری آواز گونجتی ہوئی سنائی دی۔

”اس کے ساتھ کو دیکھو..... وہ ادھر کھیتوں میں چھپا ہے۔“

بھاگ دوڑ کی آوازیں ایک بار پھر سنائی دینے لگیں۔ اور میں اطمینان سے پودوں میں چھپا لیٹا رہا۔



یہ سب کچھ پلاننگ کے تحت ہوا تھا۔ ایک انسپکٹر کی قیادت میں ڈیرے پر چھاپہ مارنے والی پولیس پارٹی، تاجی کو گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ انہوں نے تاجی کے ساتھیوں کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تاجی کو پکڑنے کے بعد پولیس والے کھیتوں کی طرف چند ہوائی فائر کرنے کے بعد واپس چلے گئے تھے۔

میں جب اس کھیت سے نکل کر ڈیرے کے قریب آیا تو پولیس کی گاڑی کھیتوں کے درمیان کشادہ راستے پر واپس جا رہی تھی۔ اس کی ہیڈ لیمپس کی روشنیاں اچھلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

”معاہدہ ایک غیر ملکی سفارت کار کے قتل کا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ معاہدہ نہیں دے گا۔ اور پھر یہ کیس ایس پی سعید جیسے فرض شناس اور ذمہ دار آفیسر کے پاس ہے جسے جھکا یا نہیں جاسکتا۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ صرف کل کا دن انتظار کرو۔ پرسوں سب کچھ اخبارات میں آ جائے گا۔“

کھانے کے بعد چائے کا دور بھی چلا اور پھر تین بجے کے قریب ہم سونے کی تیاری کرنے لگے۔ میرے ہاں صرف دو چار پائیاں تھیں۔ ایک میرے کمرے میں اور دوسری ساتھ والے کمرے میں۔ ہال کمرے کے وسط میں بڑی درمی پھٹی ہوئی تھی۔ اس لئے سب لوگوں نے وہیں سونے کا فیصلہ کر لیا اور جس کو جہاں جگہ ملی لیٹ گیا۔ میں نے صوفے پر قبضہ جمالیا۔ سولجر نے لیٹنے سے پہلے جی بھادی تھی۔ راہداری کی جی جلتی چھوڑ دی تھی جس کی مدد سے روشنی ہال کمرے میں بھی پہنچ رہی تھی۔

سب لوگ سوچتے تھے۔ مگر میں جاگ رہا تھا اور آج کی صورت حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

جب میں نے قصور میں ایس پی سعید سے رابطہ کیا تھا تو پہلے تو اسے میری باتوں کا یقین نہیں آیا تھا۔ لیکن ماضی میں میری فراہم کردہ اطلاعات کے پیش نظر اسے میری بات کا یقین کرنا پڑا۔ لیکن میری توقع کے مطابق وہی مسئلہ سامنے آ گیا۔ یعنی وہ اپنے علاقے سے باہر کسی جگہ چھاپہ نہیں مار سکتا تھا۔ البتہ اس نے یہ بات ضرور کہی تھی کہ وہ لاہور کے اس علاقے کے پولیس آفیسر کو فون پر اطلاع دیدے تو وہ کارروائی کر سکتا ہے۔ میں نے یہ اُلجھن بھی دور کر دی۔ جب میں نے بتایا کہ تاجی اس کے علاقے میں موجود ہے اور بھارت کی طرف فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہے تو وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ منجھ گیا تھا کہ میں ہی تاجی کو اس طرف لے کر آیا ہوں۔

اور پھر اس نے خود ہی پروگرام بنالیا کہ ڈیرے پر چھاپہ کس طرح مارا جائے گا۔ صرف چار آدمی ایک انشپکڑی قیادت میں آئے تھے اور اس طرح تاجی اس کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ اس کے ساتھیوں کے بارے میں یہ کہا جاتا کہ وہ رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کھیتوں میں فرار ہو گئے تھے۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ اپنے ہاتھ پر ہلکا سا بوجھ محسوس کر کے چونک گیا۔ میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ نجمہ صوفے کے قریب درمی پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ جاگ رہی تھی۔ اور اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔

ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اور پھر نجانے کب میری

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تم اندر چلو۔“ میں نے کہا اور گیٹ پوری طرح کھول دیا۔ سولجر گاڑی اندر لے آیا تو میں نے گیٹ بند کر دیا اور ہم اندر آ گئے۔

گھر کی حالت دیکھ کر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری نظر آرہی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں آنے کے بعد ان تینوں نے صفائی پر اچھا خاصہ وقت لگایا تھا۔

”کیوں بھی گھر والو!“ سولجر باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو ملے گا یا نہیں؟“

”تین تین عورتیں گھر میں ہوں اور کچھ کھانے کو نہ ملے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ رخصی نے جواب دیا۔ ”میں نے کھانا تیار رکھا ہوا ہے۔ بس سالن گرم کرنے میں دو منٹ لگیں گے۔“

”تمہارے بازو کی تکلیف کیسی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب تو تکلیف زیادہ نہیں ہے۔“ رخصی نے بازو کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے جواب دیا۔ ”دوپہر کو سولجر ہمیں میرے ہی گھر چھوڑ کر گیا۔ رات کا کھانا بھی ہم نے وہیں تیار کیا تھا۔ پھر دس بجے کے قریب ہم تینوں یہاں آ گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہارا استقبال تمہارے ہی گھر پر کیا جائے۔“

”استقبال تو ہو چکا۔ اب جلدی سے کھانا لے آؤ۔ واقعی بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“ میں نے کہا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

میرا سارا دن بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ قصور تک آمد و رفت کے سفر نے تو مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ راستے کی دھول مٹی سے الگ برا حال ہو رہا تھا۔ میں بہت دیر تک شاور کے نیچے کھڑا ٹھنڈے پانی سے نہاتا رہا اور جب کپڑے بدل کر باہر نکلا تو اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

نجمہ نے سنٹر ٹیبل پر کھانا لگا دیا تھا۔ میں اور سولجر کھانا کھاتے اور باتیں کرتے رہے۔ نجمہ کو زیادہ دلچسپی تاجی سے تھی۔ وہ اس کے بارے میں کیریڈ کرید کر پوچھ رہی تھی۔

”اب اس کا انجام پھانسی کے تختے پر ہی ہو گا۔“ میں اسے بتا رہا تھا۔ ”پولیس اس سے سب کچھ قبولوالے لگی اور ایسے ایسے لوگوں کے چہرے بے نقاب ہوں گے کہ پورے ملک میں نہیں تو لاہور میں ضرور ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا۔ صرف کل کا دن انتظار کرو۔ پرسوں اخبارات سے تمہیں سب کچھ پتہ چل جائے گا۔“

”اس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ نجمہ نے کہا۔ ”اگر پولیس نے دباؤ میں آ کر اس کیس کو دبا دیا تو۔۔۔۔۔؟“

تاجی نے ان درجنوں لڑکیوں کے بارے میں بھی بتایا تھا جنہیں اس نے سبز باغ دکھا کر ملک کے مختلف حصوں سے اغوا کیا تھا۔ ان میں نجمہ کا نام بھی شامل تھا۔ لیکن بہت سی لڑکیوں کے نام پتے تو اسے یاد بھی نہیں رہے تھے۔

ایس پی سعید کے بیان کے مطابق قصور میں ابتدائی تفتیش کے دوران تاجی نے انکشاف کیا تھا کہ مادام دھکے کو اس کے ساتھی کلکیل نے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا تھا اور دھکے کا گن مین بھی اس کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔ اس روز تاجی نے مجھے غلط بتایا تھا کہ کلکیل سلامت پورہ میں اپنی بہن کے گھر چھپا ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید کلکیل اسے میرے قبضے سے چھڑانے کی کوشش کرے گا۔ اسی لئے اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن پولیس کے سامنے وہ جھوٹ نہیں بول سکی تھی اور بتا دیا تھا کہ وہ کچی تھنڈی میں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔

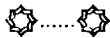
قصور کی پولیس نے کل دن میں ہی لاہور پولیس کے تعاون سے چھاپہ مار کر کلکیل، جیدی اور ریاض کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ اور اس پولیس کانفرنس میں وہ تینوں بھی موجود تھے۔ کلکیل نے بھی اخبار نویسوں کے سامنے مادام دھکے کے قتل کا اعتراف کر لیا تھا۔

تمام اخبارات میں مرکزی خبر کے علاوہ چھوٹی چھوٹی خبروں کی صورت میں اور بھی بہت سے انکشافات تھے۔ اور مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع کی گئی تھی۔ اور لچپی کی بات یہ تھی کہ میرا نام کہیں بھی نہیں تھا۔ البتہ تاجی نے جن معززین اور شرفاء کو نکال دیا تھا ان میں ملک شہاب کا نام بھی شامل تھا۔ اس کے بیان کے مطابق وہ بھی دو تین مرتبہ اس کی چوکھٹ پر حاضری دے چکا ہے۔ میں نے اپنے چہرے کے سامنے سے اخبار ہٹایا تو مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ نجمہ، رختی، سولجر اور یہاں تک کہ شبو بھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ سب کے ہاتھوں میں ایک ایک اخبار تھا اور سب کے سر اخباروں پر اس طرح جھکے ہوئے تھے جیسے ہونہار طالب علم کلاس روم میں بیٹھے بڑے انہماک سے اپنا اپنا سبق یاد کر رہے ہوں۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اور پھر سب سے پہلے نجمہ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی سنسنی تھی۔

میری پُرہنگام زندگی کا ایک مرحلہ اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ اور اب ملک شہاب سے معرکہ باقی رہ گیا تھا۔ وہی میرا اصل حریف تھا۔

رختی نے بھی اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ چند لمحے خاموشی میں گزرے اور پھر ہمارے بیچ مباحثوں اور تبصروں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔



آنکھیں بند ہوئیں اور میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔



اگلادان ہمارے حساب سے کسی غیر معمولی بات کے بغیر گزر گیا۔ لیکن اس سے اگلے روز اخبارات کی ہیڈ لائنز چیخ چیخ کر ہنگامہ خیز صورت حال بیان کر رہی تھیں۔

ایک اخبار تو میرے ہاں آتا ہی تھا۔ سولجر اسٹال پر جا کر تین چار اخبار اور لے آیا تھا اور تمام اخباروں کی ہیڈ لائن ایک ہی تھی۔

”لبنانی سفیر مادام دھکے کے قاتل گرفتار کر لئے گئے۔“

اس ہیڈ لائن کے نیچے کئی ذیلی سرخیاں تھیں۔ تاجی کے ساتھ کلکیل کی تصویر دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ اور پھر وہ خبر پڑھتا چلا گیا۔

مادام دھکے کے قاتلوں کی گرفتاری کا انکشاف لاہور میں آئی جی کے دفتر میں ایک ہنگامی پولیس کانفرنس میں کیا گیا تھا۔

ایس پی سعید کے مطابق اسے خفیہ طور پر اطلاع ملی تھی کہ لبنانی سفارت کار کے قاتل ہندوستان کی طرف فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس اطلاع پر قصور کے قریب کھیتوں میں ایک ویران ڈیرے پر چھاپہ مارا گیا۔ ممتاز عرف تاجی نامی عورت پولیس کے ہاتھ لگ گئی جبکہ اس کے دوسرے ایک زبردست مقابلے کے بعد تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کھیتوں میں فرار ہو گئے۔ قصور کے پولیس آفس میں تاجی نامی اس عورت سے پوچھ گچھ کی گئی تو یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ مادام دھکے کو تاجی نے کلکیل نامی ایک آدمی کے ساتھ مل کر قتل کیا تھا۔

تاجی نے پولیس کے سامنے یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ یہ قتل رانا مقبول عرف جسوت سنگھ نامی ایک شخص کے کہنے پر کیا گیا تھا جس نے اسے دس لاکھ روپے اور سونے کے زیورات تحفے میں دیئے تھے۔

تاجی نے اخبار نویسوں کے سامنے اور بھی بہت سے سنسنی خیز انکشافات کئے تھے کہ کس طرح این جی او کی آڑ میں اس نے بدکاری کا اڈہ کھول رکھا تھا اور کون کون لوگ اس کی پشت پناہ کرتے اور عیاشی کے لئے اس کی چوکھٹ پر سر جھکاتے تھے۔

ان میں کئی اعلیٰ سرکاری آفیسروں، سیاستدانوں اور وزیروں کے نام بھی تھے۔ یہ سب لوگ تھے جنہیں معاشرے میں نہایت اعلیٰ اور معزز مقام حاصل تھا۔ پہلے بھی ایسے لوگوں کے چہرے بے نقاب ہوتے رہتے تھے۔ لیکن تاجی نے اپنے بیان سے انہیں جس طرح تنکا کیا تھا وہ بڑی عبرت انگیز بات تھی۔

لیا تھا۔ اس کے برعکس وہ آئے دن تاجی کی کوٹھی پر آکر داد عیش حاصل کرتا رہا تھا۔ ایسے بددیانت اور راہی افسروں کے خلاف بھی عوام کے مظاہرے جاری تھے۔ پورے شہر میں ان کے خلاف بینرز لگے ہوئے تھے۔ ان کی گرفتاری اور ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے مطالبے کئے جا رہے تھے۔ بعض افسروں کے بارے میں تو عوام کا مطالبہ یہ تھا کہ انہیں ان کے حوالے کر دیا جائے۔

”وہ چھوٹی سیاسی جماعتیں جنہیں پنپنے کا کبھی موقع نہیں مل سکا تھا اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ خود ساختہ لیڈر آگے آرہے تھے اور بڑی جوشیلی تقریریں کر کے عوام کو ان بڑے سیاستدانوں کے خلاف بھڑکا رہے تھے جنہوں نے سیاست میں کبھی ان کی دال نہیں گھنے دی تھی۔

شرپند اور غنڈہ عناصر بھی اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ہنگامہ آرائی میں یہ سب سے آگے تھے۔ پھراؤ، توڑ پھوڑ اور لوٹ مار میں یہ غنڈے اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے تھے۔

پولیس بددیانت اعلیٰ سرکاری افسروں اور ان سیاستدانوں کو بھرپور تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ جو عوام یا اس ملک سے کبھی بھی تعلق نہیں رہے تھے بلکہ وہ محض اس ملک کو لوٹنے کے لئے سیاست میں آئے تھے ان میں سے کئی کی کوٹھیوں پر پولیس کا زبردست پہرہ تھا۔ کئی لوگ رو پڑے ہوئے تھے لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جو عوام کے ایک ہجوم کے ہاتھ لگ گیا۔

وہ ماکھا گجر کا خاندان تھا۔ جو ایک سرحدی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کا اصل نام مبارک علی تھا لیکن بچپن ہی سے اسے ماکھا کہہ کر پکارا جاتا تھا اور پینتالیس سال کا ہونے کے باوجود وہ اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔

ماکھا گجر کا خاندان برسوں سے دودھ کا کاروبار کرتا آ رہا تھا اس کے ماں باپ کا بھی یہی کام تھا اور ماکھا گجر نے بھی آٹھویں تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہی کاروبار سنبھالا تھا۔

ان کے پاس بیسیوں بھینسیں تھیں جن کا دودھ صبح شام شہر پہنچایا جاتا تھا۔ اس کاروبار میں اگرچہ انہیں لاکھوں کی آمدنی تھی مگر اس کے علاوہ ان کے اور دھندے بھی تھے جنہیں کسی طور بھی جائز نہیں کہا جاسکتا تھا۔

ماکھا گجر کا گاؤں انڈیا کی سرحد سے بالکل ملا ہوا تھا۔ وہ چہر کمیت بھی انہی کی ملکیت تھے جو سرحدی لکیر تک چلے گئے تھے۔ ماکھا گجر کا خاندان شروع ہی سے اس صورتحال سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس گنگ اس خاندان کا وہ دھندہ تھا جس سے انہیں تو فائدہ پہنچ رہا تھا لیکن اس

مادام دیکھ اور تاجی کا باب ختم ہو چکا تھا۔

تاجی کے بیان نے پورے ملک میں ہلچل سی مچادی تھی۔ بعض علاقوں میں تو ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ لاہور اس حوالے سے سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔ پھرے ہوئے لوگ ان معززین کو تلاش کر رہے تھے۔ جنہیں تاجی کے بیان نے ننگا کر دیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں عوام نے اپنے دونوں کے ذریعے منتخب کر کے اسمبلیوں میں بھیجا تھا۔ تاکہ وہ ان کے مسائل حل کروا سکیں۔ ملک کی بھلائی اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کام کر سکیں۔ لیکن وہ لوگ اسمبلیوں میں جا کر عوام کو بھول گئے تھے۔ انہیں صرف اپنی عیاشیاں یاد رہ گئی تھیں۔ اور وہ تاجی جیسی طوائفوں کے ہاتھوں کا کھلوتا بن گئے تھے۔ انہوں نے اپنی عزت، ناموس، شرافت اور سب کچھ تاجی جیسی طوائفوں کے قدموں پر ڈال دیا تھا۔ ان کے حلقے کے ہزاروں لوگ مل کر بھی ان سے اپنا کوئی جائز مطالبہ نہیں منوا سکتے تھے۔ لیکن اکیلی تاجی نے معمولی سے اشارے پر ان سے بڑی بڑی باتیں منوالی تھیں۔ انہی کی نظر کرم سے بڑے بڑے ذکیت، قائل اور سنگین جرائم میں لوٹ لوگ قانون کی گرفت میں آنے سے بچ رہے تھے۔ اور اب وہی لوگ اپنی چانیں بچانے کے لئے چھپتے پھر رہے تھے۔ پولیس اپنی فرض شناسی کا ثبوت اس طرح دے رہی تھی کہ ایک طرف ان معززین کو بھرپور تحفظ فراہم کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف ان کے خلاف غم و غصے کا اظہار کرنے والے عوام پر لٹائیاں اور گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔

وہ سرکاری آفیسر جو تاجی اور اس کی فراہم کردہ لڑکیوں کے حسن و شباب سے فیض یاب ہوتے رہے تھے۔ وہ بھی عوام کے عتاب کا شکار بنے ہوئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کسی عام آدمی کا جائز کام بھی رشوت لئے بغیر نہیں کرتے تھے۔ لیکن تاجی کے ایک اشارے پر سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ ان میں پولیس کے علاوہ دوسرے حکموں کے اعلیٰ افسران بھی شامل تھے۔ ان میں ایک تو وہ تھا جس نے ایک رات تاجی کی کوٹھی پر گزارنے کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر ماڈل ٹاؤن میں آٹھ کنال کا ایک پلاٹ تاجی کو الاٹ کر دیا تھا اور ایک وہ پولیس آفیسر تھا جس نے تاجی پر ایک اغوا شدہ لڑکی کا قتل ثابت ہو جانے کے بعد بھی اسے قانون کی گرفت میں نہیں

جائے مخصوص انداز میں ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ ماکھا گجر اکثر سوچتا کہ اسے پہلے سیاست میں آنے کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔

اسمبلی کا ممبر بننے کے بعد تو اس کے اسمگلنگ کے دھندے میں بھی ساری رکاوٹیں خود بخود دور ہو گئی تھیں۔

باغبانپورہ والے مکان میں وہ عوام سے رابطہ رکھتا تھا۔ ان سے وعدے کرتا تھا۔ انہیں سبز باغ دکھاتا تھا۔ البتہ سمن آباد والی کوٹھی اس کے آرام اور آرائش کے لئے مخصوص تھی۔ یہاں اس کے خاص دوست جمع ہوتے۔ بڑے بڑے لوگوں کو دعوتیں دی جاتیں۔ جن میں اعلیٰ سرکاری آفیسرز بھی مدعو ہوتے۔ ان دعوتوں میں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی تھی..... شراب نوشی کی عادت تو ماکھا گجر کو بہت عرصہ پہلے ہی تھی۔ لیکن پہلے وہ ٹھرا قسم کی دیسی شراب پیا کرتا تھا۔ اب ان محفلوں میں اعلیٰ قسم کی انگلش شراب اڑائی جاتی تھی۔ ماکھے کو عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن ایک روز سمن آباد والی کوٹھی میں اس کی ملاقات تاجی سے ہو گئی۔ وہ اس علاقے کے ایک معزز شخص کے ساتھ اس محفل میں آئی تھی۔ یوں تو ان محفلوں میں عورتوں کا آنا کوئی اچھے کی بات نہیں تھی۔ اکثر لوگوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی حسین عورت ضرور ہوتی تھی۔ لیکن ماکھا گجر کسی سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ مگر اس رات تاجی کو دیکھ کر نجانے کیوں وہ اپنے دل میں کچھ کچھ محسوس کرنے لگا۔

گوری چٹی اونچی لمبی تاجی نے گہرے جامنی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جو اس کی گوری چٹی رنگت پر خوب سج رہی تھی۔ وہ جب بھی ماکھے کے سامنے آتی۔ ساڑھی کا پلو نیچے اٹھکا رہتا۔ اس کے سیلیولیس بلاؤز کا گریبان بھی خاصا فراخ تھا۔ اس کے گداز بدن کے جھلکتے ہوئے عریاں حصے دیکھ کر ماکھا گجر اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگتا۔

چند روز بعد تاجی سے ایک اور ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات اس معزز شخص کے گھر ہوئی تھی۔ جس کے ساتھ تاجی پہلی مرتبہ آئی تھی۔ یہاں کتنی کے چند دوست تھے۔ نہایت بے تکلف قسم کے تاجی بھی ماکھے گجر سے بے تکلف ہو گئی۔

اور پھر یہ بے تکلفی بڑھتی گئی۔ کبھی ماکھے گجر کی سمن آباد والی کوٹھی پر اور کبھی اس معزز شخص کے گھر میں۔ اور بالآخر ایک رات ماکھے گجر کے قدم تاجی کے دروازے تک پہنچ گئے۔ اس رات تاجی نے اس کی بے چینی کسی حد تک دور کر دی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس کے بڑے دل میں لگی ہوئی آگ کو کچھ اور بھڑکا دیا۔

تاجی کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تو تھی۔ اس نے ماکھے گجر کو پوری طرح اپنے جال

سے ملک کی جڑیں مسلسل کھوکھلی ہو رہی تھیں۔ اناج، گھی، تیل اور دیگر کئی چیزیں بڑی مقدار میں سرحد پار اسمگل کر دی جاتی تھیں۔

ماکھا گجر نے بڑے ہو کر اپنے باپ کا دودھ کا کاروبار سنبھالتا تو اسمگلنگ کا دھندہ بھی اسے وراثت میں ملا تھا۔ وہ ایک آدھ مرتبہ پکڑا بھی گیا۔ مگر پیسہ دے کر چھوٹ جاتا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بات بھی خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اس علاقے کے ایم پی اے جیسے لوگوں کا یہ گھناؤنا کاروبار بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہتا تھا۔ ان کے آدمی بھی اس سرحدی پٹی سے ادھر کا مال ادھر کرتے تھے لیکن کبھی پکڑے نہیں گئے تھے اور اتفاق سے کبھی کوئی فرض شناس آفیسر انہیں پکڑ بھی لیتا تو یا تو اس آفیسر کو کسی علاقے میں ٹرانسفر کر دیا جاتا یا اسے کسی الزام میں ملازمت ہی سے نکال دیا جاتا۔

ماکھا گجر طویل عرصے تک گہری نظروں سے صورتحال کا جائزہ لیتا رہا اور بالاخر اس نے بھی اس اسمبلی کا ممبر بننے کا فیصلہ کر لیا اور اگلے الیکشن کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔

یہ گجروں کا نامی گرامی خاندان تھا۔ ان کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ ماکھا گجر پوری سندھ سے اپنا ہوم ورک کرتا رہا۔ اس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی ویسے بھی پاکستان کی یہ ریت رہی ہے کہ یہاں برادریوں اور قومیتوں کی بنیاد پر ہی الیکشن جیتے جاتے ہیں۔ پاکستان کے لئے ووٹ کوئی نہیں دیتا۔ یہاں برادری اور قومیت کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ ماکھا گجر کے پاس دونوں چیزیں تھیں۔ گجر برادری پورے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کے پاس روپے پیسے کی بھی کمی نہیں تھی۔ وہ الیکشن میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گیا۔

ماکھا گجر اب اسمبلی کا ممبر تھا۔ اب وہ دودھ فروش نہیں اسمبلی کا ایک معزز رکن تھا۔ اس نے ایک شاندار کار خرید لی تھی۔ جس کے آگے پیچھے ایم پی اے کی سنہری حروف والی پلیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ پولیس والے اس کی گاڑی دیکھ کر سیلوٹ کرتے۔

ماکھا گجر عوام سے رابطہ رکھنے کے لئے باغبانپورہ میں ایک مکان خرید لیا اور کچھ عرصہ بعد اس نے سمن آباد میں بھی ایک شاندار کوٹھی خرید لی۔

سیاست میں آنے کے بعد پہلی بار اسے پتہ چلا کہ زندگی کے مزے کیا ہوتے ہیں۔ وہی پولیس والے جو اس کے دودھ کے ڈرموں سے لدے ہوئے رہڑوں کا چالان کیا کرتے تھے اس کو دیکھ کر کھٹ۔ سیرایاں بجا دیتے۔ اخبار نویس اس کے انٹرویو اور بیانات حاصل کرنے کے لئے اس کا گھیراؤ کئے رکھتے۔ جب وہ اسمبلی کے کسی اجلاس میں شرکت کے لئے جاتا تو کار سے اترتے ہی اس کے سامنے کیمروں کی فلش لائیں چمکنے لگتیں۔ وہ ہونٹوں پر مسکرائیں

نہیں سنی اور دمکی دی کہ اگر پولیس نے مداخلت کی تو خون خرابہ ہوگا۔ جس کی ذمہ داری پولیس پر عائد ہوگی۔ پولیس پیچھے ہٹ گئی۔ لوگوں نے اس مالکے گجر اور اس کے حامیوں کو جو قابو آگئے تھے، نکال کر دیا۔ ان کے جسموں پر صرف ایک ایک چنڈی رہنے دی گئی۔ پھر ان کے منہ کالے کر کے بازاروں میں گھمایا گیا اور ان کے خلاف نعرے لگائے گئے۔ میں گہری نظروں سے صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان ہنگاموں میں کہیں ملک شہاب کا نام بھی سننے میں آئے گا مگر وہ چالاک آدمی تھا۔ صورتحال کا اندازہ لگاتے ہی روپوش ہو گیا تھا۔ کئی روز تک اس کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آیا۔

اور پھر ایک روز اخبار نے ایک مختصر سا مضمون شائع کیا جس کے ساتھ ملک شہاب کی تصویر بھی تھی۔ مضمون میں ملک شہاب کے کالے کرتوتوں کو کھول کر بیان کیا گیا تھا۔ ہیر وئن کی اس گنگ کے حوالے سے اسے معصوم اور بے گناہ لوگوں کا قاتل قرار دیا گیا تھا۔ مضمون نگار نے بعض بڑے لوگوں اور سرکاری افسروں کی نشاندہی بھی کی تھی جو ذاتی مفاد کے لئے ہیر وئن کے گناہوں کا روبرو میں درپردہ اس کی حمایت اور مدد کرتے تھے۔

مضمون میں گلبرگ اور ماڈل ٹاؤن میں ملک شہاب کی ان دو کوشیوں کی نشاندہی بھی کی گئی تھی جو اس نے ناجائز آمدنی سے بنائی تھیں۔

میرا خیال تھا کہ لوگ اخبار کے اندرونی صفحہ پر شائع ہونے والے اس مختصر سے مضمون کو نظر انداز کر دیں گے۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ لوگ ابھی غصے میں پھرے ہوئے اور طیش کھائے ہوئے تھے۔ وہ ملک شہاب جیسے شخص کو کیسے نظر انداز کر دیتے جس نے نوجوان نسل کے خون میں زہر گھول دیا تھا۔ ہیر وئن کے استعمال سے ہزاروں نوجوان موت کے گھاٹ اتر چکے تھے اور لاکھوں مفلوج ہو رہے تھے۔

اس رات عوام کے پھرے ہوئے دو گروہوں نے ملک شہاب کی گلبرگ ماڈل ٹاؤن والی کوشیوں پر دھاوا بول دیا۔ ملک شہاب ان دونوں میں سے کسی کوشی میں موجود نہیں تھا۔ لوگوں نے دونوں کوشیوں کو آگ لگا دی اور جب اطلاع پا کر فائر بریگیڈ کی گاڑیاں پہنچیں تو لوگوں نے انہیں بھی قریب نہیں آنے دیا۔ پولیس بھی دور ہی رک گئی تھی۔

یہ ہنگامے کئی روز تک جاری رہے اور پھر لوگ سب کچھ بھول گئے جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ لوگ ہر بات کو بھول جانے کے عادی ہوتے ہیں۔

میں ان ہنگاموں کے دوران خاموش ہی رہا تھا میرا اگرچہ کہیں بھی نام نہیں آیا تھا لیکن میں باہر نکلنے سے گریز کرتا رہا۔ انتہائی ضرورت کے وقت باہر نکلتا اور تھوڑا سا گھوم پھر کر واپس

میں پھنسا لیا تھا اور جب مالکے گجر سے ایک ”چھوٹی سی فرمائش“ کی تو وہ انکار نہیں کر سکا تھا۔ اس نے تاجی کے دوست اس معزز شخص کو اپنے علاقے میں سڑکوں کی تعمیر کا کروڑوں روپے کا ٹھیکہ دلوا دیا۔ اس کام کے لئے متعلقہ محکمے نے باقاعدہ طور پر ٹینڈر طلب کئے تھے۔ اصولی طور پر یہ ٹھیکہ اسی کمپنی کو دیا جانا چاہیے تھا جس نے سب سے کم ریٹ دیئے تھے مگر یہ ٹھیکہ تاجی کے دوست معزز شخص کو دے دیا گیا جس کے ریٹ سب سے زیادہ تھے۔ مالکے گجر تاجی کی بات نہیں ٹال سکتا تھا اور محکمہ کا سربراہ مالکے کا حکم ٹال کر اپنی نوکری سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا۔ مالکے آخر کو اس علاقے کا اسمبلی ممبر تھا۔

تاجی بڑی ہوشیاری سے کام لے رہی تھی۔ اس نے لشکارے دے دے کر مالکے گجر سے ایسے کام کروائے تھے جن کا کوئی قانونی جواز نہیں بنتا تھا۔ اس سے کئی لوگوں کی حق تلفی ہوئی تھی۔ لیکن نہ تو تاجی کو اس کی پروا تھی اور نہ ہی مالکے گجر کو احساس۔ تاجی کو صرف مالکے کے توسط سے ملنے والی دولت سے غرض تھی اور مالکے کو اپنی عیاشی سے جس کا ذریعہ تاجی تھی۔

اور یہ وہی مالکے گجر تھا جو ان ہنگاموں میں پھری ہوئی پبلک کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ مالکے گجر ان دنوں سن آباد والی کوشی میں تھا۔ وہ صورتحال سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ تاجی نے گرفتاری کے بعد دیئے جانے والے بیان میں جن لوگوں کے نام لے لے کر ان کے کرتوت واضح کئے تھے وہ یا تو روپوش ہو گئے تھے یا انہوں نے کسی متوقع صورتحال سے نمٹنے کے لئے پولیس سے مدد طلب کر لی تھی۔ لیکن مالکے گجر کو گھمنڈ تھا کہ وہ اسمبلی کا ممبر ہے۔ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ویسے اس نے احتیاطاً چار گن میں اپنی کوشی پر تعینات کر دیئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر عوام کے کسی گروہ نے اس کی کوشی کے سامنے مظاہرے کی کوشش کی تو وہ لوگ گن میٹوں کی کلاشکوف رائفلیں دیکھ کر تتر بتر ہو جائیں گے۔ لیکن جب عوام کا بھرا ہوا ریلوے چاروں گن مین بھی بے بس ہو کر رہ گئے۔ لوگوں نے ان کی رائفلیں چھین کر توڑ دیں۔

یہ صورتحال دیکھ کر مالکے گجر نے کوشی کی عقبی دیوار پھلانگ کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر لوگوں نے اسے بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے سڑک پر لا کر خوب دھلائی کی گئی۔

اس ہنگامے کی اطلاع پا کر پولیس بھی پہنچ گئی۔ لیکن پھرے ہوئے جھوم کو دیکھ کر وہ بھی ”وو رک گئے اور خاموش تماشاخیوں کی طرح تماشہ دیکھنے لگے۔ تاہم ایک ذمہ دار پولیس آفیسر نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں لیکن لوگوں نے اس کی ایک

نہیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی گڑبڑ در ہے۔

”کیا بات ہے۔ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟“
میں نے پوچھا۔

”وہ دولت کہاں ہے؟ رختی نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

”کیا.....؟ کوئی دولت.....؟“ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”انجانے بننے کی کوشش مت کرو رختی۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔
”میں اس دولت کی بات کر رہی ہوں جو تم مادام دھکے کی کوٹھی سے اڑا کر لائے تھے اور آج
بک اس بات کو مجھ سے چھپائے رکھا تھا۔“

”اوہ۔“ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف
دیکھا رہا۔ پھر ڈرینگ ٹیبل سے چابی نکال کر الماری کا تالا کھولنے لگا۔

میں نے الماری کے دونوں دروازے چوہت کھول دیئے۔ درمیان والے خانے میں
نوٹوں کے بنڈل رکھے ہوئے تھے۔ جن کے اوپر ایک کپڑا پڑا ہوا تھا۔ میں نے وہ کپڑا ہٹا
دیا۔ نوٹوں کے یہ بنڈل پندرہ بیس لاکھ روپے کی مالیت سے زیادہ نہیں تھے۔

”یہ دولت اگرچہ میں نے تم سے شناسائی ہونے سے پہلے حاصل کی تھی۔ لیکن اگر تم اس
میں جسے دار بننا چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم اس میں سے جتنی رقم چاہو لے سکتی
ہو۔“

”میں اگر چاہتی تو کئی روز پہلے یہ پوری کی پوری رقم غائب کر دیتی اور تمہیں پتہ بھی نہ
چلتا۔“ رختی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں آتے جاتے اکثر برآمدے کے
ایک پلر کے قریب جھٹکتے ہوئے دیکھا تھا۔“ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”جب تم
کئی روز تک غائب رہے تو مجھے تجسّس ہوا اور ایک رات میں نے یہاں آکر پلر کے پیچھے ہاتھ
ڈالا تو مجھے چابیوں کا گچھا مل گیا۔ میں نے اندر داخل ہو کر پورے گھر کی تلاشی لی۔ اس میں
ڈرینگ ٹیبل میں مجھے الماری کی چابی بھی مل گئی اور میں نے الماری میں رکھے ہوئے نوٹوں
کے یہ بنڈل بھی دیکھ لئے میں اگر چاہتی تو اس روز یہ بنڈل غائب کر دیتی اور تمہیں مجھ پر شبہ
بھی نہ ہوتا۔“ وہ ایک بار پھر چند لمحوں کو خاموش ہو گئی اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے
لگی۔ ”اس روز پہلی بار مجھے شبہ ہوا تھا کہ تم نے مادام دھکے کی کوٹھی سے دولت بھی چا لی تھی۔
اس سے پہلے میں تمہارے پاس وہ لاکٹ بھی دیکھ چکی تھی۔ میں نے پورے گھر کی تلاشی لے
ڈالی۔ کسی ایسی جگہ کو نظر انداز نہیں کیا جہاں کچھ چھپایا جاسکتا ہو۔ مگر مجھے اور کچھ نہیں ملا۔“

آجاتا۔

اگرچہ ہمارا یہ ٹھکانہ بالکل محفوظ تھا۔ لیکن میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس لئے شب کو
اس کے گھر واپس بھیج دیا۔ وہ ایک شریف اور غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ غریب ہونے کے
باوجود اس محلے میں اس کے باپ کی بڑی عزت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہم پر ایسا کوئی وقت
آنے پر شبو بھی ہمارے ساتھ پکڑی جائے یا ہمارے ساتھ اس کا نام بھی آئے۔ اس طرح ظاہر
ہے اس کے باپ کی رسوائی ہوتی غریب کے پاس عزت ہی تو سب سے بڑی دولت ہوتی
ہے۔ اسے بٹہ لگ جائے تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔

میرے اور رختی کے تعلقات اب کسی سے ڈھکے چھپے نہیں رہے تھے۔ محلے کے لوگ سب
کچھ دیکھتے مگر کوئی ہمارے خلاف زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ حالانکہ میں سمجھتا تھا
کہ اگر محلے کا کوئی آدمی ہمارے خلاف پولیس میں شکایت کر دیتا تو ہم اچھی خاصی مصیبت میں
پھنس سکتے تھے۔

رختی اب صرف میرے گھر تک محدود نہیں تھی۔ اس کے اپنے گھر کے بھی چکر لگتے رہتے
تھے اور پھر ایک روز یہ انکشاف میرے لئے خاصا دلچسپ ثابت ہوا کہ محلے کے لوگ ہمارے
خلاف کوئی شکایت کیوں نہیں کر رہے تھے۔ رختی نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے
سامنے والی پڑوسن کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ نجمہ سایہ وال کی رہنے والی اور اس کی
بچپن کی سہیلی ہے اور یہ کہ میں اس سے شادی کر کے لایا ہوں اس طرح لوگوں کی زبانیں بند
ہو گئی تھیں۔ شادمان والی کوٹھی میں تاجی سے مادام دھکے کے بارے میں پوچھ گچھ کے دوران
رختی یہ بھی جان گئی تھی کہ میں مادام دھکے کی کوٹھی سے بہت سی دولت اڑا لایا تھا اور اتنے دن
کی خاموشی سے میں یہ سمجھا تھا کہ رختی شاید اس بات کو بھول چکی تھی لیکن میرا خیال غلط نکلا وہ
ایسی باتوں کو آسانی سے بھولنے والی نہیں تھی۔

اس روز نجمہ سولجر کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھی۔ میں اور رختی گھر میں اکیلے تھے۔ میں اس
وقت کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ کئی روز گھر میں بند رہنے سے بیزار سی طاری تھی اور میں
سوچ رہا تھا کہ ایک دو روز میں مجھے باہر نکلتا چاہئے۔ ملک شہاب کو تلاش کر کے اسے کیفر
کردار تک پہنچانا میرا مشن تھا۔ لیکن اس طرح گھر میں پڑے رہ کر میں اپنے اس مشن کو کیفر
کردار تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ رختی کمرے میں آکر بیٹھ کے سامنے کرسی پر بیٹھ
گئی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی اور نظریں میرے چہرے پر جیسے کچھ ٹول رہی

کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں مادام دھکے کی نوکری چھوڑے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے اور ہو سکتا ہے اس دوران اس نے وہ دولت تمہ خانے سے نکال لی ہو اور اپنے سفارت خانے پہنچا دی ہو یا کسی اور محفوظ جگہ منتقل کر دی گئی ہو۔“

”نہیں۔“ رخشی نے جواب دیا۔ ”میں پورے رثوق سے کہہ سکتی ہو کہ وہ دولت اب بھی اسی تہہ خانے میں موجود ہے اور اگر ہم نے جلدی ہی کوئی قدم نہ اٹھایا تو وہ سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”لیکن..... وہاں ابھی تک پولیس کا پہرہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پولیس والوں کی موجودگی میں ہم کوٹھی میں کیسے گھس سکتے ہیں۔“

”میں نے ایک طریقہ سوچ رکھا ہے۔“ رخشی مسکرائی ”ہم آسانی سے نہ صرف کوٹھی میں بلکہ تہہ خانے میں بھی داخل ہو جائیں گے۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے ابھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

رخشی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور پھر اس نے جو طریقہ بتایا میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”اگر ان پولیس والوں کو شبہ ہو گیا تو وہ گولی مار دیں گے۔“

”تم مرد ہو کر مرد کی فطرت کو نہیں سمجھ سکے۔“ رخشی نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھ جیسی حسین لڑکی جب بکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں گرنے کو تیار ہو تو بڑے بڑے زاہد و عابد بھی لڑکھڑا جاتے ہیں اور وہ تو پولیس والے ہیں جو چند روپوں کے لئے اپنا ایمان بیچ دیتے ہیں۔ آج رات کو مجھ جیسی خوبصورت لڑکی کو دیکھیں گے تو ان کی رال ٹپک پڑے گی۔ وہ نہ صرف اپنا فرض بلکہ اپنے آپ کو بھی بھول جائیں گے۔“

”سوچ لو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”اگر تم واقعی ان کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ بھوکے بھڑیلوں کی طرح تم پر ٹوٹ پڑیں گے اور تمہارے پیچھے ادھیڑ ڈالیں گے۔“

”میں ایسا موقع نہیں آنے دوں گی۔“ رخشی نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور پھر تم کس مرض کی دوا ہو۔ کیا تم دور کھڑے تماشہ دیکھتے رہو گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ رات کے وقت وہاں کتنے پولیس والے ڈیوٹی پر موجود ہوتے ہیں۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”کچھ ہوتا تو تمہیں ملتا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”مادام دھکے کی کوٹھی سے میں جو کچھ لایا تھا وہ یہی ہے چند لاکھ ان میں سے خرچ بھی ہو چکے ہیں۔ رقم کے علاوہ لاکر تھا جو بعد میں تاجی کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اب پتہ نہیں کہاں ہے۔“

”وہ زیورات اور سونے کے بکٹ جو اس رقم کے ساتھ تھے۔“ رخشی نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”نقد رقم کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ تمہیں میری بات کا یقین کرنا پڑے گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم چاہو تو اس میں سے کچھ حصہ لے سکتی ہو۔“

”میں حصہ طلب نہیں کر رہی دیے اگر تم کچھ اور نہیں بتانا چاہتے تو میں کوئی اعتراض نہیں کروں گی۔ میں تو تم سے کچھ اور بات کرنا چاہتی تھی۔“ رخشی نے کہا۔

”کیا.....؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”دو روز پہلے اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ حکومت مادام دھکے کی کوٹھی لبنانی سفارت خانے کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔“ رخشی نے جواب دیا۔

”یہ خبر تو میں نے بھی پڑھی تھی.....“ میں نے کہا۔ ”لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ وہ کوٹھی کرائے کی ہے۔“

”یہ درست ہے کہ وہ کوٹھی کرائے کی ہے لیکن اس کا سامان تو اب سفارت خانے کی ملکیت ہے۔“ رخشی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے سفارت خانے کے کسی شخص کو کوٹھی میں تہہ خانے کا علم ہو۔“

”اوہ.....“ میں چونک گیا۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔

”اور بالفرض۔“ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر سفارت خانے والوں کو تہہ خانے کا علم نہ بھی ہو تو وہ لوگ سارا سامان اٹھالیں گے اور کوٹھی مالک کے قبضے میں چلی جائے گی۔ مالک کو تو تہہ خانے کا یقیناً پتہ ہو گا اور اس طرح وہ ساری دولت اس کے قبضے میں چلی جائے گی۔“

”ہاں..... یہ بات تو ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”اور میں نہیں چاہتی کہ وہ بے حساب دولت مالک مکان کو بیٹھے بیٹھائے مل جائے۔“ رخشی نے کہا۔

”لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ وہ دولت اب بھی اس تہہ خانے میں موجود ہو۔“ میں نے اس

گرمی سے نجمہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔
 ”بہت گرمی ہو رہی ہے۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے
 شاپنگ بیگ لے لئے۔ وہ دوپٹے کے پلو سے چہرے کا پسینہ پونچھتی ہوئی برآمدے کی طرف
 بڑھ گئی۔

”رونی باؤ! میں نے دو مرتبہ سکنجبین پلائی ہے اسے۔ پھر بھی گرمی گرمی جیتی رہی ہے۔“
 سولجر نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ وہ بھی پسینے میں تر ہو رہا تھا۔
 اندر آ کر نجمہ کتنی دیر تک ٹڈ سال سی پٹکھے کے نیچے پڑی رہی اور پھر اٹھ کر اپنے کام میں
 مصروف ہو گئی اور خوشی بھی اس کی مدد کرنے لگی۔

اس روز شام سے ذرا پہلے میں گاڑی پر کوٹھی سے نکل کھڑا ہوا میرا رخ گلبرگ کی طرف
 تھا۔

میں نے مادام دخلکہ کی کوٹھی کے سامنے اور پیچھے والی سڑک پر ایک دو چکر لگائے کوٹھی کے
 سامنے والے رخ پر تو کشادہ سڑک تھی۔ جہاں ٹریفک کی آمد و رفت جاری تھی۔ لیکن پچھلی
 طرف دس بارہ فٹ چوڑی گلی تھی۔ سامنے والی کوٹھیوں کی پشت بھی اسی طرف تھی۔ جس کی وجہ
 سے یہ گلی زیادہ مستعمل نہیں تھی۔ اس گلی میں نہ تو اسٹریٹ لائٹ تھی اور نہ ہی صفائی کا خیال رکھا
 گیا تھا۔ اکثر کوٹھیوں کے ملازم کوڑا کرکٹ اس طرف پھینک دیتے تھے۔

مادام دخلکہ والی کوٹھی کے عقب میں ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ اس دروازے کے دونوں طرف
 دیوار کے ساتھ کوڑے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ منع کرنے والا کوئی نہیں تھا اور کوٹھیوں کے
 ملازم کوڑا یہیں پھینک جانے تھے۔

تیسرے چکر پر سامنے والے رخ پر آ کر میں نے کار مادام دخلکہ کی کوٹھی کے گیٹ کے
 سامنے روک لی۔ کچھ دیر تک انجن کو ریس دیتا رہا اور پھر انجن بند کر کے نیچے اتر آیا اور کار کا
 بانٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

سڑک پر ٹریفک کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں چند لمحوں پر جھکا رہا پھر ڈکی میں سے
 خالی ڈبہ نکالا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ایک لمحہ کو رک کر میں نے کال بیل
 کا بٹن دبایا لیکن اندر کہیں بھی بیل کی آواز سنائی نہیں دی۔ میں نے گیٹ کی جھری میں سے
 جھانک کر دیکھا۔ سامنے بہت دور برآمدے میں آنے سامنے چار پائیوں پر دو آدمی بیٹھے
 ہوئے تھے۔ ان میں ایک سادہ لباس میں تھا۔ دوسرے کے جسم پر پولیس کی وردی تھی۔ ان
 دونوں کے درمیان فرش پر حقہ رکھا ہوا تھا اور وہ باری باری حقے کے کش لگا رہے تھے۔

”میں نے معلوم کر لیا ہے۔“ رخصتی نے کہا۔ ”وہ تین کانٹیل ہیں جو مستقل اس کوٹھی پر
 ڈیوٹی دیتے ہیں انہوں نے اپنی چار پائیاں برآمدے میں ڈال رکھی ہیں باہر کا ایک ہاتھ روم
 ان کے استعمال ہے۔ اس کے علاوہ کوٹھی کے تمام دروازے مقفل اور سربمہر ہیں۔ ان کی
 ڈیوٹی تو یہ ہے کہ ایک کانٹیل باہر والے گیٹ پر رہے۔ ایک برآمدے میں اور تیسرا گشت کرتا
 رہے لیکن وہاں چونکہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ تینوں برآمدے میں پڑی ہوئی جھلکاسی
 چار پائیوں پر پڑے اینٹھتے رہتے ہیں۔ اس طرح ہم آسانی سے ان پر قابو پا سکتے ہیں۔“
 ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے اپنا ہوم ورک مکمل کر رکھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور تم نے
 اسلام آباد والے دوست کو بھی اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا ہوگا۔“

”مخدوم!“ رخصتی بولی۔ ”میں نے اسے شامل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ کسی تیسرے کو
 مفت کا حصہ کیوں دیا جائے۔“

”مقتل مند ہو۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے پروگرام کیا ہے۔“
 ”پروگرام تو تم بتاؤ گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ کل تم خود کسی وقت
 جا کر باہر سے کوٹھی کا جائزہ لے لو۔ اس کے بعد ہم پروگرام فائل کریں گے لیکن ہمیں جو کچھ
 بھی کرنا ہے بہت جلد کرنا ہے۔ اگر کوٹھی لبنانی سفارت خانے کے حوالے کر دی گئی تو سب کچھ
 ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں آج شام ہی اس طرف کا ایک چکر لگا لیتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا
 پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ بتاؤ کہ اس کے بعد تم کیا کرو گی۔ اتنی دولت
 ہاتھ آنے کے بعد.....“

”ابھی میں نے کچھ نہیں سوچا۔“ اس نے میری بات کاٹ دی اور کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر
 آ گئی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے دماغ
 میں پھر کوئی کیڑا اگلبلانے لگا تھا۔ میں بیڈ سے اٹھنا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے دھکا دے کر گرا
 دیا۔ وہ اس طرح سے میری طرف لپکی جیسے بلی چوہے پر چھپتی ہے اور پھر ٹھیک اسی وقت کال
 بیل کی آواز سنائی دی۔

رخصتی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں اسے ایک طرف ہٹا کر کمرے سے باہر نکلا تو وہ
 بھی میرے پیچھے ہی چلی آئی تھی وہ ہال کمرے میں ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئی اور میں برآمدے
 والا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

”وہ نجمہ اور سولجر تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں کئی کئی شاپنگ بیگز تھے۔ دھوپ اور تیز

معاملہ کچھ اور تھا۔ ایک تو بقول رختی کے کوٹھی کے تہہ خانے میں اتنی دولت تھی کہ ہماری آنے والی کئی سلیس عیش کر سکتی تھیں اور پھر مجھ پر رختی کا دباؤ تھا۔ وہ پولیس میں رہ چکی تھی اور بہت چالاک عورت تھی۔ میرے بہت سے راز اس پر آشکار ہو چکے تھے۔ اگر میں اس معاملے میں اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا تو وہ میرے لئے بہت سے مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ مجھے کوئی لائحہ نہیں تھا۔ میرے پاس تو پہلے ہی اتنی دولت تھی کہ میں زندگی بھر عیش کر سکا تھا لیکن رختی نے مجھے اس چوری پر مجبور کر دیا تھا۔

اس رات میں اور رختی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ وہاں تین پولیس والے ڈیوٹی دیتے تھے اور رختی کا خیال تھا کہ انہیں قابو میں کرنے کے لئے نجبہ کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔ میں نجبہ کو اس معاملے سے الگ رکھنا چاہتا تھا لیکن رختی کا اصرار تھا کہ اسے ساتھ رکھنا پڑے گا کیونکہ اسکے خیال میں وہ اکیلی تین آدمیوں کو قابو میں نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ نجبہ ہوگی تو وہ تینوں آسانی سے گرفت میں آجائیں گے۔

اور پھر نجبہ کو بھی رختی ہی نے ساتھ دینے پر آمادہ کیا تھا۔ نجبہ نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا اور رضامندی کا اظہار کر دیا اور سو لجر بھی اس منصوبے میں ہمارا ساتھی دینے پر آمادہ ہو گیا تھا اس کی ضرورت بھی تھی۔

میں نے مادام دھکے کی کوٹھی اور اس کے آس پاس کی گلیوں اور سڑکوں کا نقشہ بنا کر وضاحت کی کہ ہمیں کہاں سے کوٹھی کے اندر داخل ہونا ہے اور منصوبے کی تکمیل کے بعد باہر نکل کر کس طرف جانا ہے۔ کوٹھی کے اندر کا نقشہ رختی نے سمجھا دیا تھا۔ جس رات میں ملک شہاب کے بندوں سے پناہ لینے کے لئے اس کوٹھی میں داخل ہو رہا تھا۔ اس رات میں نے بھی کوٹھی کی وسعت کا کچھ اندازہ لگا لیا تھا لیکن اس وقت مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس کے نیچے کوئی تہہ خانہ بھی ہے۔ تہہ خانے کے راستے کی وضاحت بھی رختی نے کر دی تھی۔

اور پھر اس سے اگلے روز ہم نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔



رات تاریک اور سنسان تھی۔

مجھے وہ رات یاد آگئی جب ملک شہاب کے بندوں سے بچنے کے لئے گلبرگ کی گلیوں اور سڑکوں پر بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس رات بھی سڑکیں اور گلیاں ایسی ہی سنسان تھیں لیکن آج صورت حال اس حد تک مختلف تھی کہ میں جان بچانے کے لئے بھاگ نہیں رہا تھا۔ میں نے کار مادام دھکے والی عقبی گلی کے موڑ سے ذرا آگے درختوں کے نیچے روک لی میں

میں نے گیٹ پر دستک دی تو وہ دونوں گیٹ کی طرف دیکھنے لگے اور پھر وردی والا اٹھ کر گیٹ کی طرف آنے لگا۔ اس نے چار پائی پر رکھی ہوئی رائفل بھی اٹھالی تھی۔

”کیا بات ہے بھئی کس کی تلاش ہے۔“ کانشیل نے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول کر گھورتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”پانی کی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میری گاڑی کے ریڈی ایٹر میں پانی ختم ہو گیا ہے اگر آپ ایک ڈبہ پانی دے دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

کانشیل نے پہلے کار کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا اور اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”وہ ادھر نکلا ہوا ہے۔ لے لو پانی۔“

میں گیٹ میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وسیع و عریض لان کسی جنگل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ لان، جو کسی وقت لش گرین رہا ہوگا گھاس بالکل زرد ہو رہی تھی۔ خود رو جھاڑیوں نے پورے کمپاؤنڈ پر قبضہ جما رکھا تھا۔ صرف پختہ رویشیں بچی ہوئی تھیں دائیں طرف پختہ روش کے قریب ہی لان کے کنارے پر نکلا ہوا تھا۔ اس نکلے کی وجہ سے آس پاس کچھ سبزہ بھی تھا۔

میں نکلا کھول کر ڈبے میں پانی بھرنے لگا اور اس دوران گہری نظروں سے اطراف کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ ڈبہ بھر گیا تو میں نے نکلا بند کر دیا اور کانشیل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گیٹ سے باہر آ گیا اور کار کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے لگا۔ کانشیل چند لمحوں کے بعد وہاں کھڑا میری طرف دیکھتا رہا پھر گیٹ بند کر کے اندر چلا گیا۔

میں نے ریڈی ایٹر کا کیپ کھول کر پانی ڈالا پانی واقعی کم ہو رہا تھا ڈبے کا پورا پانی اس میں سا گیا۔ کیپ لگا کر میں نے بانٹ گرا دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ خالی ڈبہ میں نے پچھلی سیٹ کے فٹ میٹ پر ڈال دیا تھا۔

اس کے بعد میں نے کوٹھی کے آگے یا پیچھے کا چکر نہیں لگایا۔ میں نے دونوں طرف سے کوٹھی کا جائزہ لے لیا تھا اس قسم کی کوٹھیوں کے کمپاؤنڈ میں داخل ہونا زیادہ مشکل نہیں ہوتا لیکن یہاں صورتحال مختلف تھی کوٹھی کی دیوار پر چڑھ کر بڑی آسانی سے اندر کودا جاسکتا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ آگے کوٹھی کے تمام دروازے سر بمبر تھے اور تین عدد پولیس کانشیل وہاں ڈیوٹی دے رہے تھے۔

چوری ڈکیتی میری لائن نہیں تھی۔ میں تو اپنے دشمن کو لٹا کر مارنے والا تھا۔ میں نے کبھی چھپ کر وار نہیں کیا تھا اور چوری کو تو میں بزدلی کا سب سے بڑا فعل سمجھتا تھا۔ لیکن یہاں

مادام دھکے کی کوشی کے عقب میں پہنچ کر رک گیا اور تاریکی میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس وقت مخالف سمت سے دے قدموں کی بہت ہلکی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے تاریکی میں گھور کر دیکھا۔ تاریکی میں لیٹا ہوا ایک انسانی ہیولہ دیوار کے ساتھ ریٹکتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔

وہ سولجر تھا جو میرے قریب آ کر رک گیا۔ ہم دونوں دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے تھے وقت گزرنے کا انتظار کرتے رہے اور پھر دوسری طرف کوشی کا گیٹ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سن کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ پانچ منٹ مزید گزر گئے میں نے سولجر کو اشارہ کیا اور ہم دونوں دیوار پر چڑھ کر بڑی آہستگی سے دوسری طرف کود گئے۔

”میں اس طرف جا رہا ہوں اور تم اس طرف سے جاؤ۔“ میں نے سولجر کو ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”پورے کپاؤنڈ میں خشک جھاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں خیال رکھنا آواز پیدا نہ ہو۔“

”فکر ہی مت کرو رونی باؤ۔“ سولجر نے بھی سرگوشی میں جواب دیا اور دے قدموں ایک طرف بڑھنے لگا۔

میں چند لمحوں کے بعد اٹھ کر اٹھ رہا تھا اور پھر دے قدموں دوسری طرف چلنے لگا۔ میں نے پستول جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ مادام دھکے کی موت کے بعد اس کوشی پر بالکل توجہ نہیں دی گئی تھی خود رو جھاڑیاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ خشک جھاڑیاں پیروں کے نیچے آ کر چرچا رہی تھیں۔ میں بہت محتاط ہو کر چل رہا تھا۔ اور پھر اچانک ہی میں رک گیا اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بائیں طرف سے ایسی آواز سنائی دی تھی جیسے خشک جھاڑیاں کسی کے پیروں کے نیچے آ کر چرچا رہی ہوں۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھورنے لگا لیکن درختوں میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے کوئی بلی وغیرہ ہو۔

میں ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ کوشی کی عمارت کے قریب پہنچ کر میں ایک لمحہ کور کا اور دیوار کے ساتھ ساتھ آگے سرکنے لگا۔ میں ایک بار پھر ٹھک گیا۔ جھاڑیوں کے سرسراہٹ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی تھی۔ اس بار بھی کچھ دکھائی نہیں دیا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ مجھے یہاں کسی اور کی موجودگی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ اگر وہ کوئی پولیس والا ہوتا تو وہ پوشیدہ رہنے کی بجائے مجھے لاکارتا۔ میں تقریباً دو منٹ تک وہاں کھڑا رہا۔ اس دوران کسی قسم کی آواز سنائی نہ دی میں اسے اپنا داہمہ سمجھ کر ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔

نے انجن بند کر دیا اور ہم چاروں نیچے اتر آئے۔ آدھا گھنٹہ پہلے گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے نجمہ اور رخی کا بغور جائزہ لیا تھا۔ ان دونوں نے ساڑھیاں پہن رکھی تھیں۔

کار سے اتر کر ہم تاریکی میں چلتے ہوئے سڑک کے موڑ پر آ گئے مادام دھکے کی کوشی وہاں سے چوتھے نمبر پر تھی۔ میں نے سولجر کو اشارہ کیا وہ واپس مڑ کر پچھلی گلی کی طرف چلا گیا اور میں خود نجمہ اور رخی کے ساتھ کارنروالی کوشی کی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگا۔

کوشیاں کافی وسیع و عریض تھیں۔ ان کے آگے بھی دیواروں کے ساتھ مختصر سے لان بنے ہوئے تھے۔ ان سے آگے سروس روڈ تھی پھر ایک کشادہ فٹ پاتھ اور اس کے بعد سڑک تھی جو اس وقت سنسان پڑی تھی۔

مادام دھکے کی کوشی کا گیٹ وہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ دھکے کی کوشی کے سامنے بھی دیواروں کے ساتھ آٹھ دس فٹ چوڑا لان تھا جو اجڑ چکا تھا۔ گاڑیوں کی باڑ بھی سوکھ چکی تھی۔ میں نے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اندر جھانکا۔

برآمدے میں مدہم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ ایک آدمی چارپائی پر سو رہا تھا اور دوسرا چارپائی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا جب کہ تیسری چارپائی خالی پڑی تھی۔ تیسرا کاشیبل یا تو موجود نہیں تھا یا وہ کوشی کے پچھلی طرف گشت پر تھا۔

ٹھیک اسی وقت سڑک کے اگلے موڑ پر ایک گاڑی اس طرف مڑتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے ہیڈ لیمپس کی روشنی دیکھتے ہی نجمہ اور رخی کو اشارہ کیا اور ہم تینوں بڑی پھرتی سے گاڑیوں کی آڑ میں گر گئے۔

میں باڑ کی شاخوں کے اندر سے اس گاڑی کی طرف دیکھتا رہا وہ تیز رفتاری سے ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ وہ گاڑی آگے جا کر ایک اور موڑ پر گھومنے کے بعد نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے نجمہ اور رخی کو اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولا۔

”تم لوگ ابھی یہیں لیٹی رہو۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد اپنا کام شروع کر دینا۔“

ان دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں باڑ سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے چل پڑا۔ دو اور کوشیوں کے بعد ایک گلی تھی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس گلی میں داخل ہو کر پچھلی گلی میں پہنچ گیا۔

اس طرف تاریکی کچھ زیادہ تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں چند لمحوں کے بعد سڑک پر گھورتا رہا اور پھر دیوار کے ساتھ ساتھ دے قدموں آگے بڑھنے لگا۔

ایک دم چیخ اٹھا۔

”اوئے فضل دین..... دیکھ یہ کون گھس آیا ہے اندر رنگ میں بونگ ڈالنے۔ پکڑ اس کو۔“
دوسرا پولیس والا سادہ لباس میں تھا۔ وہ اب تک رختی سے الجھا ہوا تھا۔ رختی نے مجھے دیکھ لیا تھا اور اب وہ فضل دین سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر فضل دین شاید اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ اسی لمحہ سولجر بھی کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر فضل دین کو بالوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور اس کے جسم پر دو تین کمراری قسم کی ٹھوکریں رسید کر دیں۔

اب ان دونوں کو ہوش آچکا تھا لیکن ہم نے ان کے حواس ٹھکانے نہیں آنے دیے، میں اور سولجر ان دونوں کی دھنکی کرتے رہے اور وہ خاموشی سے پٹتے رہے۔ نجمہ اور رختی بھی ایک طرف خاموشی سے تماشہ دیکھتی رہیں۔

میں نے پتوتل تان لیا۔ وہ دونوں دیوار کے قریب پشت کے بل پڑے تھے۔ دونوں کے چہروں پر بے پناہ خوف تھا۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر خوفزدہ تھے۔ وہ شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ میرا اور سولجر کا تعلق پولیس سے ہے جو اتفاقاً اس طرف آ نکلے تھے اور انہیں لڑکیوں کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔

”سس..... سر یہ..... لڑکیاں خود ہی..... یہاں آئی تھیں۔“ وردی والے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”انہیں یہاں بھیجا گیا تھا۔ تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟“ میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”وہ..... وہ آج چھٹی پر ہے سر۔“ اس کا نشیل نے جواب دیا۔
”ان دونوں کے ہاتھ پیر باندھ دو۔“ میں نے نجمہ اور رختی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”تم دونوں کی ساڑھیاں رسی کا کام دے سکتی ہیں۔“

ان دونوں سے پہلے سولجر حرکت میں آیا تھا۔ اس نے رختی والی ساڑھی اٹھالی اور فضل دین کے ہاتھ پیر باندھنے لگا۔ ساڑھی کے پلو کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر اس کے منہ میں بھی ٹھونس دیا۔
باوردی کا نشیل کو بھی اس طرح بے بس کرنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”رونی باؤ..... یہ دروازہ۔“ اس نے اندر کی جانب ایک دروازہ کی طرف اشارہ کیا۔
”میرا خیال ہے یہ کمرہ بھی سیل تھا۔ انہوں نے اپنے استعمال کے لئے اس کمرے کے دروازے کی سیل توڑ دی۔ اب ہمیں اندر داخل ہونے کے لئے کوئی سرکاری سیل نہیں توڑنی

دیوار کے ساتھ گھونسنے سے پہلے میں نے رک کر دوسری طرف دیکھا اور چونک گیا۔
برآمدے کی جتنی بھی ہوئی تھی۔ تاہم مرکزی دروازے کے دائیں طرف ایک دروازے کے دوسری طرف روشنی چھلک رہی تھی۔ وہ دروازہ دو تین انچ کے قریب کھلا ہوا تھا اور اندر سے ہلکے قہقہوں کی دبی دبی سی آوازیں سی سنائی دے رہی تھیں۔

میں دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ برآمدے میں کچھی ہوئی چار پائیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے میرا پیر کی چیز سے ٹکرا گیا۔ پہلے اس چیز کے گرنے کی آواز ابھری اور پھر غٹ غٹ کی آواز سنائی دینے لگی۔ جیسے پانی بہ رہا ہو۔

میں بڑی پھرتی سے ستون کی آڑ میں دبک گیا۔ میرا خیال تھا کہ آہٹ کی آواز سن کر اندر سے کوئی نہ کوئی ضرور برآمد ہوگا لیکن ایسا کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا البتہ غٹ غٹ کی آواز بدستور سنائی دیتی رہی اور پھر بہت ہی ناگوار سی بو میرے نھتوں سے نکلنے لگی اور اس کے ساتھ ہی میں سمجھ گیا کہ فرش پر رکھا ہوا حقہ ہے جو میرے پیر سے ٹکرا کر گرا تھا اور اس کا بدبودار پانی غٹ غٹ کی آواز سے بہہ رہا تھا۔

چند لمحوں بعد میں پھر آگے بڑھنے لگا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں رکا پہلے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی کچھ دکھائی نہیں دیا البتہ بائیں طرف سے آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے دھکے سے دروازہ کھول دیا اور پھر وہ منظر دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ دونوں پولیس والے نجمہ اور رختی کو دبوچے ہوئے تھے۔ نجمہ اور رختی کی ساڑھیاں اتر چکی تھیں۔ ان کے جسموں پر صرف بلاؤز اور پٹی کوٹ رہ گئے تھے۔ اس کمرے میں دو تین سال خوردہ سی کرسیاں تھیں اور ایک چھوٹی سی میز تھی۔ فرش پر درری کچھی ہوئی تھی اور وہ دونوں پولیس والے اس درری پر انہیں رگید رہے تھے۔ وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح بھنبھوڑ رہے تھے۔

میں نے اگرچہ دروازہ زوردار دھماکے سے کھولا تھا جس سے اچھی خاصی آواز پیدا ہوئی تھی لیکن لگتا تھا کہ ان دونوں پولیس والوں نے یا تو آواز سنی نہیں تھی یا اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ نجمہ اور باوردی پولیس والا میرے قریب تھے۔ نجمہ دبی ہوئی تھی اور پولیس والا اسے بلاؤز کی قید سے بھی آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے قریب پہنچ کر ایک زوردار ٹھوکر اس کے سر پر ماری۔ وہ کراہ کر دوسری طرف اٹ گیا، پہلے تو وہ صورت حال کو سمجھ ہی نہیں سکا لیکن جب وہ صورتحال کو سمجھا تو اسے دیر ہو چکی تھی۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے اسے ایک اور زوردار ٹھوکر رسید کر دی پہلے تو وہ کراہا پھر

بھری بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اگر اس میں کندے نہ لگے ہوئے ہوتے تو اس جگہ پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”یہ ڈھکنا ہٹاؤ..... اس کے نیچے سیڑھیاں ہیں۔ جلدی کرو۔“ رُخشی نے میری طرف دیکھ کر اس طرح بازو بلبے لپچے میں کہا جیسے میں اس کا ادنیٰ ملازم ہوں۔

میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ جھینپ سی گئی۔

”سوری روئی!“ وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”تم جانتے ہو اس وقت کتنی ٹینشن ہے۔“

میں نے سو بجر کو اشارہ کیا اور پھر ہم دونوں نے جھک کر کندوں میں ہاتھ پھنسا کر وہ سلیب اٹھالیا۔ کنکریٹ کا بنا ہوا تقریباً تین انچ موٹا وہ سلیب خاصا وزن تھا۔ اسے ہٹانے کے لئے ہم دونوں کو خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔

سلیب ایک طرف رکھ کر میں نیچے جھانکنے لگا۔ فرش میں پیدا ہونے والے خلا کے اندر بیڑھیاں تھیں۔ کمرے کی ٹیوب لائٹ کی روشنی چند بیڑھیوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس سے نیچے اندر میرا تھا۔

”ایک منٹ۔“ رُخشی کہتے ہوئے رائٹنگ ٹیبل کی طرف لپکی۔ ٹیبل کے پیچھے دیوار میں سوچ بورڈ لگا ہوا تھا جس پر کئی سوچ لگے ہوئے تھے۔ اس نے جھک کر ایک سوچ آن کر دیا۔

تہہ خانے کے اندر روشنی پھیل گئی۔

”یہ سلیب ہم دو آدمیوں سے مشکل سے اٹھ سکا ہے۔ مادام دھکے اکیلی اسے کیسے اٹھاتی ہو گی؟“ میں نے کہا۔

”جیسے تیسے اٹھالیتی ہوگی۔ اب نیچے اترو۔ ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔“ رُخشی نے کہا۔

سب سے پہلے میں نے ہی بیڑھیوں پر قدم رکھا تھا۔ یہ تہہ خانہ زمین کے اندر خاصی گہرائی میں تھا۔ آٹھ بیڑھیاں سیدھی تھیں اور پھر چار پانچ فٹ چوڑی لینڈنگ۔ وہاں سے بیڑھیاں بائیں طرف مڑ گئی تھیں۔ اس طرف بھی آٹھ بیڑھیاں ہی تھیں۔

بیڑھیوں کے اختتام پر وہ وسیع ہال تھا۔ دیواروں کے ساتھ شیشے کے دروازوں والی اونچی الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ آفس ٹیبل، شاندار صوفے سیٹ اور کئی خوبصورت کرسیاں تھیں۔ یہ سارا فرنیچر کمرے کے وسط میں جمع تھا۔ دو صوفے سجے اور برکھے ہوئے تھے۔ قالین بھی رول کیا ہوا تھا۔ ہال کے ایک طرف شیشے کی دیواروں والا ایک لمبا چوڑا کیمین بنا ہوا تھا۔ اس میں ایک آفس ٹیبل اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کیمین کی تین فٹ تک اونچی دیوار اینٹوں کی تھی

پڑے گی۔“

میں نے آگے بڑھ کر وہ دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلنے سے اس کمرے کی روشنی میں دوسری طرف کا کچھ حصہ بھی روشن ہو گیا۔ میں نے دوسری طرف پہنچ کر دیوار کو ٹٹولا اور بتی جلادی۔

یہ وہی ہال کمرہ تھا جہاں اس رات میں نے مادام دھکے کے مگن مین کی لاش دیکھی تھی۔ کمرہ اسی طرح آراستہ تھا۔ فرش پر دیوار سے دیوار تک دبیز قالین بچھے ہوئے تھے اور شاندار فرنیچر آراستہ تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی فرق صرف اتنا تھا کہ تمام فرنیچر دھول سے اٹا ہوا تھا۔ ظاہر ہے یہ کوئی تین چار مہینوں سے بند تھی اور اس دوران صفائی کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”ادھر..... اس کمرے میں۔“ رُخشی نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”تہہ خانے کا راستہ اس کمرے میں ہے۔“

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس طرف آ گئے۔ یہ مادام دھکے کی خوابگاہ کے سامنے والا کمرہ تھا۔ رُخشی نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر گھمایا تو وہ آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔ اس نے دروازے کے اندر کی طرف دیوار ٹٹول کر بتی جلادی۔

یہ کمرہ لائبریری کے طور پر آراستہ تھا۔ دائیں طرف کھڑکی کے قریب خوبصورت رائٹنگ ٹیبل تھی۔ کرسی کی پشت کھڑکی کی طرف تھی اور کھڑکی کے سامنے نیلے رنگ کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ دروازے کے ساتھ والی دیوار اور دوسری دو دیواروں کے ساتھ بھی شیشے کے سلائیڈنگ ڈورز والی اونچی الماریاں ایستادہ تھیں جن میں لاتعداد کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک الماری کے سامنے آرام وہ صوفہ اور اس کے سامنے شیشے کے ٹاپ والی کافی ٹیبل بھی پڑی ہوئی تھی۔

”تہہ خانے کا راستہ اس صوفے کے نیچے ہے۔ اسے ہٹاؤ یہاں سے۔“ رُخشی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اور سو بجر نے وہ صوفہ اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ رُخشی جھک کر قالین اس جگہ سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ نجمہ بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔

قالین کے نیچے چار مربع فٹ فرش کا ایک ٹکڑا فرش کے دوسرے حصے سے کسی قدر الگ تھک نظر آ رہا تھا۔ اس میں دو جگہوں پر پھوٹے پھوٹے گڑھے تھے جن میں آہنی کندے لگے ہوئے تھے۔

فرش کا یہ ٹکڑا کسی کٹر کے ڈھکنے سے مشابہ تھا جو اس طرح اپنی جگہ پر فٹ تھا کہ معمولی سی

رخشی تو جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ وہ نوٹوں کے بنڈل اور سونے کی اینٹیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ وہ خوشی سے چیخ رہی تھی۔ اور پھر دوڑ کر صوفے کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے ایک کٹن اٹھایا اور اس کا کورا اتار کر الماری میں رکھا ہوا خزانہ اس میں بھرنے لگی۔ جذبات اور خوشی سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سونے کی چند اینٹیں اور نوٹوں کے بنڈل نیچے بھی گر گئے تھے۔ نجمہ اور سولجر بھی حیرت زدہ سی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی اتنی دولت نہیں دیکھی تھی۔ ان دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اتنا بڑا خزانہ میں نے بھی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرے خیال میں یہ دولت کئی ارب روپے مالیت کی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ مادام دھلکے نے یہ سب کچھ یہاں کیوں جمع کر رکھا تھا۔

رخشی نے سب کچھ صوفے کٹن کے کور میں بھر لیا اور نیچے گرے ہوئے نوٹوں کے بنڈل اور سونے کی اینٹیں اٹھانے لگی۔

وہ اس خزانے سے بھرا ہوا بیگ (کٹن کور) اٹھا کر اس الماری کی طرف چلی گئی جس کے قریب رسہ اور دوسری چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے اچانک ہی محسوس ہوا جیسے دولت ہاتھ آتے ہی رخشی کا رویہ کچھ بدل گیا ہو۔

”رخشی!“ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بیگ میرے حوالے کر دو اور یہاں سے نکل چلو۔“

”یہ سب کچھ میرا ہے۔ تم مادام دھلکے کی خواب گاہ سے جو کچھ لے گئے تھے میں نے اس میں سے حصہ نہیں مانگا تھا۔ اب اس میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میرے قریب مت آنا۔ دور رہو مجھ سے۔“

”پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ میں نے چیخ کر کہا۔

”اتنا بڑا خزانہ دیکھ کر کوئی بھی خفص پاگل ہو سکتا ہے۔“

سیڑھیوں کی طرف سے آنے والی یہ بھاری آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ سیڑھیوں پر دو آدمی کھڑے تھے۔ ایک دروازہ قامت ڈبلا پتلا سا آدمی تھا۔ یوشیپ داڑھی، اوپر کوئل کھائی ہوئی باریک مونچیں، سرمجھا اور موٹی موٹی آنکھیں۔ اس کا چہرہ عجیب خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ دوسرا آدمی درمیانے قد کا مالک تھا۔ وہ کلین شید تھا اور سر کے بال اتنے لمبے تھے کہ گردن پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

”کون ہو تم.....؟“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔ ویسے میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ کون لوگ

جن پر سینٹ کا پلستر کیا ہوا تھا اور اوپر لکڑی کی بلیوں کے فریم بنا کر شیشے لگے ہوئے تھے۔ دروازے پر نیچے تین فٹ تک لکڑی تھی اور اوپر شیشہ تھا۔

اس کیمین کے دائیں طرف لکڑی کی تین الماریاں ایستادہ تھیں۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ تہہ خانے کی سیڑھیوں کے راستے تو یہ سب کچھ نہیں لایا جاسکتا تھا۔ کرسیاں تو شاید آجاتیں مگر میزیں اور اتنی بڑی بڑی الماریوں کا اس راستے سے آنا ممکن نہیں تھا۔

”یہ سارا سامان ان سیڑھیوں سے اندر کیسے آیا ہو گا؟“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہی سوال میں نے بھی مادام دھلکے سے پوچھا تھا۔“ رخشی نے جواب دیا۔ ”وہ تقریباً دس سال سے اس کوٹھی میں رہ رہی تھی اور یہ سارا فرنیچر اس نے تہہ خانے کے اندر ہی بنوایا تھا۔“

میں ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بائیں طرف والی دیوار کی شیشے کی دروازوں والی الماریوں سے ذرا آگے ایک بہت بڑا رسہ لچھے کی صورت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک ٹائمر موٹر کا جیک، دو پٹرول والے ڈبے اور اس قسم کی چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔

”وہ..... وہ اس الماری میں.....“ رخشی نے کیمین کے دائیں طرف لکڑی کی الماریوں کی طرف اشارہ کیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر ایک الماری کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر دروازہ لاک تھا۔

”یہ دروازہ کھولو.....“ وہ میری طرف دیکھ کر چیخی۔ ”سب کچھ اسی میں ہے۔ ساری دولت اس الماری میں بھری ہوئی ہے۔“

میں آگے بڑھ گیا۔ الماری کے ہینڈل کو ایک دو جھٹکے دیئے مگر دروازہ لاک تھا۔ میں نے پستول کی نال لاک پر رکھ کر ٹرائیگر وادیا۔

تہہ خانہ فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر دروازہ کھول دیا اور اس کے ساتھ ہی میں اچھل پڑا۔

رخشی نے غلط نہیں کہا تھا۔ یہ الماری اوپر سے نیچے تک دولت سے بھری ہوئی تھی۔ ایک خانے میں امریکی ڈالر رو کے بنڈل تھے۔ دوسرے میں انڈین کرنسی، تیسرے میں پاکستانی کرنسی کے بنڈل اور چوتھے خانے میں سونے کی اینٹیں بھری ہوئی تھیں۔ میں نے ایک اینٹ اٹھا کر دیکھی۔ اس کا حجم گولڈ لیف کے پیکٹ کے برابر تھا اور وزن کسی طرح بھی پانچ اونس سے کم نہیں ہو سکتا تھا۔

”تم نے واقعی بڑے کام کئے ہیں روٹی باؤ!“ مخدوم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”مادام دھکے کے قاتلوں کو پکڑوانا تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ملک شہاب کو بھی تم نے انگلیوں پر نچا رکھا ہے۔ جس رات مادام دھکے قتل ہوئی تھی، اتفاق سے تم یہاں پہنچ گئے تھے اور اس کے بیڈروم سے ساری دولت سمیٹ کر آ گئے تھے۔ کسی کو تم پر شبہ نہیں ہو سکا۔ یہاں کا پروگرام بھی تم نے بڑی مہارت سے بنایا تھا۔ لیکن ہر کام میں کامیابی ضروری نہیں ہوتی۔ آج کی یہ ناکامی تمہاری زندگی کی سب سے بڑی شکست بن جائے گی۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر رخصتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے بھی آج بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے رخصتی! مجھے توقع نہیں تھی کہ تم روٹی کو پھانسنے میں اس قدر ہوشیاری کا ثبوت دو گی۔ بہر حال اب تم اس طرف آ جاؤ۔ تاکہ ہم یہاں سے نکلنے کی تیاری کریں۔“

رخصتی نے نوٹوں کے بندلوں اور سونے کی اینٹوں سے بھرا ہوا وہ بیگ دونوں ہاتھوں سے اس طرح سینے سے لگا رکھا تھا جیسے ماں نے بچے کو اٹھا رکھا ہو۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر قدم آگے بڑھا دیا۔

اس نے دوسرا قدم اٹھایا ہی تھا کہ قریب کھڑی ہوئی نجمہ نے بڑی پھرتی سے اپنی ٹانگ آگے کر دی۔ رخصتی کی ٹانگ اس کی ٹانگ میں اُلجھی اور وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گری۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ تھلا بھی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر آگے جا گرا تھا۔ نجمہ بھی اس کے ساتھ ہی نیچے گر گئی تھی۔

”اے خبردار!“ مخدوم چیخا۔ ”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“

لیکن سولجر اس سے زیادہ پھرتا نکلا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے جیب سے پستول نکال کر فائر کر دیا۔ گولی مخدوم کے ساتھی کے سینے میں لگی اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

میں نے بھی مخدوم کی طرف چھلانگ لگا دی۔ مخدوم نے فائر کر دیا تھا مگر گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ اگر میں سیدھی چھلانگ لگاتا تو یہ گولی میرے سینے میں پوست ہوتی۔ لیکن میں نے نیچے کی طرف چھلانگ لگائی تھی اور میں اس کے پیروں کے قریب گرا تھا۔

میں نے اس کے پیروں کو ٹخنوں کے قریب سے پکڑ کر زوردار جھکا دیا۔ وہ کراہتا ہوا پشت کے بل گرا۔ اس دوران ٹرائیگر دب جانے سے ایک اور فائر ہوا تھا۔ گولی چھت میں لگی تھی۔

میں نے مخدوم کو دوسری گولی چلانے کا موقع نہیں دیا اور اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ گولی قریب پڑے ہوئے مخدوم کے ساتھی کی لاش میں پوست ہو گئی۔ میں نے اس کے پستول والے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں لے کر

ہو سکتے ہیں۔

”میں نے تم سے مخدوم کا عائدانہ تعارف تو کر دیا تھا لیکن تمہاری اس سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔“ ان میں سے کسی کے بولنے سے پہلے ہی رخصتی بول اٹھی۔ ”یہ مخدوم ہے۔ اس کا حلیہ تو بڑا عجیب سا ہے لیکن بڑے کام کا آدمی ہے یہ۔ ٹھیک وقت پر پہنچا ہے۔“
 ”اوہ.....“ میں چونک گیا۔ ”تو تم نے پہلے ہی سے یہ سازش تیار کر رکھی تھی۔“

”ہاں۔“ رخصتی بولی۔ ”مخدوم کا لبثانی سفارتخانے سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی یہ کبھی اسلام آباد گیا ہے۔ یہ بھی مادام دھکے کا باؤی گاڑ رہ چکا ہے۔ جن دنوں میں مادام دھکے کے پاس تھی، یہ بھی ان دنوں وہیں تھا۔ میرے بعد مادام دھکے نے اسے بھی نوکری سے نکال دیا۔ میں نے ہی مخدوم کو تہ خانے میں اس دولت کے بارے میں بتایا تھا۔ ہم اس خزانے پر ہاتھ صاف کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے کہ مادام دھکے کو قتل کر دیا گیا۔ اس طرح ہمارا یہ منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔“

اس دوران تم سے ملاقات ہوئی۔ مجھے اپنی سبیلی کے شوہر سے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا اور میں نے تمہارے گرد جال بننا شروع کر دیا۔ تم بڑی آسانی سے میرے اس سنہری جال میں پھنس گئے۔ پچھلے دو تین دنوں کے دوران جب میں تمہارے ساتھ یہ پروگرام بنا رہی تھی تو اس کی ایک ایک تفصیل سے مخدوم کو بھی آگاہ کرتی رہی تھی۔ مخدوم کو آج دن میں، میں نے پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ گیا۔ اب تمہاری کہانی ختم ہو گئی۔“

میرے دماغ میں آمدہاں سی چل رہی تھیں۔ رخصتی پر مجھے پہلے شبہ تو تھا ہی لیکن اس سے اس قدر چالاکی کی توقع نہیں تھی۔ میں نے سولجر کی طرف دیکھا، وہ بھی کچھ بدحواس سا نظر آ رہا تھا۔ نجمہ کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا۔ وہ رخصتی سے صرف دو قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

”تمہاری کہانی اب واقعی ختم ہو چکی ہے روٹی!“ سیرگی پر کھڑے ہوئے مخدوم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پستول پھینک دو۔ اور اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو بھیجا اڑا دوں گا۔“

میں نے پستول پھینک دیا اور ایک بار پھر کن انکھیوں سے سولجر کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ اس نے اپنا پستول جیب میں ڈال لیا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ یہ اچھا ہی تھا کہ اس کا پستول مخدوم یا اس کے ساتھی کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔
 مخدوم سیرگی پر ہی کھڑا رہا جبکہ اس کا ساتھی نیچے اتر آیا۔

بیڑھیوں کی طرف دوڑی تھی۔ میرے گرنے سے وہ زد میں آگئی اور گولی نے اس کا بھیچہ اڑا دیا تھا۔ وہ لہراتی ہوئی اس تھیلے پر گری تھی جس میں نوٹوں کے بنڈل اور سونے کی اینٹیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کی کھوپڑی سے بہنے والا خون تھیلے کو تر کرنے لگا۔

مخدوم ایک لمحہ کو بدحواس ہو گیا تھا اور میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا دور تک لے گیا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ایک بار پھر ٹرائیگر دبا دیا۔ اس مرتبہ پستول سے نکلی ہوئی گولی نے سولجر کو چاٹ لیا۔۔۔۔۔۔ گولی سولجر کے سینے میں لگی۔ وہ چیختا ہوا الماری کے قریب رسوں کے ڈھیر پر گرا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور انگلی ٹرائیگر پر۔ اس کے جسم میں تشنگ پیدا ہوا تو ٹرائیگر دب گیا۔ گولی رسوں کے ڈھیر کے قریب پڑے ہوئے پٹرول کے ابک ڈبے میں لگی۔ ڈبہ ایک دھماکے سے پھٹا اور چلتا ہوا پٹرول چاروں طرف پھیل گیا۔

آگ کے شعلے بڑی تیزی سے پھیلنے لگے تھے۔ قالین اور فرنیچر پلک جھپکنے کی دیر میں شعلوں کی زد میں آ گئے تھے۔ نجمہ بری طرح چیختی لگی۔

”نجمہ بھاگو۔۔۔۔۔۔ بیڑھیوں کی طرف۔“ میں چیخا۔

اس صورت حال نے مخدوم کو بھی بدحواس کر دیا تھا۔ میں نے اس کا پستول والا ہاتھ موڑ کر پستول کی نال اس کی گردن سے لگا دی اور ٹرائیگر دبا دیا۔ فائر ہوا اور گولی اس کی گردن میں پوسٹ ہو گئی۔

میں اسے چھوڑ کر ایک جھپکنے سے اٹھ کھڑا ہوا اور بدحواسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آگ پورے تہہ خانے میں پھیل رہی تھی۔ نجمہ بیڑھیوں کے قریب پہنچ گئی تھی۔

میں نے جھک کر قریب پڑا ہوا پستول اٹھالیا اور اس وقت میری نظر رخی کی لاش کے نیچے دبے ہوئے تھیلے پر پڑ گئی۔ میں وہ تھیلا اٹھانے کے لئے آگے بڑھا۔ اس وقت آگ کا ایک گولہ میری طرف لپکا اور میں تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

تہہ خانے میں شعلوں کے ساتھ گاڑھا سیاہ دھواں بھر رہا تھا۔ میں نے اس دولت کا خیال ذہن سے نکال کر نجمہ کا ہاتھ پکڑا اور بیڑھیوں کی طرف لپکا۔

نجمہ خوف سے چیخ رہی تھی۔ میں اسے بڑی مشکل سے کھینچ کر اوپر لاسکا تھا۔ بیڑھیوں میں کئی دھواں بھرا ہوا تھا جو اس راستے سے اوپر والے کمرے میں بھر رہا تھا۔

کمرے سے نکل کر میں نجمہ کو کھینچتا ہوا ہال میں آ گیا اور پھر ہم اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں وہ دونوں پولیس والے بندھے پڑے تھے۔ تہہ خانے میں اگرچہ کئی گولیاں چلی تھیں مگر

پوری قوت سے مروڑ دیا۔

پستول مخدوم کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور میں نے اس کے چہرے پر گھونٹوں کی بارش کر دی۔

اس دوران مجھے دوسری طرف دیکھنے کا موقع بھی مل گیا۔ رخی اور نجمہ ایک دوسرے سے سخت گھٹا ہو رہی تھیں۔ وہ دونوں خونخوار بلیوں کی طرح غرائی ہوئی ایک دوسرے پر جھپٹ رہی تھیں۔ نجمہ کچھ کمزور پڑ رہی تھی اور سولجر اسے بچانے کے لئے رخی کو کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران رخی کا ایک ہاتھ سولجر کے منہ پر پڑا۔ وہ کراہتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلتا تھا۔

میری توجہ ایک لمحہ کو مخدوم کی طرف سے ہٹی تھی اور اس موقع سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پیروں پر اٹھا کر اچھال دیا۔ میں الٹی قلابازی کھاتا ہوا پیچھے گرا۔ میرا سر ایک کرسی سے ٹکرا گیا تھا۔ کھوپڑی پر زوردار چوٹ لگی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چمکاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت مخدوم نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

مخدوم مجھے بری طرح رگید رہا تھا۔ اس کا ایک زوردار گھونٹہ میری کنپٹی پر پڑا۔ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ مجھ سے زیادہ طاقتور تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر پوری طرح اس کی گرفت میں آ گیا تو وہ میری زندگی کے آخری لمحات ہوں گے۔ میں اس کے نیچے دبا ہوا تھا اور وہ میرے منہ پر گھونٹے برسا رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اس کو سر سے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔

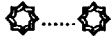
میری پہلی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی لیکن دوسری مرتبہ مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ ٹکر اس کی ناک پر لگی۔ وہ کراہ اٹھا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسری ٹکر مار دی۔۔۔۔۔۔ یہ ٹکر بھی اس کی ناک پر لگی جو پہلے سے زیادہ زوردار تھی۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ میں نے اسے دھکا دے کر اپنے اوپر سے گرا دیا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

مخدوم لوٹ لگا کر مجھ سے دور ہٹ گیا تھا اور اتفاق سے اس کے ہاتھ میں اپنے ساتھی کا پستول آ گیا۔ اس نے ٹرائیگر دبا دیا۔ میں اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا بیک کی چیز میں الجھا اور میں کراہتا ہوا منہ کے بل گرا۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی رخی کی چیخ بھی تہہ خانے میں سچ اٹھی تھی۔ رخی اس وقت اٹھ کر

کار کے قریب پہنچ کر نجمہ ایک بار پھر گر گئی۔ میں نے کار کا دروازہ کھول کر اسے اندر ٹھونسا اور خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے انجن اشارت کیا ہی تھا کہ نضا ایک زوردار دھماکے سے لرز اٹھی۔

میں نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔



کار میں بیٹھے ہوئے نجمہ نے ساڑھی چادر کی طرح دوہری تہری کر کے اپنے اوپر لپیٹ لی تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ یوں کانپتی رہی جیسے شدید سردی لگ رہی ہو لیکن پھر بتدریج اپنی کیفیت پر قابو پاتی چلی گئی۔

میں تیز رفتاری سے کار کو ایسی سڑکوں پر دوڑاتا رہا جہاں پولیس کی کسی گشتی پارٹی سے آمنا سامنا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

”وہ سب ختم ہو گیا۔“ بالآخر نجمہ نے سیٹ پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”رکشی کتنی غلیظ عورت نکلی۔ دولت دیکھتے ہی ایک دم بدل گئی۔“

”دولت دیکھ کر نہیں۔ اس نے پہلے ہی سے یہ منصوبہ بنا رکھا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کل مجھے اس کی باتوں سے کچھ شبہ سا تو ہوا تھا لیکن میں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ بہر حال اس کا لالچ اسے لے ڈوبا۔ مجھے اس کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ ہاں مجھے افسوس ہے تو سولجر کی موت کا..... وہ مخلص آدمی تھا۔ اس کے دل میں کوئی لالچ نہیں تھا۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گا۔“

”شبو کو پتہ چلے گا تو اس کا کیا حال ہو گا۔“ نجمہ نے کہا۔ ”میں تو شاید اس کا سامنا نہ کر سکوں۔“

”شبو کا سامنا کرنے کی ہمت میرے اندر بھی نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اسی لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ چند روز ہم لوگ روپوش رہیں گے اور شبو سے بھی رابطہ نہیں رکھیں گے۔“

”تم نے ان پولیس کانسٹیبلوں کو چھوڑ کر غلطی نہیں کی؟“ نجمہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”نہیں۔ میں نے انہیں چھوڑ کر کوئی غلطی نہیں کی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ان کا تصور ہی کیا تھا جو انہیں موت کے حوالے کر دیا جاتا؟“

”لیکن اگر انہوں نے ہماری نشاندہی کر دی تو؟“ نجمہ بولی۔

آواز اور ہر ایک نہیں پہنچ سکی تھی۔

میں نجمہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچ گیا۔ اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ تہہ خانے میں آگ پوری طرح پھیل گئی تھی اور دھواں بھر رہا تھا۔ تہہ خانہ کسی بھی وقت دھماکے سے پھٹ سکتا تھا۔ اس کوٹھی کے پرے پر جانیں گے اور یہ دو پولیس والے بے گناہ مارے جائیں گے۔ ان سے تو ہماری کوئی دشمنی نہیں تھی۔

میں نجمہ کو برآمدے میں چھوڑ کر کمرے میں واپس آ گیا۔

”تہہ خانے میں آگ لگی ہوئی ہے اور یہ کوٹھی کسی بھی وقت دھماکے سے اڑ سکتی ہے۔“ میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگوں سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تمہیں کھول رہا ہوں۔ اپنی جانیں بچا کر بھاگ جاؤ۔“

میں جھک کر باوردی کانسٹیبل کی بندشیں کھولنے لگا۔ وہ خوفزدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ بیچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور لائبریری روم سے نکلنے والا گاڑا دھواں اب ہال میں پھیل رہا تھا۔

دوسرے آدمی کی بندشیں کھول کر میں نے وہ ساڑھی بھی اٹھالی۔ وہ دونوں میرے ساتھ ہی باہر لپکے تھے۔ باہر آ کر میں نے کچھاسی ساڑھی نجمہ کے ہاتھ میں تھامی اور اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دونوں کانسٹیبل کچھ گڑبڑ کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن ان دونوں نے ہال کمرے میں بھرتا ہوا دھواں دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی برآمدے سے نکل کر چیتے ہوئے ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

میں نجمہ کا ہاتھ پکڑ کر کوٹھی کے پچھلی طرف دوڑا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ کوٹھی میں داخل ہوتے وقت میں نے دو تین مرتبہ جھاڑیوں کے سرسراہنے کی آوازیں سنی تھیں تو وہ میرا دھم نہیں تھا۔ وہ منہ روم اور اس کا ساٹھی تھے جو پہلے سے یہاں چھپے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

دیوار کے قریب پہنچ کر میں نے پہلے نجمہ کو سہارا دے کر اوپر چڑھایا اور پھر خود دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسری طرف کوڑے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ہمیں اس طرف اترنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

اس وقت تین بج چکے تھے۔ ہم تاریک گلی میں ایک طرف دوڑتے رہے۔ نجمہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ ایک مرتبہ وہ لڑکھڑا کر گری۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے جھک کر اس کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور ایک بار پھر دوڑنے لگا۔

اور چائے بنانے لگا۔

جب میں چائے بنا کر لایا تو نجمہ اسی طرح صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا اور دونوں کپ سامنے سنٹر ٹیبل پر رکھ دیئے۔

”لو..... چائے پو تمہارے حواس بحال ہوں گے تو پھر تیاری شروع کر دیتا۔“ میں نے کہا۔

نجمہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ میں نظریں جھکا کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

”یہاں سے جانا ضروری ہے کیا؟“ نجمہ اپنا کپ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ یہاں تو ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”رکشی جب واپس نہیں آئے گی تو محلے کے لوگ ہم سے اس کے بارے میں ضرور دریافت کریں گے۔ پچھلے چند روز سے تو وہ مسلسل ہمارے یہاں ہی رہی تھی۔ میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ ہمیں یہ جگہ چھوڑنی ہی ہوگی۔“

”کہاں جائیں گے؟“ نجمہ نے پوچھا۔

”دو چار روز شادمان والی کوٹھی میں رہیں گے۔ اس کے بعد کوئی اور بندوبست کیا جائے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں ان ہنگاموں سے اب استقامت گئی ہوں۔“ نجمہ بولی۔ ”کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم یہاں سے کہیں دور چلے جائیں اور آرام اور سکون سے زندگی گزار سکیں؟“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک میرے دشمن مجھے بھول نہ جائیں۔ اور ملک شہاب کیسے مجھے بھول سکتا ہے؟ مگر تم پریشان مت ہو۔“ میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”ملک شہاب سے منٹے کے بعد ہم یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے۔ جہاں کوئی ہمیں پریشان نہیں کرے گا۔“

میں چائے ختم کر کے اٹھ گیا۔

”تم کپڑے بدل لو..... اور اپنی چیزیں سمیٹ لو۔ ہم دن کی روشنی پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد

یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔“

میں اپنے کمرے میں آ گیا اور الماری کھول کر اس میں رکھے ہوئے نوٹوں کے بنڈل نکال کر پلنگ پر ڈالنے لگا۔ پیروں کی ہلکی سی آہٹ سن کر پیچھے مڑا تو مجھے سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہونے لگا۔

”ناممکن.....“ میں نے کہا۔ ”وہ ہمیں جانتے ہی نہیں تو ہماری نشاندہی کس طرح کر سکیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ ہمارا حلیہ بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن وہ دونوں اس قدر بدحواس تھے کہ ہمارا حلیہ انہیں یاد ہی نہیں رہا ہوگا۔ اور ویسے ایک بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب ان دونوں کو ان کا محکمہ بھی تلاش نہیں کر سکے گا۔“

”کیا مطلب؟“ نجمہ نے مجھے گھورا۔

”وہ خوفزدہ ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ اسی کوٹھی کی حفاظت پر تعینات تھے۔ انہوں نے غفلت کا مظاہرہ کیا۔ دو حسین عورتوں کو دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئے۔ اگر بات صرف چوری یا ڈکیتی کی حد تک محدود رہتی تو شاید وہ بعد کی صورتحال کا سامنا کر لیتے۔ لیکن اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ سامنے آئیں گے۔“

باتوں کے ساتھ میری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رہی۔ تقریباً بیس منٹ بعد کار ہمارے مکان والی گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے کار گیٹ کے سامنے روک کر ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھی ہوئی چابیوں کا کچھا نکال کر نجمہ کی طرف بڑھا دیا۔ نجمہ نے نیچے اتر کر گیٹ کھول دیا اور میں کار کو اندر لیتا چلا گیا۔

برآمدے والے دروازے سے پال کمرے میں داخل ہو کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور بتی جلادی۔ نجمہ میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ روشنی ہوتے ہی وہ آگے بڑھ کر ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس نے اپنے اوپر چادر کی طرح لپٹی ہوئی ساڑھی اتار کر پھینک دی۔ میں نے پہلی مرتبہ غور سے اس کی طرف دیکھا تو چوکنے بغیر نہیں رہ سکا۔

نجمہ کا حلیہ واقعی بہت اتر ہو رہا تھا۔ لچھے ہوئے بال، چہرے اور گردن پر چند خراشیں اور بلاؤز بھی پوری طرح پھٹ چکا تھا۔ رکشی سے دھینگا مشتی میں اس کی حالت واقعی بگڑ گئی تھی۔ وہ صوفے پر پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

”کمرے میں جا کر کپڑے بدل لو اور یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔“ میں نے اس کے قریب رک کر کہا۔ ”چند جوڑے کپڑے اور کچھ انتہائی ضرورت کی چیزیں ایک سوٹ کیس میں ڈال لو۔“

”کیا مطلب؟“ نجمہ نے مجھے گھورا۔ ”کیا یہ جگہ ہمیں چھوڑنی ہوگی؟“

”ہاں..... ہم صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل چلیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہاں رہنا ہمارے لئے ٹھیک نہیں ہوگا۔“

مجھے اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ میں نجمہ کو وہیں چھوڑ کر کچن میں چلا آیا

مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ایک رات ملک شہاب کے بندے موت کے فرشتوں کی طرح میرے تعاقب میں لگے ہوئے تھے اور میں چھپنے کے لئے مادام دھکے کی کوشی میں گھس گیا تھا۔ اس سے تھوڑی دیر پہلے ہی تاجی اور ٹکیل مادام دھکے کو قتل کر کے فرار ہوئے تھے۔ اگر وہ بدحواس نہ ہوئے ہوتے تو یہ ساری دولت بھی انہی کے ہاتھ لگتی۔“

”یہ..... یہ تو کروڑوں روپے ہیں۔ اور یہ زیورات اور سونے کے بکٹ.....“ وہ ایک ایک چیز اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر سنسنی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ ”یہ دولت اتنی ہے کہ ہماری آنے والی دو تین نسلیں عیش کر سکتی ہیں۔ کسی کو کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”کیا کہہ رہی ہو..... ہماری آنے والی نسلیں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، ہماری نسلیں۔“ وہ روانی میں کہہ گئی۔ اور جب مطلب سمجھ میں آیا تو وہ بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ ”میں نے غلط تو نہیں کہا نا؟“

اس نے بانہیں پھیلا کر میری طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ مگر میں تیزی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

”اب تم جلدی سے اپنے جامے میں آ جاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ دن طلوع ہو چکا ہے۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہئے۔“ میں نے کہا۔

نجمہ گہرا سانس لے کر پیچھے ہٹ گئی اور الماری میں سے کپڑے نکالنے لگی۔

میں نے نوٹوں کے تمام بنڈل اور زیورات اور سونے کے بکٹ سوٹ کیس میں رکھ دیئے۔ ان کے اوپر اپنے دو تین جوڑے رکھے اور پھر نجمہ نے جو کپڑے نکال کر دیئے وہ بھی سوٹ کیس میں رکھ دیئے۔

ہماری تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ لیکن میں اس وقت یہاں سے نکلنا چاہتا تھا جب سڑکوں پر ٹریفک کی روانی ہو اور چیکنگ کا کوئی خطرہ نہ ہو۔

”یہاں آخری ناشتہ کر لیں۔“ نجمہ نے میری طرف دیکھا۔ ”میرا مطلب ہے اس گھر میں آخری ناشتہ۔“

”ہاں..... بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ نجمہ کچن میں گھس گئی۔ اور پھر آدھے گھنٹے بعد ہم دونوں ناشتہ کر رہے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے سوٹ کیس کار کی ڈگی میں رکھ دیا اور اندر گھوم پھر کر آخری مرتبہ مکان کو دیکھنے لگا۔ ملک شہاب سے

نجمہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ میرے حواس بحال ہوئے تو صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ نجمہ آنکھیں بند کئے مدھوش سی پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ میں اٹھ کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں تیار ہو کر ہاتھ روم سے نکلا تو نجمہ اسی طرح بیڈ پر پڑی تھی۔ میں نے الماری کے اوپر رکھا ہوا ایک سوٹ کیس اٹھا کر بیڈ پر رکھا اور الماری میں سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ اور پھر نجمہ کو اسی طرح پڑے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

بہت ہلکا سا آجالا پھیلنے لگا تھا۔ میں برآمدے میں کھڑا کچھ دیر ادھر دیکھتا رہا جہاں انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک تھا۔ ڈھکنے کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بار پھر ادھر ادھر کے مکانوں کی چھتوں کی طرف دیکھا اور جھک کر ٹینک کا ڈھکنا اٹھانے لگا۔

ڈھکنا ایک طرف رکھ کر میں نے پانی میں ڈوبا ہوا بیگ نکال لیا اور اس سے بندھی ہوئی رتی کھولنے لگا۔

اسے ٹینک میں پھینک کر میں نے ڈھکنا دوبارہ اوپر رکھ دیا اور بیگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بیگ سے نچرنے والا پانی دھاروں کی صورت میں ڈھلوان فرش پر بہہ رہا تھا۔

میں نے بیگ اٹھایا اور اندر آ گیا۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے سے پہلے میں برآمدے والا دروازہ اندر سے لاک کرنا نہیں بھولا تھا۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو نجمہ جسم پر تولیہ لپیٹے ہاتھ روم سے نکل رہی تھی۔ جس طرح بیگ سے پانی نچ رہا تھا اسی طرح نجمہ کے جسم پر بھی پانی کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔

”یہ کیا ہے؟“ نجمہ نے حیرت سے تھیلے کی طرف دیکھا۔

”جس کے لئے رختی اور اس کے ساتھیوں نے جان دے دی اور ہم اپنی جانیں بچا کر لے آئے۔“ میں نے جواب دیا اور بیگ درمی پر رکھ دیا۔ اس سے نچرنے والا پانی درمی میں جذب ہونے لگا۔

میں بیگ کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے اوپر پلٹا ہوا پلاسٹک کا تھیلا کھولنے لگا۔ پلاسٹک کے تین تھیلے تھے جو میں نے اتار کر ایک طرف ڈال دیئے۔ کیٹس کا بیگ بالکل خف تھا۔ اور جب میں نے بیگ کی زپ کھول کر اسے بیڈ پر پلٹا تو نجمہ اس طرح اچھلی تھی جیسے بچہ نے ڈمک مار دیا ہو۔

”یہ..... یہ کیا.....؟“ مارے حیرت کے اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

”یہ وہ خزانہ ہے جو کئی مہینے پہلے میں مادام دھکے کی کوشی سے اڑا کر لایا تھا۔“ میں نے

نجمہ بھی شاید برآمدے والے دروازے کی آڑ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی باہر آگئی۔ اور پھر میں اس عورت کو باہر نہیں روک سکا تھا۔ میں نے کرسیاں لا کر برآمدے ہی میں ڈال دیں۔

”معاف کیجئے مسز فرید!“ میں نے کہا۔ ”کئی روز گھر بند ہونے کی وجہ سے ہر چیز گرد آلود ہو رہی ہے۔ ہم صفائی کر رہے تھے۔ آپ برانہ مائیں تو یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔“

”میں برا کیوں مانوں گی بھئی۔“ مسز فرید کہتے ہوئے بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آپ لوگ کچھ بتا کر نہیں گئے تھے۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔“

”گئے تو ہم دو تین دن کے لئے تھے۔ مگر آپ جانتی ہیں زمینداری میں کتنے جنجال ہوتے ہیں۔ خلاف توقع زیادہ دن لگ گئے۔“

”آپ بیٹھے، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ نجمہ کہتے ہوئے اندر چلی گئی۔ میں مسز فرید کے پاس بیٹھا اپنی زمینداری کی من گھڑت کہانیاں سناتا رہا۔ شروع میں جب ہم یہاں آئے تھے تو محلے والوں کو یہی بتایا تھا کہ ہم گجرات کے رہنے والے ہیں اور زمین بیچ کر شہر میں کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ اور اب میں اسے کچھ ایسے ہی قصے سن رہا تھا۔

نجمہ نے اندر سے آواز دی تو میں اٹھ کر اندر آ گیا۔ وہ چائے بنا چکی تھی۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ مسز فرید کے سامنے کس قسم کی باتیں کرنی ہیں۔ نجمہ ٹرے اٹھا کر باہر چلی گئی۔

مسز فرید تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھی رہی۔ اس کے جانے کے بعد ہم پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ سوٹ کیس دیوار گیر الماری کے نچلے خانے میں رکھ کر الماری کو تالا لگا دیا گیا تھا۔

دو بج گئے تھے۔ ہم لوگ اگرچہ مارکیٹ سے کھانے پینے کا سامان لے کر آئے تھے مگر ابھی کھانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔

پانچ بجے کے قریب کھلی میں رکشہ رکا اور تیل بجائے جانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے باہر آ کر دروازہ کھولا تو احمدمدکھ کر حیران رہ گیا۔

”مجھے یقین تھا کہ تم یہیں ملو گے۔“ وہ اندر آتے ہوئے بولا۔

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہاں تو بڑی گڑبڑ ہے روٹی باؤ!“ احمدمد نے جواب دیا۔ اس وقت ہم اندر آ چکے تھے۔

”میں وزیر آباد گیا ہوا تھا۔ کل رات ہی واپس آیا ہوں۔ آج صبح رکشہ لے کر نکلا تھا۔ گلبرگ کی طرف گیا تو وہاں بڑا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ رات کو کسی نے مادام دھکے کی کوٹھی کو آگ لگا دی تھی۔ بڑی پولیس جمع تھی ادھر۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بتانے لگا کہ کوٹھی کی ڈیوٹی پر تعینات ایک پولیس والے کو چاہ میراں سے پکڑ لیا گیا تھا۔ اس نے ساری کہانی سنا دی تھی اور یہ بھی

پنگے بازی کے بعد یہ مکان میرے لئے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔ اگر رختی نداری نہ کرتی تو شاید میں کچھ عرصہ اور یہاں رہتا۔ لیکن اب یہ پناہ گاہ بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔

میں نے کار گیٹ سے باہر نکالی۔ نجمہ نے برآمدے والا دروازہ بند کر کے گیٹ کو بھی باہر سے تالا لگا دیا اور کار میں آ کر بیٹھ گئی۔

رختی والے مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظریں غیر ارادی طور پر سامنے والے مکان کی طرف اٹھ گئیں۔ توقع کے عین مطابق پڑوس دروازے کی آڑ میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ یہ پڑوس بھی بڑی عجیب عورت ثابت ہوئی تھی۔ اس کا کام ہی شاید محلے والوں کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنا تھا۔

مین روڈ پر آ کر میں نے کار کو بائیں طرف موڑا اور کچھ دور ایک کٹ سے گھما کر اسے سڑک کے دوسرے حصے پر لے آیا اور رفتار بڑھا دی۔

اس وقت اٹھ بج رہے تھے اور سڑکوں پر اچھا خاصا ٹریفک رواں تھا۔ ہمیں شاہ جمال تک پہنچنے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آئی تھی۔

شاہ جمال مارکیٹ میں ایک جگہ کار روک کر ہم نے کچھ سامان خریدا اور دوبارہ کار میں آ گئے۔ وہاں سے شادمان کالونی میں اس کوٹھی تک آنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

پہلی کوٹھی سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے اس کوٹھی کی چابیوں کا گچھا اٹھالیا تھا۔ گیٹ کے سامنے کار روک کر میں نے چابیوں کا گچھا نجمہ کی طرف بڑھا دیا اور وہ دروازہ کھول کر کار سے اتر گئی۔

گھر کی ہر چیز گرد آلود ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے تو جھاڑ پونچھ میں لگ گئے۔ ابھی ہم اس کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ کال نیلی کی آواز سن کر اچھل پڑے۔ میں نے اور نجمہ نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”زکو..... میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا اور باہر آ گیا۔

گیٹ کا ذیلی دروازہ کھولا تو سامنے ایک عورت کو دیکھ کر میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ ہماری اس کوٹھی کی پڑوس تھی۔ پہلے بھی وہ کئی بار نجمہ کے پاس آ چکی تھی۔

”ارے! آپ لوگ کہاں چلے گئے تھے؟“ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

”گجرات گئے ہوئے تھے۔ خلاف توقع کئی روز وہاں رہنا پڑ گیا۔“ میں نے جواب دیا۔

میں اسے باہر ہی سے ٹر خادینا چاہتا تھا مگر وہ اندر کھسی چلی آرہی تھی۔

کی۔ اس لئے میرے خیال میں ہمیں فوری طور پر کوئی اور جگہ تلاش کر لینا چاہئے۔
 ”کوئی اور جگہ ہے ذہن میں؟“ امجد نے پوچھا۔

”نہیں..... فی الحال ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر میرے گھر چلو.....“ امجد بولا۔ ”سوچنے کا موقع نہیں ہے۔ تمہاری باتیں سن کر مجھے صورتحال کی نزاکت کا احساس ہو رہا ہے۔ ایسا کرتے ہیں۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”تم لوگ اپنا سامان گاڑی میں رکھ کر میرے رکشے کے پیچھے چلے آؤ۔“

”گاڑی بھی اب مشکوک ہو چکی ہے۔ اسے ہم یہیں چھوڑ دیں گے اور تمہارے رکشے میں چلیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ اور نجمہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”وہ سوٹ کیس الماری میں سے نکال لو۔ ہم اسی وقت یہاں سے روانہ ہوں گے۔“
 نجمہ ایک بار پھر دہشت زدہ سی ہو گئی۔

اس وقت سات بج رہے تھے اور اندھیرا پھیل رہا تھا۔ نجمہ نے ہر چیز وہیں پر چھوڑ دی جہاں تھی اور دیوار گیر الماری سے وہ سوٹ کیس نکال لیا جسے یہاں آنے کے بعد کھولا بھی نہیں گیا تھا۔

امجد کا رکشہ گیٹ کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ باہر نکل کر پہلے میں نے نجمہ کو اندر بٹھایا۔ سوٹ کیس اس کے پیروں کے قریب فٹ میٹ پر رکھ کر میں نے کوشی کے گیٹ کو تالا لگا دیا اور خود بھی نجمہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سوٹ کیس کی وجہ سے پیر رکشے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ رکشہ کے دروازوں کی وجہ سے مزید پریشانی ہو رہی تھی۔

رکشہ پارک کی طرف جانے کی بجائے کئی کے دوسری طرف جا رہا تھا۔ ابھی پہلے موڑ پر پہنچے ہی تھے کہ دائیں طرف پولیس کی تین جیپیں سامنے آ گئیں۔ امجد نے بڑی پھرتی سے رکشہ بائیں طرف گھما دیا۔ رکشہ آگے والی جیپ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔ امجد کے منہ سے گندی گالی نکل گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے رخ پھیر لیا۔

”کیوں..... کیا ہوا..... ڈر گئے؟“ میں نے کہا۔

”تمہارا خیال درست نکلا روئی باؤ!“ امجد پیچھے مڑ کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ ”آگے والی جیپ میں شبو اور اس کا باپ بیٹھا ہوا ہے۔“

”کیا.....؟“ میں اچھل پڑا۔

جیپوں کے ہیڈ لیمپس کی روشنی براہ راست رکشہ کے دروازے پر پڑ رہی تھی۔ اگر رکشہ میں دروازے نہ لگے ہوتے تو ہم روشنی کی زد میں آ جاتے۔ لیکن اس وقت ان دروازوں نے

بتایا کہ ان دو عورتوں میں ایک رخشندہ نام کی عورت تھی جو پہلے پولیس میں رہ چکی تھی اور ایک آدمی سابق کانسیبل سولجر تھا۔

میں چونک گیا۔ امجد کے کہنے کے مطابق رخشندہ کا نام سن کر وہ سمجھ گیا کہ کیا ہوا ہو گا۔ سولجر کے نام نے بھی اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

”میں تمہاری دوسری کوشی کی طرف گیا تو مجھے دور ہی رُک جانا پڑا۔ تمہاری اور رخشہ کی کوشی پر پولیس کا قبضہ ہے اور کسی کو گلی میں بھی نہیں جانے دیا جا رہا۔ پوچھ گچھ پر پتہ چلا کہ یہاں کوئی بھی نہیں پکڑا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ تم لوگ کہاں ہو سکتے ہو۔“

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ہم لوگ بد وقت وہاں سے نکل آئے تھے۔ اگر وہاں رہ جاتے تو اس وقت سلاخوں کے پیچھے بند ہوتے۔ وہ شاید میری چھٹی حس تھی جس نے مجھے وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”سولجر کہاں ہے روئی باؤ؟“ امجد نے بالآخر وہ سوال کر ہی ڈالا جس سے میں ڈر رہا تھا۔
 ”سولجر۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے افسوس ہے وہ ہم میں نہیں رہا۔“

”اور رخشہ؟“ امجد نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”اس کی غداری کی وجہ سے تو سولجر کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔“ میں نے کہا اور پھر تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔

میں آخر میں کہہ رہا تھا۔ ”رخشہ کی نیت میں دراصل شروع ہی سے کھوٹ تھا۔ اگر وہ غداری نہ کرتی تو سولجر اس وقت ہمارے ساتھ بیٹھا ہوتا۔ میرا ایک قیمتی دوست ضائع ہو گیا۔ مجھے اس کا افسوس زندگی بھر رہے گا۔“

”واقعی۔ وہ بہت پیارا آدمی تھا۔“ امجد نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ ”اب کیا پروگرام ہے روئی باؤ..... کیا تم اس جگہ کو اپنے لئے محفوظ سمجھتے ہو؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”اب تمہاری باتوں سے اندازہ ہوا ہے کہ یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ پولیس کو سولجر کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ انہیں یہ بھی پتہ چل گیا ہو گا کہ سولجر بھی کوشی کی آگ میں جل کر مر چکا ہے۔ لیکن اس کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے پولیس کوئی نہ کوئی کارروائی ضرور کرے گی۔ اگر وہ سولجر کے مکان پر پہنچ گئے تو ممکن ہے پوچھ گچھ کے دوران شبو ان کے ہاتھ چڑھ جائے اور شبو اس کوشی میں کئی بار آ چکی ہے۔ وہ پولیس کی مار برداشت نہیں کر سکے گی اور انہیں سیدھا یہاں لے آئے

اپنی اصل حالت میں بچا ہوا ہے کہ اس کے کبھی بھی ایک سے زیادہ دعویدار نہیں رہے۔
”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے اُنکھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بڑی دلچسپ کہانی ہے۔“ امجد بولا۔ ”میرا پردادا اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ میرا دادا بھی اپنے والدین کی واحد اولاد تھا۔ اور پھر میرا والد، اس کا بھی کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ اور اس کے بعد میں ہوں۔ میں بھی بالکل اکیلا ہی ہوں۔ کوئی بہن بھائی نہیں۔ اس طرح یہ مکان ہمیشہ فرو واحد کی ملکیت رہا ہے۔ اس لئے اس کے حصے بخرے نہیں ہوئے۔“

”اور شاید تم نے شادی نہیں کی۔ تمہارے بعد.....“

”نہیں روئی باؤ!“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”میرا بھی ایک بیٹا ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”بارہ سال پہلے میری شادی ہوئی تھی۔ اس کے دو سال بعد بچے کی پیدائش ہوئی اور خدا کی بندی بیٹے کو جنم دے کر خود اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ بیٹے کو میری اماں اور میری خالہ نے پالا ہے۔ وہ اب ماشاء اللہ دس سال کا ہے اور چوتھی کلاس میں پڑھتا ہے۔“

”ایک مرتبہ تم نے اپنی والدہ کا ذکر کیا تھا۔ کہاں ہیں وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”انہیں نارووال اپنی خالہ کے پاس چھوڑ کر آیا ہوں۔“ امجد نے جواب دیا۔ ”میرا بیٹا ارشد بھی وہیں رہتا ہے۔ میں مہینے میں ایک دو مرتبہ ملنے کے لئے چلا جاتا ہوں۔ اور اماں کبھی میرے پاس رہتی ہے اور کبھی اپنی بہن کے پاس نارووال چلی جاتی ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”تم لوگ کمرے میں بیٹھو۔ میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔“

”امجد بھائی! مجھے بتاؤ، باورچی خانہ کہاں ہے؟ میں چائے بناتی ہوں۔“ نجمہ نے کہا۔

”تو پھر آؤ۔“ امجد نے کہا۔

ہم باورچی خانے میں آ گئے۔ باورچی خانے کو دیکھ کر امجد کی والدہ کی سلیقہ مندی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری اور اپنی اپنی جگہ پر موجود تھی۔ امجد، نجمہ کو مختلف چیزوں کے بارے میں بتانے لگا۔ پھر ایک پتیلی اٹھاتے ہوئے بولا۔

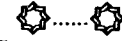
”تم چائے کے لئے پانی چڑھاؤ..... میں دودھ لے کر آتا ہوں۔“

امجد باہر چلا گیا۔ نجمہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ میں لیکن کے دروازے میں کھڑا اسے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد باہر رکشہ رکنے کی آواز سنائی دی اور پھر امجد پتیلی اٹھائے اندر داخل ہوا۔ دودھ لینے کے لئے اسے آگے بازار تک جانا پڑا تھا۔

ہمیں بچا لیا تھا۔

آخری چپ جیسے ہی ہماری کونٹی والی گلی میں مڑی، امجد رکشہ کو سڑک کے وسط میں لے آیا اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ جلد ہی ہم گلیوں سے نکل کر مین روڈ پر آ گئے۔ امجد رکشہ کو طوفانی رفتار سے دوڑاتا رہا۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت بھی ہم بال بال بچے تھے۔ اگر دو تین منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ہم مارے جاتے۔ میں نے گردن گھما کر نجمہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ میں اس کا ہاتھ تھپتھپانے لگا۔



مصری شاہ جیسی منجانب آبادی میں وہ گلی کافی کشادہ تھی۔ امجد کا مکان گلی کے شروع ہی میں تھا۔ اس نے گلی میں داخل ہوتے ہی رکشہ روک لیا اور انجن بند کر دیا۔ اس گلی کے سامنے اگرچہ کھلی سڑک تھی مگر وہاں دکانیں وغیرہ نہیں تھیں اس لئے گلی کے سامنے سڑک پر بھی اتنی رونق نہیں تھی۔ تاہم چاہ میراں اور امن پورہ کی طرف سے دلی دروازہ اور انٹین کی طرف جانے والا سارا ٹریفک اس سڑک سے گزرتا تھا۔ اس گلی سے تقریباً پچاس گز آگے کا علاقہ رنگ برنگی روشنیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس طرف رات بھر کھلے رہنے والے کئی ریسٹورنٹ اور بان کی دکانیں تھیں۔ آگے بہت لمبا چوڑا بازار تھا جہاں دس گیارہ بجے تک عام دکانیں بھی کھلی رہتی تھیں۔

امجد نے مکان کا تالا کھولا اور رکشے میں سے سوٹ کیس اٹھا کر ہمیں اشارہ کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

مکان کا صحن بہت کشادہ اور پختہ اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ بالکل سامنے تین بکرے تھے جبکہ بائیں طرف جگہ خالی تھی اور دیوار کے قریب کئیاں بنی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف بھی دو کمرے تھے۔ ایک کمرہ بیٹھک کے طور پر آراستہ تھا اور اس کا ایک دروازہ باہر سڑک کی طرف بھی کھلتا تھا۔

امجد ہمیں سامنے والے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرہ بہت بڑا تھا۔ اس میں دو چار پائیاں اور تین چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اندر داخل ہو کر اس نے سوٹ کیس ایک طرف رکھ دیا اور پھر ہمیں گھوم پھر کر مکان دکھانے لگا۔ مکان کا رقبہ اتنا بڑا تھا کہ ایک شاندار پلازہ بن سکتا تھا۔

”یہ مکان میرے پردادا نے بنوایا تھا روئی باؤ!“ امجد کہہ رہا تھا۔ ”اور اب تک اس لئے

محلے میں ان کا ملنا جلنا کم ہی رہتا ہے۔ ایک مائی آتی تھی گھر کا کام کاج کرنے کے لئے۔ نارود وال جانے سے پہلے اسے منع کر دیا تھا۔ صبح اس سے کہہ دوں گا۔ وہ آکر کام کر دیا کرے گی۔ کھانا بہت اچھا پکاتی ہے وہ۔“

”ہمارے بارے میں وہ کیا سمجھے گی؟“ میں نے پوچھا۔
 ”مہمان تو ہر گھر میں آتے ہیں۔ وہ کوئی جرح تو نہیں کرے گی۔“ امجد نے کہا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اب تم لوگ آرام کرو۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“
 امجد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ بھیڑ دیا اور دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔ نجمہ بھی اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔
 ”اس سوٹ کیس کو یہاں کوئی خطرہ تو نہیں؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

”امجد سے تو کوئی خطرہ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اب تک تو اس نے میرے اعتماد کو نہیں ہینچائی۔ وہ ہمارے لئے جو کچھ بھی کر رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر مکمل طور پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔“
 ”اس پر ہم نے بھروسہ تو کیا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت ہم اس کے رحم و کرم پر ہیں۔“ نجمہ نے کہا۔

میں چند لمبے خاموش رہا، پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔
 ”ایک بات بتاؤ نجمہ..... تمہیں اپنا گھریا نہیں آتا؟“

نجمہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ مجھے اپنی بات پر افسوس ہونے لگا۔ میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔
 ”مجھے افسوس ہے نجمہ مجھے تم سے یہ سوال نہیں کرنا چاہئے تھا۔“ میں نے متاسف لہجے میں کہا۔

”تم نے یہ سوال کر کے کوئی برا نہیں کیا۔“ وہ افسردہ سے لہجے میں بولی۔ ”حقیقت یہ ہے کہ میں کبھی ایک لمحہ کو بھی اپنے گھر کو نہیں بھولی ہوں۔ مجھے ہر لمحہ وہ سب کچھ یاد آتا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، گھر کا آنگن۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ میں نے گھر کی دہلیز کے باہر قدم نکال کر واقعی بہت بڑی غلطی کی تھی۔ ماں باپ اپنی اولاد کے لئے جو کچھ بھی کرتے ہیں، بہتر ہی کرتے ہیں۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔

چائے بنا کر ہم اسی کمرے میں آگئے جہاں ہمارا سوٹ کیس رکھا گیا تھا۔ میں اور امجد کرسیوں پر بیٹھ گئے اور نجمہ ایک چارپائی پر پیر لٹا کر بیٹھ گئی اور ہم چائے کی چسکیوں کے ساتھ آج کی صورت حال پر تبصرہ کرنے لگے۔

ہماری قسمت ہی اچھی تھی جو آج دو مرتبہ بال بال بچے تھے۔ میری چھٹی حس نے مجھے خطرے کا احساس دلایا تھا اور ہم ایجوکیشن ٹاؤن والی کوٹھی سے نکل آئے تھے۔ اور پھر امجد فرشتہ بن کر ہی شادمان ٹاؤن والی کوٹھی پہنچ گیا تھا جس سے ہمیں صورتحال کا پتہ چلا اور پولیس کے پہنچنے سے صرف دو منٹ پہلے ہم وہاں سے بھی نکل آئے تھے۔ اور اب یہ جگہ..... یہاں میرے خیال میں ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

اب امجد ہی ایک ایسا واحد شخص تھا جو ہمیں جانتا تھا۔ تاجی کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ رنجی کا قصہ بھی تمام ہو چکا تھا۔ لے دے کر ملک شہاب کا منٹارہ گیا تھا۔ ملک شہاب سے میں چھپ کر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس کا قصہ نمٹانے کے لئے سامنے آنا ضروری تھا۔ اگرچہ میرے لئے پولیس کا خطرہ بدستور تھا۔ لیکن امجد کے مکان کی صورت میں مجھے ایک ایسی پناہ گاہ مل گئی تھی جہاں میں پولیس سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

اس گلی میں صرف چند ہی مکان تھے۔ البتہ تقریباً سو گز آگے اس سے دائیں بائیں کئی گلیاں پھوٹی تھیں۔ اور گنجان آبادی شروع ہو جاتی تھی۔

امجد کے پرانے طرز کے مکان کا پھانک نما دروازہ اتنا کشادہ تھا کہ رکشہ آسانی سے اندر آ سکتا تھا۔ اس روز ہمیں یہاں لانے کے بعد وہ رکشہ چلانے نہیں گیا تھا۔ رات گیارہ بجے کے قریب وہ رکشہ اندر لے آیا اور پھر ہم دو ڈھائی بجے تک باتیں کرتے رہے۔

”اب تمہیں ایک اور کام کرنا ہے۔“ میں نے امجد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جن دنوں تاجی گرفتار ہوئی تھی، ملک شہاب روپوش ہو گیا تھا۔ معلوم کرو وہ کہاں ہے۔ میرا خیال ہے بھائی میں شکرے کے اڈے سے یا مرنگ میں چیتے کے اڈے سے اس کے بارے میں معلوم ہو سکتا ہے۔“

”میں معلوم کر لوں گا روٹی باؤ!“ امجد نے جواب دیا۔ ”ویسے بہتر یہی ہے کہ تم لوگ دو چار دن باہر مت نکلو، احتیاط بہر حال ضروری ہے۔ یہاں تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”یہاں پر بڑے سبکی کی آمد و رفت کیسی ہے..... میرا مطلب ہے پاس پڑوس کی عورتیں تمہاری والدہ سے ملنے تو آتی ہوں گی۔“ میں نے پوچھا۔

”زیادہ نہیں۔“ امجد نے جواب دیا۔ ”میری والدہ اصل میں کچھ چڑچڑے مزاج کی ہیں۔“

اور گردن پر لہراتے ہوئے بال۔ کہیں جانے کا ارادہ ہے کیا؟“ اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے۔

”ہاں..... اتارکلی کی تلاش میں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا اتارکلی تمہیں اپنے ساتھ کھڑی نظر نہیں آرہی؟“ نجمہ مسکرا کر بولی۔ میں جواب دینے کی بجائے اس کی طرف گھوم گیا۔ وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔

”مجھے کبھی چھوڑ کر مت جانا۔ میرا تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔“ میرے کان کے قریب

اس کی سرگوشی ابھری۔

”تمہیں اپنے سے الگ کرنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب تو ہم جنیں گے بھی اکٹھے اور مریں گے بھی ایک ساتھ۔“ میں نے اسے بانہوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کر لیا۔ ”کئی دن ہو گئے ہیں یہاں آئے ہوئے۔ آج ہم سیر کے لئے نکلیں گے اور رات کا کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔“

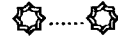
نجمہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھرائی۔ باہر جانے کے خیال سے وہ بھی خوش ہو گئی تھی۔ اس روز دوپہر کو امجد کھانا کھانے کے لئے آیا تو میں نے اسے بھی بتا دیا کہ ہم رات کا کھانا باہر کھائیں گے۔ وہ تو اس بات پر تیار تھا کہ ہمیں اپنے رکشے پر لے جائے مگر میں نے اسے منع کر دیا۔

ہم رات آٹھ بجے کے قریب گھر سے نکلے۔ نجمہ نے میری فرمائش پر ساڑھی پہنی تھی۔ دروازہ قامت اور گداز بدن پر اسے یہ لباس بہت اچھا لگتا تھا اور اس وقت تو وہ واقعی بہت شاندار لگ رہی تھی۔

مکان کے بیرونی دروازے کو تالا لگا کر میں نے چابیوں کا گچھا پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ گلی میں اس وقت لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ بعض لوگ مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ لاہور میں ساڑھی پہننے کا رواج نہیں تھا۔ اونچی سوسائٹی کی خواتین تقریبات کے موقع پر یہ لباس استعمال کرتی تھیں۔ عام خواتین تو جانتی بھی نہیں تھیں کہ ساڑھی جسم پر لپٹی کیسے جاتی ہے۔ گلی سے نکل کر ہم سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ دونوں طرف ٹریفک رواں تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد ہمیں ایک رکشہ مل گیا۔

مال روڈ پر لاؤڈ ریٹورنٹ سے کچھ دور ہم نے رکشہ چھوڑ دیا۔ مال روڈ پر اس وقت بہت رونق تھی۔ ہم ٹہلتے ہوئے ریٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت ریٹورنٹ

اور پھر اسے سسکیاں بھرتے دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ میں اٹھ کر اس چارپائی پر آ گیا اور اسے تسلی دینے لگا۔ نجمہ میرے سینے سے سرٹکا کر سسکیاں بھرتی رہی اور وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔



ہمیں امجد کے مکان میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ یہاں ہمیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ کسی پڑوسن کا آنا جانا بھی نہیں تھا۔ رابعہ نامی ایک بھاری بھر کم ادھیڑ عمر عورت صبح آ جاتی۔ ہمارے لئے ناشتہ وہی بناتی اور دوپہر کا کھانا تیار کر کے چلی جاتی۔ یہاں زیادہ کام تو تھا نہیں جو اسے دن بھر یہاں رہنا پڑتا۔ ویسے بھی اگلے مہینے اس کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی اور اس کی اپنی بھی کچھ گھریلو مصروفیات تھیں۔

رابعہ، نجمہ سے کچھ بے تکلف ہو گئی تھی اور باتوں باتوں میں یہ اشارے دیتی رہتی تھی کہ اسے کچھ مالی مدد کی ضرورت ہے۔ نجمہ نے بھی اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کے لئے کچھ چیزیں لے دے گی اور کچھ مالی مدد بھی کر دے گی۔

امجد صبح ناشتہ کرتے ہی رکشہ لے کر نکل جاتا۔ وہ دوپہر کا کھانا گھر پر آ کر ہمارے ساتھ کھاتا اور پھر اس کی واپسی رات گیارہ بجے کے قریب ہوتی۔

بھائی گیٹ کے علاقے میں شکرے کے اڈے اور مزنگ میں چھتے کے اڈے سے اسے اسے ملک شہاب کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا لیکن بہر حال وہ اس کی تلاش میں تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ رکشے پر سواریاں تو کم ہی اٹھاتا تھا، ملک شہاب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے شہر بھر میں پھیلے ہوئے فشیات کے اڈوں پر زیادہ گھومتا رہتا تھا۔

اس ایک ہفتے کے دوران نجمہ تو رابعہ کے ساتھ ایک دو مرتبہ بازار بھی گئی تھی۔ اسے کوئی نہیں جانتا تھا اور کوئی خطرہ نہیں تھا۔ البتہ میں نے کبھی دروازے سے باہر بھی جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔

میں نے داڑھی بڑھالی تھی اور مونچھوں کو بھی کنارے سے اوپر کی طرف بل دینا شروع کر دیئے تھے۔ اس روز میں نے بے ترتیب داڑھی کو یو شپپ میں تراش کر اپنا حلیہ درست کیا اور آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اور پھر اتنے میں اپنے پیچھے نجمہ کا عکس دیکھ کر میں چونک گیا۔

”مغل شہزادے لگ رہے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کتابوں میں مغل شہزادوں کی ایسی ہی تصویریں دیکھی ہیں۔ گول داڑھی، نوک دار بل کھاتی ہوئی باریک مونچھیں

معیاری اور شرفاء کے ریسٹورنٹ میں آمد و رفت رکھتا ہو۔ لیکن جیب میں پیسہ ہو تو کوئی بھی شخص کہیں بھی جاسکتا ہے۔

میں نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ کسی میز پر واقعی کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔
”ٹھیک ہے..... بیٹھ جائیے۔ ہم تھوڑی دیر میں یہاں سے اٹھنے ہی والے ہیں۔“ میں نے ناگوار سے لہجے میں جواب دیا۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ وہ میری نظروں میں رہے اور اتفاق سے وہ ہماری ہی میز پر بیٹھ رہا تھا۔

”شکریہ۔“ اس نے کرسی گھسیٹ لی اور پھر بیٹھتے ہوئے چوک کر نجمہ کی طرف دیکھنے لگا۔
”ارے!“ اس کے لہجے میں قدرے حیرت تھی۔ ”اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ مس نجمہ ہیں۔ میں نے آپ کو.....“

”ممتاز کی کٹھی پر دیکھا تھا۔“ میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔
”جی ہاں..... جی ہاں..... میں یہی کہنا چاہتا تھا۔“ میری مداخلت پر وہ گڑبڑا سا گیا۔
نجمہ کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ کرسی پر بار بار پہلو بدلنے لگی جس سے اس کی بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”مسٹر.....“ میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
”مسلمان۔ میرا نام سلمان وحید ہے۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔
”مسلمان وحید صاحب.....“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ ممکن نہیں کہ جو عورت اپنی ہمت اور قوت ارادی کے بل بوتے پر زندگی کی دلدل سے نکل آئی ہو اسے شرافت کی پُر سکون زندگی بسر کرنے دی جائے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ اسے یہ یاد دلایا جاتا رہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک وہ ایک طوائف کے پاس تھی؟“

”مجھے افسوس ہے سربجی!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”مجھے تو خوشی ہوئی نجمہ بی بی کو آپ جیسے ایک شریف آدمی کے ساتھ دیکھ کر۔ وہ تاجی تو واقعی بڑی خبیث عورت تھی۔ اس نے پتہ نہیں کتنے گھر اجاڑے ہوں گے۔ اس کا انجام تو اس سے بھی برا ہونا چاہئے تھا۔ مجھے اپنا دوست سمجھو سربجی!“ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ”آپ کو ایک اچھے اور شریف آدمی کے ساتھ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے نجمہ بی بی! خدا آپ کو یہ نئی زندگی مبارک کرے۔“

”شکریہ سلمان صاحب!“ نجمہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ کے ساتھ وہ بھی تو ہوتے تھے۔ کیا نام تھا ان کا، شاہد ملک صاحب یا.....“
”ملک شہاب۔“ سلمان بولا۔ ”ہیر ورن کا اسمگر۔ وہ بھی آج کل روپوش ہے۔ میں بھی کئی

میں جگہ نہیں ملے گی۔ لیکن اتفاق سے ایک میز سے ایک پارٹی اٹھی تو ویٹر ہمیں وہاں لے آیا۔ میں نے صرف کافی کا آرڈر دیا۔ یہاں ہمارا کھانا کھانے کا پروگرام نہیں تھا۔ کھانے کے لئے میں نے فائینو اسٹار ہوٹل کا پروگرام بنایا تھا۔ اور تقریباً دس بجے وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ شاید یہاں ملک شہاب کے کسی آدمی سے آمنا سامنا ہو جائے۔

میں نے نجمہ کو جان بوجھ کر سامنے والی کرسی پر بٹھایا تھا تاکہ وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہونے والے ہر شخص کی نظروں میں آسکے۔ نجمہ طویل عرصہ تاجی کے پاس رہی تھی۔ وہاں اور لوگوں کے علاوہ ملک شہاب بھی آیا کرتا تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں ملک شہاب سے سامنا ہونے کی توقع تو نہیں تھی لیکن ایسا کوئی آدمی نظروں میں آسکتا تھا جس کا تاجی کے ہاں آنا جانا رہا ہو۔

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے میں بھی ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میں نے نجمہ کی طرف دیکھا تو چوک سا گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے تھے۔ بھنویں تن گئیں اور آنکھوں میں تشویش سی ابھر آئی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔
”وہ..... وہ آیا ہے۔ سلمان۔“ اس نے سرگوشیاں لہجے میں کہا۔
”مسلمان کون ہے؟“ میں نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔ ”میں نے یہ نام پہلی مرتبہ سنا ہے۔“
”ایک دو مرتبہ ملک شہاب کے ساتھ تاجی کی کٹھی پر آیا تھا۔“ نجمہ نے بتایا۔ ”پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔ وہ اسی طرف آ رہا ہے۔“
میں اطمینان سے بیٹھا کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ نجمہ بھی اب میری طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

صرف دو منٹ بعد ایک آدمی ہماری میز کے قریب آ کر رُکا۔ ”میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“
اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کسی اور ٹیبل پر کوئی سیٹ خالی نہیں ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو.....“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ درمیانے قد و قامت کا آدمی تھا۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ سفید پینٹ، کالی شرٹ اور جو تے بھی سفید ہی تھے۔ وہ کلین شیو تھا۔ ناک قدرے موٹی اور آنکھیں چھوٹی تھیں۔ بھنویں آپس میں ملی ہوئی اور پیشانی تنگ تھی۔ شکل و صورت سے وہ خاصا کینہ پرور لگتا تھا اور وہ ایسا آدمی ہرگز نہیں تھا جو اس قسم کے

بھی لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سلمان نے جگہ تلاش کر کے سروس روڈ پر ہی گاڑی کھڑی کر دی۔

ہوٹل کا بڑا ہال سالگرہ کی تقریب کے لئے مخصوص تھا جبکہ ہوٹل کے دوسرے گاہک دوسرے ہال کا رخ کر رہے تھے۔ ہم بھی دوسرے ہال میں آگئے۔ سلمان ہمیں ایک میز پر بٹھا کر سالگرہ والے ہال میں چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔

وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دوسرے آدمی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ ملک شہاب کا سالانہ ظفر تھا جو اسی ہوٹل کے ہال میں میرے ہاتھوں پٹ چکا تھا۔ سلمان نے ظفر سے میرا تعارف اپنے دوست رحمان کے نام سے کرایا اور نجمہ کو میری مسز ظاہر کیا۔ ظفر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”آئیے نا..... آپ لوگ اس طرف آئیے۔“ وہ بولا۔ ”سالگرہ کا کیک تو کٹ چکا ہے۔ اب کھانا شروع ہونے والا ہے۔ آئیے آپ لوگ بھی۔“

ہم معمولی سے ردو کد کے بعد اس کے ساتھ دوسرے ہال میں آگئے۔ لاتعداد مہمان تھے۔ اور اسی وقت کھانا شروع ہو گیا تھا۔

میرے شبہات کو اب کچھ تقویت مل رہی تھی۔ سلمان نے ظفر کو یہاں لا کر فرضی نام سے جس طرح ہمارا تعارف کرایا تھا اس سے مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔

ایک گھنٹے میں مہمان رخصت ہونا شروع ہو گئے۔ ظفر اور سلمان ہمارے ساتھ ہی تھے۔ وہ ہمارے سامنے اس طرح بچھے جا رہے تھے جیسے ہم ان کے خاص مہمان ہوں۔ اور پھر ہم چاروں کافی دیر تک الگ بیٹھے رہے۔ ظفر نے ہمیں اگلے روز ماڈل ٹاؤن میں اپنی کونٹری میں رات کے کھانے کی دعوت بھی دے دی تھی اور بڑا اصرار کیا تھا کہ ہم ضرور آئیں۔

بارہ بجے ہم ہوٹل سے نکلے تو سلمان نے پیشکش کی کہ وہ ہمیں اپنی گاڑی پر ہمارے گھر چھوڑ دے گا۔ لیکن میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے ٹیکسی کو ترجیح دی۔

وہ ٹیکسی ہم نے لکشی چوک پر چھوڑ دی۔ اس وقت بھی یہاں خاصی رونق تھی۔ فضا میں چرخے اور نکلے وغیرہ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رک گیا اور دو چرخوں کا آرڈر دے دیا۔

ریسٹورنٹ کے سامنے سڑک کے کنارے تک میزیں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ بہت سے لوگ بار بار نجمہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

روز تک اسے تلاش کرتا رہا ہوں مگر پتہ نہیں وہ کہاں غائب ہے۔ ویسے آج اس کے بھانجے کی سالگرہ ہے فائو اسٹار ہوٹل میں۔ اس وقت تو وہاں خوب ہنگامہ ہو رہا ہوگا۔“

”اتفاق سے ہمارا کھانا کھانے کا پروگرام بھی وہیں کا ہے۔ کچھ دیر کے لئے یہاں رک گئے تھے۔ ایک دوست کا انتظار تھا۔ لیکن شاید اب وہ نہیں آئے گا۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو چلئے..... وہیں چلتے ہیں۔ اگر آپ دونوں کو میرے ساتھ پر کوئی اعتراض نہ ہو تو۔“ اس نے کہتے ہوئے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ ”میری گاڑی باہر موجود ہے۔“

”ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ اور پھر ہمارا کافی کا بل بھی سلمان وحید ہی نے ادا کیا تھا۔ ہم ریسٹورنٹ سے باہر آئے تو ذرا آگے اس کی شاندار اوپل کار کھڑی تھی۔ میں اور نجمہ پیچھے بیٹھ گئے اور سلمان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

سلمان وحید راستے بھرتا جی کے بارے میں باتیں کرتا اور اسے گالیاں دیتا رہا۔ پھر اس نے خود ہی موضوع بدل دیا۔ اب وہ ملک شہاب کو گالیاں دے رہا تھا۔

”اس جیسے لوگوں کو تو چوراہے پر بھانسی دینی چاہئے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ قانون کے محافظ ہیں، وہی ملک شہاب جیسے لوگوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے خلاف بھی کوئی کارروائی ہونی چاہئے۔“

”یہ تو ممکن ہی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایسے محکموں میں لوگ خدمت کا جذبہ لے کر نہیں آتے۔ ان کے دل میں لالچ ہوتا ہے۔ دولت کا..... وہ تو کمائی کے لئے ایسے محکموں میں آتے ہیں۔“

”ٹھیک کہتے ہو سرجی.....“ سلمان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس نے ابھی تک میرا نام نہیں پوچھا تھا اور مجھے سرجی کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا۔

میرے ذہن میں شبہات جنم لے رہے تھے۔ میں نے اس سے پہلے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ ملک شہاب کا ساتھی تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے مجھے دیکھا ہو اور پہچان لیا ہو۔ لیکن اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

فائو اسٹار ہوٹل اتنے نورینا ہوا تھا۔ پوری عمارت رنگ برنگی روشنیوں سے بگمگم رہی تھی۔ عمارت کے سامنے وسیع و عریض لان کے پودوں اور درختوں پر بھی رنگ برنگی روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ہوٹل کے پارکنگ لائٹ پر تو سائیکل کھڑی کرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ باہر سروس روڈ پر

کے لئے ایک رکشہ بھی کرائے پر لے دیا۔

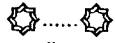
ظفر کی کوٹھی تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اور پھر میرا پورا دن اس کے آس پاس ہی گزرا تھا۔ پانچ بجے کے قریب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ملک شہاب کی بہن تھی جو اس کوٹھی سے نکل کر تیسری گلی میں واقع ایک اور شاندار کوٹھی میں گئی تھی۔ اور یہ مختصر سا سفر بھی اس نے ایک کار میں کیا تھا۔ جب کار اندر جانے کے لئے گیٹ کھلا تو میرا رکشہ اس وقت کوٹھی کے سامنے سے گزر رہا تھا اور میں نے لان میں کرسی پر بیٹھے ہوئے ملک شہاب کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اس کے بعد میں اس علاقے میں نہیں رکا۔

میرے گھر پہنچنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد امجد بھی پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی خوشخبری سنا دی۔

”میں نے ملک شہاب کا ٹھکانہ معلوم کر لیا ہے۔“ وہ بولا۔

”ظفر والی کوٹھی کے پیچھے تیسری گلی میں۔“ میں نے کہا۔

امجد حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں بھی ملک شہاب کے ٹھکانے تک پہنچ چکا تھا۔



میں نے اور نجمہ نے اپنی تیاری مکمل کر لی تھی۔ نجمہ نے شلوار قمیض پہنی تھی اور میں نے جینز اور اوپن شرٹ۔

امجد بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھا۔ لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔

”ہو سکتا ہے یہ ہماری آزادی یا زندگی کی آخری رات ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم ایک شریف آدمی ہو۔ پرانی دوستی کی وجہ سے اب تک تم نے ہمارا ساتھ دیا جس کے لئے میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔ لیکن اب میں تمہیں اپنے سے دور ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ناکردہ جرم میں پکڑے یا مارے جاؤ۔ اگر ہم آج رات واپس نہ آئے تو تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔“

”وہ کیا؟“ امجد نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے سوپ کیس چارپائی پر رکھ کر کھول دیا اور اوپر رکھے ہوئے کپڑے اٹھا کر ایک طرف ڈال دیے۔ لمبوٹ کیس میں بھرا ہوا خزانہ دیکھ کر امجد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”یہ مت پوچھنا کہ ہمارے پاس یہ دولت کہاں سے آئی۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے بعد اس میں سے آدھا حصہ تم رکھ لینا اور آدھا متحق لوگوں میں بانٹ دینا۔“

یہاں رک کر میں یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا؟ سلمان وحید پر میرا شبہ قوی تر ہوتا جا رہا تھا۔ جب ہم لارڈز ریسٹورنٹ سے نکلے تھے تو فائو اسٹار ہوٹل تک راستے بھر وہ ملک شہاب کو گالیاں دیتا رہا تھا۔ لیکن ہوٹل پہنچنے کے بعد ظفر کے سامنے اس نے ملک شہاب کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے تھے۔ اس پر مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی چال چل رہا ہے۔

جب ہم گھر پہنچے تو ایک بجنے والا تھا۔ امجد آچکا تھا۔ میں نے چرغوں والا تھیلا نجمہ کے حوالے کر دیا۔

”مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔ یہ پلیٹوں میں نکال کر لاؤ۔“ میں نے کہا۔

”میں نے بھی ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔ اور امجد بھائی بھی کھائیں گے۔“ نجمہ کہتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔

پندرہ منٹ بعد ہم تینوں بیٹھے روٹی نان اور چرغہ کھا رہے تھے۔ میں امجد کو سلمان وحید کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اطمینان سے ساری بات سنتا رہا۔ پھر میرے خاموش ہونے پر بولا۔

”سلمان وحید کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں روٹی باؤ! وہ نہایت گھٹیا اور بیچ آدمی ہے۔

ملک شہاب کو وہ پہلے بھی عورتیں سلائی کیا کرتا تھا اور اب بھی شاید وہ اسی خدمت پر مامور ہے۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا، پھر بولا۔ ”اس نے تمہیں یقیناً نہیں پہچانا۔ وہ تو نجمہ کے چکر میں ہو گا۔ اگر تمہیں پہچان لیا ہوتا تو تمہیں ظفر کے پاس لے کر بھی نہ جاتا۔“

”کل ظفر نے ہماری دعوت کی ہے اپنی کوٹھی پر۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ اپنی کوٹھی پر تمہیں بے بس کر کے نجمہ کو کہیں اور لے جانے کی کوشش کریں گے۔“ امجد نے کہا۔ ”ویسے ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔ ظفر اور سلمان..... دونوں ہی کو معلوم ہے کہ ملک شہاب کہاں ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کا پیچھا کر کے اس کی خفیہ پناہ گاہ کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔“

”یہ کام بھی تمہیں ہی کرنا ہے۔ بلکہ ہم دونوں کریں گے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے ظفر کی کوٹھی دیکھی ہوئی ہے۔ میں کل اس کی نگرانی شروع کر دیتا ہوں۔ تم سلمان کی نگرانی شروع کر دو۔“

”نقشہ نام سے پہلے پہلے ہمیں کامیابی حاصل کر لینی چاہئے۔“

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد میں بھی امجد کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔ میں نے امجد کے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سر پر مفلر لپیٹا ہوا تھا۔ ایک درکشاپ پر امجد نے مجھے دن بھر

دوسرا آدمی اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا۔ میں نے اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا دی۔ وہ بھی منہ کے بل چیخا ہوا گر۔

”ماجھے..... جیرے..... گامے.....“ ملک شہاب اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ میں نے جیب سے پستول نکال لیا اور ملک شہاب کو اٹھنے کا موقع دیئے بغیر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

دو تین نوکر دوڑتے ہوئے ہال کمرے میں پہنچ گئے۔ لیکن اسی وقت فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ نجمہ نے قمیض کے نیچے چھپا ہوا اپنا پستول نکال کر گولی چلا دی تھی۔ اندر آنے والوں میں سے ایک آدمی چیخا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

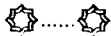
ایک آدمی لمبی سی چھری تانے میری طرف لپکا۔ میں نے بھی گولی چلا دی۔ ملک شہاب نے اٹھ کر اندرونی دروازے کی طرف دوڑنے کی کوشش کی۔ میں پے درپے فائر کرتا چلا گیا۔ تین گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ ایک نے اس کی کھوپڑی اڑا دی تھی۔ وہ قالین پر ڈھیر ہو گیا۔

نجمہ کی چیخ سن کر میں اس طرف مڑا۔ باہر سے آنے والے چوکیدار نے نجمہ پر فائر کھول دیا تھا۔ ایک گولی نجمہ کے سینے میں لگی اور وہ ڈھیر ہو گئی.....!

میرے اوپر جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ میں اندھا دھند فائرنگ کرنے لگا۔ اپنا پستول خالی ہوا تو نجمہ کا پستول اٹھا لیا۔

اور پھر یکایک خاموشی چھا گئی۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ میرے گرد کئی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ موت کا سوداگر ملک شہاب بھی میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔ نجمہ..... سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر گولی لگی تھی۔ وہ ابھی زندہ تھی۔ میں نے اس کا سراپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ ویران سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس نے آخری ہنسی لی اور دم توڑ دیا۔

میں نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ باہر ایک ہجوم جمع ہو رہا تھا۔ شور کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اور آدھے گھنٹے بعد جب پولیس آئی تو میں نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔



اجد میرا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ اس نے شہر کے بہترین وکیلوں کی خدمات حاصل کی تھیں اور روپیہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ لیکن اگر عدالت مجھے رہا کر دیتی تو میں اسے نا انصافی سمجھتا۔

اجد حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

رات گیارہ بجے کے قریب اس نے ہمیں اپنے رکشہ پر ماڈل ٹاؤن میں ملک شہاب والی کوٹھی سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

نجمہ اور میں ٹہلنے والے انداز میں کوٹھی کے سامنے آ گئے۔ گیٹ کے اندر کی طرف چوکیدار بیٹھا ہوا تھا۔ ہلکی سی دستک پر اس نے ذیلی دروازہ کھول دیا۔

”ملک صاحب کو بتاؤ مس نجمہ آئی ہیں ان سے ملنے کے لئے۔“ میں نے کہا تو چوکیدار نے صاف انکار کر دیا کہ ملک صاحب یہاں نہیں رہتے۔

”تمہاری شامت تو نہیں آئی؟“ میں نے اسے گھورا۔ ”ہمیں ظفر نے بھیجا ہے کہ ملک صاحب یہاں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر تم نے انہیں اطلاع نہ دی تو وہ تمہیں معاف نہیں کریں گے۔“

چوکیدار چند لمحے ہمیں گھورتا رہا، پھر دروازہ بند کر کے اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔

ہم برآمدے والے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے ہی وسیع لاؤنج میں ملک شہاب ایک اور آدمی کے ساتھ بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ نجمہ کو دیکھ کر اس کی باجھیں کھل اٹھیں۔

”اچھا ہوا تم آ گئیں۔ اس وقت تم جیسی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر یہ کون ہے؟“ وہ پہلے نجمہ اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں یہاں کیسے آئی؟“ نجمہ نے کہا۔ اس نے ملک کے سوال کا دوسرا حصہ نظر انداز کر دیا تھا۔

”ارے بھی ظفر نے بھیجا ہوگا۔“ ملک بولا۔ ”اس نے بتایا تھا کہ آج تمہاری دعوت ہے۔ وہ تمہیں یہیں لانا چاہتا تھا۔ مگر تم نے بہت دیر کر دی۔ آؤ..... اب مزید دیر مت کرو۔ یہ تمہارا دلال ہے تو اسے باہر بٹھا دو برآمدے میں۔“

میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے آگے بڑھ کر میز کو پیر کی ٹھوک سے الٹ دیا اور ملک کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر اسے زوردار جھٹکے سے اٹھا دیا۔

”آنکھیں کھولو اور مجھے پہچانو ملک شہاب!“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔ ”میں اس لڑکی کا دلال نہیں، روٹی ہوں۔ تمہارا دوست۔“

ملک شہاب کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ میں نے اسے دھکا دے کر صوف پر گرادیا۔ وہ چیخا ہوا صوف پر سمیت پیچھے الٹ گیا۔

مجھے موت کی سزا سنا کر جیل میں ڈال دیا گیا۔

میں سنٹرل جیل لاہور کی کال کوٹھڑی میں بیٹھا اپنی یہ داستان لکھ رہا ہوں..... میں اس تنگ سی کوٹھڑی میں بالکل اکیلا ہوں۔ بچپن میں بھی اکیلا رہا۔ ماں باپ کی محبت کو ترستا رہا۔ میں نے دنیا والوں سے محبت کرنے کی کوشش کی مگر مجھے ہر جگہ ٹھکرا دیا گیا۔

اور آج میں سنٹرل جیل کی اس کوٹھڑی میں بیٹھا اپنی موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر مجھے بچپن میں باپ کی محبت ملی ہوتی تو شاید میرا یہ انجام نہ ہوتا۔

میں اپنی داستان ختم کرتے ہوئے والدین سے درخواست کروں گا کہ خدارا! اولاد سوتیلی بھی ہو تو اسے محرومی کے اندھیرے میں دھکیلنے کی بجائے تھوڑی سی محبت ضرور دیجئے۔ آپ کی یہ تھوڑی سی محبت ایک انسان کی زندگی سنوار سکتی ہے۔ اپنوں کی بے اعتنائی اور محرومی کا شکار انسان میری طرح معاشرے کا ناسور بن جاتا ہے۔ جس کا علاج وہی ہے جس کا میں منتظر ہوں۔

موت..... بھیا تک موت!

(ختم شد)